یہودیت و نصرانیت

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی

مطبوعات اشاعتِ اسلام ٹرسٹ —— ۶۱۳

یہودیت و نصرانیت

مصنف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مرتب

نعیم صدیقی

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی

C اشاعت اسلام ٹرسٹ دہلی ۶

بارِ اول جنوری ۱۹۸۴ء ۱۰۰۰

قیمت 40/-

مطبوعہ

(جمال آفسٹ پریس دہلی)

فہرست

حصہ اول —— یہودیت

باب ۱

بنی اسرائیل حضرت ابراہیمؑ سے حضرت یوسفؑ تک۔

فصل ۱ : تعارفی توضیحات :- ۱۷-۲۲

حضرت ابراہیمؑ کی نسل کی دو شاخیں —— بنی اسرائیل کی وجہ تسمیہ ——
بنی اسرائیل کا وسیع و عظیم ماضی —— یہودیت کی ابتدا اور وجہ تسمیہ۔

فصل ۲ : حضرت یوسفؑ کے دورِ عروج میں بنی اسرائیل کی نوآبادکاری۔ ۲۳-۲۶

مصر میں چرواہے بادشاہوں کا دورِ حکومت —— حضرت یوسفؑ کا
دورِ اقتدار —— بائبل کا بیان۔

فصل ۳ : دورِ یوسفؑ کے بعد کیا گزری؟ ۲۷-۲۹

بنی اسرائیل پر فراعنہ کے مظالم —— بائبل سے ایک ضروری
اقتباس

باب ۲

بعثتِ موسیٰ علیہ السلام کے بعد۔

فصل ۱ : بعثتِ موسیٰؑ کے وقت بنی اسرائیل کا حالِ زار۔ ۲۳-۳۵

دعوتِ موسیٰؑ سے اکابر و اشراف کا گریز۔

فصل ۲ : دربارِ فرعون میں موسیٰ علیہ السلام کی دعوت :- ۳۹-۳۹

فرعون کا ردِ عمل۔

فصل ۳ : دورِ موسیٰؑ میں بنی اسرائیل پر فرعونی مظالم :- ۴۰-۴۲

فرعون کے عہد میں ان کی غلامانہ حیثیت — بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے موسیٰؑ کا مطالبہ۔

فصل ۴ : مصر سے بنی اسرائیل کا خروج، ۴۳

فصل ۵ : خروج کے احوال :- ۴۴-۴۸

فرعون کا تعاقب — فرعون کی غرقابی — ایک ضمنی بحث۔

فصل ۶ : بنی اسرائیل پر دورِ غلامی کے اثرات :- ۴۹-۵۰

فصل ۷ : عطائے شریعت :- ۵۱-۵۲

کوہِ طُور پر حضرت موسیٰؑ کی پہلی طلبی — الواح پر لکھے ہوئے احکام۔

فصل ۸ : گوسالہ پرستی کا فتنہ، ۵۳-۶۰

گائے بیل کی پرستش کا رواجِ عام — کوہِ طُور سے واپسی اور فتنہ کی تحقیقات — پیروانِ سامری کا عذر — سامری کی فتنہ طرازی اور اس کی سزا — گوسالہ پرستی پر بنی اسرائیل کا معافی مانگنا — شرک کے مجرمین کو سزا — فتنہ کی بیخ کنی کے بعد تنظیمِ نَو۔

فصل ۹ : بیابانِ سینا میں اللہ تعالیٰ کے احسانات :- ۶۱-۶۴

تین بڑے احسانات — من وسلویٰ کا نزول — مزید تفصیل۔

فصل ۱۰ : خدائی احسانات کے جواب میں بنی اسرائیل کا ٹیڑھا رویّہ :- ۶۵-۷۲

بے صبر ہوکر شہری غذائیں مانگتے ہیں — ایک بستی کی فتح اور بنی اسرائیل کا کردار — گائے ذبح کرنے کا حکم اور ان کی حیلہ جوئی — قتل کا ایک واقعہ — بیت المقدس میں داخلے کا حکم — بنی اسرائیل کی دُوں ہمتی۔

فصل ۱۱ : بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آخری وصیّتیں :- ۷۳-۷۴

بائیبل میں آپ کی روایت شدہ تقریر۔

باب ۳

یہود کا بگاڑ اور اس کے نتائج

فصل ۱ : یہود کا اخلاقی تنزل اور سیاسی پراگندگی :- ۸۲-۷۷

تفرقہ و تصادم اور اس کے نتائج — یہودی حکومت کا قیام اور تباہی — بائیبل میں یہودیوں کے اخلاقی تنزل کا ریکارڈ — ہوسیع نبی کا بیان — یسعیاہ نبی کا بیان — میکاہ نبی کا بیان — متذکرہ بیانات کا ماحصل — انبیاء کی مساعی اصلاح

فصل ۲ : انبیاء کی مسلسل تنبیہات :- ۸۹-۸۳

تنبیہ جو بار بار کی جاتی رہی — حضرت داؤد علیہ السلام کی زبان سے اوّلین تنبیہ — پہلے فساد کے ظہور پر تباہی کی خبر حضرت یسعیاہ یوں دیتے ہیں — آخری لمحے پر یرمیاہ نبی کی آواز — حزقی ایل نبی کا یہود سے خطاب — دوسرے فساد کے متعلق حضرت عیسیٰؑ کا انتباہ۔

فصل ۳ : یہود کے ایمانی و اخلاقی بگاڑ پر قرآن کی مزید توضیحات :- ۱۰۸،۹۰

یہودی علماء اور درویشوں کی پستیاں — یہود میں کثرتِ سوال کی بیماری — علمِ کتاب اللہ کو مقید کرنے کا جرم — کلامِ الٰہی میں تحریف — تحریفِ کلمات کی تین صورتیں — کلام اللہ میں الٹ پھیر — یہود توراۃ کا تحفظ نہ کر سکے — عقیدۂ آخرت میں خرابی — اُخروی نجات کے متعلق زعمِ اجارہ داری — ان کا ایک گروہ آخرت کا منکر تھا — بدعملی کے باوجود اُخروی کامرانی کا عقیدہ — آخرت میں ہمیں سزا ہوگی بھی تو معمولی ہوگی — عوام علم سے محروم اور مفروضات میں مگن تھے — خدا کی چہیتی مخلوق — غیر یہودیوں سے جو سلوک چاہیں کریں — یہودیوں کا اچھا عنصر — ضابطۂ سبت میں نقب زنی — قتلِ انبیاء کا جرم — یہود کی طرف سے قتلِ انبیاء کا اقرار۔

باب ۴

جنگ کے متعلق یہودیوں کے نظریات۔

فصل ۱ : ان کے مذہب کی رُو سے اُن کا مقصدِ جنگ اور قوانینِ جنگ :- ۱۸-۱۱۱

مقصدِ جنگ — حدودِ جنگ۔

باب ۵

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت داؤد علیہ السلام تک کا دور۔

فصل ۱ : یہود کا مطالبۂ بادشاہت اور اس کے نتائج ۔ ۱۲۱-۱۲۷

سموئیل نبی سے بادشاہ کے تقرر کا تقاضا — سموئیل نبی کا انتباہ — خدا کی طرف سے بادشاہ مقرر کر دیا گیا — قرآن کا بیان — تابوتِ سکینہ — واقعۂ نہر میں ان کی بے صبری کی مثال — اسرائیلیوں کا جالوت پر غالب آنا — حضرت داؤد کی بہادری

فصل ۲ : غلبۂ فلسطین سے حملۂ بخت نصّر تک (اس دور کا مجموعی جائزہ) :- ۱۲۸-۱۳۲

فلسطین میں یہودیت کا ابتدائی دور — ہدایت کو فراموش کر دیا گیا — پہلا خمیازہ — دوسرا خمیازہ — یہودی سلطنت دو ٹکڑوں میں بٹ گئی — ریاست سامریہ پر کیا گزری؟ — یہودیہ پر بخت نصّر کا تباہ کُن حملہ۔

فصل ۳ : حضرت الیاسؑ کی اصلاحی اور انتباہی مساعی :- ۱۳۳-۱۳۸

بنی اسرائیل کے جلیل القدر نبی — بائبل میں حضرت الیاسؑ کا تذکرہ — حضرت الیاسؑ کی دعوت اور انتباہ اور معجزات — حضرت الیاسؑ کو ملک بدر کر دیا گیا — یہودیہ میں حضرت الیاسؑ کی دعوتی مہم — حضرت الیاسؑ کی پیشینگوئی پوری ہو کر رہی — یہودیوں کا دیوتا "بعل"۔

فصل ۴ : دَورِ داؤدیؑ اور سلیمانیؑ میں یہود کا عروج :- ۱۳۹-۱۴۶

حضرت داؤدؑ کے دَور میں فولادی صنعت — لوہے کے استعمال کا دور جدید تحقیقات کی روشنی میں — حضرت سلیمانؑ کا دورِ نبوت و حکومت — ہوائی تسخیر اور بحری بیڑہ — حضرت سلیمانؑ کے لیے تسخیرِ جنات — جدید زمانے کا ایک مغالطہ — ملکۂ سبا کا ایمان لانا — عہدِ عتیق میں متذکرہ قصے کا ایک خلاصہ — قرآن اور عہد نامۂ عتیق کے بیان میں مماثلت۔

فصل ۵ : یہودی بابل کی اسیری کے زمانے میں :- ۱۴۷-۱۴۹

قصۂ ہاروت و ماروت — دوسروں کی بیویاں ہتھیانے کا فتنہ۔

فصل ۶ : بابل کی اسیری سے نجات کے بعد حضرت عیسیٰؑ تک کا دَور :- ۱۵۴-۱۵۰

یہود کو ایک اور مہلتِ اصلاح دی گئی ــــ نقشۂ احوال پلٹ گیا ــــ ہیکلِ سلیمانی دوبارہ تعمیر کیا گیا ــــ حضرت عُزَیرؑ کا زمانۂ تجدیدِ اصلاح ــــ یونانیوں کا فلسطین پر قبضہ ــــ یہودی مذہب و تہذیب کی بیخ کنی کی مہم ــــ مَکّابی تحریک اور اس کی کامیابی ــــ مَکّابی تحریک کا زوال اور رومی دورِ اقتدار۔

باب ۶

حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا دَور اور یہود کا دوسرا فسادِ عظیم

فصل ۱ : یہودیوں کی اصلاح کے لیے حضرت یحییٰؑ کی مساعی :- ۱۵۹-۱۵۷

حضرت زکریاؑ کو بیٹے کی بشارت ــــ بیابان میں پکارنے والے کی آواز ــــ یوحنا بپتسمہ دینے والا ــــ اُن کی تعلیمات ــــ یہودی فرمانروا کے ہاتھوں حضرت یحییٰؑ کا قتل۔

فصل ۲ : حضرت عیسیٰؑ کی مساعیٔ اصلاح اور یہود کا معاندانہ رویّہ :- ۱۷۴-۱۶۰

حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش کی بشارت ــــ حضرت مریمؑ کیوں دُور چلی جاتی ہیں ــــ حضرت مریمؑ کی پریشانی ــــ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے بعد حضرت مریمؑ کو ہدایت ــــ حضرت مریمؑ اپنی قوم کے سامنے ــــ گہوارے میں حضرت عیسیٰؑ کا قوم کو جواب دینا ــــ حضرت عیسیٰؑ یہودیوں کے لیے رسول اور نمونہ مقرر کیے گئے ــــ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت ــــ دینِ موسیٰؑ کے مُصدّق تھے ــــ یہود پر حضرت عیسیٰؑ کی تنقید ــــ شریعت سے یہود کے انحراف کی ایک مثال ــــ یہود نے دعوتِ عیسیٰؑ کو رد کر دیا ــــ یہودیوں کا زعمِ باطل کہ مسیح کو صلیب دی گئی ــــ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت اور یہود کی گمراہی ــــ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیوں کرتے ہیں؟

فصل ۳ : یہودیوں کا دوسرا فسادِ عظیم :- ۱۷۶-۱۷۵

فلسطینی ریاست کی تقسیم ـــ دوسرا فسادِ عظیم اور اس کی پاداش۔

باب ۷

اپنے انبیاء کے متعلق یہود کی تہمتیں اور غلط بیانیاں۔

فصل ۱ : انبیاء پر یہودیوں کے لگائے ہوئے داغ اور قرآن :- ۱۸۱-۱۷۹

فصل ۲ : حضرت لوط علیہ السلام :- ۱۸۳-۱۸۲

فصل ۳ : حضرت اسماعیل علیہ السلام :- ۱۹۰-۱۸۴

قرآن حضرت اسماعیلؑ کو ذبیح قرار دیتا ہے ـــ بائیبل کی تضاد بیانی ـــ اسلامی روایات میں اختلافات کی حقیقت ـــ حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح ہونے کے واضح دلائل ـــ حضرت عمر بن عبدؒ العزیز کی ایک مجلسی بحث۔

فصل ۴ : حضرت یعقوب علیہ السلام :- ۱۹۲-۱۹۱

فصل ۵ : حضرت یوسف علیہ السلام :- ۱۹۹-۱۹۲

حضرت یوسفؑ کے پہلے خواب کا قصہ ـــ بھائیوں کے خلاف چغلیاں کھانے کا الزام ـــ کنوئیں میں ڈالے جانے پر یوسفؑ کی کیفیت ـــ رہائی کے موقعے کی غلط تصویر۔

فصل ۶ : حضرت موسیٰ علیہ السلام :-

ان پر قتلِ عمد کا الزام ـــ مدین میں قید کا افسانہ اور بدکاری کا الزام ـــ ۲۰۲-۱۹۷ مفروضہ بیوی سے چالیس سال تک قطعِ تعلق کا الزام ـــ پیغمبرانہ معجزات کے مقابلہ میں جادوگروں کے طلسمات ـــ دوسروں کے زیورات ہتھیانے کے حکم کا الزام۔

فصل ۷ : حضرت ہارون علیہ السلام :- ۲۰۶-۲۰۳

حضرت ہارونؑ پر بچھڑا بنانے اور اسے معبود بنانے کا الزام ـــ قومی اتحاد

کی خاطر شرک کو گوارا کرنے کا الزام ـــ حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے دَور میں سامری کے وجود کا انکار۔

فصل ۸ : حضرت داؤد علیہ السلام :۔ ۲۱۳-۲۰۷

اوریاہ حتی کی بیوی کے متعلق گھناؤنا الزام ـــ قرآن کی بیان کردہ صحیح صورتِ واقعہ ـــ شریر النفس لوگوں کی حاشیہ آرائی ـــ توضیحِ مزید۔

فصل ۹ : حضرت سلیمان علیہ السلام :۔ ۲۱۸-۲۱۴

حضرت سلیمانؑ پر تصویر سازی کا الزام ـــ انگوٹھی کا افسانہ ـــ تلمودی روایات۔

فصل ۱۰ : حضرت ایوب علیہ السلام :۔ ۲۲۲-۲۱۹

پیکرِ صبر کو پیکرِ اضطراب بنا دیا گیا ـــ سفرِ ایوبؑ کے تین حصوں کا تضاد ـــ سفرِ ایوب محض ایک شاعرانہ داستان طرازی ہے۔

باب ۸

ظہورِ اسلام اور یہودِ عرب۔

فصل ۱ : عرب کے یہودیوں کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر : ۲۲۹-۲۲۵

یہودِ عرب کی کوئی مستند تاریخ موجود نہیں ـــ یہودِ عرب کا اپنے متعلق بیان ـــ اصل صورتِ واقعہ ـــ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے حجاز اور یثرب میں یہودیوں کی پوزیشن ـــ معاشی حالت۔

فصل ۲ : نزولِ قرآن کے وقت یہود کی مذہبی اور اخلاقی حالت :۔ ۲۳۳-۳۳۰

ایک سرسری جائزہ ـــ نہ خدا پر ایمان نہ آخرت پر ـــ ان کا مذہبی تعصب ـــ شرک سے لاپرواہی اور جزئیات کا ناپ تول ـــ یہود کا خدائی قانون پر عمل پیرا ہونے سے اعراض۔

فصل ۳ : اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہود کے مخالفانہ ہتھکنڈے۔ ۲۴۳-۲۳۴

مسلمانوں کے خلاف مشرک قبائل سے ساز باز — مذہبی اثر کا معاندانہ استعمال — تلبیسِ حق اور کتمانِ حق — ذُو معنیین الفاظ کا شر پسندانہ استعمال — صبح اسلام لاؤ، شام کفر کرو — مسلمانوں سے منافقانہ رویہ — شبہات پھیلانے کی کوشش۔

فصل ۴ : ایک مقدمۂ زنا میں یہود کا اپنے مذہب سے انحراف :- ۲۴۶-۲۴۲

یہودیوں کا خفیہ مشورہ — یہودیوں کا پول کُھل گیا — یہود کی نمائشی مذہبیت۔

فصل ۵ : نامعقول اعتراضات اور بے تکے مطالبات :- ۲۵۴-۲۴۷

یہود کو اسلامی اصلاحات سخت ناگوار تھیں — ایک ایک چیز پر سو سو اعتراضات — کعبہ کو قبلہ بنانے پر اعتراض — رسولؐ اللہ کی بشریّت پر اعتراض — حلّت و حرمت کے متعلق فقہی اعتراض — حضرت زینبؓ کے نکاح پر مفسدانہ پروپیگنڈا — اللہ کا مذاق اڑانے کی جسارت — جبریل سے عداوت — لکھی لکھائی کتاب آسمان سے اتار کر دکھاتے — سوختنی قربانی کا مطالبہ۔

فصل ۶ : معاہدۂ مدینہ اور یہود کی خلاف ورزیاں :- ۲۵۹-۲۵۵

یہود کی عہد شکنی کے تین وجوہ — چند واقعاتی شواہد۔

باب ۹

یہودِ مدینہ کے مفسدانہ رویے کی چند واقعاتی تفاصیل۔

فصل ۱ : یہود اپنے کیفرِ کردار تک کیسے پہنچے؟ ۲۷۱-۲۶۲

کعب بن اشرف کا قتل — ابو رافع کے قتل کا واقعہ — جنگِ اُحد کے موقع پر غداری — حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش — بنی نَضیر کو حضورؐ کی طرف سے الٹی میٹم — حضورؐ کے الٹی میٹم کے جواب میں مقابلہ کا اعلان — مخالفینِ اسلام کا اعتراض اور اس کا جواب — اس کاروائی

پر کیسے اعتراض کیا جا سکتا ہے۔

فصل ۲ : غزوہ خندق کے وقت بنو قریظہ کی بدعہدی۔ ۲۷۵-۲۵

حضورؐ کو بروقت اطلاع مل گئی ـــــ بنو غطفان سے صلح کی تجویز اور اس کا ترک نُعیم بن مسعود کی پارٹ۔

فصل ۳ : بنو قریظہ پر چڑھائی اور محاصرہ۔ ۱۷۷-۴۷۱

بنو قریظہ کی طرف سے صلح کی درخواست ـــــ بنو قریظہ کے مقرر کردہ ثالث کا فیصلہ۔

فصل ۴ : بنو قریظہ کے قتلِ عام پر مخالفین کے اعتراضات اور ان کا جواب۔ ۲۸۱-۲۷۸

فصل ۵ : عرب میں یہود کا زور ٹوٹ گیا۔ ۲۸۲-۲۸۲

فصل ۶ : یہودِ خیبر کا اخراج (خلافتِ راشدہ میں)۔ ۲۸۸-۲۸۴

طے شدہ شرائط سے یہود کا انحراف ـــــ حضرت عمرؓ کے دور میں یہودِ خیبر کے اخراج کی کارروائی ـــــ اس معاملے سے متعلق ایک اہم حدیث۔

باب ۱۰

موجودہ دور میں یہودی ریاست کا قیام اور اس کی مسلم دشمن کارروائیاں

فصل ۱ : یہودی ریاست کے قیام کا پس منظر۔ ۲۹۵-۲۹۱

یہودی عزائم کی تحریک ـــــ یہودیوں کی احسان فراموشی ـــــ یہودیوں کی منصوبہ بندی۔

فصل ۲ : بین الاقوامی صورتِ حالات۔ ۳۰۰-۲۹۶

ترکی اور عربی قوم پرستی کا تصادم ـــــ جنگِ عظیم اول اور اعلان بالفور ـــــ مجلسِ اقوام کی کارگزاری ـــــ انگریزی انتداب کا کارنامہ۔

فصل ۳ : یہودیوں کا آئندہ لائحۂ عمل۔ ۳۰۹-۳۰۱

”قومی وطن“ سے ”قومی ریاست“ تک ـــــ یہودی منصوبہ کا تیسرا مرحلہ ـــــ یہودیوں کا چوتھا منصوبہ ـــــ پس چہ باید کرد؟

فصل ۴ : خاتمۂ بحث۔ ۳۱۵ ۳۱۱

فہرست

حصہ دوم — نصرانیت

باب ۱

ظہورِ مسیح علیہ السلام

فصل ۱ : حضرت مریم اور ولادتِ عیسٰی علیہ السلام۔ ۳۳-۳۱۵

اُمّ مریم کی نذر — حضرت مریم کی پیدائش — دُعا اور قبولیتِ دعا — حضرت مریمؑ حضرت زکریاؑ کی کفالت میں — حضرت مریم کے پاس ملائکہ کی آمد — حضرت عیسٰی کی بشارت — مشرقی جانب گوشہ نشینی — فرشتے کی آمد پر ان کا استعجاب — جائے اعتکاف سے دور چلی جاتی ہیں — حالتِ زچگی کے وقت ان کی پریشانی — فرشتے کی ندا — حضرت مریمؑ قوم کے سامنے — گہوارہ میں حضرت عیسٰیؑ کا کلام کرنا — حضرت عیسٰیؑ کی ابتدائی پرورش کہاں ہوئی ہے — اس واقعہ کی ایک مہمل تاویل — بے باپ پیدائش کی دلیل۔

فصل ۲ : حضرت مسیحؑ کی معجزانہ پیدائش کے متعلق چند نکات۔ ۳۳-۳۲۶

حضرت مسیحؑ کی پیدائش اور سُنّت اللہ — معجزانہ پیدائش کی وجہ سے حضرت عیسٰیؑ ابن اللہ نہیں ہیں — پیدائش میں حضرت عیسٰی کی حضرت آدمؑ سے مماثلت — اعجازی پیدائش عجائباتِ تخلیق کا ایک نمونہ ہے — کلمہ اور روح من اللہ کی بحث — عیسٰیؑ اور مریم علیہما السلام دونوں مل کر ایک نشانی ہیں۔

باب ۲

حضرت عیسیٰؑ کی دعوت اور تعلیمات

فصل ۱ : حضرت عیسیٰؑ کی اساسی تعلیم:- ۳۳۷-۳۳۲

میں بیّنات لے کر آیا ہوں ۔ نبوت عیسیٰ کی بیّنات ۔۔۔ دین موسوی کی تجدید ۔۔۔ حضرت عیسیٰ کی دعوت کے تین نکات ۔۔۔ انجیل اور دعوت کے تین نکات ۔

فصل ۲ : مروّجہ چار انجیلوں میں تعلیماتِ عیسوی:- ۲۴۴-۳۳۸

دعوتِ توحید ۔۔۔ حکومتِ الٰہی ۔۔۔ حق و باطل کی کشمکش کا پیغام ۔۔۔ راہِ حق میں آزمائش ضروری ہے ۔۔۔ ایک انقلابی تحریک ۔۔۔ مسلکِ صبر کی تلقین ۔۔۔ حبِّ دنیا سے اجتناب اور فکرِ آخرت کی دعوت ۔۔۔ تحملِ شدائد کی تعلیم کا مقصد ۔۔۔ حکومتِ الٰہی کا جامع مینی فیسٹو ۔۔۔ حکومت خدمت ہے ۔۔۔ یہودی علماء و مشائخ پر تنقید ۔۔۔ حضرت عیسیٰؑ کے خلاف مذہبی اکابر کی سازش ۔۔۔ حضرت عیسیٰؑ کے خلاف اکابرِ یہود کا مقدمہ ۔۔۔ حضورؐ کے مکی دورِ دعوت سے مماثلت ۔

فصل ۳ : دعوتِ عیسیٰؑ مسیحیت کی تعبیر کے مطابق:- ۲۵۹-۳۴۵

تعلیمِ محبت کا مسیحی تصور ۔۔۔ مسیحیت کی رہبانی روح ۔۔۔ آسمانی بادشاہت اور دنیوی بادشاہت میں منافات ۔۔۔ دنیوی سروسامان سے کلی اجتناب کے چند احکام ۔۔۔ تمدن اور تہذیب سے کامل انقطاع ایک مفسرِ انجیل کا نقطۂ نظر ۔۔۔ زینتِ استعمالِ شر سے مسیحیت کا احتراز ۔۔۔ تذلّل و انفعال کی تعلیمات کے مضمرات ۔۔۔ مسیحیت اجتماعی نظام کی نقیض ہے ۔۔۔ راہبوں اور سنیاسیوں کی ایک مختصر جماعت مسیحیت پر چل سکتی ہے ۔۔۔ مسیحیت پوری انسانیت کے لیے ذریعۂ نجات نہیں ہے ۔۔۔ فطرت کے بالکل خلاف ۔۔۔ مسیحی نظریۂ محبت اور دوسرے انسانی فطری جذبات ۔۔۔ ظلمِ عظیم ۔

فصل ۴ : مسیح کی حقیقی تعلیمات کا تجزیہ :- ۲۶۶-۲۶۰

موجودہ مسیحیت کے نقائص اور کوتاہیاں ـــ ایک مستقل جداگانہ مذہب نہ تھا ـــ عیسائیت دینِ یہود کا تتمہ ہے ـــ دعوت نا تمام رہی ـــ یہود کو اخلاقی پستی سے نکالنے کی کوشش ـــ تعلیمِ صبر و استقامت آخری دور میں جہاد کی نا تمام تعلیم ـــ مسیحیت اور موسوی شریعت کا تعلق -

باب ۳

حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں تحریف

فصل ۱ : مسیحیت کا ظہور :- ۳۸۲-۲۶۹

موسوی شریعت سے جدائی ـــ جدائی کا دو طرفہ عمل ـــ لفظ "مسیحی" کا اوّلین استعمال ـــ عیسائیوں پر قرآن کا ایک احسان ـــ سینٹ پال نے ایک نیا دین بنا ڈالا ـــ نئے دین سے سینٹ پال کا مقصد ـــ اس فتنے کی روک تھام میں پیروانِ مسیح کی ناکامی ـــ تعلیماتِ عیسیٰؑ کو بالکل ملیا میٹ کر دیا گیا ـــ اصولِ دین میں پہلی تحریف ـــ اصولِ دین میں دوسری تحریف ـــ شریعتِ موسوی کی مخالفت ـــ پولوسی مسیحیت کے مضر اخلاقی اثرات ـــ ظلم کا مقابلہ کرنے کی رُوح کا فقدان ـــ مسیحی خود ظالم بن گئے ـــ سینٹ کی قرار داد اور تھیوڈوسیوس کے فرامین ـــ عیسائیوں کی آپس میں اخلاق سوز لڑائیاں ـــ متذکرہ حالات کی ذمہ داری موجودہ مسیحیت پر ہے ـــ پاپائی نظام

فصل ۲ : عیسائیوں کے بنیادی عقائد میں فساد :- ۳۹۰-۲۸۳

تقلیدِ اغیار کا مرض ـــ اناجیل کی رُو سے حضرت عیسیٰؑ انسان تھے ـــ حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ بنا دیا گیا ـــ عقیدۂ تثلیث یونانی فکر پر مبنی ہے ـــ اُلوہیتِ مسیحؑ کو باقاعدہ مسیحی عقیدہ قرار دیا گیا ـــ شخصیتِ مسیح میں اُلوہیت اور انسانیت کا اجتماع ـــ گناہ سے نجات اور فضلِ خداوندی ـــ

انسان کے پیدائشی گناہ گار ہونے کا عقیدہ ــــ اصل بیماری غلو تھی ــــ
حضرت مریم کو مادرِ خدا قرار دینا ۔

فصل ۳ : صُحفِ اناجیل کی تاریخی حیثیت :۔ ۳۹۱-۳۹۸
کیا موجودہ اناجیل قابلِ اعتماد ہیں؟ ــــ صُحفِ انجیل اور ان کے مرتبین ــــ
اناجیل کی دستاویزی حیثیت کا جائزہ ــــ قرآن کس انجیل کی تصدیق کرتا ہے
ــــ انجیل اور دیگر کُتبِ آسمانی کے متعلق ایک جامع جائزہ ۔

باب ۴
رہبانیّت کا ظہور اور نشو و ارتقا

فصل ۱ : ظہورِ رہبانیّت کے اسباب :۔ ۴۰۱-۴۰۲
رہبانیّت کے ابتدائی جراثیم ــــ پہلا سبب ــــ دوسرا سبب ــــ
تیسرا سبب ۔

فصل ۲ : مسیحی فلسفہ رہبانیت :۔ ۴۰۳-۴۰۴
اس فلسفہ کے مآخذ ــــ اس فلسفہ کا عملی ظہور ۔

فصل ۳ : عیسائی رہبانیت کی چند خصوصیات :۔ ۴۰۵-۴۱۳
جسمانی اذیت پسندی ــــ ترکِ طہارت و نظافت ــــ ازدواجی زندگی سے
احتراز ــــ قطع رحمی اور قرابتوں کا خاتمہ ــــ فرقہ وارانہ بنیادوں پر ظلم و تعدّی
ترک و تجرد کے ساتھ دنیا پرستی ــــ خانقاہوں میں فحاشی کے اڈے ۔

باب ۵
عیسائیوں کی تاریخ کے چند اہم اجزا

فصل ۱ : اصحابِ اُخدود :۔ ۴۱۷-۴۲۱
حضرت صہیبؓ رومی کی روایت ــــ حضرت علیؓ کی بیان کردہ روایت
ــــ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ــــ اسلامی مؤرخین کا بیان ــــ
واقعۂ اصحاب الاخدود کے عینی شاہد ــــ کعبۂ نجران کی تعمیر ۔

فصل ۲ : واقعۂ اصحابِ کہف :- ۴۲۲-۴۳۷

کہف و رقیم کی بحث — قصّہ کی قدیم ترین شہادت — بعض مستشرقین کی اختلافی بحث — محلِ واقعہ اور اس کی تفصیلات — ایک اعتراض اور اس کا جواب — قرآن کا بیان — قصّہ بیان کرنے کا مقصد۔

فصل ۳ : یمن پر عیسائیت کا تسلط اور واقعۂ فیل :- ۴۳۸-۴۴۷

حبش کی عیسائی سلطنت کا یمن پر حملہ — ابرہہ یمن کے اقتدار پر کیسے قابض ہوا؟ — بلادِ عرب پر سیاسی، تجارتی اور مذہبی مہم — کعبہ پر ابرہہ کی فوج کشی — اہلِ مکہ کا جوابی طرزِ عمل — حفاظتِ کعبہ کے لیے خدائی انتظامات — اس واقعہ کے متعلق اُدبائے عرب کی شہادتیں — واقعہ کے متعلق اہم روایات — سرورِ عالم کی ولادتِ مبارکہ — قرآن میں اس واقعہ کا اجمالی تذکرہ کس لیے؟

باب ٦

بائبل میں نبی آخر الزمان کی پیشین گوئیاں

فصل ۱ : حضرت موسیٰؑ کی زبان سے بشارت :- ۴۵۱-۴۵۲

قرآن کا اشارہ — تین اہم توضیحی اشارات۔

فصل ۲ : حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے بشارت :- ۴۵۴-۴۶۲

وہ احمدؐ ہوگا — وہ نبیؐ سے کیا مراد ہے؟ — انجیل یوحنا کی پیشین گوئیاں — انجیل ترجمہ در ترجمہ کے عمل سے گزری — انجیل کے مشتبہ نسخے اور ان میں رد و بدل — ایک اور قابلِ توجہ پہلو — یوحنا کی پیشین گوئیوں کا ماحصل — ایک لفظ کا ہیر پھیر — اصل لفظ "منحمنّا" تھا — نجاشی کی تصدیق۔

فصل ۳ انجیلِ برناباس میں حضورؐ کے متعلق واضح تر پیشینگوئیاں :- ۴۶۳-۴۷۳

برناباس مسیحؑ کے اوّلین حواریوں میں سے تھا — برناباس کی شخصیت اناجیلِ اربعہ سے بہت برتر — یہ انجیل نبوتِ موسیٰؑ کی صحیح آئینہ دار ہے —

انجیلِ برناباس سے عیسائیوں کی مخالفت کی وجہ ـــ انجیل برناباس میں غلط عقائد کی تردید ـــ عیسائیوں کی بدقسمتی ـــ انجیل برناباس میں مندرج چند پیشین گوئیاں ـــ چند شبہات اور ان کا جواب۔

باب ۷

عیسائی خاتم النبیین کے دور میں

فصل ۱ : چند اہم واقعات :۔ ۴۷۷-۴۸۹

ورقہ بن نوفل کی تصدیقِ نبوت ـــ عیسائی سلطنت میں مسلمانوں کی ہجرت اُولیٰ ـــ حبشہ کے عیسائی بادشاہوں کی حق پسندی ـــ حبش کے لیے مسلمانوں کا خاص رویّہ ـــ مُقوقِسِ مصر کا رویّہ ـــ قرآن میں رومیوں کی فتح کی بشارت ـــ وفدِ نجران رسالت مآب کی خدمت میں ـــ حبشہ سے وفد کی آمد۔

فصل ۲ : مسیحی عقائد اور تصورات کی اصلاح کے لیے قرآن کی تلقینات :۔ ۴۹۰-۵۰۳

الوہیتِ مسیح کی تردید ـــ حضرت عیسیٰؑ کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے تھے ـــ حواریانِ عیسیٰؑ مسلم تھے ـــ عیسائیوں کا اقامتِ انجیل سے انحراف ـــ عیسائیت اور یہودیت ذریعۂ ہدایت نہیں ـــ احبار و رہبان کا غلط مقام ـــ کھوکھلی رسمِ اصطباغ۔

باب ۸

عیسائیوں سے متعلق مسلمانوں کے دو اہم مسائل

فصل ۱ : اسلام کا ضابطۂ حلت و حرمت اور ذبیحۂ اہلِ کتاب :۔ ۵۰۷-۵۲۴

اہلِ کتاب کے ساتھ مواکلت و مشاربت کا اصولی حکم ـــ وہ اشیاء جن کا کھانا حرام ہے ـــ ذبح کے لیے تذکیہ کی شرط ـــ حدیث میں ذبح کے تفصیلی احکام ـــ ذبیحہ کی حلت کے لیے تسمیہ کی شرط ـــ تسمیہ کے بارے میں فقہاء کے مسالک ـــ شافعیہ کا نقطۂ نظر اور اس کی کمزوری ـــ ذبیحۂ اہلِ کتاب کے بارے میں فقہاء کے مسالک۔

فصل ۲ : نکاحِ کتابیہ :- ۵۴۳-۵۲۵

اختلافاتِ سلف — ابنِ عمرؓ کا مسلک — ابنِ عباسؓ کا مسلک — جمہور کا مسلک اور ان کے اختلافات — صحیح مسلک — نکاح کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر — مخلوط شادیوں کی مضرّت — اختلافِ مذہب کے نقصانات — اسلامی قانونِ ازدواج کی شانِ اعتدال — مسلم اور غیر مسلم کے نکاح کی حرمت — مسلم اور غیر مسلم کے نکاح کی قیود — نکاحِ کتابیہ کی اجازت — نکاحِ کتابیہ کی کراہیت — نکاحِ کتابیہ میں ایک ضروری احتیاط۔

باب ۹

متفرّقات

فصل ۱ : ضمیمہ ۱ - ایک مسیحی بزرگ کے چند اعتراضات۔ ۵۵۵-۵۴۷

فصل ۲ : ضمیمہ ۲ - پوپ پال ششم کا پیغامِ امن اور اس کا جواب۔ ۵۶۲-۵۵۶

فصل ۳ : ضمیمہ ۳ - پاکستان میں مسیحیت کی ترقی کے اصل وجوہ۔ ۵۶۵-۵۶۳

ضمیمہ اول ۵۶۸-۵۶۴

ضمیمہ دوم ۵۷۳-۵۶۹

باب ۱

بنی اسرائیل

حضرت ابراہیمؑ سے حضرت یوسفؑ تک

ہردیال میونسپل پبلک لائبریری دہلی
نمبر اضافہ 16909 تاریخ 1983
باب اردو نمبر کتاب 1006

فصل ۱

تعارفی توضیحات

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انھوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستان عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے اس مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں اپنے خلیفے مقرر کیے، شرقِ اُردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو، شام و فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو اور اندرونِ عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مامور کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکے میں وہ گھر تعمیر کیا، جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔ ①

حضرت ابراہیمؑ کی نسل کی دو شاخیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں۔ ایک حضرت اسماعیلؑ کی اولاد، جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ اور جو عرب قبیلے نسلاً حضرت اسماعیلؑ کی اولاد نہ تھے وہ بھی چونکہ ان کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم و بیش متأثر تھے، اسی لیے وہ اپنا سلسلۂ نسب انہی سے جوڑتے تھے۔

دوسرے حضرت اسحاقؑ کی اولاد، جن میں حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور بہت سے انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوبؑ کا نام چونکہ اسرائیل تھا، اسی لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے ان کا دین قبول کیا انھوں نے یا تو اپنی انفرادیت ہی ان کے اندر گم کر دی، یا وہ نسلاً تو ان سے الگ رہے مگر مذہباً ان کے متبع رہے۔ اسی شاخ میں جب پستی و تنزل کا دور آیا تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر

عیسائیت نے جنم لیا۔ ②

حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے چار بیویوں سے تھے۔ حضرت یوسفؑ اور ان کے چھوٹے بھائی بن یمین ایک بیوی سے اور باقی دس دوسری بیویوں سے۔

فلسطین میں حضرت یعقوبؑ کی جائے قیام حبرون (موجودہ الخلیل) کی وادی میں تھی جہاں حضرت اسحاقؑ اور ان سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام رہا کرتے تھے ان کے علاوہ حضرت یعقوبؑ کی کچھ زمین سِکّم (موجودہ نابلس) میں بھی تھی۔ ③

بنی اسرائیل کی وجہ تسمیہ

اسرائیل کے معنی ہیں عبداللہ یا بندۂ خدا۔ یہ حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ وہ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے انہی کی نسل کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ ④

اس قوم کی اپنی روایات یہ ہیں کہ ان کے مورثِ اعلیٰ حضرت یعقوبؑ سے اللہ تعالیٰ نے کشتی لڑی۔ رات بھر کشتی ہوتی رہی اور صبح تک لڑ کر بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ پچھاڑ سکا۔ پھر جب صبح ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا: اب مجھے جانے دے تو انھوں نے کہا۔ میں تجھے نہ جانے دوں گا جب تک تو مجھے برکت نہ دے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے؟ انھوں نے کہا یعقوب۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آئندہ تیرا نام یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا۔ کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔[1] ⑤

---

[1] ملاحظہ ہو: یہودیوں کا جدید ترین ترجمہ کتب مقدسہ (THE HOLY SCRIPTURES) شائع کردہ جیوئش پبلیکیشن سوسائٹی آف امریکا ۱۹۵۴ء کتاب پیدائش باب ۳۲، آیات ۲۵ تا ۲۹۔ عیسائیوں کے ترجمۂ بائیبل میں بھی یہ مضمون اسی طرح بیان ہوا ہے۔ یہودی ترجمہ کے حاشیہ میں اسرائیل کے معنی لکھے گئے ہیں (HE WHO STRIVETH WITH GOD) یعنی "جو خدا سے زور آزمائی کرے"۔ اور انسائیکلوپیڈیا آف ببلیکل لٹریچر میں عیسائی علماء نے اسرائیل کے معنی کی تشریح یہ کی ہے کہ (WRESTLOR WITH GOD) یعنی "خدا سے کشتی لڑنے والا" پھر بائیبل کی کتاب ہوسیع میں حضرت یعقوبؑ کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ "وہ اپنی توانائی کے ایام میں خدا سے کشتی لڑا، پھر فرشتے سے کشتی لڑا اور غالب آیا"۔ (باب ۱۲- آیت ۴) مؤلف۔

بنی اسرائیل کا وسیع اور عظیم ماضی

ایک طرف حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر ان کی قوم میں پیدا ہوئے اور دوسری طرف حضرت یوسفؑ کے زمانے میں اور ان کے بعد مصر میں ان کو بڑا اقتدار نصیب ہوا۔ مدتِ دراز تک یہی اس زمانے کی مہذب دنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے، اور ان ہی کا سکہ مصر اور اس کے نواح میں رواں تھا۔

عموماً لوگ بنی اسرائیل کے عروج کی تاریخ حضرت موسیٰؑ سے شروع کرتے ہیں لیکن قرآن اس مقام پر (المائدہ ۔ ۲۰) پر تصریح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اصل زمانۂ عروج حضرت موسیٰؑ سے پہلے گزر چکا تھا جسے خود حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے سامنے اس کے شاندار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ ⑥

یہودیت کی ابتداء اور وجہ تسمیہ

اصل دین جو حضرت موسیٰؑ اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء لائے تھے وہ تو اسلام ہی تھا۔ ان انبیاء میں سے کوئی بھی یہودی نہ تھا اور نہ ان کے زمانے میں یہودیت پیدا ہوئی تھی۔ یہ مذہب اس نام کے ساتھ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ اُس خاندان کی طرف منسوب ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یہوداہ کی نسل سے تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جب ان کی سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تو یہ خاندان اُس ریاست کا مالک ہوا جو یہودیہ کے نام سے موسوم ہوئی، اور بنی اسرائیل کے دوسرے قبیلوں نے اپنی الگ ریاست قائم کر لی جو سامریہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ پھر اسیریا نے نہ صرف یہ کہ سامریہ کو برباد کر دیا بلکہ ان اسرائیلی قبیلوں کا بھی نام و نشان مٹا دیا جو اس ریاست کے بانی تھے۔

اس کے بعد صرف یہوداہ اور اس کے ساتھ بن یمین کی نسل ہی باقی رہ گئی جس پر یہوداہ کی نسل کے غلبے کی وجہ سے یہود کے لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔ اس نسل کے اندر کاہنوں اور ربیوں اور احبار نے اپنے اپنے خیالات اور رجحانات کے مطابق عقائد اور رسوم اور مذہبی ضوابط کا جو ڈھانچہ صدہا برس میں تیار کیا اس کا نام یہودیت ہے۔ یہ ڈھانچہ چوتھی صدی قبل مسیح سے بننا شروع ہوا اور پانچویں صدی بعد مسیح تک بنتا رہا۔ اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی ربانی ہدایت کا بہت تھوڑا ہی عنصر اس میں شامل ہے، اور اس کا حلیہ بھی اچھا خاصا بگڑ چکا ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں

اکثر مقامات پر ان کو اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، یعنی اے وہ لوگو جو یہودی بن کر رہ گئے ہو۔ ان میں سب کے سب اسرائیلی ہی نہ تھے بلکہ وہ غیر اسرائیلی لوگ بھی تھے، جنھوں نے یہودیت قبول کر لی تھی۔ قرآن میں جہاں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے، وہاں بنی اسرائیل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور جہاں مذہب یہود کے پیروؤں کو خطاب کیا گیا ہے وہاں اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا” کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ⑦

فصل ۲

حضرت یوسفؑ کے دورِ عروج میں بنی اسرائیل کی نوآبادکاری

بائیبل کے علما کی تحقیق اگر درست مانی جائے تو حضرت یوسفؑ کی پیدائش ۱۹۰۶ ق م کے لگ بھگ زمانے میں ہوئی اور ۱۸۹۰ ق۔م کے قریب زمانے میں وہ واقعہ پیش آیا جس سے قرآن میں قصۂ یوسفؑ علیہ السلام کی ابتداء ہوئی ہے، یعنی ان کا خواب دیکھنا اور پھر کنوئیں میں پھینکا جانا۔ اس وقت حضرت یوسفؑ کی عمر سترہ برس کی تھی۔ جس کنوئیں میں وہ پھینکے گئے وہ بائیبل اور تلمود کی روایات کے مطابق سِکّم کے شمال میں دوتن (موجودہ دُوثان) کے قریب واقع تھا اور جس قافلے نے انہیں کنوئیں سے نکالا وہ جلعاد (شرق اردن) سے آ رہا تھا اور مصر کی طرف عازم تھا۔

مصر میں چرواہے بادشاہوں کا دورِ حکومت

مصر پر اس زمانے میں پندرھویں خاندان کی حکومت تھی جو مصری تاریخ میں چرواہے بادشاہوں (HYKSES KINGS) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عربی النسل تھے اور فلسطین و شام سے مصر جا کر ۲ ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں سلطنتِ مصر پر قابض ہو گئے تھے۔ عرب مؤرخین اور مفسرینِ قرآن نے ان کے لیے "عمالیق" کا نام استعمال کیا ہے جو مصریات کی موجودہ تحقیقات سے ٹھیک مطابقت رکھتا ہے

مصر میں یہ لوگ اجنبی حملہ آور کی حیثیت رکھتے تھے اور ملک کی خانگی نزاعات کے سبب سے انہیں وہاں اپنی بادشاہی قائم کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہی سبب ہوا کہ ان کی حکومت میں حضرت یوسفؑ کو عروج حاصل کرنے کا موقع ملا اور پھر بنی اسرائیل وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، ملک کے بہترین زرخیز علاقے میں آباد کیے گئے، اور ان کو وہاں بڑا اثر و رسوخ حاصل ہوا، کیونکہ وہ ان غیر ملکی حکمرانوں کے ہم جنس تھے۔ پندرھویں صدی قبل مسیح کے اواخر تک یہ لوگ مصر پر قابض رہے

اور ان کے زمانے میں ملک کا سارا اقتدار عملاً بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں رہا۔ اُسی دَور کی طرف سورۂ مائدہ رکوع ۴ کے آغاز میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَ جَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا۔ اس کے بعد ملک میں ایک زبردست قوم پرستانہ تحریک اٹھی، جس نے "ہکسوس" اقتدار کا تختہ الٹ دیا۔ ڈھائی لاکھ کی تعداد میں عمالقہ ملک سے نکال دیے گئے۔ ایک نہایت متعصّب قبطی النسل خاندان برسرِ اقتدار آگیا اور اس نے عمالقہ کے زمانے کی یادگاروں کو چن چن کر مٹا دیا اور بنی اسرائیل پران مظالم کا سلسلہ شروع کیا جن کا ذکر حضرت موسیٰؑ کے قصے میں آتا ہے۔

مصری تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان چرواہے بادشاہوں نے مصری دیوتاؤں کو تسلیم نہیں کیا تھا، بلکہ اپنے دیوتا شام سے اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ مصر میں ان کا مذہب رائج ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید حضرت یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہوں کو فرعون کے نام سے یاد نہیں کرتا، کیونکہ فرعون مصر کی مذہبی اصطلاح تھی اور یہ لوگ مصری مذہب کے قائل نہ تھے۔ لیکن بائبل میں غلطی سے اس کو بھی "فرعون" ہی کا نام دیا گیا ہے۔ شاید اس کے مرتب کرنے والے سمجھتے ہوں گے کہ مصر کے سب بادشاہ "فراعنہ" ہی تھے۔ موجودہ زمانہ کے محققین جنھوں نے بائبل اور مصری تاریخ کا تقابل کیا ہے۔ عام رائے یہ رکھتے ہیں کہ چرواہے بادشاہوں میں سے جس فرمانبروا کا نام مصری تاریخ میں اپوفیس (APOPHES) ملتا ہے وہی حضرت یوسفؑ کا ہم عصر تھا۔

حضرت یوسفؑ کا دورِ اقتدار

مصر کا دار السلطنت اس زمانے میں مُمْفِس (منف) تھا۔ جس کے کھنڈر قاہرہ کے جنوب میں ۱۴ میل کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں وہاں پہنچے۔ دو تین سال عزیزِ مصر کے گھر رہے۔ آٹھ نو سال جیل میں گزارے۔ ۳۰ سال کی عمر میں ملک کے فرمانروا ہوئے اور ۸۰ سال تک بلا شرکتِ غیرے تمام مملکتِ مصر پر حکومت کرتے رہے۔ اپنی حکومت کے نویں یا دسویں سال انھوں نے حضرت یعقوبؑ کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلا لیا اور اُس علاقے میں آباد کیا جو دمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس علاقے کا نام جُشن یا گوشن بتایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی اور انتقال کے وقت بنی اسرائیل کو وصیت کی کہ جب تم اس ملک

نکلو تو میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے جانا ۔ ⑧

بائیبل کا بیان

بائیبل کا بیان ہے کہ سب افرادِ خاندان جو اس موقع پر مصر گئے ۶۷ تھے ۔ اس تعداد میں دوسرے گھرانوں کی ان لڑکیوں کو شمار نہیں کیا گیا جو حضرت یعقوبؑ کے ہاں بیاہی ہوئی آئی تھیں ۔ اس وقت حضرت یعقوبؑ کی عمر ۱۳۰ سال تھی اور اس کے بعد وہ مصر میں ۱۷ سال زندہ رہے ۔

اس موقع پر ایک طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں داخل ہوئے تو حضرت یوسفؑ سمیت ان کی تعداد ۶۸ تھی اور تقریباً پانچ سو سال کے بعد جب وہ مصر سے نکلے تو وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے ۔ بائیبل کی روایت ہے کہ خروج کے بعد دوسرے سال بیابانِ سینا میں حضرت موسیٰؑ نے ان کی جو مردم شماری کرائی تھی اس میں صرف قابلِ جنگ مردوں کی تعداد ۶۰۳۵۵۰ تھی ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عورت ، مرد ، بچے ، سب ملا کر وہ کم از کم ۲۰ لاکھ ہوں گے ۔ کیا کسی حساب سے پانچ سو سال میں ۶۸ آدمیوں کی اتنی اولاد ہو سکتی ہے ؟ مصر کی کل آبادی اگر اس زمانے میں ۲ کروڑ فرض کی جائے (جو یقیناً بہت مبالغہ آمیز اندازہ ہوگا) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ صرف بنی اسرائیل وہاں ۱۰ فی صدی تھے ۔ کیا ایک خاندان محض تناسل کے ذریعہ سے اتنا بڑھ سکتا ہے ؟ اس سوال پر غور کرنے سے ایک اہم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے ۔ ظاہر بات ہے کہ ۵ سو برس میں ایک خاندان تو اتنا نہیں بڑھ سکتا ۔ لیکن بنی اسرائیل پیغمبروں کی اولاد تھے ۔ ان کے لیڈر حضرت یوسفؑ ، جن کی بدولت مصر میں ان کے قدم جمے ، خود پیغمبر تھے ۔ اس کے بعد چار پانچ صدی تک ملک کا اقتدار انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہا ۔ اس دوران میں یقیناً انھوں نے مصر میں اسلام کی خوب تبلیغ کی ہوگی ۔ اہلِ مصر میں سے جو لوگ اسلام لائے ہوں گے ان کا مذہب ہی نہیں ، ان کا تمدن اور پورا طریقِ زندگی غیر مسلم مصریوں سے الگ اور بنی اسرائیل سے ہم رنگ ہو گیا ہوگا مصریوں نے ان سب کو اسی طرح اجنبی ٹھہرایا ہوگا ۔ جس طرح ہندوستان میں ہندوؤں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ٹھہرایا ۔ ان کے اوپر اسرائیلی کا لفظ اسی طرح چسپاں کر دیا ہوگا جس طرح غیر عرب مسلمانوں پر "محمڈن" کا لفظ آج چسپاں کیا جاتا ہے ۔ اور وہ خود بھی دینی و تہذیبی روابط اور شادی بیاہ کے تعلقات کی وجہ سے غیر مسلم مصریوں سے الگ اور بنی اسرائیل سے وابستہ ہو کر رہ گئے ہوں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب مصر پرستی کا طوفان اٹھا تو مظالم صرف بنی اسرائیل پر ہی نہیں ہوئے بلکہ مصری مسلمان بھی ان کے

ساتھ یکساں لپیٹ لیے گئے۔ اور جب بنی اسرائیل نے ملک چھوڑا تو مصری مسلمان بھی ان کے ساتھ نکلے اور ان سب کا شمار اسرائیلیوں ہی میں ہونے لگا۔

ہمارے اس قیاس کی تائید بائیبل کے متعدد اشارات سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "خروج" میں جہاں بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کا حال بیان ہوا ہے، بائیبل کا مصنف کہتا ہے کہ "ان کے ساتھ ایک ملی جلی گروہ بھی گئی" (۱۲: ۲۸) اسی طرح "گنتی" میں وہ پھر کہتا ہے کہ "جو ملی جلی بھیڑ ان لوگوں میں تھی وہ طرح طرح کے حرص کرنے لگی" (۱۱: ۴) پھر بتدریج ان غیر اسرائیلی مسلمانوں کے لیے "اجنبی" اور "پردیسی" کی اصطلاحیں استعمال ہونے لگیں۔ چنانچہ تورات میں حضرت موسیٰؑ کو جو احکام دیے گئے ان میں ہم کو یہ تصریح ملتی ہے:

> "تمہارے لیے اور اس پردیسی کے لیے جو تم میں رہتا ہے نسل در نسل سدا ایک ہی آئین رہے گا۔ خداوند کے آگے پردیسی بھی ویسے ہی ہوں جیسے تم ہو۔ تمہارے لیے اور پردیسیوں کے لیے جو تمہارے ساتھ رہتے ہیں ایک ہی شرع اور ایک ہی قانون ہو" (گنتی، ۱۵: ۱۵-۱۶)
>
> "جو شخص بے باک ہو کر گناہ کرے خواہ وہ دیسی ہو یا پردیسی وہ خداوند کی اہانت کرتا ہے وہ شخص اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے گا"۔ (گنتی؛ ۱۵: ۳۰)
>
> "خواہ معاملہ بھائی بھائی کا ہو یا پردیسی کا، تم ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کرنا۔" (استثنا، ۱: ۶)

اب یہ تحقیق کرنا مشکل ہے کہ کتابِ الٰہی میں غیر اسرائیلیوں کے لیے وہ اصل لفظ کیا استعمال کیا گیا تھا جسے مترجموں نے "پردیسی" بنا کر رکھ دیا۔ ⑨

تلمود میں لکھا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ کی آمد کی خبر دار السلطنت میں پہنچی تو حضرت یوسفؑ سلطنت کے بڑے بڑے امراء و اہلِ مناصب اور فوج فرا کو لے کر ان کے استقبال کے لیے نکلے اور پورے تزک و احتشام کے ساتھ ان کو شہر میں لائے۔ وہ دن وہاں جشن کا تھا۔ عورتیں، مرد، بچے، سب اس جلوس کو دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے اور سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ⑩

فصل ۳

دورِ یوسفیؑ کے بعد کیا گزری

بنی اسرائیل پر فراعنہ کے مظالم

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝

(القصص، آیت ۴)

ترجمہ: "واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ اُن میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔"

اصل میں لفظ عَلَا فِي الْأَرْضِ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے زمین میں سر اٹھایا، باغیانہ روش اختیار کی، اپنی اصل حیثیت یعنی بندگی کے مقام سے اٹھ کر خود مختاری اور خداوندی کا روپ دھار لیا، ماتحت بن کر رہنے کے بجائے بالادست بن بیٹھا اور جبار و متکبر بن کر ظلم ڈھانے لگا۔

اس کی حکومت کا قاعدہ یہ نہ تھا کہ قانون کی نگاہ میں ملک کے سب باشندے یکساں ہوں اور سب کو برابر حقوق دیے جائیں، بلکہ اس نے تمدن و سیاست کا یہ طرز اختیار کیا کہ ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا جائے[1]۔ بائبل میں اس کی فرعونی تفریق اور امتیاز کی جو تشریح ملتی ہے وہ یہ ہے۔

---

[1] یہاں کسی کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ اسلامی حکومت بھی تو مسلم اور ذمی کے درمیان تفریق کرتی ہے اور ان کے حقوق و اختیارات ہر حیثیت سے یکساں نہیں رکھتی۔ یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ اس فرق کی بنیاد فرعونی تفریق کے برعکس نسل، رنگ، زبان یا طبقاتی امتیاز پر نہیں ہے۔ بلکہ اصول اور مسلک کے اختلاف پر ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت میں ذمیوں اور مسلمانوں کے درمیان قانونی حقوق میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ تمام تر فرق صرف سیاسی حقوق (باقی بر صفحہ ۱۲)

بائیبل سے ایک ضروری اقتباس

"تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسفؑ کو نہیں جانتا تھا اور اس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا، دیکھو بنی اسرائیل ہم سے زیادہ قوی ہو گئے ہیں۔ سو آؤ ہم ان کے ساتھ حکمت سے پیش آئیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور اس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں۔ اس لیے انھوں نے ان پر بیگار لینے والے مقرر کیے جو ان سے سخت کام لے کر انھیں ستائیں۔ سو انھوں نے فرعون کے لیے ذخیرے کے شہر پتُوم اور رَعمسیس بنائے ...... اور مصریوں نے بنی اسرائیل پر تشدد کر کے ان سے کام کرایا اور انھوں نے ان سے سخت محنت سے گارا اور اینٹ بنوا بنوا کر اور کھیت میں ہر قسم کی خدمت لے کر ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی سب خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے۔ تشدد کی تھیں .... تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائیوں سے .... باتیں کیں اور کہا کہ جب عبرانی (یعنی اسرائیلی) عورتوں کے تم بچہ جناؤ اور ان کو پتھر کی بیٹھکوں پر بیٹھی دیکھو تو اگر بیٹا ہو تو اسے مار ڈالنا، اور اگر بیٹی ہو تو جیتی رہے۔" (خروج، باب ۱، آیت ۸-۱۶)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا دور گزر جانے کے بعد مصر میں ایک قوم پرستانہ انقلاب ہوا تھا اور قبطیوں کے ہاتھ جب دوبارہ اقتدار آیا تو نئی قوم پرست حکومت نے بنی اسرائیل کا زور توڑنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس سلسلے میں صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا گیا کہ اسرائیلیوں کو

(بقیہ صفحہ ۱۱) میں ہے اور اس فرق کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک اصولی حکومت میں حکمران جماعت صرف وہی ہو سکتی ہے جو حکومت کے بنیادی اصولوں کی حامی ہو۔ اس جماعت میں ہر وہ شخص داخل ہو سکتا ہے جو اس کے اصولوں کو مان لے اور ہر وہ شخص اس سے خارج ہو جاتا ہے جو ان اصولوں کا منکر ہو جائے۔ آخر اس تفریق میں اور اس فرعونی تفریق میں کیا وجہ مشابہت ہے جس کی بنا پر محکوم نسل کا کوئی فرد کبھی حکمران گروہ میں شامل نہیں ہو سکتا؟ جس میں محکوم نسل کے لوگوں کو سیاسی اور قانونی حقوق تو درکنار بنیادی انسانی حقوق کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔ تمام فوائد و منافع اور حسنات و درجات صرف حکمران قوم کے لیے مختص ہوتے ہیں اور یہ مخصوص حقوق صرف اسی شخص کو حاصل ہوتے ہیں جو حکمران قوم میں پیدا ہو جائے۔ (مؤلف)

ذلیل وخوار کیا جاتا اور انھیں ادنیٰ درجے کی خدمات کے لیے مخصوص کر لیا جاتا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ بنی اسرائیل کی تعداد گھٹائی جائے اور ان کے لڑکوں کو قتل کر کے صرف ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے تاکہ رفتہ رفتہ ان کی عورتیں قبطیوں کے تصرف میں آتی جائیں اور ان سے اسرائیل کے بجائے قبطی نسل پیدا ہو۔ تلمود اس کی مزید تفصیل یہ دیتی ہے کہ حضرت یوسفؑ کی وفات پر ایک صدی سے کچھ زیادہ مُدّت گزر جانے کے بعد یہ انقلاب ہوا تھا۔ وہ بتاتی ہے کہ نئی قوم پرست حکومت نے پہلے تو بنی اسرائیل کو ان کی زرخیز زمینوں اور ان کے مکانات اور جائدادوں سے محروم کیا۔ پھر انھیں حکومت کے تمام مناصب سے بے دخل کیا۔ اس کے بعد بھی جب قبطی حکمرانوں نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل اور اور ان کے ہم مذہب مصری کافی طاقتور ہیں تو انھوں نے اسرائیلیوں کو ذلیل وخوار کرنا شروع کیا۔ اور ان سے سخت محنت کے کام قلیل معاوضوں پر یا بلا معاوضہ لینے لگے۔ یہ تفسیر ہے قرآن کے اس بیان کی کہ مصر کی آبادی کے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا اور سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ آلِ فرعون بنی اسرائیل کو سخت عذاب دیتے تھے۔ (یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ)

مگر بائیبل اور قرآن دونوں اس ذکر سے خالی ہیں کہ فرعون سے کسی نجومی نے یہ کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جس کے ہاتھوں فرعونی اقتدار کا تختہ الٹ جائے گا اور اسی خطرے کو روکنے کے لیے فرعون نے اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا یا فرعون نے کوئی خوفناک خواب دیکھا تھا اور اس کی تعبیر یہ دی گئی تھی کہ ایک لڑکا بنی اسرائیل میں ایسا اور ایسا پیدا ہونے والا ہے۔ یہ افسانہ تلمود اور دوسری اسرائیلی روایات سے ہمارے مفسرین نے نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو جیوش انسائیکلو پیڈیا، مضمون "موسیٰ" اور (THE TALMUD SELECTIONS ص ۱۲۳۔۱۲۴) (۱۱)

باب ۲

بعثتِ موسیٰ علیہ السّلام کے بعد

فصل ۱

بعثتِ موسیٰؑ کے وقت بنی اسرائیل کا حالِ زار

بنی اسرائیل کئی صدیوں تک مصر میں انتہائی ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان موسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا، ان کے ذریعے سے اس قوم کو غلامی کی حالت سے نکالا، پھر ان پر کتاب نازل کی، اور اس کے فیض سے وہی دبی اور پسی ہوئی قوم ہدایت پا کر دنیا میں ایک نامور قوم بن گئی۔[1] ⑫

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ (یونس آیت ۸۳)

ترجمہ: ”(پھر دیکھو کہ) موسیٰؑ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنھیں خوف تھا کہ) فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا، اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رکتے نہیں ہیں۔“

متن میں لفظ ذُرِّیَّة استعمال ہوا ہے جس کے معنی اولاد کے ہیں ہم نے اس کا ترجمہ ”نوجوان“ کیا ہے مگر دراصل اس خاص لفظ کے استعمال سے جو بات قرآن مجید بیان کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے

---

[1] بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ دور جو حضرت موسیٰؑ سے پہلے گزرا ہے قریب قریب بالکل تاریکی میں ہے۔ بائیبل اور تلمود بھی اس پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالتیں اور نہ مصر کی قدیم تاریخ اور اثریات سے اس معاملے میں کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ (از مؤلف) تفہیمات حصہ دوم ص ۱۲۶

کہ اس پرخطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے اور علمبردارِ حق کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کی جرأت چند لڑکوں اور لڑکیوں نے تو کی مگر ماؤں اور باپوں اور قوم کے سن رسیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ ان پر مصلحت پرستی اور دنیاوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی کچھ اس طرح چھائی رہی کہ وہ ایسے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے جس کا راستہ ان کو خطرات سے پُر نظر آ رہا تھا۔ بلکہ وہ الٹے نوجوانوں ہی کو روکتے رہے کہ موسیٰؑ کے قریب نہ جاؤ، ورنہ تم خود بھی فرعون کے غضب میں مبتلا ہو گے اور ہم پر بھی آفت لاؤ گے۔

دعوتِ موسیٰؑ سے اکابر و اشراف کا گریز

چند نوجوانوں کو چھوڑ کر بنی اسرائیل کی پوری قوم میں سے کوئی بھی اس بات پر آمادہ نہ ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کو اپنا رہبر و پیشوا مان کر ان کی پیروی اختیار کر لیتا اور اس دعوتِ اسلامی کے کام میں ان کا ساتھ دیتا۔ پھر بعد کے فقرے نے اس بات کو واضح کر دیا کہ ان کے اس طرزِ عمل کی اصل وجہ یہ نہ تھی کہ انھیں حضرت موسیٰؑ کے صادق اور ان کی دعوت کے حق ہونے میں کوئی شک تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ، اور خصوصاً ان کے اکابر و اشراف، حضرت موسیٰؑ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو فرعون کی سخت گیری کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ نسلی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور موسیٰ علیہم السلام کے امتی تھے اور اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب مسلمان تھے، لیکن ایک مدتِ دراز کے اخلاقی انحطاط نے اور اس پست ہمتی نے جو زیردستی سے پیدا ہوئی تھی ان میں اتنا بل بوتا باقی نہ چھوڑا تھا کہ کفر و ضلالت کی فرمانروائی کے مقابلہ میں ایمان و ہدایت کا علَم لے کر خود اٹھتے، یا جو اٹھا تھا اس کا ساتھ دیتے۔

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی اس کشمکش میں عام اسرائیلیوں کا طرزِ عمل کیا تھا، اس کا اندازہ بائیبل کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے۔

> ”جب وہ فرعون کے پاس سے نکلے آ رہے تھے تو ان کو موسیٰؑ اور ہارونؑ ملاقات کے لیے راستہ پر کھڑے ملے۔ تب انھوں نے ان سے کہا کہ خداوند ہی دیکھے اور تمھارا انصاف کرے، تم نے تو ہم کو فرعون اور اس کے خادموں کی نگاہ میں ایسا گھنونا کیا ہے کہ ہمارے قتل کے لیے ان کے ہاتھ میں تلوار دے دی ہے۔“ (خروج ۶: ۲۰-۲۱)

تلمود میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے کہتے تھے :

> "ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بھیڑیے نے بکری کو پکڑا اور چرواہے نے آکر اس کو بچانے کی کوشش کی اور دونوں کی کش مکش میں بکری کے ٹکڑے اڑ گئے۔ پس اسی طرح تمھاری اور فرعون کی کھینچ تان میں ہمارا کام تمام ہو کر رہے گا۔"

ان ہی باتوں کی طرف سورۂ اعراف میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا (آیت : ۱۲۹) ⑭

فصل ۲

دربارِ فرعون میں موسیٰ علیہ السّلام کی دعوت

حضرت موسیٰؑ دو چیزوں کی دعوت لے کر فرعون کے پاس گئے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی بندگی (اسلام) قبول کرے دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل کی قوم کو جو پہلے سے مسلمان تھی اپنے پنجۂ ظلم سے رہا کر دے۔[1] (الاعراف حاشیہ ۸۶۔)

سورۂ طٰہٰ اور سورۂ نازعات میں فرمایا۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فرعون کے پاس جاکر وہ سرکش ہوگیا ہے، اور الشعراء میں فرمایا اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ”جب کہ پکارا تیرے رب نے موسیٰؑ کو کہ جا ظالم قوم کے پاس، فرعون کی قوم کے پاس“ ⑭

فرعون کا ردِّ عمل

(۱) فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِىْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ۔ (القصص۔ ایت ۳۶)

پھر جب موسیٰ ان لوگوں کے پاس ہماری کھلی نشانیاں لے کر پہنچا تو انھوں نے کہا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر بناوٹی جادو۔ اور یہ باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سنی ہی نہیں۔

اشارہ ہے ان باتوں کی طرف جو تبلیغِ رسالت کے سلسلے میں حضرت موسیٰؑ نے پیش کی تھیں۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان باتوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ النازعات میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس سے

---

[1] دوسری طرف انھوں نے بنی اسرائیل کو یہ تعلیم و تربیت دی کہ:۔

”اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔“ زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں ہی سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ آخری کامیابی انہی کے لیے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کرتے ہیں (الاعراف۔ آیت ۱۲۸) ج ۲ ص ۶۱

کہا کہ هَلْ لَكَ إِلٰٓى أَنْ تَزَكّٰى وَأَهْدِيَكَ إِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى۔ "کیا تو پاکیزہ روش اختیار کرنے پر آمادہ ہے اور میں تجھے تیرے رب کی راہ بتاؤں تو خشیت اختیار کرے گا؟" سورہ طٰہٰ میں ہے کہ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۔ إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَآ أَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى۔ "ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لائے ہیں اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہِ راست کی پیروی کرے اور ہم پر وحی کی گئی ہے کہ سزا ہے اس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔" اور إِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ۔ "ہم تیرے رب کے پیغمبر ہیں تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے۔" انہی باتوں کے متعلق فرعون نے کہا کہ ہمارے باپ دادا نے بھی کبھی یہ نہیں سنا تھا کہ فرعونِ مصر سے اوپر بھی کوئی ایسی مقتدر ہستی ہے جو اس کو حکم دینے کی مجاز ہو، جو اسے سزا دے سکتی ہو، جو اسے ہدایات دینے کے لیے کسی آدمی کو اس کے دربار میں بھیجے، اور جس سے ڈرنے کے لیے مصر کے بادشاہ سے کہا جائے۔ یہ تو نرالی باتیں ہیں جو آج ہم ایک شخص کی زبان سے سن رہے ہیں۔ ⑮

> (۲) وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓأَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ غَيْرِيْ فَأَوْقِدْ لِيْ
> يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ أَطَّلِعُ إِلٰٓى إِلٰهِ مُوْسٰى
> وَإِنِّيْ لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ (القصص آیت ۔ ۳۸)
>
> اور فرعون نے کہا: "اے اہلِ دربار، میں اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ ہامان! ذرا اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا، شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسٰی کے خدا کو دیکھ سکوں، میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔"

اس قول سے فرعون کا مطلب ظاہر ہے کہ یہ نہیں تھا اور نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ہی تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہوں، کیونکہ ایسی بات ایک پاگل ہی کے منہ سے نکل سکتی ہے اور اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، کیونکہ اہلِ مصر کے مذہب میں بہت سے معبودوں کی پرستش ہوتی تھی۔ اور خود فرعون کو جس بنا پر معبودیت کا مرتبہ دیا گیا تھا وہ بھی صرف یہ تھی کہ اسے سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا تھا۔ سب سے بڑی شہادت قرآن مجید کی موجود ہے کہ فرعون خود بہت سے دیوتاؤں کا پرستار تھا۔ وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ۔ "اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا تو موسٰی اور اس کی قوم کو چھوٹ دے

دے گا کہ ملک میں فساد برپا کریں اور تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں۔" (الاعراف رکوع ١٥) اس لیے لامحالہ یہاں فرعون نے لفظ "خدا" اپنے لیے بمعنی خالق و معبود نہیں بلکہ بمعنی مطاع و حاکمِ مطلق استعمال کیا تھا، اس کا مدعا یہ تھا کہ اس سرزمینِ مصر کا مالک میں ہوں۔ یہاں میرا حکم چلے گا۔ میرا ہی قانون یہاں قانون مانا جائے گا۔ میری ذات ہی یہاں امر و نہی کا سرچشمہ تسلیم کی جائے گی کوئی دوسرا یہاں حکم چلانے کا مجاز نہیں ہے۔[1] ⑯

فرعون کا جواب

یہ موسیٰ کون ہے جو رب العالمین کا نمائندہ بن کر آ کھڑا ہوا ہے اور مجھے اس طرح احکام سنا رہا ہے کہ گویا اصل فرمانروا یہ ہے اور میں اس کا تابع فرمان ہوں۔ اسی بنا پر اس نے اپنے دربار کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَھٰذِہِ الْاَنْھٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ۔ "اے قوم، کیا مصر کی بادشاہی میری ہی نہیں ہے اور یہ نہریں میرے تحت جاری نہیں ہیں؟" (الزخرف، آیت : ٥١)۔ اور اسی بنا پر وہ حضرت موسیٰ سے بار بار کہتا تھا۔ اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا وَتَکُوْنَ لَکُمَا الْکِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ، "کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے ہٹا دے جو ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آ رہا ہے اور اس ملک میں بڑائی تم دونوں بھائیوں کی ہو جائے (یونس۔ آیت ٧٨) اَجِئْتَنَا

---

[1] اس لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو فرعون کی پوزیشن ان ریاستوں کی پوزیشن سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو خدا کے پیغمبر کی لائی ہوئی شریعت سے آزاد و خود مختار ہو کر اپنی سیاسی اور قانونی حاکمیت کی مدعی ہیں۔ وہ خواہ سرچشمۂ قانون اور صاحبِ امر و نہی کسی بادشاہ کو مانیں یا قوم کی مرضی کو، بہرحال جب تک وہ یہ موقف اختیار کیے ہوئے ہیں کہ ملک میں خدا اور اس کے رسول کا نہیں بلکہ ہمارا حکم چلے گا۔ اس وقت تک ان کے اور فرعون کے موقف میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بے شعور لوگ فرعون پر لعنت بھیجتے رہیں اور ان کو سندِ جواز عطا کرتے رہیں، حقائق کی سمجھ بوجھ رکھنے والا تو معنی اور روح کو دیکھے گا نہ کہ الفاظ اور اصطلاحات کو۔ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ فرعون نے اپنے لیے "الٰہ" کا لفظ استعمال کیا تھا، اور یہ اسی معنی میں "حاکمیت" کی اصطلاح استعمال کرتی ہیں۔ (از مؤلف) ⑰

لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى، "اے موسیٰ کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اپنے
جادو کے زور سے ہماری زمین سے بے دخل کر دے؟" (طٰہٰ - آیت ۵۷) اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ
دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ، "میں ڈرتا ہوں کہ یہ شخص تم لوگوں کا دین بدل ڈالے گا یا
ملک میں فساد برپا کرے گا۔" (المومن - آیت ۲۶) ⑱

فصل ۳

دورِ موسوی میں بنی اسرائیل پر فرعونی مظالم

اس مضمون کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا ہے جن میں سے تین اہم آیات درج کی جا رہی ہیں۔ (مرتبین)

(۱) قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ۝

(اعراف۔ آیت ۱۲۷)

ترجمہ: "فرعون نے جواب دیا میں ان کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور ان کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔"

واضح رہے کہ ایک دورِ ستم وہ تھا جو حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے رعمسیس ثانی کے زمانہ میں جاری ہوا تھا اور دوسرا دورِ ستم یہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد شروع ہوا۔ دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کر دیا گیا اور بیٹیوں کو جیتا چھوڑ دیا گیا تاکہ بتدریج ان کی نسل کا خاتمہ ہو جائے اور یہ قوم دوسری قوموں میں گم ہو کر رہ جائے۔ غالباً اسی دور کا ہے وہ کتبہ جو ۱۸۹۶ء میں قدیم مصری آثار کی کھدائی کے دوران میں ملا تھا اور جس میں یہی فرعون منفتاح اپنے کارناموں اور فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ اسرائیل کو مٹا دیا گیا۔ اس کا بیج تک باقی نہیں۔ ⑲

(۲) وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝

(الاعراف۔ آیت ۱۴۱)

ترجمہ: "اور (اللہ فرماتا ہے) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرعون والوں سے تمھیں

نجات دی جن کا حال یہ تھا کہ تمھیں سخت عذاب میں مبتلا رکھتے تھے، تمھارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمائش تھی۔"

(۳) وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (ابراہیم۔ آیت ۶)

ترجمہ: "یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ اس نے تم کو فرعون والوں سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے۔ تمھارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ بچا رکھتے تھے۔ اس میں تمھارے رب کی طرف تمھاری بڑی آزمائش تھی۔"

فرعون کے عہد میں ان کی غلامانہ حیثیت

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۚ (المومنون۔ آیت ۴۷)

ترجمہ: "کہنے لگے کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟ اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری بندی ہے۔"

اصل الفاظ ہیں "جن کی قوم ہماری عابد ہے"۔ عربی زبان میں کسی کا "مطیع فرمان" ہونا اور اس کا "عبادت گزار" ہونا، دونوں تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ جو کسی کی بندگی و اطاعت کرتا ہے وہ گویا اس کی عبادت کرتا ہے۔ اس سے بڑی اہم روشنی پڑتی ہے لفظ "عبادت" کے معنی پر اور انبیاء علیہم السلام کی اس دعوت پر کہ صرف اللہ کی عبادت کرنے اور اس کے سوا ہر ایک کی عبادت چھوڑ دینے کی تلقین جو وہ کرتے تھے، اس کا پورا مفہوم کیا تھا۔ "عبادت" ان کے نزدیک صرف "پوجا" نہ تھی۔ ان کی دعوت یہ نہیں تھی کہ صرف پوجا اللہ کی کرو باقی بندگی و اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ وہ انسان کو اللہ کا پرستار بھی بنانا چاہتے تھے اور مطیع فرمان بھی۔ اور ان دونوں معنوں کے لحاظ سے دوسروں کی عبادت کو غلط ٹھہراتے تھے۔ (۲۰)

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۔

(الشعراء۔ آیت ۱۸)

ترجمہ: "فرعون نے کہا: کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں بچہ سا نہیں پالا تھا؟ تم نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے۔"

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ۝ (الشعراء۔ آیت ۲۲)

ترجمہ: "حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا: رہا یہ تیرا احسان جو تو نے مجھ پر جتایا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا تھا۔"

یعنی تیرے گھر میں پرورش پانے کے لیے میں کیوں آتا اگر تو نے بنی اسرائیل پر ظلم نہ ڈھایا ہوتا؟ تیرے ہی ظلم کی وجہ سے تو میری ماں نے مجھے ٹوکری میں ڈال کر دریا میں بہایا تھا۔ ورنہ کیا میری پرورش کے لیے میرا اپنا گھر موجود نہ تھا۔ اس لیے اس پرورش کا احسان جتانا تجھے زیب نہیں دیتا۔ (۲۱)

بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ

قَالَا رَبَّنَآ إِنَّنَا نَخَافُ أَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ أَوْ أَنْ يَّطْغٰى ۝ قَالَ لَا تَخَافَآ إِنَّنِيْ مَعَكُمَآ أَسْمَعُ وَأَرٰى ۝ فَأْتِيٰهُ فَقُوْلَآ إِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ (طٰهٰ۔ آیات ۴۵ تا ۴۷)

ترجمہ: "دونوں نے عرض کیا پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا پل پڑے گا۔ فرمایا۔ ڈرو مت میں تمہارے ساتھ ہوں، سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں، بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہِ راست کی پیروی کرے۔"

فصل ۴

مصر سے بنی اسرائیل کا خروج

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِىْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا
فِى الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ
فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝ (طٰہٰ - آیات ۷۷ - ۷۸)

ترجمہ: "ہم نے موسیٰؑ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ، اور اُن کے لیے سمندر میں سے سوکھی سڑک بنالے، تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ (سمندر کے بیچ سے گزرتے ہوئے) ڈر لگے۔ پیچھے سے فرعون اپنے لشکر لے کر پہنچا اور پھر سمندر ان پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔"

فصل ۵

خروج کے احوال

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ٥ فَاَرْسَلَ
فِرْعَوْنُ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ٥ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ٥
وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ۙ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ٥ (الشعرآء۔ آیات ۵۲ تا ۵۶)

ترجمہ: "ہم نے موسیٰؑ کو وحی بھیجی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ۔ تمھارا پیچھا کیا جائے گا۔ اس پر فرعون نے (فوجیں جمع کرنے کے لیے) شہروں میں نقیب بھیج دیے (اور کہلا بھیجا) کہ یہ کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں، اور انھوں نے ہم کو بہت ناراض کیا ہے اور ہم ایک ایسی جماعت ہیں جس کا شیوہ ہر وقت چوکنا رہنا ہے۔"

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر کار ایک رات مقرر فرما دی جس میں تمام بنی اسرائیل اور غیر اسرائیلی مسلمانوں کو (جن کے لیے "میرے بندوں" کا جامع لفظ استعمال کیا گیا ہے) مصر کے ہر حصے سے ہجرت کے لیے نکل پڑنا تھا۔ یہ سب لوگ ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہو گئے۔

واضح رہے کہ بنی اسرائیل کی آبادی مصر میں کسی ایک جگہ مجتمع نہ تھی بلکہ ملک کے تمام شہروں اور بستیوں میں بٹی ہوئی تھی اور خصوصیت کے ساتھ منف (MEMPHIS) سے رَعْمسیس تک اُس علاقے میں اُن کی بڑی تعداد آباد تھی جسے جُشَن کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ لہٰذا موسیٰؑ کو جب حکم دیا گیا کہ اب تمھیں بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جانا ہے، تو انھوں نے بنی اسرائیل کی تمام بستیوں میں ہدایات بھیج دی ہوں گی کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ ہجرت کے لیے تیار ہو جائیں اور ایک خاص رات مقرر کر دی ہوگی کہ اس رات ہر بستی کے مہاجرین نکل کھڑے ہوں۔ یہ ارشاد کہ "تمھارا پیچھا

کیا جائے گا۔" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہجرت کے لیے رات کو نکلنے کی ہدایت کیوں کی گئی تھی یعنی قبل اس کے کہ فرعون لشکر لے کر تمھارے تعاقب میں نکلے تم راتوں رات اپنا راستہ اس حد تک طے کر لو کہ اس سے بہت آگے نکل چکے ہو۔ (۲۲)

اس زمانے میں نہر سویز موجود نہ تھی بحر احمر سے بحرِ روم (میڈیٹرینین) تک کا پورا علاقہ کھلا ہوا تھا مگر اس علاقے کے تمام راستوں پر فوجی چھاؤنیاں تھیں جن سے بخیریت نہیں گزرا جا سکتا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ نے بحرِ احمر کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا۔ غالباً ان کا خیال یہ تھا کہ سمندر کے کنارے کنارے چل کر جزیرہ نمائے سینا کی طرف نکل جائیں۔ لیکن ادھر سے فرعون لشکرِ عظیم لے کر تعاقب کرتا ہوا ٹھیک اس موقع پر آ پہنچا جبکہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا۔ سورۂ شعرآء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کا قافلہ لشکرِ فرعون اور سمندر کے درمیان بالکل گھر چکا تھا۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ۔ "اپنا عصا سمندر پر مار" فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ"۔ فوراً سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح کھڑا ہو گیا"۔ اور بیچ میں صرف یہی نہیں کہ قافلے کے گزرنے کا راستہ نکل آیا۔ بلکہ بیچ کا یہ حصہ اوپر کی آیات کے مطابق خشک ہو کر سوکھی سڑک کی طرح بن گیا۔[1]

فرعون کا تعاقب

فرعون نے لشکر جمع کرتے وقت جو باتیں کہیں وہ اس کی چھپی خوف زدگی کو ظاہر کرتی ہیں جس پر وہ بے خوفی کا نمائشی پردہ ڈال رہا تھا۔ ایک طرف وہ جگہ جگہ سے فوجیں بھی فوری امداد کے لیے بلا رہا تھا، جو اس بات کی کھلی علامت تھی کہ اسے بنی اسرائیل سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ دوسری طرف وہ اس بات کو چھپانا بھی چاہتا تھا کہ مدتہائے دراز کی دبی اور پسی ہوئی قوم، جو انتہائی ذلت کی غلامی میں زندگی بسر کر رہی تھی، اس سے فرعون جیسا قاہر فرمانروا خطرہ محسوس کر رہا ہے، حتّٰی کہ اسے فوری امداد کے لیے

---

[1] یہ صاف اور صریح معجزے کا بیان ہے اور اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ ہوا کے طوفان یا جوار بھاٹے کی وجہ سے سمندر ہٹ گیا تھا۔ اس طرح جو پانی ہٹتا ہے وہ دونوں طرف ٹیلوں کی صورت میں کھڑا نہیں ہو جاتا اور بیچ کا حصہ سوکھ کر سڑک کی طرح نہیں بن جاتا۔ (۲۳)

فوجیں طلب کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ اس لیے وہ پیغام اس انداز میں بھیجتا ہے کہ یہ بنی اسرائیل بے چارے چیز ہی کیا ہیں، کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں جو ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے لیکن انھوں نے ایسی حرکتیں کی ہیں کہ ہمیں ان پر غصہ آگیا ہے۔ اس لیے ہم انھیں سزا دینا چاہتے ہیں۔ اور فوجیں ہم کسی خوف کی وجہ سے جمع نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ صرف ایک احتیاطی کارروائی ہے۔ ہماری دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ کوئی بعید سے بعید بھی امکانی خطرہ ہو تو ہم بروقت اس کی سرکوبی کرنے کے لیے تیار رہیں۔ (۲۴)

فرعون کی غرقابی

سورۂ شعرآء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کے گزرتے ہی فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے اس درمیانی راستے میں اُتر آیا (آیات ۶۴ - ۶۶) یہاں بیان کیا گیا ہے کہ سمندر نے اس کو اور اس کے لشکر کو دبوچ لیا۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے کہ بنی اسرائیل سمندر کے دوسرے کنارے پر سے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق ہوتے دیکھ رہے تھے (آیت ۵۰) اور سورۂ یونس میں بتایا گیا ہے کہ ڈوبتے وقت فرعون پکار اٹھا۔ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآئِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ "میں مان گیا کہ کوئی خدا نہیں ہے، اس خدا کے سوا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں" مگر اس آخری لمحہ کے ایمان کو قبول نہ کیا گیا اور جواب ملا۔ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ، فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً۔ "اب ایمان لاتا ہے؟ اور پہلے یہ حال تھا کہ نافرمانی کرتا رہا اور فساد کیے چلا گیا۔ اچھا آج ہم تیری لاش کو بچائے لیتے ہیں تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنا رہے (یونس آیات ۹۰-۹۲) (۲۵)

ایک ضمنی بحث

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِیْمٍ كَذٰلِكَ

وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ○ (الشعرآء۔ آیات ۵۰ تا ۵۹)

ترجمہ: "اسی طرح ہم انھیں ان کے باغوں اور چشموں اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہوں سے نکال لائے۔ یہ تو ہوا ان کے ساتھ اور (دوسری طرف) بنی اسرائیل کو ہم نے ان سب چیزوں کا وارث کر دیا۔"

بعض مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ جن باغوں، چشموں، خزانوں اور بہترین قیام گاہوں سے یہ ظالم لوگ نکلے تھے انہی کا وارث اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کر دیا۔ یہ مطلب اگر لیا جائے تو اس کے معنی لازماً یہ ہونے چاہئیں کہ فرعون کے غرق ہو جانے کے بعد بنی اسرائیل پھر واپس پہنچ گئے ہوں اور آلِ فرعون کی دولت و حشمت ان کے قبضے میں آگئی ہو۔ لیکن یہ چیز تاریخ سے بھی ثابت نہیں ہے اور خود قرآن مجید کی دوسری تصریحات سے بھی اس آیت کا مفہوم مطابقت نہیں رکھتا۔

سورۂ بقرہ، سورۂ مائدہ، سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ میں جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل مصر کی طرف پلٹنے کے بجائے اپنی منزلِ مقصود (فلسطین) ہی کی طرف آگے روانہ ہو گئے اور پھر حضرت داؤدؑ کے زمانہ (سنہ ۱۰۱۳-۹۶۳ ق م) تک ان کی تاریخ میں جو واقعات بھی پیش آئے وہ سب اُس علاقے میں پیش آئے، جو آج جزیرہ نمائے سینا، شمالی عرب، شرقِ اُردن اور فلسطین کے ناموں سے موسوم ہیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہی باغ، چشمے، خزانے اور محلات، بنی اسرائیل کو بخش دیے جن سے فرعون اور اس کی قوم کے سردار اور امراء نکالے گئے تھے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو ان نعمتوں سے محروم کیا، اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو یہی نعمتیں عطا فرما دیں۔ یعنی وہ فلسطین کی سرزمین میں باغوں، چشموں، خزانوں اور عمدہ قیام گاہوں کے مالک ہوئے۔ اسی مفہوم کی تائید سورۂ اعراف کی یہ آیت کرتی ہے۔ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا (آیات - ۱۳۶-۱۳۷)۔ "تب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا۔ کیونکہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور ان سے بے پروا ہو گئے تھے اور ان کے بجائے ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے اس ملک کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا۔" یہ برکتوں سے مالا مال سرزمین کا استعارہ قرآن مجید میں عموماً فلسطین ہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور کسی علاقے کا نام لیے بغیر جب اس کی یہ صفت بیان کی جاتی ہے تو اس سے یہی علاقہ مراد ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا۔ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ۔ اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوا وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ

الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ۔ اور وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا۔ اسی طرح سورۂ سبا میں بھی اَلْقُرَی الَّتِیْ بَارَکْنَا فِیْهَا کے الفاظ سرزمین شام و فلسطین ہی کی بستیوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ (۲۶)

فصل ۶

بنی اسرائیل پر دورِ غلامی کے اثرات

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ
قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ (اعراف آیت - ۱۳۸)

ترجمہ: "بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے گزار دیا۔ پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پر ان کا گزر ہوا جو اپنے بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگے، اے موسٰی ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں"۔

بنی اسرائیل نے جس مقام پہ بحرِ احمر کو عبور کیا وہ غالباً موجودہ شہر سویز اور اسماعیلیہ کے درمیان کوئی مقام تھا۔ یہاں سے گزر کر یہ لوگ جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی علاقے کی طرف ساحل کے کنارے کنارے روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں جزیرہ نمائے سینا کا مغربی اور شمالی حصہ مصر کی سلطنت میں شامل تھا۔ جنوب کے علاقے میں موجودہ شہر طور اور ابو زنیمہ کے درمیان تانبے اور فیروزے کی کانیں تھیں جن سے اہلِ مصر بہت فائدہ اٹھاتے تھے، اور ان کانوں کی حفاظت کے لیے مصریوں نے چند مقامات پر چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں۔ انہی چھاؤنیوں میں سے ایک چھاؤنی مُفقَہ کے مقام پہ تھی، جہاں مصریوں کا ایک بہت بڑا بت خانہ تھا جس کے آثار اب بھی جزیرہ نما کے جنوبی مغربی علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے قریب ایک اور مقام بھی تھا جہاں قدیم زمانے سے سامی قوموں کی چاند دیوی کا بت خانہ تھا۔ غالباً انہی مقامات میں سے کسی کے پاس سے گزرتے ہوئے بنی اسرائیل کو، جن پہ مصریوں کی غلامی نے مصریت زدگی کا اچھا خاصا گہرا ٹھپا لگا رکھا تھا، ایک مصنوعی خدا کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔

بنی اسرائیل کی ذہنیت کو اہلِ مصر کی غلامی نے جیسا کچھ بگاڑ دیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ مصر سے نکل آنے کے ۶۰ برس بعد حضرت موسٰیؑ کے خلیفۂ اول حضرت

یُوشع بن نُون اپنی آخری تقریر میں بنی اسرائیل کے مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> "تم خداوند کا خوف رکھو اور نیک نیتی اور صداقت کے ساتھ اس کی پرستش کرو اور ان دیوتاؤں کو دور کر دو جن کی پرستش تمہارے باپ دادا بڑے دریا کے پار اور مصر میں کرتے تھے اور خداوند کی پرستش کرو۔ اور اگر خداوند کی پرستش تم کو بری معلوم ہوتی ہو تو آج ہی تم اُسے جس کی پرستش کرو گے چُن لو۔.......... اب رہی میری اور میرے گھرانے کی بات سو ہم تو خداوند ہی کی پرستش کریں گے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۴۰ سال تک حضرت موسیٰؑ کی اور ۲۸ سال تک حضرت یوشعؑ کی تربیت رہنمائی میں زندگی بسر کر لینے کے بعد بھی یہ قوم اپنے اندر سے ان اثرات کو نہ نکال سکی جو فراعنۂ مصر کی بندگی کے دور میں اس کی رگ رگ کے اندر اتر گئے تھے۔ پھر بھلا کیونکر ممکن تھا کہ مصر سے نکلنے کے بعد فوراً ہی جو بت کدہ سامنے آ گیا تھا اس کو دیکھ کر ان بگڑے ہوئے مسلمانوں میں سے بہتوں کی پیشانیاں اس آستانے پر سجدہ کرنے کے لیے بے تاب نہ ہو جائیں جس پر وہ اپنے سابق آقاؤں کو ماتھا رگڑتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ ㉗

فصل ۷

عطائے شریعت

کوہِ طور پر حضرت موسیٰؑ کی پہلی طلبی

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (البقرہ، آیت ۵۱)

ترجمہ: "یاد کرو جب ہم نے موسیٰؑ کو چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر بلایا"

مصر سے نجات پانے کے بعد جب بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا میں پہنچ گئے تو حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے چالیس شبانہ روز کے لیے کوہ طور پر طلب فرمایا تاکہ وہاں اس قوم کے لیے جو اب آزاد ہو چکی ہے، قوانین شریعت اور عملی زندگی کی ہدایات عطا کی جائیں۔ (۲۸)

ملاحظہ ہو بائیبل کی کتاب خروج باب ۲۴ تا ۳۱

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ج (الاعراف۔ آیت ۱۴۲)

ترجمہ: "ہم نے موسیٰؑ کو تیس شب و روز کے لیے (کوہ سینا پر) طلب کیا اور بعد میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا، اس طرح اس کے رب کی مقرر کردہ مدت پورے چالیس دن ہو گئی۔"

مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل کی غلامانہ پابندیاں ختم ہو گئیں اور انھیں ایک خود مختار قوم کی حیثیت حاصل ہو گئی تو حکمِ خداوندی کے تحت حضرت موسیٰؑ کوہ سینا پر طلب کیے گئے تاکہ انھیں بنی اسرائیل کے لیے شریعت عطا کی جائے۔ چنانچہ وہ طلبی جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی طلبی تھی۔ اور اس کے لیے چالیس دن کی میعاد اس لیے مقرر کی گئی تھی کہ حضرت موسیٰؑ ایک پورا چلّہ پہاڑ پر گزاریں اور روزے رکھ کر شب و روز عبادت اور تفکر و تدبر کر کے اور دل و دماغ کو یکسو کر کے

اس قولِ ثقیل کے اخذ کرنے کی استعداد اپنے اندر پیدا کریں جو ان پر نازل کیا جانے والا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ارشاد کی تعمیل میں کوہِ سینا جاتے وقت بنی اسرائیل کو اس مقام پر چھوڑا تھا جو موجودہ نقشے میں نبی صالح اور کوہِ سینا کے درمیان وادی الشیخ کے نام سے موسوم ہے۔ اس وادی کا وہ حصہ جہاں بنی اسرائیل نے پڑاؤ کیا تھا آج کل میدانُ الرّاحہ کہلاتا ہے۔ وادی کے ایک سرے پر وہ پہاڑی واقع ہے جہاں مقامی روایت کے بموجب حضرت صالح علیہ السلام ثمود کے علاقے سے ہجرت کر کے تشریف لے آئے تھے، آج وہاں ان کی یادگار میں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک اور پہاڑی جبلِ ہارون نامی ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے ناراض ہو کر جا بیٹھے تھے۔ تیسری طرف سینا کا بلند پہاڑ ہے جس کا بالائی حصہ اکثر بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے اور جس کی بلندی ۷۳۵۹ فیٹ ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر آج تک وہ کھوہ زیارت گاہِ عام بنی ہوئی ہے جہاں حضرت موسیٰ نے چلہ کیا تھا۔ اس کے قریب مسلمانوں کی ایک مسجد اور عیسائیوں کا ایک گرجا موجود ہے اور پہاڑ کے دامن میں رومی قیصر جسٹنین کے زمانہ کی ایک خانقاہ آج تک موجود ہے۔ (۲۹)

الواح پر لکھے ہوئے احکام

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ج فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا ط (اعراف ایت ۱۴۵)

ترجمہ: "اس کے بعد ہم نے موسیٰ کو ہر شعبۂ زندگی کے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت تختیوں پر لکھ کر دے دی اور اس سے کہا۔ ان ہدایات کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھال اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کے بہتر مفہوم کی پیروی کریں۔"

بائیبل میں تصریح ہے کہ دونوں تختیاں پتھر کی سلیں تھیں اور ان تختیوں پر لکھنے کا فعل بائیبل اور قرآن دونوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم اس بات کا تعین کر سکیں کہ آیا ان تختیوں پر کتابت کا کام اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنی قدرت سے کیا، یا کسی فرشتے سے یہ خدمت لی تھی، یا خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ استعمال فرمایا تھا۔ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو بائیبل کتاب خروج، باب ۳۱ آیت ۱۸۔ باب ۳۲، آیت ۱۵، ۱۶۔ استثناء باب ۵ آیت ۶-۲۲) (۳۰)

فصل ۸

گوسالہ پرستی کا فتنہ

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسٰی مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (اعراف - آیت ۱۴۸)

ترجمہ: "موسیٰ کے پیچھے اس کی قوم کے لوگوں نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کا پتلا بنایا۔ جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ کیا انھیں نظر نہ آتا تھا کہ نہ وہ ان سے بولتا ہے اور نہ کسی معاملہ میں ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ مگر پھر بھی انھوں نے اسے معبود بنا لیا اور وہ سخت ظالم تھے۔"

یہ اُس مصریت زدگی کا دوسرا ظہور تھا جسے لیے ہوئے بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے۔ مصر میں گائے کی پرستش اور تقدیس کا جو رواج تھا اس سے یہ قوم اتنی شدت کے ساتھ متاثر ہو چکی تھی کہ قرآن کہتا ہے وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ یعنی ان کے دلوں میں بچھڑا بس کر رہ گیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ ابھی مصر سے نکلے ہوئے ان کو صرف تین مہینے ہی گزرے تھے، سمندر کا پھٹنا، فرعون کا غرق ہونا، ان لوگوں کا بخیریت اس بندِ غلامی سے نکل آنا جس کے ٹوٹنے کی کوئی امید نہ تھی اور سلسلے کے دوسرے واقعات ابھی بالکل تازہ تھے۔ اور انھیں خوب معلوم تھا کہ یہ جو کچھ ہوا محض اللہ کی قدرت سے ہوا ہے، کسی دوسرے کی طاقت اور تصرف کا اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ مگر اس پر بھی انھوں نے پہلے تو پیغمبر سے مصنوعی خدا طلب کیا، اور پھر پیغمبر کے پیٹھ موڑتے ہی خود ایک مصنوعی خدا بنا ڈالا۔ یہی وہ حرکت ہے جس پر بعض انبیاءِ بنی اسرائیل نے اپنی قوم کو اس بدکار عورت سے تشبیہ دی ہے، جو اپنے شوہر کے سوا ہر دوسرے مرد سے دل لگاتی ہو اور شبِ اول میں بھی

بے وفائی سے نہ چوکی ہو ㉛

گائے بیل کی پرستش کا رواج عام

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ
بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ٥ (البقرہ - آیت ۵۱)

ترجمہ: "یاد کرو جب ہم نے موسیٰ کو چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر بلایا تو اس کے پیچھے تم بچھڑے کو اپنا معبود بنا بیٹھے۔ اس وقت تم نے بڑی زیادتی کی تھی۔"

گائے اور بیل کی پرستش کا مرض بنی اسرائیل کی ہمسایہ اقوام میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ مصر اور کنعان میں اس کا عام رواج تھا۔ حضرت یوسفؑ کے بعد بنی اسرائیل جب انحطاط میں مبتلا ہوئے اور رفتہ رفتہ قبطیوں کے غلام بن گئے تو انھوں نے من جملہ اور امراض کے ایک یہ مرض بھی اپنے حکمرانوں سے لے لیا تھا۔ (بچھڑے کی پرستش کا واقعہ بائیبل کی کتاب خروج باب ۳۲ میں تفصیل سے درج ہے۔ ㉜

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ٥ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ
اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ٥ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ
السَّامِرِيُّ (سورہ طٰہٰ آیات ۸۳ تا ۸۶)

ترجمہ: "(حضرت موسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا) اور کیا چیز تمھیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی موسیٰ؟ اس نے عرض کیا۔" وہ بس میرے پیچھے آ رہے ہیں میں جلدی کر کے تیرے حضور آ گیا ہوں اے میرے رب، تاکہ تو مجھ سے خوش ہو جائے۔" فرمایا "اچھا، تو سنو، ہم نے تمھارے پیچھے تمھاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انھیں گمراہ کر ڈالا۔"

طور سے واپسی اور فتنے کی تحقیقات

فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ
وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ
غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ٥ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا
وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ٥
فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ٥

فَنَسِیَ ؕ .... قَالَ فَاذۡهَبۡ فَاِنَّ لَكَ فِی الۡحَیٰوةِ اَنۡ تَقُوۡلَ لَا مِسَاسَ
وَاِنَّ لَكَ مَوۡعِدًا لَّنۡ تُخۡلَفَهٗ ۚ وَانۡظُرۡ اِلٰۤی اِلٰهِكَ الَّذِیۡ ظَلۡتَ عَلَیۡهِ
عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنۡسِفَنَّهٗ فِی الۡیَمِّ نَسۡفًا ۝ (سورۂ طٰہٰ۔ آیات ۸۶ تا ۹۷

ترجمہ: "موسیٰؑ سخت غصّے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ جاکر اس نے کہا۔ "اے میری قوم کے لوگو، کیا تمہارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے؟ کیا تمہیں دن لگ گئے ہیں یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اوپر لانا چاہتے تھے۔ کیا تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟" انھوں نے جواب دیا "ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی، معاملہ یہ ہوا کہ ہم، لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے لَد گئے تھے اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا۔ پھر اسی طرح سامری نے بھی کچھ کر ڈالا اور اُن کے لیے ایک بچھڑے کی صورت بنا کر نکال لایا، جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ لوگ پکار اٹھے۔ یہی ہے تمھارا خدا اور موسیٰؑ کا خدا، موسیٰؑ اسے بھول گیا۔" کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع و نقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے؟ ہارونؑ (موسیٰؑ کے آنے سے) پہلے ان سے کہہ چکا تھا کہ لوگو، تم اس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو، تمھارا رب تو رحمان ہے پس تم میری پیروی کرو۔ اور میری بات مانو مگر انھوں نے اس سے کہہ دیا کہ "ہم تو اسی کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰؑ واپس نہ آجائے۔" موسیٰؑ (قوم کو ڈانٹنے کے بعد ہارونؑ کی طرف پلٹا اور) بولا "ہارونؑ تم نے جب دیکھا تھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمھارا ہاتھ پکڑا تھا۔ کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی تھی؟" ہارون نے جواب دیا۔ "اے میری ماں کے بیٹے، میری ڈاڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آکر کہے گا تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔" موسیٰؑ نے کہا۔ "اور سامری، تیرا کیا معاملہ ہے؟" اس نے جواب دیا۔ "میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں کو نظر نہ آئی۔ پس میں نے رسول کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی اٹھالی اور اس کو ڈال دیا۔ میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سمجھایا۔" موسیٰؑ نے کہا "اچھا تو جا، اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا۔ اور تیرے لیے بازپرس کا ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا

اور دیکھ اپنے اس خدا کو جس پر تو ریجھا ہوا تھا، اب ہم اسے جلا ڈالیں گے اور ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہا دیں گے۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم کو راستے ہی میں چھوڑ کر حضرت موسیٰؑ اپنے رب کی ملاقات کے شوق میں آگے چلے گئے تھے۔ طور کی جانب اَیمن میں جہاں کا وعدہ بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا، ابھی قافلہ پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ حضرت موسیٰؑ اکیلے ہی روانہ ہو گئے اور حاضری دے دی۔ (۳۳)

پیروانِ سامری کا عذر

جو لوگ سامری کے فتنے میں مبتلا ہوئے ان کا عذر یہ تھا کہ ہم نے تو زیورات پھینک دیے تھے۔ نہ ہماری کوئی نیّت بچھڑا بنانے کی تھی، نہ ہمیں معلوم تھا کہ کیا بننے والا ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ پیش آیا وہ تھا ہی کچھ ایسا کہ اسے دیکھ کر ہم بے اختیار شرک میں مبتلا ہو گئے۔

"ہم لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے لد گئے تھے۔" اس کا سیدھا مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں نے مصر کی رسموں کے مطابق جو بھاری بھاری زیورات پہن رکھے تھے وہ اس صحرا نوردی میں ہم پر بار ہو گئے تھے اور ہم پریشان تھے کہ اس بوجھ کو کہاں تک لادے پھریں۔ لیکن بائیبل کا بیان ہے کہ یہ زیورات مصر سے چلتے وقت ہر اسرائیلی گھرانے کی عورتوں اور مردوں نے اپنے مصری پڑوسی سے مانگ کر لیے تھے اور اس طرح ہر ایک اپنے پڑوسی کو لوٹ کر راتوں رات "ہجرت" کے لیے چل کھڑا ہوا تھا، یہ اخلاق کا زنامہ صرف اس حد تک نہ تھا کہ ہر اسرائیلی نے بطورِ خود اسے انجام دیا ہو بلکہ یہ کارِ خیر اللہ کے نبی حضرت موسیٰؑ نے ان کو سکھایا تھا۔ اور نبی کو بھی اس کی ہدایت خود اللہ میاں نے دی تھی! بائیبل کی کتاب خروج میں ارشاد ہوتا ہے:

> "خدا نے موسیٰ سے کہا .... جا کر اسرائیلی بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر اور ان کو کہہ.... کہ جب تم نکلو گے تو خالی ہاتھ نہ نکلو گے بلکہ تمہاری ایک ایک عورت اپنی پڑوسن سے اور اپنے گھر کی مہمان سے سونے چاندی کے زیور اور لباس مانگ لے گی۔ ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو لوٹ لو گے۔" (باب ۳ ۔ آیت ۱۴ تا ۲۲)

> "اور خداوند نے موسیٰ سے کہا ..... سو اب تو لوگوں کے کان میں بات ڈال دے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے پڑوسی اور ہر عورت اپنی پڑوسن سے سونے چاندی کے زیور

> لے اور خداوند نے ان لوگوں پر مصریوں کو مہربان کر دیا" (باب ۱۱- آیت ۲-۳)
>
> "اور بنی اسرائیل نے موسیٰ کے کہنے کے موافق یہ بھی کیا کہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیور اور کپڑے مانگ لیے۔ اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ جو کچھ انھوں نے مانگا انھوں نے دے دیا۔ سو انھوں نے مصریوں کو لوٹ لیا" (باب ۱۲- آیت ۳۵-۳۶)[1]

بنی اسرائیل کا یہ قول کہ "اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا" اس کا مطلب ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جب اپنے زیورات لادے پھرنے سے لوگ تنگ آ گئے ہوں گے تو باہم مشورے سے یہ بات طے پائی ہو گی کہ سب کے زیورات ایک جگہ جمع کر لیے جائیں، اور یہ نوٹ کر لیا جائے کہ کس کا کتنا سونا اور کس کی کتنی چاندی ہے۔ پھر ان کو گلا کر اینٹوں اور سلاخوں کی شکل میں ڈھال لیا جائے تاکہ قوم کے مجموعی سامان کے ساتھ گدھوں اور بیلوں پر ان کو لاد کر چلا جا سکے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق ہر شخص اپنے زیورات لا لا کر ڈھیر میں پھینکتا چلا گیا ہو گا۔ (۳۴)

بنی اسرائیل کے اس عذر کے بعد کی عبارت پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قوم کا جواب "پھینک دیا تھا" پر ختم ہو گیا ہے اور بعد کی یہ تفصیل اللہ تعالیٰ خود بتا رہا ہے۔ اس سے صورتِ واقعہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ پیش آنے والے فتنے سے بے خبر، اپنے اپنے زیور لا لا کر ڈھیر کرتے چلے گئے اور سامری صاحب بھی ان میں شامل تھے۔ بعد میں زیور گلانے کی خدمت سامری صاحب نے اپنے ذمے لے لی اور کچھ ایسی چال چلی کہ سونے کی اینٹیں یا سلاخیں بنانے کے بجائے ایک بچھڑے کی مورت بھٹی سے برآمد ہوئی جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ اس طرح سامری نے قوم کو دھوکا دیا کہ میں تو صرف سونا گلانے کا قصوروار ہوں، یہ تمھارا خدا آپ ہی اس شکل میں جلوہ فرما ہو گیا ہے۔ (۳۵)

سامری کی فتنہ طرازی اور اس کی سزا

سامری ایک فتنہ پرداز شخص تھا جس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک زبردست مکر و فریب کی اسکیم

---

[1] یہ ہے وہ کتاب جسے یہود و نصاریٰ خدا کا کلام کہتے ہیں۔ قرآن مجید کا بیان اس کی اس روایت کو غلط قرار دیتا ہے اور صحیح صورتِ حال پیش کرتا ہے۔ (مؤلف)

تیار کی تھی۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ سونے کا بچھڑا بنا کر اس میں کسی تدبیر سے بچھڑے کی سی آواز پیدا کر دی اور ساری قوم کے جاہل و نادان لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا۔ اس پر مزید جسارت یہ بھی کی کہ خود حضرت موسیٰؑ کے سامنے ایک پُر فریب داستان گھڑ کر رکھ دی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ مجھے وہ کچھ نظر آیا تھا جو دوسروں کو نظر نہ آتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ یہ افسانہ بھی گھڑ دیا کہ رسول کے نقشِ قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی سے یہ کرامت صادر ہوئی ہے۔ رسول سے مراد ممکن ہے کہ جبریل ہی ہوں جیسا کہ قدیم مفسرین نے سمجھا ہے۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ اس نے رسول کا لفظ خود حضرت موسیٰؑ کے لیے استعمال کیا تھا، تو یہ اس کی ایک اور مکّاری تھی۔ وہ اس طرح حضرت موسیٰؑ کو ذہنی رشوت دینا چاہتا تھا تاکہ وہ اسے اپنے نقشِ قدم کی مٹی کا کرشمہ سمجھ کر پھول جائیں اور اپنی مزید کرامتوں کا اشتہار دینے کے لیے سامری کی خدمات مستقل طور پر حاصل کر لیں۔ قرآن اس سارے معاملے کو سامری کے فریب ہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، اپنی طرف سے بطور واقعہ بیان نہیں کر رہا ہے کہ اس سے کوئی قباحت لازم آتی ہو اور لغت کی کتابوں سے مدد لے کر خواہ مخواہ کی سخن سازی کرنی پڑے۔ بلکہ بعد کے فقرے میں حضرت موسیٰؑ نے جس طرح اس کو پھٹکارا ہے اور اس کے لیے سزا تجویز کی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کے گھڑے ہوئے اس پر فریب افسانے کو سنتے ہی اس کے منہ پر مار دیا گیا۔ (۲۶)

حضرت موسیٰؑ نے سامری سے جو بات فرمائی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ زندگی بھر کے لیے معاشرے سے اس کے تعلقات توڑ دیے گئے اور اس کو اچھوت بنا کر رکھ دیا گیا۔ ساتھ ساتھ یہ ذمہ داری بھی اسی پر ڈالی گئی کہ ہر شخص کو وہ خود اپنے اچھوت پن سے آگاہ کرے اور دور ہی سے لوگوں کو مطلع کرتا رہے کہ میں اچھوت ہوں، مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ بائیبل کی کتاب احبار میں کوڑھیوں کی چھوت سے لوگوں کو بچانے کے لیے جو قواعد بیان کیے گئے ہیں ان میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ:

> "اور جو کوڑھی اس بلا میں مبتلا ہو اس کے کپڑے پھٹے اور اس کے بال بکھرے رہیں اور وہ اپنے اوپر کے ہونٹ کو ڈھانکے اور چلا چلا کر کہے ناپاک ناپاک۔ جتنے دنوں تک وہ اس بلا میں مبتلا رہے وہ ناپاک رہے گا اور وہ ہے بھی ناپاک۔ بس وہ اکیلا رہے اس کا مکان لشکرگاہ سے باہر ہو" (باب ۱۳- آیت ۴۵ - ۴۶)

اس سے گمان ہوتا ہے کہ یا تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کے طور پر اس کو کوڑھ کے مرض میں مبتلا کر دیا گیا ہوگا۔ یا پھر اس کے لیے یہ سزا تجویز کی گئی ہوگی کہ جس طرح جسمانی کوڑھ کا مریض لوگوں سے الگ کر دیا جاتا ہے اسی طرح اخلاقی کوڑھ کے اس مریض کو بھی الگ کر دیا جائے، اور یہ بھی کوڑھی کی طرح پکار پکار کر ہر قریب آنے والے کو مطلع کرتا رہے کہ میں ناپاک ہوں مجھے نہ چھونا (۳۷)

گوسالہ پرستی پر بنی اسرائیل کا معافی مانگنا

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ (اعراف ۔ آیت ۱۵۵)

ترجمہ: "اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر نمائندوں کو منتخب کیا تاکہ وہ (اس کے ساتھ) ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں"

یہ طلبی اس غرض کے لیے ہوئی تھی کہ قوم کے ستر نمائندے کوہِ سینا پر پیشی خداوندی میں حاضر ہو کر قوم کی طرف سے گوسالہ پرستی کے جرم کی معافی مانگیں اور از سرِ نو اطاعت کا عہد استوار کریں۔ بائیبل اور تلمود میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں البتہ یہ ذکر ہے کہ جو تختیاں حضرت موسیٰؑ نے پھینک کر توڑ دی تھیں ان کے بدلے دوسری تختیاں عطا کرنے کے لیے آپ کو کوہِ سینا پر بلایا گیا۔ (خروج۔ باب ۳۴) (۳۸)

شرک کے مجرمین کو سزا

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ (البقرہ ۔ آیت ۵۴)

ترجمہ: "یاد کرو جب موسیٰؑ (یہ نعمت لیے ہوئے پلٹا، تو اس) نے اپنی قوم سے کہا کہ لوگو، تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے لہٰذا تم اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو، اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔"

یعنی اپنے ان آدمیوں کو قتل کرو، جنھوں نے گوسالے کو معبود بنایا اور اس کی پرستش کی۔ (۳۹)

فتنہ کی بیخ کنی کے بعد تنظیمِ نَو

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ (الاعراف ۔ آیت ۱۶۰)

ترجمہ: "اور ہم نے اس قوم کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کرکے انھیں مستقل شکل دے دی تھی"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوہِ سینا کے بیابان میں بنی اسرائیل کی مردم شماری کرائی، پھر ان کے بارہ گھرانوں کو جو حضرت یعقوبؑ کے دس بیٹوں اور حضرت یوسفؑ کے دو بیٹوں کی نسل سے تھے، الگ الگ گروہوں کی شکل میں منظم کیا اور ہر گروہ پر ایک ایک سردار مقرر کیا تاکہ وہ ان کے اندر اخلاقی، مذہبی، تمدنی و معاشرتی اور فوجی حیثیت سے نظم قائم رکھے اور احکامِ شریعت کا اجرا کرتا رہے۔ نیز حضرت یعقوبؑ کے بارھویں بیٹے لاوی کی اولاد، جس کی نسل سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ تھے، ایک الگ جماعت کی شکل میں منظم کیا تاکہ وہ ان سب قبیلوں کے درمیان شمعِ حق روشن رکھنے کی خدمت انجام دیتی رہے۔ (۴۰)

فصل ۹

بیابانِ سینا میں اللہ تعالیٰ کے احسانات

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهُ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۚ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ (الاعراف ۱۶۰)

ترجمہ: "اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اس کو اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو۔ چنانچہ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنے پانی پینے کی جگہ متعین کر لی۔ ہم نے ان پر بادل کا سایہ کیا اور ان پر مَن و سلویٰ اتارا۔"

تین بڑے احسانات

اوپر جس تنظیم کا ذکر کیا گیا ہے وہ منجملہ ان احسانات کے تھی جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کیے۔ اس کے بعد اب مزید تین احسانات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ جزیرہ نمائے سینا کے بیابانی علاقہ میں ان کے لیے پانی کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام کیا گیا۔[1] دوسرے یہ کہ ان کو دھوپ کی تپش سے بچانے کے لیے آسمان پر بادل چھا دیا گیا۔[2] تیسرے یہ کہ ان کے لیے خوراک کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام من و سلویٰ کے نزول کی شکل میں کیا

---

[1] وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔ سیاح اسے جا کر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اس میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ ۱۲ چشموں میں یہ مصلحت تھی کہ بنی اسرائیل کے قبیلے بھی ۱۲ ہی تھے۔ خدا نے ہر ایک قبیلے کے لیے الگ چشمہ نکال دیا تاکہ ان کے درمیان پانی پر جھگڑا نہ ہو۔ (مؤلف)

[2] یعنی جزیرہ نمائے سینا میں جہاں دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ تمہیں میسر نہ تھی، ہم نے ابر سے تمہارے بچاؤ کا انتظام کیا۔ اس موقع پر خیال رہے کہ بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نکل آئے تھے (باقی بر صفحہ

گیا ۔ ظاہر ہے کہ ان تین اہم ترین ضروریات زندگی کا بندوبست نہ کیا جاتا تو یہ قوم جس کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچی ہوئی تھی، اس علاقہ میں بھوک پیاس سے بالکل ختم ہو جاتی ۔ آج بھی کوئی شخص وہاں جائے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ اگر یہاں پندرہ بیس لاکھ آدمیوں کا ایک عظیم الشان قافلہ یکایک آ ٹھہرے، تو اس کے لیے پانی، خوراک اور سائے کا آخر کیا انتظام ہو سکتا ہے ۔ موجودہ زمانے میں پورے جزیرہ نمائے سینا کی آبادی چند ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور آج اس بیسویں صدی میں بھی اگر کوئی سلطنت پانچ چھ لاکھ فوج وہاں لے جانا چاہے تو اس کے مدبّروں کو رسد کے انتظام کی فکر میں دردِ سر لاحق ہو جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے بہت سے محققین نے، جو نہ کتاب کو مانتے ہیں اور نہ معجزات کو تسلیم کرتے ہیں، یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا کے اس حصے سے گزرے ہوں گے جس کا ذکر بائبل اور قرآن میں آیا ہے ۔ ان کا گمان ہے کہ شاید یہ واقعات فلسطین کے جنوبی اور عرب کے شمالی حصہ میں پیش آئے ہوں گے ۔ جزیرہ نمائے سینا کے طبعی اور معاشی جغرافیہ کو دیکھتے ہوئے وہ اس بات کو بالکل ناقابلِ تصور سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی قوم یہاں برسوں ایک ایک جگہ پڑاؤ کرتی ہوئی گزر سکتی تھی، خصوصاً جب کہ مصر کی طرف سے اس کی رسد کا راستہ بھی منقطع تھا، اور دوسری طرف خود اس جزیرہ نما کے مشرق اور شمال میں عمالقہ کے قبیلے اس کی مزاحمت پر آمادہ تھے ۔ ان امور کو پیش نظر رکھنے سے صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان چند مختصر آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے جن احسانات کا ذکر فرمایا ہے وہ درحقیقت کتنے بڑے احسانات تھے اور اس کے بعد یہ کتنی بڑی احسان فراموشی تھی کہ اللہ کے فضل و کرم کی ایسی صریح نشانیاں دیکھ لینے پر بھی یہ قوم مسلسل ان نافرمانیوں اور غداریوں کی مرتکب ہوتی رہی جن سے اس کی تاریخ بھری پڑی ہے ۔ ㊶

مَنّ و سلویٰ کا نزول

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ط كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ہ (البقرہ ۔ آیت ۵۷)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور سینا کے علاقے میں مکانات کا تو کیا ذکر، سر چھپانے کے لیے ان کے پاس خیمے تک نہ تھے ۔ اس زمانے میں اگر خدا کی طرف سے ایک مدت تک آسمان کو ابرآلود نہ رکھا جاتا، تو یہ قوم دھوپ سے ہلاک ہو جاتی ۔ (از مؤلف)

ترجمہ: "اور ہم نے مَن و سلوٰی کی غذا تمھارے لیے فراہم کی اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں انھیں کھاؤ۔ مگر تمھارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ ہم پر ظلم نہ تھا بلکہ انھوں نے آپ اپنے اوپر ظلم کیا۔"

مَن اور سلوٰی وہ قدرتی غذائیں تھیں جو اس مہاجرت کے زمانے میں ان لوگوں کو چالیس برس تک مسلسل ملتی رہیں۔ مَن دھنیے کے بیج جیسی ایک چیز تھی جو اوس کی طرح گرتی اور زمین پر جم جاتی تھی، اور سلوٰی بٹیر کی قسم کے پرندے تھے۔ خدا کے فضل سے ان کی اتنی کثرت تھی کہ ایک پوری کی پوری قوم محض انھی غذاؤں پر زندگی بسر کرتی رہی اور اسے فاقہ کشی کی مصیبت نہ اٹھانی پڑی۔ حالانکہ آج کسی نہایت متمدن ملک میں بھی اگر چند لاکھ مہاجر یکایک آپڑیں تو ان کی خوراک کا انتظام مشکل ہو جاتا ہے۔ (۴۲)

مزید تفصیل

بائیبل کا بیان ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل دشتِ سین میں ایلیم اور سینا کے درمیان گزر رہے تھے اور خوراک کے ذخیرے ختم ہو کر فاقوں کی نوبت آگئی تھی، اس وقت مَن و سلوٰی کا نزول شروع ہوا، اور فلسطین کے آباد علاقے میں پہنچنے تک پورے چالیس سال یہ سلسلہ جاری رہا (خروج باب ۱۶۔ گنتی باب ۱۱، آیت ۷۔۹۔ یشوع، باب ۵، آیت ۱۲) کتاب خروج میں مَن و سلوٰی کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے:

> "اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا۔ اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی اور جب وہ اوس جو پڑی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول گول چیز، ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اسے دیکھ کر آپس میں کہنے لگے مَن؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔" (باب ۱۶۔ آیت ۱۳۔۱۵)

> "اور بنی اسرائیل نے اس کا نام مَن رکھا اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید اور اس کا مزہ شہد کے بنے ہوئے پوئے کی طرح تھا۔" (آیت ۳۱۔)

گنتی میں اس کی مزید تشریح یہ ملتی ہے:

> "لوگ اِدھر اُدھر جا کر اسے جمع کرتے اور اسے چکی میں پیستے یا اوکھلی میں کوٹ لیتے تھے۔

پھر اسے ہانڈیوں میں اُبال کر روٹیاں بناتے تھے۔ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا اور رات کو جب لشکرگاہ میں اوس پڑتی تو اس کے ساتھ مَن بھی گرتا تھا۔" (باب ۱۱۔ آیت ۸-۹)

یہ بھی ایک معجزہ تھا کیونکہ ۴۰ برس بعد جب بنی اسرائیل کے لیے خوراک کے فطری ذرائع بہم پہنچ گئے تو یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب نہ اس علاقے میں بٹیروں کی وہ کثرت ہے، نہ مَن ہی کہیں پایا جاتا ہے۔ تلاش و جستجو کرنے والوں نے ان علاقوں کو چھان مارا ہے جہاں بائبل کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل نے ۴۰ سال تک دشت نوردی کی تھی۔ مَن ان کو کہیں نہ ملا۔ البتہ کاروباری لوگ خریداروں کو بے وقوف بنانے کے لیے مَن کا حلوا ضرور بیچتے پھرتے ہیں۔ (۴۳)

فصل ۱۰

خدائی احسانات کے جواب میں بنی اسرائیل کا ٹیڑھا رویہ

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ
الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (البقرہ - ۵۵)

ترجمہ: "یاد کرو جب تم نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ ہم تمہارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے، جب تک کہ اپنی آنکھوں سے علانیہ خدا کو (تم سے کلام کرتے) نہ دیکھ لیں ۔ اس وقت تمہارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست صاعقے نے تم کو آ لیا۔"

یہ اشارہ جس واقعہ کی طرف ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر جب حضرت موسیٰؑ طور پر تشریف لے گئے تھے، تو آپ کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے ستر نمائندے بھی لے کر آئیں ۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان عطا کی، تو آپ نے اسے ان نمائندوں کے سامنے پیش کیا ۔ اس موقع پر قرآن کہتا ہے کہ ان میں سے بعض شریر کہنے لگے کہ ہم محض تمہارے بیان پر کیسے مان لیں کہ خدا تم سے ہم کلام ہوا ہے ۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور انھیں سزا دی گئی - لیکن بائبل کہتی ہے کہ:

> "انھوں نے اسرائیل کے خدا کو دیکھا ۔ اس کے پاؤں کے نیچے نیلم کے پتھر کا چبوترا سا تھا، جو آسمان کی مانند شفاف تھا ۔ اور اس نے بنی اسرائیل کے شرفا پر اپنا ہاتھ نہ بڑھایا ۔ سو انھوں نے خدا کو دیکھا اور کھایا پیا۔" (خروج، باب ۲۴ - آیت ۱۰-۱۱)

لطف یہ ہے کہ اسی کتاب میں آگے چل کر لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے خدا سے عرض کیا کہ مجھے اپنا جلال دکھا دے، تو اس نے فرمایا کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا (دیکھو خروج، باب ۳۳ - آیت ۱۸-۲۳) (۴۴)

بے صبر ہو کر شہری غذائیں مانگتے ہیں

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ط قَالَ أَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ أَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ط اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ ط وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ق وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط (سورہ البقرہ آیت ۶۱)

ترجمہ: "یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ، اے موسیٰؑ، ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار، ساگ، ترکاری، گیہوں، لہسن پیاز، دال وغیرہ پیدا کرے۔ تو موسیٰؑ سے کہا، کیا ایک بہتر چیز کے بجائے ادنیٰ درجے کی چیزیں لینا چاہتے ہو؟ اچھا کسی شہری آبادی میں جا رہو، جو کچھ تم مانگتے ہو وہاں مل جائے گا۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلت و خواری اور پستی و بدحالی ان پر مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔"

یہ مطلب نہیں ہے کہ من و سلویٰ چھوڑ کر، جو بے مشقت مل رہا ہے، وہ چیزیں مانگ رہے ہو جن کے لیے کھیتی باڑی کرنی پڑے گی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس بڑے مقصد کے لیے تم سے صحرا نوردی کرائی جا رہی ہے، اس کے مقابلے میں کیا تم کو کام و دہن کی لذت اتنی زیادہ مرغوب ہے کہ اس مقصد کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو اور ان چیزوں سے محرومی کچھ مدت کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے؟ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو گنتی، باب ۱۱، آیت ۴-۹) (۴۵)

ایک بستی کی فتح اور بنی اسرائیل کا کردار

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ○ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (البقرہ - ۵۹)

ترجمہ: "پھر یاد کرو جب ہم نے کہا تھا کہ یہ بستی جو تمہارے سامنے ہے اس میں داخل ہو جاؤ،

اس کی پیداوار، جس طرح چاہو، مزے سے کھاؤ، مگر بستی کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے داخل ہونا اور کہتے جانا حِطَّۃٌ حِطَّۃٌ ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے اور نیکوکاروں کو مزید فضل وکرم سے نوازیں گے مگر جو بات کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر کچھ اور کر دیا۔ آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔ یہ سزا تھی ان نافرمانیوں کی جو وہ کرتے رہے تھے۔"

یہ ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکا ہے کہ اس بستی سے کونسی بستی مراد ہے۔ جس سلسلۂ واقعات میں یہ ذکر ہو رہا ہے وہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے، جبکہ بنی اسرائیل ابھی جزیرہ نمائے سینا ہی میں تھے۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ یہ اسی جزیرہ نما کا کوئی شہر ہوگا لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد شِطّیم ہو، جو یریحُو کے بالمقابل دریائے اُرْدُن کے مشرقی کنارے پر آباد تھا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ اس شہر کو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کی زندگی کے اخیر زمانے میں فتح کیا اور وہاں بڑی بدکاریاں کیں جن کے نتیجے میں خدا نے ان پر وبا بھیجی اور ۲۴ ہزار آدمی ہلاک کر دیے۔ (گنتی باب ۲۵، آیت ۱-۸)۔ (۴۶)

یعنی حکم یہ تھا کہ جابر و ظالم فاتحوں کی طرح اکڑتے ہوئے نہ گھسنا، بلکہ خدا ترسوں کی طرح منکسرانہ شان سے داخل ہونا (جیسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے) اور حِطَّۃٌ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جانا، دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتلِ عام کے بجائے بستی کے باشندوں میں درگزر اور عام معافی کا اعلان کرتے جانا۔ (۴۷)

گائے ذبح کرنے کا حکم اور ان کی حیلہ جوئی

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ط قَالُوْۤا
اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ط قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ قَالُوا
ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ ط قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ
وَّلَا بِكْرٌ ط عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِكَ ط فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ط قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا
تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ
عَلَیْنَا ط وَاِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ

لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ج مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ط قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ط فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ (البقرۃ ۔ آیات ۶۷ تا ۷۱)

ترجمہ: "پھر وہ واقعہ یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمھیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہنے لگے کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟ موسیٰؑ نے کہا: میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔ بولے اچھا، اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتلائے۔ موسیٰؑ نے کہا اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا، بلکہ اوسط عمر کی ہو۔ لہٰذا جو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرو۔ پھر کہنے لگے اپنے رب سے یہ اور پوچھ دو کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ موسیٰؑ نے کہا وہ فرماتا ہے زرد رنگ کی گائے ہونی چاہیے جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والے کا جی خوش ہو جائے۔ پھر بولے اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ کیسی گائے مطلوب ہے؟ ہمیں اس کی تعیین میں اشتباہ ہو گیا ہے، اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتہ پا لیں گے۔ موسیٰؑ نے جواب دیا: اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی، نہ زمین جوتتی ہے نہ پانی کھینچتی ہے، صحیح سالم اور بے داغ ہے، اس پر وہ پکار اٹھے کہ ہاں، اب تم نے ٹھیک پتہ بتایا ہے۔ پھر انھوں نے اسے ذبح کیا ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔"

چونکہ ان لوگوں کو اپنی ہمسایہ قوموں سے گائے کی عظمت و تقدیس اور گاؤ پرستی کے مرض کی چھوت لگ گئی تھی، اس لیے ان کو حکم دیا گیا کہ گائے ذبح کریں۔ ان کے ایمان کا امتحان ہی اسی طرح ہو سکتا تھا کہ اگر وہ واقعی اب خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے تو یہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے جس بت کو معبود سمجھتے رہے ہیں اسے اپنے ہاتھ سے توڑ دیں۔ یہ امتحان بہت کڑا تھا۔ دلوں میں پوری طرح ایمان اترا ہوا نہ تھا، اس لیے انھوں نے ٹالنے کی کوشش کی اور تفصیلات پوچھنے لگے مگر جتنی جتنی وہ تفصیلات پوچھتے گئے اتنے ہی گھرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ آخر کار اسی خاص قسم کی سنہری گائے پر، جسے اس زمانے میں پرستش کے لیے مختص کیا جاتا تھا، گویا انگلی رکھ کر بتا دیا گیا کہ اسے ذبح کرو۔ بائیبل میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے مگر وہاں یہ ذکر نہیں ہے کہ بنی اسرائیل نے اس حکم کو کس طرح ٹالنے کی کوشش کی تھی (ملاحظہ ہو گنتی، باب ۱۶ - آیت ۱ - ۱۰) ㊽

قتل کا ایک واقعہ

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (البقرہ - آیات ۷۲-۷۳)

ترجمہ: "اور تمھیں یاد ہے وہ واقعہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی[1]، پھر اس کے بارے میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام تھوپنے لگے تھے اور اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ تم چھپاتے ہو کھول کر رکھ دے گا۔ اس وقت ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اس کے ایک حصے سے ضرب لگاؤ۔ دیکھو، اس طرح اللہ مردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔"

اس مقام پر یہ بات تو صریح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لیے ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتہ بتا دے۔ لیکن اس غرض کے لیے جو تدبیر بتائی گئی تھی، یعنی "لاش کو اس کے ایک حصے سے ضرب لگاؤ"، اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مفسرین نے بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ اوپر جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اسی کے گوشت سے مقتول کی لاش پر ضرب لگانے کا حکم ہوا۔ اس طرح گویا بیک کرشمہ دو کار ہوئے۔ ایک یہ کہ اللہ کی قدرت کا ایک نشان انھیں دکھایا گیا۔ دوسرے یہ کہ گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبودیت پر بھی ایک کاری ضرب لگی کہ اس نام نہاد معبود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی تو اسے ذبح کرنے سے ایک آفت برپا ہو جانی چاہیے تھی نہ کہ اس کا ذبح ہونا الٹا مفید ثابت ہو۔ (۴۹)

بیت المقدس میں داخلے کا حکم

وَإِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ .... يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلٰى أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خٰسِرِينَ ۝ قَالُوا يٰمُوسٰى

---

[1] بنی اسرائیل کی اخلاقی پستی پر یہ واقعہ بھی شاہد ہے۔ یہ قوم وطن چھوڑ کر خدا پرستی کے لیے بیاباں نوردی کرتی ہے مگر اس مقدس مشن اور سفر کے باوجود قتل جیسے جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ (مرتبین)

إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ ۖ وَإِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا ۚ فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ۝ قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غٰلِبُونَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ قَالُوا يٰمُوسَىٰ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُونَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِينَ ۝ قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۚ يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِينَ ۝ (المائدہ۔ آیات ۲۰ تا ۲۶)

ترجمہ: "اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا...... اے برادران قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے، پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام پلٹو گے۔ انھوں نے جواب دیا اے موسیٰ! وہاں تو بڑے بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں۔ ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لیے تیار ہیں۔ ان ڈرنے والوں میں دو شخص ایسے بھی تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا۔ انھوں نے کہا۔ ان جبّاروں کے مقابلے میں دروازے کے اندر گھس جاؤ، جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم مومن ہو۔ لیکن انھوں نے پھر یہی کہا کہ اے موسیٰ! ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمھارا رب دونوں جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ اس پر موسیٰ نے کہا۔ اے رب میرے! میرے اختیار میں کوئی نہیں مگر یا میری اپنی ذات یا میرا بھائی، پس تو ہمیں ان نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔ اللہ نے جواب دیا اچھا تو وہ ملک چالیس سال تک ان پر حرام ہے، یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے۔ ان نافرمانوں کی حالت پر ہرگز ترس نہ کھاؤ۔"

اس سے مراد فلسطین کی سرزمین ہے، جو حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ کا مسکن رہ چکی تھی۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل آئے تو اسی سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے نامزد فرمایا اور حکم دیا کہ جا کر اسے فتح کر لو۔

حضرت موسیٰؑ کی یہ تقریر اس موقع کی ہے جب کہ مصر سے نکلنے کے تقریباً دو سال بعد آپ اپنی قوم کو لیے ہوئے دشتِ فاران میں خیمہ زن تھے۔ یہ بیابان، جزیرہ نمائے سینا میں عرب کی شمالی اور فلسطین کی جنوبی سرحد سے متصل واقع ہے۔

بنی اسرائیل کی دُوں ہمّتی

اس قصے کی تفصیلات بائیبل کی کتاب گنتی، استثنا اور یشوع میں ملیں گی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے دشتِ فاران سے بنی اسرائیل کے ۱۲ سرداروں کو فلسطین کا دورہ کرنے کے لیے بھیجا تاکہ وہاں کے حالات معلوم کر کے آئیں۔ یہ لوگ چالیس دن دورہ کر کے وہاں سے واپس آئے اور انھوں نے قوم کے مجمعِ عام میں بیان کیا کہ واقعی وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں لیکن جو لوگ وہاں بسے ہوئے ہیں وہ زورآور ہیں .... ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں۔ .... وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے وہ سب بڑے قدآور ہیں اور ہم نے وہاں بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبار ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈے ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے۔ یہ بیان سن کر سارا مجمع چیخ اٹھا کہ اے کاش ہم مصر میں ہی مر جاتے، یا کاش اس بیابان ہی میں مرتے! خداوند کیوں ہم کو اس ملک میں لے جا کر تلوار سے قتل کروانا چاہتا ہے؟ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں۔ وہ آپس میں کہنے لگے کہ آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنا لیں اور مصر کو لَوٹ چلیں۔ اس پر ان بارہ سرداروں میں سے، جو فلسطین کے دورے پر بھیجے گئے تھے، دو سردار یوشعؑ اور کالب اٹھے اور انھوں نے اس بزدلی پر قوم کو ملامت کی۔ کالب نے کہا چلو ہم ایک دم جا کر اس ملک پر قبضہ کر لیں۔ کیونکہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرف کریں۔ پھر دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا .... فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو۔ اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو .... اور ہمارے ساتھ خداوند ہے، سو ان کا خوف نہ کرو۔ مگر قوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ انھیں سنگسار کر دو۔ آخرکار اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور اس نے فیصلہ فرمایا کہ اچھا اب یوشع اور کالب کے سوا اس قوم کے بالغ مردوں میں سے کوئی بھی اس سرزمین میں داخل ہونے نہ پائے گا، یہ قوم چالیس برس تک بے خانماں پھرتی رہے گی۔ یہاں تک کہ جب ان میں سے ۲۰ برس سے لے کر اوپر کی عمر تک کے سب مرد مر جائیں گے اور نئی نسل جوان ہو کر اٹھے گی تب انھیں فلسطین فتح کرنے

کا موقع دیا جائے گا۔ چنانچہ اس فیصلۂ خداوندی کے مطابق بنی اسرائیل کو دشتِ فاران سے شرقِ اُردن تک پہنچتے پہنچتے پورے ۳۸ برس لگ گئے۔ اس دوران میں وہ سب لوگ مر کھپ گئے جو جوانی کی عمر میں مصر سے نکلے تھے۔ شرقِ اُردن فتح کرنے کے بعد حضرت موسیٰؑ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت یوشع بن نون کے عہد خلافت میں بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ فلسطین فتح کر سکیں۔ (۵۰)

فصل ۱۱

بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ کی آخری وصیّت

بائبل میں آپ کی روایت شدہ تقریر

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (ابراھیم - ۷)

ترجمہ: "اور یاد رکھو تمھارے رب نے (بنی اسرائیل کو) خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا۔ اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔"

اس مضمون کی تقریر بائبل کی کتاب استثناء میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ اس تقریر میں حضرت موسیٰؑ اپنی وفات سے چند روز پہلے بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے سارے اہم واقعات یاد دلاتے ہیں، پھر توراۃ کے ان تمام احکام کو دہراتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو بھیجے تھے پھر ایک طویل خطبہ دیتے ہیں جس میں بتاتے ہیں کہ اگر انھوں نے اپنے رب کی فرمانبرداری کی تو کیسے کیسے انعامات سے نوازے جائیں گے اور اگر نافرمانی کی روش اختیار کی تو اس کی کیسی سخت سزا دی جائے گی۔ یہ خطبہ کتاب استثناء کے ابواب نمبر ۴۔ ۶۔ ۸۔ ۱۰۔ ۱۱ اور ۲۸ تا ۳۰ میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے بعض بعض مقامات کمال درجہ مؤثر و عبرت انگیز ہیں۔ مثال کے طور پر اس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں جن سے پورے خطبے کا اندازہ ہو سکتا ہے:

> "سُن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا کے ساتھ محبت رکھ۔ اور یہ باتیں جن کا حکم آج میں تجھے دیتا ہوں تیرے دل پر نقش رہیں۔ اور تو ان کو اپنی اولاد کے ذہن نشین کرنا۔ اور گھر بیٹھے راہ چلتے اور لیٹتے اور اٹھتے ان کا ذکر کرنا!" (باب ۶ - آیات ۴ - ۷)

"پس اے اسرائیل! خداوند تیرا خدا تجھ سے اس کے سوا اور کیا چاہتا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کا خوف مانے اور اس کی سب راہوں پر چلے اور اس سے محبت رکھے اور اپنے سارے دل اور ساری جان سے خداوند اپنے خدا کی بندگی کرے اور خداوند کے جو احکام اور آئین جو میں تجھ کو آج بتاتا ہوں ان پر عمل کرے تاکہ تیری خیر ہو۔ دیکھ آسمان اور زمین اور جو کچھ زمین میں ہے یہ سب خداوند تیرے خدا ہی کا ہے۔" (باب ۱۰۔ آیات ۱۲-۱۴)

"اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات کو جانفشانی سے مان کر اس کے ان سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھے دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا دنیا کی سب قوموں سے زیادہ تجھ کو سرفراز کرے گا اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات سنے تو یہ سب برکتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو ملیں گی۔ شہر میں بھی تو مبارک ہوگا اور کھیت میں بھی مبارک ...... خداوند تیرے دشمنوں کو جو تجھ پر حملہ کریں تیرے روبرو شکست دلائے گا۔ ...... خداوند تیرے انبار خانوں میں اور سب کاموں میں جن میں تو ہاتھ ڈالے برکت کا حکم دے گا ...... تجھے اپنی پاک قوم بنا کر رکھے گا اور دنیا کی سب قومیں یہ دیکھ کر کہ تو خداوند کے نام سے کہلاتا ہے تجھ سے ڈر جائیں گی۔ تو بہت سی قوموں کو قرض دے گا پر خود قرض نہیں لے گا اور خداوند تجھے دم نہیں بلکہ سر ٹھہرائے گا۔ اور تو پست نہیں بلکہ سرفراز ہی رہے گا۔" (باب ۲۸۔ آیات ۱-۱۳)

لیکن اگر تو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے خدا کی بات سن کر اس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر پڑیں گی اور تجھ کو لگیں گی۔ شہر میں بھی تو لعنتی ہوگا اور کھیت میں بھی لعنتی ...... خداوند ان سب کاموں میں جن کو تو ہاتھ لگائے لعنت اور پھٹکار اور اضطراب کو تجھ پر نازل کرے گا ...... وبا تجھ سے لپٹی رہے گی ..... آسمان جو تیرے سر پر ہے پیتل کا اور زمین جو تیرے نیچے ہے لوہے کی ہو جائے گی ..... خداوند تجھے تیرے دشمنوں کے آگے شکست دلائے گا تو ان کے مقابلے کے لیے ایک ہی راستہ سے جائے گا مگر ان کے سامنے سات سات راستوں سے بھاگے گا .... عورت سے منگنی تو تو کرے گا مگر دوسرا اس سے مباشرت کرے گا۔ تو گھر بنائے گا لیکن اس میں بسنے نہ پائے گا۔ تو تاکستان لگائے گا پر اس کا پھل نہ کھا سکے گا۔ تیرا بیل تیری آنکھوں کے سامنے ذبح کیا جائے گا .... بھوکا اور پیاسا اور ننگا اور سب چیزوں کا محتاج ہو کر تو اپنے ان دشمنوں کی خدمت کرے گا جن کو خداوند تیرے برخلاف بھیجے گا۔ اور غنیم تیری گردن پر لوہے کا جوا رکھے گا جب تک وہ تیرا ناس نہ کر دے ..... خداوند تجھ کو زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام قوموں میں پراگندہ کر دے گا۔" (باب ۲۸۔ آیات ۱۵، ۶۴) (51)

باب ۳

یہود کا بگاڑ اور اُس کے نتائج

فصل ۱

یہُود کا اخلاقی تنزُّل اور سیاسی پراگندگی

موسوی شریعت جس زمانہ میں بھیجی گئی تھی وہ بنی اسرائیل کی ذہنی طفولیت کا زمانہ تھا۔ ان میں کسی گہری اخلاقی تعلیم کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ نے ان کو ایک سادہ عقیدہ اور ایک سیدھے سے ضابطۂ اخلاق کی تعلیم دے کر چھوڑ دیا تھا جس میں اخلاقی فضائل، روحانی پاکیزگی اور ایمانی روح کی بہت کمی تھی۔ چند صدیوں تک بنی اسرائیل اس شریعت کے پابند رہے مگر بعد کے زمانہ میں جب ان کے معاملات نے وسعت اختیار کی تو وہ کمی جو شریعت میں رہ گئی تھی، رنگ لانے لگی۔ رفتہ رفتہ بنی اسرائیل کی اخلاقی حالت خراب ہوتی چلی گئی اور فسادِ اخلاق کا طبیعی نتیجہ اضمحلالِ قویٰ کی شکل میں ظاہر ہوا۔

تفرقہ و تصادم اور اس کے نتائج

پہلے ان کی جماعت کا شیرازہ منتشر ہوا، پھر منتشر اجزاء میں باہم تصادم شروع ہوا، اور آخر میں غلامی کی لعنت ان پر مسلط ہو گئی جس نے انھیں پستی و تنزُّل کی انتہا کو پہنچا دیا۔ مسیحؑ کی پیدائش سے ۷۲۸ برس پہلے اشوریوں نے ان کو مغلوب کیا اور دو صدی تک وہ اور ان کے بعد اہلِ بابل، انھیں پیتے رہے۔ پھر ۵۳۹ق م میں ایرانی آگئے اور دو سو برس تک ان کا دورہ رہا۔ ان کے بعد سکندرِ اعظم کی قیادت میں یونانیوں نے ان کو مغلوب کیا (۳۳۲ ـ ۳۲۳ ق م) اور سکندر کی وفات کے بعد مصر کے بطالسہ (PTOLEMIES) نے ان کو اپنا حلقہ بگوش بنالیا۔ اس طرح ایک صدی تک بنی اسرائیل یونانیوں کی غلامی میں رہے۔ پھر ۱۹۸ ق م میں ایک دوسرے یونانی خاندان سلیوکیڈیا نے ان پر اپنی حکومت قائم کر لی اور جبراً ان میں صنم پرستی کو داخل کیا۔

یہودی حکومت کا قیام اور تباہی

دوسری صدی قبل مسیح کے وسط میں یہودیوں کو کچھ آزادی کا احساس ہوا اور انھوں نے بغاوت کر کے

۱۴۱ سنہ ق م ایک آزاد یہودی حکومت قائم کرلی جو تقریباً ۸۰ برس تک زندہ رہی۔ مگر ان کے اخلاق اس قدر بگڑ چکے تھے کہ جماعت کا شیرازہ بندھنا مشکل تھا، اس لیے ان میں پھوٹ پڑی اور انھوں نے خود ہی رومیوں کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی۔ مسیحؑ کی پیدائش سے ۶۰ برس پہلے رومیوں نے فلسطین پر حملہ کیا اور جب مسیحؑ نے آنکھ کھولی تو ان کی پوری قوم رومیوں کی غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔ سات آٹھ صدی تک بابل و آشور کے ستارہ پرستوں، ایران کے آتش پرستوں اور یونان و روم کے صنم پرستوں کے ماتحت غلامانہ زندگی بسر کرنے کے باعث اس قوم کے اندر اخلاق، شرافت، دینداری اور انسانیت کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

بائیبل میں یہودیوں کے اخلاقی تنزل کا ریکارڈ

خود بائیبل کے عہدِ عتیق میں یہودیوں کے اس اخلاقی و روحانی تنزل کی تفصیلات ہم کو بکثرت ملتی ہیں۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کے بادشاہ منسی (MANESSAH) نے اہلِ بابل کے اثر سے ارضِ مقدس میں جن گمراہیوں کو رواج دیا اس کی کیفیت ۲ سلاطین باب ۲۱ میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

"اس نے اونچے مکانوں کو جنھیں ان کے باپ حزقیاہ نے ڈھایا تھا پھر بنا دیا اور بعل کے مذبح اٹھائے، اور یسیرت بنائی جس طرح اسرائیل کے بادشاہ اخی اب نے کیا تھا، اور آسمان کی ساری فوج (یعنی اجرام فلکی) کی پرستش کی اور ان کی بندگی کی۔ اس نے خداوند کے اس گھر میں جس کی بابت خداوند نے فرمایا تھا کہ میں یروشلم میں اپنا نام رکھوں گا، مذبح بنائے۔ اس نے آسمان کی ساری فوج کے لیے خداوند کے گھر کے دونوں صحنوں میں مذبح بنائے۔ اس نے اپنے بیٹے کو آگ میں گزارا اور ساعتوں کو مانا اور جادوگری کی، دیوں اور افسوں گروں سے یاری کی .... اس نے یسیرت کی مورت کو عین اس گھر میں نصب کیا جس کی بابت خداوند نے داؤدؑ کو اور اس کے بیٹے سلیمانؑ کو کہا تھا کہ اسی گھر میں اور یروشلم میں، جسے میں نے بنی اسرائیل کے سارے فرقوں میں سے چن لیا ہے، میں اپنا نام ابد تک رکھوں گا۔"

ہوسیع نبی کا بیان

اس عہد کی اخلاقی حالت کو ہوسیع نبی (۸۲۰ سنہ۔ ۷۴۱ سنہ ق م) نے اس طرح بیان کیا ہے:

"اس سرزمین کے بسنے والوں سے خداوند کا ایک جھگڑا ہے، کیونکہ ملک میں نہ راستی ہے نہ شفقت

نہ خداشناسی۔ کوسنے اور جھوٹ بولنے اور خون اور چوری اور حرام کاری کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ پھوٹ نکلے ہیں اور خون پر خون ہوتا ہے اس لیے یہ سرزمین ماتم کرے گی اور ہر ایک جو اس میں رہتا ہے جنگل کے جانوروں اور ہوا کے پرندوں سمیت ناتوان ہو جائے گا۔" (۴ : ۱ - ۳)

یسعیاہ نبی کا بیان

۷۴۰ء - ۷۰۰ء ق م میں یسعیاہ نبی کہتے ہیں :-

"تمام سر بیمار ہے اور دل بالکل سست ہے۔ تلوے سے لے کر چندیا تک اس میں کہیں صحت نہیں ہے بلکہ زخم اور چوٹ اور سڑے ہوئے گھاؤ ہیں۔ .... تمہارا ملک اجاڑ ہے، تمہاری بستیاں جل گئیں، پردیسی لوگ تمہاری زمین کو تمہارے سامنے نگلتے ہیں۔ وہ ویران ہے، گویا کہ اسے اجنبی لوگوں نے اجاڑا ہے" (۱ : ۵ - ۷)

"وہ بستی جو سراسر پاک دامن تھی کیسی چھنال ہو گئی! وہ تو انصاف سے معمور تھی، راستبازی اس میں بستی تھی، پر اب خونی رہتے ہیں۔ تیری چاندی میلی ہو گئی۔ تیری مے میں پانی مل گیا۔ تیرے سردار گردن کش چوروں کے شریک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک رشوت دوست اور انعام طلب ہے۔ وہ یتیموں کا انصاف نہیں کرتے اور بیواؤں کی فریاد ان تک نہیں پہنچتی" (۱ : ۲۱ - ۲۳)

"ان کے جشن کی محفلوں میں بربط اور بین اور اور بانسری کا زور ہے۔ لیکن وہ خداوند کے کام پر غور نہیں کرتے اور اس کے ہاتھوں کی کاریگری کو نہیں دیکھتے۔ اس لیے میری قوم اسیری میں مبتلا ہو گئی ہے کیونکہ وہ علم نہیں رکھتی۔ ان کے عزت والے بھوکوں مرتے اور عوام پیاس سے خشک ہوتے جاتے ہیں اس لیے دوزخ نے وسعت اختیار کر لی ہے اور اپنا منہ بے اندازہ پھاڑ دیا ہے۔ ان کے شان و شوکت والے اور عوام اور تمام فخر کرنے والے اس میں جا پڑیں گے۔" (۵ : ۱۲ - ۱۴)

"ان پر واویلا ہے جو مے پینے میں زور آور اور نشہ کی چیزیں ملانے میں طاقتور ہیں، جو رشوت کی خاطر بدکاروں کو صادق ٹھہراتے ہیں اور صادقوں سے ان کا حق چھین لیتے ہیں۔ سو جس طرح آگ بھوسی کو کھا جاتی ہے اور جلتا ہوا پھونس بیٹھ جاتا ہے، اسی طرح ان کی جڑ بوسیدہ ہو گی اور ان کی کلی گرد کی طرح اڑ جائے گی، کیونکہ انھوں نے ربّ الافواج کی شریعت کو ناجائز ٹھہرایا اور اسرائیل کے قدوس کے سخن کو ذلیل جانا۔" (۵ : ۲۲ - ۲۴)

میکاہ نبی کا بیان

اسی عہد کے ایک اور نبی حضرت میکاہ کہتے ہیں:۔

"اے یعقوب کے سردارو! اور بنی اسرائیل کے قاضیو! تم وہ ہو جو نیکی سے کینہ رکھتے ہیں اور بدی کو پیار کرتے ہیں، جو لوگوں کا پوست ان پر کھینچتے ہیں اور ان کی ہڈیوں کو توڑتے ہیں اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں" (۳ : ۲-۳)

"تم کہ عدالت سے عداوت رکھتے ہو، اور ساری راستی کو الٹا دیتے ہو، اس بات کو سنو! تم صیہون کو خوں ریزی سے اور یروشلم کو بے انصافی سے تعمیر کرتے ہو۔ اس کے سردار رشوت لے کر عدالت کرتے ہیں اور اس کے کاہن اجرت لے کر تعلیم دیتے ہیں اور اس کے غیب گو نقد لے کر رمالی کرتے ہیں۔" (۳ : ۹-۱۱)

متذکرہ بیانات کا ماحصل

انبیائے بنی اسرائیل کے ان اقوال سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں یہودیوں سے شریعت کی اصلی روح یعنی ایمان، صداقت، دیانت، عدل، انصاف اور پاکیزگیٔ اخلاق رخصت ہو چکی تھی۔ حرام خوری حرص و طمع، ظلم و جفا اور بے حیائی و بدکاری نے ساری قوم کو گھیر لیا تھا۔ ان کے حاکم ظالم۔ ان کے پیشوا ریاکار، ان کے سردار خائن اور ان کے علما معصیت پیشہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے شریعت کے الفاظ اور ظاہری رسوم و شعائر ہی کو اصل شریعت سمجھ لیا تھا اور اس معنوی حقیقت کو فراموش کر دیا تھا جو ہر شریعت حقہ کے احکام میں مقصودِ اصلی ہوتی ہے۔

انبیاء کی مساعیٔ اصلاح

اس روز افزوں پستی و ظاہر پرستی کو دیکھ کر مسیح سے بہت پہلے بنی اسرائیل کے انبیاء اصلاح کی کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے مواعظ و نصائح سے ان کو یہ بھولی ہوئی حقیقت یاد دلانی شروع کر دی تھی کہ خدا محض قربانیوں اور دعاؤں سے خوش نہیں ہوتا، بلکہ صداقت، ترحّم اور حسنِ معاملت سے خوش ہوتا ہے اور اس کی مہربانی حاصل کرنے کے لیے عفو و درگزر اور محبت و ایثار کی ضرورت ہے۔ چنانچہ بائیبل میں انبیاء متاخرین کے ایسے نصائح ہم کو بکثرت ملتے ہیں۔ یسعیاہ نبی فرماتے ہیں:۔

"خداوند فرماتا ہے تمھارے ذبیحوں کی کثرت سے مجھے کیا کام؟ میں مینڈھوں کی سوختنی قربانیوں اور

فربہ بچھڑوں کی چربی سے سیر ہو چکا ہوں۔ میں بیلوں اور بھیڑوں اور بکریوں کا لہو نہیں چاہتا...... اب میرے سامنے جھوٹے نذرانے مت لاؤ، لوبان سے مجھے نفرت ہے، اور نوچندی اور سبت اور جماعتِ عید سے بھی، کیونکہ میں عید اور بے دینی دونوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا جی تمھاری نوچندیوں اور تمھاری عیدوں سے بیزار ہے۔ وہ مجھ پر وبال ہیں۔ میں ان کے اٹھانے سے تھک گیا۔ جب تم اپنے ہاتھ پھیلاؤ گے میں تم سے اعراض کروں گا، جب تم دعاؤں پر دعائیں مانگو گے تو میں نہ سنوں گا کیونکہ تمھارے ہاتھ تو لہو سے بھرے ہوئے ہیں۔ اپنے تئیں دھو کر پاک کرو۔ اپنے برے کاموں کو میرے سامنے سے دور کرو۔ بدکاری سے باز آؤ۔ نیکوکاری سیکھو۔ انصاف کے پیرو بنو۔ مظلوموں کی مدد کرو۔ یتیموں کی فریاد رسی کرو۔ بیوہ عورتوں کے حامی بنو۔ .... اگر تم راضی اور فرمانبردار بنو گے تو زمین سے اچھے پھل کھاؤ گے اور اگر انکار کرو گے اور بغاوت اختیار کرو گے تو تلوار کا لقمہ بن جاؤ گے" (۱ : ۱۱-۲۰)

ایک دوسرے موقع پر یسعیاہ نبی عبادات و اعمال کی معنوی روح اور فضیلتِ اخلاقی کا درس اس طرح دیتے ہیں:-

"تم اس مقصد سے روزہ رکھتے ہو کہ لڑائی جھگڑا کرو اور خباثت کے مکے مارو۔ اس طرح روزہ جیسا کہ آج کل تم رکھتے ہو، مطلوب نہیں ہے۔ کیا یہی وہ روزہ ہے جو مجھ کو پسند ہے؟ ایسا دن جس میں آدمی اپنی جان کو فضول دکھ دے اور اپنے سر کو جھاؤ کی طرح جھکا دے اور ٹاٹ اور راکھ کی طرح بچھا دے؟ کیا تم اس کو روزہ اور خدا کا منظورِ نظر دن کہو گے؟ کیا وہ روزہ جو میں چاہتا ہوں یہ نہیں ہے کہ ظلم کی زنجیریں توڑی جائیں، جوئے کے بندھن کھولے جائیں، مظلوموں کو آزاد کیا جائے، بلکہ ہر ایک جوئے کو توڑ ڈالا جائے؟ کیا یہ نہیں کہ تو اپنی روٹی بھوکوں کو کھلائے اور مسکینوں کو جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں پناہ دے اور جب کسی کو ننگا دیکھے تو اسے پہنا دے، اور تو اپنے ہمجنسوں سے منہ نہ چھپائے؟ .... اگر تو اپنے دل کو بھوکے کی طرف مائل کرے اور آزردہ دل کو سیر کرے تو تیرا نور تاریکی میں طلوع کرے گا، اور تیری تیرگی نصف النہار کی طرح چمک اٹھے گی" (۵۸ : ۴-۱۰)

ایک اور نبی حضرت میکاہ اسی روحانی تعلیم کی اس طرح تجدید کرتے ہیں:-

"میں کیا لے کے خداوند کے حضور میں جاؤں گا؟ کیونکر خدائے تعالیٰ کو سجدہ کروں؟ کیا سوختنی

> قربانیوں اور یک سالہ بچھڑوں کو لے کر اس کے آگے جاؤں گا؟ کیا خداوند ہزاروں مینڈھوں سے یا تیل کی دس دس ہزار نہروں سے خوش ہوگا؟ کیا میں اپنے پہلوٹھے کو اپنے گناہ کے عوض، اپنے پیٹ کے پھل کو اپنی روح کی خطا کے عوض دے سکوں گا؟ نہیں اے انسان، اس نے تجھے وہ راہ دکھادی ہے جو نیک ہے۔ خداوند تجھ سے اس کے سوا اور کیا چاہتا ہے کہ تو انصاف کرے، رحم دلی کو پیار کرے اور اپنے خدا کے ساتھ فروتنی سے پیش آئے۔" (۶ : ۶ - ۸)

یہ تعلیم سات صدیوں تک بہرے کانوں سے ٹکرا کر واپس آتی رہی۔ بنی اسرائیل کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ ان میں جو اخلاقی مفاسد جڑ پکڑ گئے تھے انھیں دور کرنے کے لیے ایک زیادہ طاقتور مصلح کی ضرورت تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کو مبعوث فرمایا اور انھوں نے اسی میکاہ اور یسعیاہ والی تعلیم کو نئے جوش اور نئی روح کے ساتھ پیش کیا۔ انبیاء سابقین کی طرح ان کی تعلیم بھی شریعت موسویہ کو منسوخ کرنے اور اس کی جگہ کوئی الگ مذہب قائم کرنے کے لیے نہیں تھی، بلکہ اُس کا مقصد صرف اس کمی کو پورا کرنا تھا جو موسوی شریعت میں باقی رہ گئی تھی، اور اُس اخلاقی فضیلت کی روح کو ملتِ یہود میں پھونکنا تھا جس کی وہ ضرورت مند تھی۔ اس وقت یہودی اخلاق میں راست بازی، دیانت، حلم، عفو، زہد، قناعت، بیرچشمی، خداترسی، رحم، فروتنی اور ایثار کی کمی تھی۔ وہ حد سے زیادہ طماع، دنیا پرست، بندۂ غرض اور دَنِیُّ الطبع ہو گئے تھے۔ ان میں دینداری کی روح باقی نہ رہی تھی جو انسانیت کی جان ہے۔ (۵۲)

فصل ۲

انبیاء کی مسلسل تنبیہات

تنبیہ جو بار بار کی جاتی رہی

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ (اعراف۔ آیت ۱۶۷)

ترجمہ: "اور یاد کرو جب تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے۔"

یہ تنبیہ بنی اسرائیل کو تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح سے مسلسل کی جا رہی تھی۔ چنانچہ یہودیوں کے مجموعۂ کتب مقدسہ میں یسعیاہ اور یرمیاہ اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کی تمام کتابیں اسی تنبیہ پر مشتمل ہیں۔ پھر یہی تنبیہ مسیح علیہ السلام نے انھیں کی جیسا کہ اناجیل میں ان کی متعدد تقریروں سے ظاہر ہے۔ آخر میں قرآن نے ان کی توثیق کی اب یہ بات قرآن اور اس سے پہلے صحیفوں کی صداقت پر ایک بیّن شہادت ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا ہے جس میں یہودی قوم دنیا میں کہیں نہ کہیں روندی اور پامال نہ جاتی رہی ہو؎ (۵۲)

؎ ریاست "اسرائیل" ان کی اپنی سعی کا نتیجہ نہیں بلکہ دوسروں کی مدد سے قائم ہے

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (آل عمران۔ ۱۱۲)

ترجمہ: "ان پر ذلت تھوپ دی گئی جہاں بھی وہ پائے جائیں بجز اس کے کہ کہیں ان کو اللہ کی طرف سے اور انسانوں کی طرف سے تحفظ کی ضمانت مل جائے۔"

پوری تاریخ یہی بتاتی ہے کہ وقتاً فوقتاً دنیا کے کسی گوشے میں کوئی نہ کوئی طاقت ایسی اٹھتی رہی ہے جو یہودیوں کو خوب کھدیڑتی رہی۔ اور جہاں کہیں بھی وہ بخیریت رہے ہیں اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ اللہ کے دیے ہوئے مواقع کی بنا پر کسی دوسرے ہی انسانی گروہ کی حمایت میں آجانے کی وجہ سے رہے ہیں۔ موجودہ یہودی ریاست بھی برطانیہ اور امریکہ کی حمایت (باقی برصفحہ)

دو فسادوں کے بارے میں انتباہ

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَ
لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًاہ (بنی اسرآئیل - آیت ۴)

ترجمہ: "ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فسادِ عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔"

حضرت داؤدؑ کی زبان سے اوّلین تنبیہ

بائبل کے مجموعۂ کتب مقدسہ میں یہ تنبیہات مختلف مقامات پر ملتی ہیں۔ پہلے فساد اور اس کے برے نتائج پر بنی اسرائیل کو زبور، یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقی ایل میں متنبہ کیا گیا ہے، اور دوسرے فساد اور اس کی سخت سزا کی پیش گوئی حضرت مسیحؑ نے کی ہے جو متی اور لوقا کی انجیلوں میں موجود ہے۔ ذیل میں ہم ان کتابوں کی متعلقہ عبارتیں نقل کرتے ہیں تاکہ قرآن کے اس بیان کی پوری تصدیق ہو جائے۔

پہلے فساد کے ظہور پر تباہی کی خبر

پہلے فساد پر اوّلین تنبیہ حضرت داؤدؑ نے کی تھی جس کے الفاظ یہ ہیں

"انھوں نے ان قوموں کو ہلاک نہ کیا جیسا خداوند نے ان کو حکم دیا تھا، بلکہ ان قوموں کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہی میں قائم ہوئی ہے اور باقی ہے۔ یہ حمایت جس وقت بھی ہٹے گی اس ریاست کا حشر دنیا دیکھ لے گی۔ میرا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قوم کو فنا نہیں کرنا چاہتا بلکہ نمونۂ عبرت بنا کر باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس پر مسلسل عذاب کا کوڑا ہی برستا رہتا تو یہ کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اس کے باقی رہنے کا یہ انتظام کر دیا ہے کہ کہیں وہ پٹتی جاتی ہے تو کہیں اسے پناہ مل جاتی ہے۔ اس طرح یہ ڈھائی ہزار برس سے لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی کے مصداق اس دنیا میں جیے جا رہی ہے۔ (۵۴)

لوگوں کے دل میں یہ شک گزرنے لگا ہے کہ یہ بات (اسرائیلی ریاست کا قیام) قرآن کی پیشنگوئی کے خلاف ہے۔ لیکن یہ ریاست اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ امریکہ، انگلستان اور فرانس کے سہارے قائم ہوئی ہے اور دنیا بھر کے یہودی اس چھوٹے سے خطے میں سمٹ سمٹ کر جمع ہو رہے ہیں۔ جس روز بھی یہ مغربی طاقتیں کسی بڑی جنگ میں الجھ کر اسرائیل کی حمایت کے قابل نہ رہیں گی، وہی دن ان کے لیے پیغام موت لے کر آئے گا اور گرد و پیش کی عرب آبادی اس گندگی کے پلندے کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دے گی۔ بظاہر تو یہ یہودیوں کی کامیابی نظر آتی ہے کہ انھوں نے مغربی قوموں کی مدد سے عرب کی سرزمین میں زبردستی ایک قومی وطن حاصل کیا ہے۔ مگر دراصل یہ ان کے لیے ایک بہت بڑے عذاب کی تمہید ہے۔ (تنقیحات ص ۶۹)

مل گئے اور ان کے سے کام سیکھ گئے اور ان کے بتوں کی پرستش کرنے لگے جو ان کے لیے پھندا بن گئے۔ بلکہ انھوں نے اپنی بیٹیوں کو شیاطین کے لیے قربان کیا اور معصوموں کا، یعنی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا خون بہایا...... اس لیے خداوند کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی میراث سے نفرت ہو گئی اور اس نے ان کو قوموں کے قبضے میں کر دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمراں بن گئے۔" (باب ۱۰۶- آیات ۳۴-۴۱)

اس عبارت میں ان واقعات کو جو بعد میں ہونے والے تھے، بصیغۂ ماضی بیان کیا گیا ہے گویا کہ وہ ہو چکے۔ یہ کتبِ آسمانی کا خاص اندازِ بیان ہے۔

پھر جب یہ فسادِ عظیم رونما ہو گیا تو اس کے نتیجے میں آنے والی تباہی کی خبر حضرت یسعیاہ نبی اپنے صحیفے میں یوں دیتے ہیں:

"آہ، خطاکار گروہ، بدکرداری سے لدی ہوئی قوم، بدکرداروں کی نسل، مکار اولاد، جنھوں نے خداوند کو ترک کیا، اسرائیل کے قدوس کو حقیر جانا اور گمراہ و برگشتہ ہو گئے، تم کیوں زیادہ بغاوت کرکے اور مار کھاؤ گے؟" (باب ۱- آیت ۴-۵)

"وفادار بستی کیسی بدکار ہو گئی! وہ تو انصاف سے معمور تھی اور راستبازی اس میں بستی تھی لیکن اب خونی رہتے ہیں...... تیرے سردار گردن کش اور چوروں کے ساتھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک رشوت دوست اور انعام طلب ہے۔ وہ یتیموں کا انصاف نہیں کرتے اور بیواؤں کی فریاد ان تک نہیں پہنچتی۔ اس لیے خداوند ربُّ الافواج اسرائیل کا قادر یوں فرماتا ہے کہ آہ، میں ضرور اپنے مخالفوں سے آرام پاؤں گا اور اپنے دشمنوں سے انتقام لوں گا۔" (باب ۱- آیت ۲۱-۲۴)

"وہ اہلِ مشرق کی رسوم سے پُر ہیں اور فلستیوں کی مانند شگون لیتے اور بیگانوں کی اولاد کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں...... اور ان کی سرزمین بتوں سے بھی پُر ہے وہ اپنے ہی ہاتھوں کی صنعت، یعنی اپنی ہی انگلیوں کی کاریگری کو سجدہ کرتے ہیں۔" (باب ۲- آیت ۶-۸)

"اور خداوند فرماتا ہے، چونکہ صیہون کی بیٹیاں (یعنی یروشلم کی رہنے والیاں) متکبر ہیں اور گردن کشی اور شوخ چشمی سے خراماں ہوتی اور اپنے پاؤں سے نازرفتاری کرتی اور گھنگھرو بجاتی جاتی ہیں اس لیے خداوند صیہون کی بیٹیوں کے سر گنجے اور ان کے بدن بے پردہ کر دے گا۔

...... تیرے بہادر نذرِ تیغ ہوں گے اور تیرے پہلوان جنگ میں قتل ہوں گے۔ اس کے پھاٹک ماتم اور نوحہ کریں گے اور وہ اجاڑ ہو کر خاک پر بیٹھے گی۔" (باب ۳۔ آیت ۱۶-۲۶)

"اب دیکھ، خداوند دریائے فرات کے سخت شدید سیلاب، یعنی شاہ اسور (اسیریا) اور اس کی ساری شوکت کو ان پر چڑھا لائے گا اور وہ اپنے سب نالوں پر اور اپنے سب کناروں پر بہہ نکلے گا۔" (باب ۸۔ آیت ۷)

"یہ باغی لوگ اور جھوٹے فرزند ہیں جو خدا کی شریعت کو سننے سے انکار کرتے ہیں، جو غیب بینوں سے کہتے ہیں کہ غیب بینی نہ کرو، اور نبیوں سے کہ ہم پر سچی نبوتیں ظاہر نہ کرو۔ ہم کو خوشگوار باتیں سناؤ اور ہم سے جھوٹی نبوت کرو .... پس اسرائیل کا قدوس یوں فرماتا ہے کہ چونکہ تم اس کلام کو حقیر جانتے ہو اور ظلم اور کجروی پر بھروسا کرتے ہو اور اسی پر قائم ہو۔ اس لیے یہ بدکرداری تمھارے لیے ایسی ہوگی جیسے پھٹی ہوئی دیوار جو گرا چاہتی ہے .... وہ اسے کمہار کے برتن کی طرح توڑ ڈالے گا۔ اسے بے دریغ چکنا چور کرے گا۔ اس کے ٹکڑوں میں ایک ٹھیکرا بھی ایسا نہ ملے گا جس پر چولہے میں سے آگ یا حوض سے پانی لیا جائے۔" (باب ۳۰۔ آیت ۹-۱۴)

آخری لمحے پر یرمیاہ نبی کی آواز

پھر جب سیلاب کے بند بالکل ٹوٹنے کو تھے تو یرمیاہ نبی کی آواز بلند ہوئی اور انھوں نے کہا:

"خداوند یوں فرماتا ہے کہ تمھارے باپ دادا نے مجھ میں کون سی بے انصافی پائی جس کے سبب سے وہ مجھ سے دور ہو گئے اور بُطلان کی پیروی کر کے باطل ہوئے؟ ...... میں تم کو باغوں والی زمین میں لایا کہ تم اس کے میوے اور اس کے اچھے پھل کھاؤ۔ مگر جب تم داخل ہوئے تو تم نے میری زمین کو ناپاک کر دیا اور میری میراث کو مکروہ بنایا ...... مدت ہوئی کہ تو نے اپنے جوئے کو توڑ ڈالا اور اپنے بندھنوں کے ٹکڑے کر ڈالے اور کہا کہ میں تابع نہ رہوں گی۔ ہاں، ہر ایک اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے تو لیٹ گئی (یعنی ہر طاقت کے آگے جھکی اور ہر بت کو سجدہ کیا) .... جس طرح چور پکڑا جانے پر رسوا ہوتا ہے اسی طرح اسرائیل کا گھرانا رسوا ہوا۔ وہ اور اس کے بادشاہ اور امرا اور کاہن اور (جھوٹے) نبی، جو لکڑی سے کہتے ہیں کہ تو میرا باپ ہے اور پتھر سے کہ تو نے مجھے جنم دیا، انھوں نے میری طرف منہ نہ کیا بلکہ پیٹھ کی، پر اپنی مصیبت کے وقت

وہ کہیں گے کہ اُٹھ کر ہم کو بچا۔ لیکن تیرے وہ بت کہاں ہیں جن کو تو نے اپنے لیے بنایا؟ اور وہ تیری مصیبت کے وقت تجھ کو بچا سکتے ہیں تو اٹھیں، کیونکہ اے یہوداہ! جتنے تیرے شہر ہیں اتنے ہی تیرے معبود ہیں۔" (باب ۲- آیت ۵-۲۸)

"خداوند نے مجھ سے فرمایا کیا تو نے دیکھا کہ برگشتہ اسرائیل (یعنی سامریہ کی اسرائیلی ریاست) نے کیا کیا؟ وہ ہر ایک اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک درخت کے نیچے گئی اور وہاں بدکاری (بت پرستی) کی.......... اور اس کی بے وفا بہن یہوداہ (یعنی یروشلم کی یہودی ریاست) نے یہ حال دیکھا پھر میں نے دیکھا کہ جب برگشتہ اسرائیل کی زناکاری (یعنی شرک) کے سبب سے میں نے اس کو طلاق دے دی اور اسے طلاق نامہ لکھ دیا (یعنی اپنی رحمت سے محروم کر دیا) تو بھی اس کی بے وفا بہن یہوداہ نہ ڈری، بلکہ اس نے بھی جا کر بدکاری کی اور اپنی بدکاری کی برائی سے زمین کو ناپاک کیا اور پتھر اور لکڑی کے ساتھ زناکاری (یعنی بت پرستی) کی (باب ۳- آیت ۶-۹)

"یروشلم کے کوچوں میں گشت کرو اور دیکھو اور دریافت کرو اور اس کے چوکوں میں ڈھونڈو، اگر کوئی آدمی وہاں ملے جو انصاف کرنے والا اور سچائی کا طالب ہو تو میں اسے معاف کروں گا... ..... میں تجھے کیسے معاف کروں، تیرے فرزندوں نے مجھ کو چھوڑا اور ان کی قسم کھائی جو خدا نہیں ہیں۔ جب میں نے ان کو سیر کیا تو انھوں نے بدکاری کی اور پرے باندھ کر قحبہ خانوں میں اکٹھے ہو گئے وہ پیٹ بھرے گھوڑوں کی مانند ہوئے، ہر ایک صبح کے وقت اپنے پڑوسی کی بیوی پر ہنہنانے لگا۔ خدا فرماتا ہے کیا میں ان باتوں کے لیے سزا نہ دوں گا اور کیا میری روح ایسی قوم سے انتقام نہ لے گی؟" (باب ۵- آیت ۱-۹)

"اے اسرائیل کے گھرانے! دیکھ میں ایک قوم کو دور سے تجھ پر چڑھا لاؤں گا۔ خداوند فرماتا ہے وہ زبردست قوم ہے۔ وہ قدیم قوم ہے۔ وہ ایسی قوم ہے جس کی زبان تو نہیں جانتا اور اس کی بات کو تو نہیں سمجھتا۔ ان کے ترکش کھلی قبریں ہیں۔ وہ سب بہادر مرد ہیں۔ وہ تیری فصل کا اناج اور تیری روٹی جو تیرے بیٹوں، بیٹیوں کے کھانے کی تھی کھا جائیں گے۔ تیرے گائے بیل اور تیری بکریوں کو چٹ کر جائیں گے۔ تیرے انگور اور انجیر نگل جائیں گے۔ تیرے مضبوط شہروں کو جن پر تیرا بھروسہ ہے تلوار سے ویران کر دیں گے۔" (باب ۵- آیت ۱۵-۱۷)

“اس قوم کی لاشیں ہوائی پرندوں اور زمین کے درندوں کی خوراک ہوں گی اور اُن کو کوئی نہ ہنکائے گا۔ میں یہوداہ کے شہروں اور یروشلم کے بازاروں میں خوشی اور شادمانی کی آواز، دولہا اور دلہن کی آواز موقوف کروں گا کیوں کہ یہ ملک ویران ہو جائے گا۔” (باب ۷۔ آیت ۳۳-۳۴)

“ان کو میرے سامنے سے نکال دے کہ چلے جائیں اور جب وہ پوچھیں کہ ہم کدھر جائیں تو ان سے کہنا کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ جو موت کے لیے ہیں وہ موت کی طرف، جو تلوار کے لیے ہیں وہ تلوار کی طرف اور جو کال کے لیے ہیں وہ کال کو اور جو اسیری کے لیے ہیں وہ اسیری میں” (باب ۱۵۔ آیت ۲-۳)

حزقی ایل نبی کا یہود سے خطاب

پھر عین وقت پر حزقی ایل نبی اٹھے اور انھوں نے یروشلم کو خطاب کر کے کہا۔

“اے شہر، تو اپنے اندر خونریزی کرتا ہے تاکہ تیرا وقت آجائے اور تو اپنے لیے بت بناتا ہے تاکہ تجھے ناپاک کریں ۔۔۔۔۔۔ دیکھ اسرائیل کے امراء سب کے سب جو تجھ میں ہیں مقدور بھر خونریزی پر مستعد تھے۔ تیرے اندر انھوں نے ماں باپ کو حقیر جانا۔ تیرے اندر انھوں نے پردیسیوں پر ظلم کیا۔ تیرے اندر انھوں نے یتیموں اور بیواؤں پر ستم کیا۔ تو نے میری پاک چیزوں کو ناپاک جانا اور میرے سبتوں کو ناپاک کیا۔ تیرے اندر وہ ہیں جو چغل خوری کر کے خون کرواتے ہیں۔ تیرے اندر وہ ہیں جو بتوں کی قربانی سے کھاتے ہیں، تیرے اندر وہ ہیں جو فسق و فجور کرتے ہیں۔ تیرے اندر وہ بھی ہیں جنھوں نے اپنے باپ کی حرم شکنی کی۔ تجھ میں انھوں نے اس عورت سے جو ناپاک حالت میں تھی مباشرت کی۔ کسی نے دوسرے کی بیوی سے بدکاری کی، کسی نے اپنی بہو سے بدذاتی کی، اور کسی نے اپنی بہن، اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے اندر رسوا کیا۔ تیرے اندر انھوں نے خونریزی کے لیے رشوت خوری کی۔ تو نے بیاج اور سود لیا اور ظلم کر کے اپنے پڑوسی کو لوٹا اور مجھے فراموش کیا ۔۔۔۔۔۔ کیا تیرے ہاتھوں میں زور رہوگا۔ جب میں تیرا معاملہ فیصل کروں گا ۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔

ہاں میں تجھ کو قوموں میں تتر بتر کروں گا اور تیری گندگی تجھ میں سے نابود کر دوں گا اور تو قوموں کے سامنے اپنے آپ میں ناپاک ٹھہرے گا اور معلوم کرے گا کہ میں خداوند ہوں۔”

(باب ۲۲۔ آیت ۳-۱۶)

یہ تھیں وہ تنبیہات جو بنی اسرائیل کو پہلے فساد عظیم کے موقع پر کی گئیں۔

دوسرے فساد کے متعلق حضرت عیسیٰؑ کا انتباہ

پھر دوسرے فسادِ عظیم[1] اور اس کے ہولناک نتائج پر حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو خبردار کیا۔ متی باب ۲۳ میں آنجناب کا ایک مفصل خطبہ درج ہے جس میں وہ اپنی قوم کے شدید اخلاقی زوال پر تنقید کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

> "اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتا اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتا ہے، کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں۔ مگر تو نے نہ چاہا۔ دیکھو تمہارا گھر تمہارے لیے ویران چھوڑا جاتا ہے۔" آیت (۳۷-۳۸)
>
> "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے گا" (باب ۲۴۔ آیت ۲)

پھر جب رومی حکومت کے اہل کار حضرت مسیحؑ کو صلیب دینے کے لیے جا رہے تھے اور لوگوں کی ایک بھیڑ جس میں عورتیں بھی تھیں، روتی پیٹتی ان کے پیچھے جا رہی تھیں، تو انھوں نے آخری خطاب کرتے ہوئے مجمع سے فرمایا:

> "یروشلم کی بیٹیو! میرے لیے نہ روؤ بلکہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے روؤ، کیونکہ دیکھو، وہ دن آتے ہیں جب کہیں گے کہ مبارک ہیں وہ بانجھیں اور وہ پیٹ جو نہ جنے اور وہ چھاتیاں جنھوں نے دودھ نہ پلایا۔ اس وقت وہ پہاڑوں سے کہنا شروع کریں گے کہ ہم پر گر پڑو اور ٹیلوں سے کہ ہمیں چھپا لو۔" (لوقا۔ باب ۲۳۔ آیت ۲۸-۳۰) (۵۵)

---

[1] اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ (مرتبین)

فصل ۳

یہود کے ایمانی اور اخلاقی بگاڑ پر قرآن کی مزید توضیحات

اس فصل میں جو قرآنی آیات لی گئی ہیں، ان میں یہود پر کیے جانے والے تبصرے کا ایک خصوصی تعلق حضور نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہے۔ مگر دوسری طرف چونکہ ان میں یہود کے تاریخی بگاڑ کا وضاحت سے ذکر ہے، اس وجہ سے ان آیات کو اس باب میں لیا گیا ہے۔ رہا یہود کا وہ کردار جس کا واقعاتی لحاظ سے حضور کی دعوت اور کام سے براہ راست تعلق ہے۔ انھیں صحیح جگہ پہ باب۔ ۹ میں لیا گیا ہے۔ (مرتبین)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ
اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (آلِ عمران - آیت ۹۹)

ترجمہ: "اے نبی کہو، اے اہلِ کتاب! یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے بھی تم اللہ کی راہ سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے، حالانکہ تم خود (اس کے راہِ راست ہونے پر) گواہ ہو۔ تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔"

یہودی علماء اور درویشوں کی لپٹیاں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ
بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (التوبہ - آیت ۳۴)

ترجمہ: "اے ایمان لانے والو! ان اہلِ کتاب کے اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انھیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔"

یعنی ظالم صرف یہی ستم نہیں کرتے کہ فتوے بیچتے ہیں، رشوتیں کھاتے ہیں، نذرانے لوٹتے ہیں،

لیے ایسے مذہبی ضابطے اور مراسم ایجاد کرتے ہیں جن سے لوگ اپنی نجات ان سے خریدیں اور اُن کا مرنا جینا اور شادی اور غم کچھ بھی ان کو کھلائے بغیر نہ ہو سکے، اور وہ اپنی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کا ٹھیکیدار ان کو سمجھ لیں۔ بلکہ مزید براں اپنی انہی اغراض کی خاطر یہ حضرات خلقِ خدا کو گمراہیوں کے چکر میں پھنسائے رکھتے ہیں اور جب کبھی کوئی دعوتِ حق اصلاح کے لیے اٹھتی ہے تو سب سے پہلے یہی اپنی عالمانہ فریب کاریوں اور مکاریوں کے حربے لے لے کر اس کا راستہ روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (٥٦)

یہود میں کثرتِ سوال کی بیماری

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ (البقرۃ۔ آیت ۱۰۸)

ترجمہ: "پھر کیا اے مسلمانو، تم اپنے رسول سے اس قسم کے سوالات اور مطالبے کرنا چاہتے ہو، جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے کیے جا چکے ہیں؟"

یہودی موشگافیاں کر کر کے طرح طرح کے سوالات مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور انھیں اکساتے تھے کہ اپنے نبی سے یہ پوچھو اور یہ پوچھو اور یہ پوچھو۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا ہے کہ اس معاملے میں یہودیوں کی روش اختیار کرنے سے بچو۔ اسی چیز پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی مسلمانوں کو بار بار متنبہ فرمایا کرتے تھے کہ قیل و قال سے اور بال کی کھال نکالنے سے پچھلی امتیں تباہ ہو چکی ہیں۔ تم اس سے پرہیز کرو۔ جن سوالات کو اللہ اور اس کے رسول نے نہیں چھیڑا ان کی کھوج میں نہ لگو۔ جو حکم تمھیں دیا جاتا ہے اس کی پیروی کرو اور جن امور سے منع کیا جاتا ہے ان سے رک جاؤ۔ دور از کار باتیں چھوڑ کر کام کی باتوں پر توجہ صرف کرو۔ (٥٧)

علمِ کتاب اللہ کو مقید کرنے کا جرم

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝

(البقرۃ۔ آیت ۱۵۹)

ترجمہ: "جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں درآنحالیکہ ہم انھیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔"

علماءِ یہود کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انھوں نے کتاب اللہ کے علم کی اشاعت کرنے کے بجائے اس کو ربیوں اور مذہبی پیشہ وروں کے ایک محدود طبقے میں مقیّد کر رکھا تھا اور عامّۂ خلائق تو درکنار، خود یہودی عوام تک اس کی ہوا نہ لگنے دیتے تھے، پھر جب عام جہالت کی وجہ سے ان کے اندر گمراہیاں پھیلیں تو علماء نے نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوشش نہ کی بلکہ وہ عوام میں اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے ہر اس ضلالت اور بدعت کو، جس کا رواج عام ہو جاتا، اپنے قول و عمل سے یا اپنے سکوت سے الٰہی سندِ جواز عطا کرنے لگے۔ (۵۸)

کلامِ الٰہی میں تحریف

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ (البقرہ۔ آیت ۷۵)

ترجمہ: "اے مسلمانو! اب کیا ان لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمھاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی۔"

"ایک گروہ" سے مراد ان کے علماء اور حاملینِ شریعت ہیں۔ "کلام اللہ" سے مراد تورات، زبور اور وہ دوسری کتابیں ہیں جو ان لوگوں کو ان کے انبیاء کے ذریعے سے پہنچیں۔ "تحریف" کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اس کے اصل معنی و مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنی پہنا دینا جو قائل کے منشا کے خلاف ہوں۔ نیز الفاظ میں تغیر و تبدّل کرنے کو بھی تحریف کہتے ہیں۔ علماء بنی اسرائیل نے یہ دونوں طرح کی تحریفیں کلامِ الٰہی میں کی ہیں۔ (۵۹)

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ط (البقرہ۔ آیت ۷۹)

ترجمہ: "پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔"

یعنی ان کے علماء نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ کلامِ الٰہی کے معنی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو، بلکہ یہ بھی کیا کہ بائیبل میں اپنی تفسیروں کو، اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اوہام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں

کو اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلامِ الٰہی کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی فلسفہ، ہر مُفسّر کی تاویل، ہر متکلم کا الٰہیاتی عقیدہ، اور ہر فقیہ کا قانونی اجتہاد جس نے مجموعۂ کتبِ مقدسہ (بائیبل) میں جگہ پالی اللہ کا قول (WORD OF GOD) بن کر رہ گیا، اس پر ایمان لانا فرض ہو گیا اور اس سے پھرنے کے معنی دین سے پھر جانے کے ہو گئے۔ (۶۰)

تحریفِ کلمات کی تین صورتیں

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (النساء۔ آیت ۴۶)

ترجمہ: "جو لوگ یہودی بن گئے ہیں ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں"

یہ نہیں فرمایا کہ "یہودی ہیں" بلکہ یہ فرمایا کہ "یہودی بن گئے ہیں" کیونکہ ابتداءً وہ بھی مسلمان ہی تھے، جس طرح ہر نبی کی امت اصل میں مسلمان ہوتی ہے مگر بعد میں وہ صرف یہودی بن کر رہ گئے۔

الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دینے کے تین مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ کتاب اللہ کے الفاظ میں ردو بدل کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنی تاویلات سے آیاتِ کتاب کے معنی کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں کی صحبت میں آکر ان کی باتیں سنتے ہیں اور واپس جا کر لوگوں کے سامنے غلط طریقہ سے روایت کرتے ہیں۔ بات کچھ کہی جاتی ہے اور وہ اپنی شرارت سے کچھ کا کچھ بنا کر لوگوں میں مشہور کرتے ہیں تاکہ انھیں بدنام کیا جائے اور ان کے متعلق غلط فہمیاں پھیلا کر لوگوں کو اسلامی جماعت کی طرف آنے سے روکا جائے۔ (۶۱)

کلام اللہ میں الٹ پھیر

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۝ (آل عمران۔ آیت ۷۸)

ترجمہ: "ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے، حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی"

اس کا مطلب اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کتاب الٰہی کے معنی میں تحریف کرتے ہیں یا الفاظ کا الٹ پھیر

کرکے کچھ سے کچھ مطلب نکالتے ہیں۔ لیکن اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو جو ان کے مفاد یا ان کے خود ساختہ عقائد و نظریات کے خلاف پڑتا ہو، زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ (۶۲)

یہود تورات کا تحفّظ نہ کر سکے

عام طور پر لوگ تورات سے مراد بائیبل کے پرانے عہد نامے کی ابتدائی پانچ کتابیں، اور انجیل سے مراد نئے عہد نامے کی چار مشہور انجیلیں لے لیتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ الجھن پیش آتی ہے کہ کیا فی الواقع یہ کتابیں کلامِ الٰہی ہیں؟ اور کیا واقعی قرآن ان سب باتوں کی تصدیق کرتا ہے جو ان میں درج ہیں؟ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ تورات بائیبل کی پہلی پانچ کتابوں کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے اندر مندرج ہے۔

اور انجیل نئے عہد نامہ کی اناجیلِ اربعہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ان کے اندر پائی جاتی ہے۔

دراصل تورات سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے لے کر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دوران میں اُن پر نازل ہوئے۔ اُن میں سے دس احکام تو وہ تھے جو اللہ تعالیٰ نے پتھر کی لوحوں پر کندہ کر کے انھیں دیے تھے۔ باقی ماندہ احکام کو حضرت موسیٰؑ نے لکھوا کر اس کی بارہ نقلیں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو دے دی تھیں اور ایک نقل لاوی کے حوالے کی تھی تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ اسی کتاب کا نام "تورات" تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے بیت المقدس کی پہلی تباہی کے وقت تک محفوظ تھی۔ اس کی ایک کاپی جو بنی لاوی کے حوالے کی گئی تھی پتھر کی لوحوں سمیت، عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی تھی، اور بنی اسرائیل اس کو "توریت" ہی کے نام سے جانتے تھے۔ لیکن اس سے ان کی غفلت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکلِ سلیمانی کی مرمت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن (یعنی ہیکل کے سجادہ نشین اور قوم کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا خِلقیاہ کو ایک جگہ توریت رکھی ہوئی مل گئی اور اس نے ایک عجوبے کی طرح اسے شاہی منشی کو دیا اور شاہی منشی نے اسے لے جا کر بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہے۔ (ملاحظہ ہو ۲۔ سلاطین، باب ۲۲۔ آیت ۸ تا ۱۳) یہی وجہ ہے کہ جب بخت نصر نے یروشلم فتح کیا اور ہیکل سمیت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، تو بنی اسرائیل نے تورات کے وہ اصل نسخے جو ان کے طاقِ نسیاں پر رکھے ہوئے تھے، اور بہت ہی تھوڑی تعداد میں تھے، ہمیشہ کے لیے گم کر دیے۔ پھر جب عزرا کاہن

(عُزَیر) کے زمانے میں بنی اسرائیل کے بچے کھچے لوگ بابل کی اسیری سے واپس یروشلم آ گئے اور دوبارہ بیت المقدس تعمیر ہوا تو عزرا نے اپنی قوم کے لیے چند دوسرے بزرگوں کی مدد سے بنی اسرائیل کی پوری تاریخ مرتب کی جو اب بائیبل کی پہلی ۱۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کے چار باب یعنی خروج، اَحبار، گنتی اور استثناء حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر مشتمل ہیں، اور اس سیرت ہی میں تاریخ نزول کی ترتیب کے مطابق تورات کی وہ آیات بھی حسب موقع درج کر دی گئی ہیں جو عزرا اور ان کے مددگار بزرگوں کو دستیاب ہو سکیں۔ پس دراصل اب تورات ان منتشر اجزا کا نام ہے جو سیرتِ موسیٰ کے اندر بکھرے ہوئے ہیں۔ ہم اُنھیں صرف اس علامت سے پہچان سکتے ہیں کہ اس تاریخی بیان کے دوران جہاں کہیں سیرتِ موسیٰؑ کا مصنف کہتا ہے خدا نے موسیٰؑ سے یہ فرمایا، یا موسیٰؑ نے کہا خداوند تمھارا خدا یہ کہتا ہے، وہاں سے تورات کا ایک جُز شروع ہوتا ہے اور جہاں پھر سیرت کی تقریر شروع ہو جاتی ہے وہاں وہ جُز ختم ہو جاتا ہے۔ بیچ بیچ میں جہاں کہیں کوئی چیز بائیبل کے مصنف نے تفسیر و تشریح کے طور پر بڑھا دی ہے، وہاں ایک آدمی کے لیے یہ تمیز کرنا سخت مشکل ہے کہ آیا یہ اصل تورات کا حصہ ہے یا شرح و تفسیر۔ تاہم جو لوگ کتبِ آسمانی میں بصیرت رکھتے ہیں وہ ایک حد تک صحت کے ساتھ معلوم کر سکتے ہیں کہ ان اجزا میں کہاں کہاں تفسیری اور تشریحی اضافے ملحق کر دیے گئے ہیں۔ (۶۳)

عقیدۂ آخرت میں خرابی

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا
يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ (البقرہ - آیت ۴۸)

ترجمہ: "اور ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔"

بنی اسرائیل کے بگاڑ کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آ گئی تھی۔ وہ اس قسم کے خیالاتِ خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہیں، بڑے بڑے اولیاء، صُلحا اور زُہّاد سے نسبت رکھتے ہیں، ہماری بخشش تو انہی بزرگوں کے صدقے میں ہو جائے گی ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا کیسے پا سکتا ہے۔ انھیں جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے غافل اور گناہوں کے چکر میں مبتلا کر دیا تھا اس لیے نعمت یاد دلانے کے ساتھ ان کی اس غلط فہمی کو دُور کیا

گیا ہے۔ (۶۴)

اُخروی نجات کے متعلق زعمِ اجارہ داری

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ ج وَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (البقرہ ۲- آیت ۶۲)

ترجمہ: "یقین جانو کہ نبی عربی کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اُس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔"

سلسلہ عبارت کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ایمان اور اعمالِ صالحہ کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں ہے کہ کن کن باتوں کو آدمی مانے اور کیا کیا اعمال کرے تو خدا کے ہاں اجر کا مستحق ہو۔ یہ چیزیں اپنے اپنے موقع پر تفصیل کے ساتھ آئیں گی۔ یہاں تو یہودیوں کے اس زعمِ باطل کی تردید مقصود ہے کہ وہ صرف یہودی گروہ کو نجات کا اجارہ دار سمجھتے ہیں۔ وہ اس خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ ان کے گروہ سے اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص رشتہ ہے جو دوسرے انسانوں سے نہیں ہے، لہٰذا جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے وہ خواہ اعمال اور اعتقاد کے لحاظ سے کیسا ہی ہو بہرحال نجات اس کے لیے مقرر ہے اور باقی تمام انسان جو ان کے گروہ سے باہر ہیں وہ صرف جہنم کا ایندھن بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کے ہاں اصل چیز تمہاری یہ گروہ بندیاں نہیں ہیں، بلکہ وہاں جو کچھ اعتبار ہے وہ ایمان اور عمل صالح کا ہے۔ جو انسان بھی یہ چیز لے کر حاضر ہوگا وہ اپنے رب سے اپنا اجر پائے گا۔ خدا کے ہاں فیصلہ آدمی کی صفات پر ہوگا نہ کہ تمہاری مردم شماری کے رجسٹروں پر۔ (۶۵)

قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِندَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ (البقرہ ۲- آیت ۹۴)

ترجمہ: "ان سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر

تمھارے ہی لیے مخصوص ہے، تب تو تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔"

یہ ایک تعریض اور نہایت لطیف تعریض ہے، ان کی دنیا پرستی پر۔ جن لوگوں کو واقعی دارِ آخرت سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے وہ دنیا پر مرے نہیں جاتے اور نہ موت سے ڈرتے ہیں مگر یہودیوں کا حال اس کے برعکس تھا اور ہے۔ (۶۶)

ان کا ایک گروہ آخرت کا منکر تھا

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا (الکہف۔ آیت ۲۱)

ترجمہ: "اس طرح ہم نے اہل شہر کو ان کے (یعنی اصحابِ کہف کے) حال پر مطلع کیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کی گھڑی بے شک آکر رہے گی۔"

سریانی روایت کے مطابق اس زمانے میں وہاں قیامت اور آخرت کے مسئلے پر زور و شور کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اگرچہ رومی سلطنت کے اثر سے عام لوگ مسیحیت قبول کر چکے تھے، جس کے بنیادی عقائد میں آخرت کا عقیدہ بھی شامل تھا، لیکن ابھی تک رومی شرک اور بت پرستی اور یونانی فلسفے کے اثرات کافی طاقت ور تھے جن کی بدولت بہت سے لوگ آخرت سے انکار یا کم از کم اس کے ہونے میں شک کرتے تھے۔ پھر اس شک و انکار کو سب سے زیادہ جو چیز تقویت پہنچا رہی تھی وہ یہ تھی کہ افسس میں یہودیوں کی بڑی آبادی تھی، اور ان میں سے ایک فرقہ (جسے صَدُوقی کہا جاتا تھا) آخرت کا کھلم کھلا منکر تھا۔ یہ گروہ کتاب اللہ (یعنی توراۃ) سے آخرت کے انکار پر دلیل لاتا تھا اور مسیحی علماء کے پاس اس کے مقابلے میں مضبوط دلائل نہ تھے۔ متی، مرقس، لوقا، تینوں انجیلوں میں صدوقیوں اور مسیح علیہ السلام کے اس مناظرے کا ذکر ہمیں ملتا ہے جو آخرت کے مسئلے پر ہوا تھا۔ مگر تینوں نے مسیح علیہ السلام کی طرف سے ایسا کمزور جواب نقل کیا ہے جس کی کمزوری کو خود علمائے مسیحیت بھی تسلیم کرتے ہیں (ملاحظہ ہو متی باب ۱۱۔ آیت ۲۳-۳۲ مرقس باب ۱۲۔ آیت ۱۸-۲۷۔ لوقا باب ۲۰۔ آیت ۲۷-۴۰) اسی وجہ سے منکرینِ آخرت کا پلہ بھاری ہو رہا تھا اور مومنینِ آخرت بھی شک و تذبذب میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے۔ عین اس وقت اصحابِ کہف کے بَعث کا واقعہ پیش آیا اور اس نے بعث بعد الموت کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت بہم پہنچا دیا۔ (۶۷)

بدعملی کے باوجود اُخروی کامرانی کا عقیدہ

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (آل عمران۔ آیت ۷۷)

ترجمہ: "جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اللہ قیامت کے روز نہ ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا، بلکہ ان کے لیے تو سخت دردناک سزا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے ایسے سخت اخلاقی جرائم کرنے کے بعد بھی اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت کے روز بس یہی اللہ کے مقرب بندے ہوں گے۔ انہی کی طرف نظرِ عنایت ہوگی۔ اور جو تھوڑا بہت گناہوں کا میل دنیا میں ان کو لگ گیا ہے وہ بھی بزرگوں کے صدقے میں دھو ڈالا جائے گا۔ حالانکہ دراصل وہاں ان کے ساتھ بالکل برعکس معاملہ ہوگا۔

آخرت میں ہمیں سزا ہوگی بھی تو معمولی ہوگی

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً ۚ (البقرہ۔ آیت ۸۰)

ترجمہ: "وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں ہے الّا یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے، تو مل جائے۔"

یہ یہودیوں کی عام غلط فہمی کا بیان ہے جس میں ان کے عامی اور عالم سب مبتلا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کچھ کریں، بہرحال چونکہ ہم یہودی ہیں، لہٰذا جہنم کی آگ ہم پر حرام ہے، اور بالفرض ہم کو سزا دی بھی گئی تو بس چند روز کے لیے وہاں بھیجے جائیں گے اور پھر سیدھے جنت کی طرف پلٹا دیے جائیں گے۔ (۶۸)

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ (آل عمران۔ آیت ۲۴)

ترجمہ: "ان کا یہ طرزِ عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں آتشِ دوزخ تو ہمیں مَس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز۔ ان کے خودساختہ عقیدوں نے ان کو اپنے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔"

یعنی یہ لوگ اپنے آپ کو خدا کا چہیتا سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ ہم خواہ کچھ کریں بہرحال جنت ہماری ہے۔ ہم اہلِ ایمان ہیں۔ ہم فلاں کی اولاد اور فلاں کی اُمّت اور فلاں کے مرید اور فلاں کے دامن گرفتہ ہیں۔ بھلا دوزخ کی کیا مجال کہ ہمیں چھو جائے اور بالفرض اگر ہم دوزخ میں ڈالے بھی گئے تو بس چند روز وہاں رکھے جائیں گے تاکہ گناہوں کی جو آلائش لگ گئی ہے وہ صاف ہو جائے۔ پھر سیدھے جنت میں پہنچا دیے جائیں گے۔ اسی قسم کے خیالات نے ان کو اتنا جری و بے باک بنا دیا ہے کہ وہ سخت سے سخت جرائم کا ارتکاب کر جاتے ہیں، بدترین گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، کھُلّم کھُلا حق سے انحراف کرتے ہیں، اور ذرا خدا کا خوف ان کے دل میں نہیں آتا۔ (۶۹)

عوام علم سے محروم اور مفروضات میں مگن تھے

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝

(البقرہ - آیت ۷۸)

ترجمہ: ”ان میں ایک دوسرا گروہ اُمّیوں کا ہے جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں، بس اپنی بے بنیاد امیدوں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔“

یہ ان کے عوام کا حال تھا۔ علم کتاب سے کورے تھے۔ کچھ نہ جانتے تھے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں دین کے کیا اصول بتائے ہیں اور شرع کے کیا قواعد سکھائے ہیں اور انسان کی فلاح و خسران کا مدار کن چیزوں پر رکھا ہے۔ اس علم کے بغیر وہ اپنے مفروضات اور اپنی خواہشات کے مطابق گھڑی ہوئی باتوں کو دین سمجھے بیٹھے تھے اور جھوٹی توقعات پر جی رہے تھے۔ (۷۰)

خدا کے چہیتے فرزند

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ
بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ
مَنْ يَّشَآءُ ؕ (المآئدہ ۵ - آیت ۱۸)

ترجمہ: ”یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پوچھو، پھر وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کیے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔“

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ (المائدہ۔ ۸۰)

ترجمہ: ”آج تم ان میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو (اہلِ ایمان کے مقابلہ میں) کفار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں یقیناً بہت برا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے ان کے لیے کی ہے، اللہ ان پر غضب ناک ہو گیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔“

غیر یہودیوں سے جو سلوک چاہیں کریں

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ (اٰل عمران۔ آیت ۷۵)

ترجمہ: ”ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں اُمّیوں (غیر یہودی لوگوں) کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔“

یہ محض یہودی عوام ہی کا جاہلانہ خیال نہ تھا، بلکہ ان کے ہاں کی مذہبی تعلیم بھی یہی کچھ تھی اور ان کے بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کے فقہی احکام ایسے ہی تھے۔ بائبل قرض اور سود کے احکام میں اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان صاف تفریق کرتی ہے (استثناء ۱۵ : ۱ - ۳ - ۲۳ : ۲۰) تلمود میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیلی کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں، مگر غیر اسرائیلی کا بیل اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ کوئی گری پڑی چیز ملے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ گرد و پیش آبادی کن لوگوں کی ہے۔ اگر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیے۔ غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان وہ چیز رکھ لینی چاہیے۔ ربّی شماعیل کہتا ہے کہ اگر اُمّی اور اسرائیلی کا مقدمہ قاضی کے پاس آئے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے مذہبی بھائی کو جتوا سکتا ہو تو اس کے مطابق جتوائے اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے اور اگر اُمّیوں کے قانون کے تحت جتوا سکتا تھا تو اس کے تحت جتوائے اور کہے کہ یہ تمہارا قانون ہے اور اگر دونوں قانون ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس حیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کر سکتا ہو کرے۔ ربّی شموایل کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی ہر غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ (تالمودک مسلینی، پال آئزک ہرشوں، لندن ۱۸۸۰ء صفحات ۳۷، ۲۱۰-۲۲۱) (۷۱)

ان کی اکثریت کا بگاڑ

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ

اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (المائدہ۔ آیت ۸۱)

ترجمہ: "اگر فی الواقع یہ لوگ اللہ اور پیغمبر اور اس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہل ایمان کے مقابلہ میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے۔ مگر ان میں سے بیشتر لوگ خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا اور نبی اور کتاب کے ماننے والے ہوتے ہیں۔ انھیں فطرتاً مشرکین کے مقابلہ میں ان لوگوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی ہوتی ہے جو مذہب میں خواہ ان سے اختلاف ہی رکھتے ہوں مگر بہر حال انہی کی طرح خدا اور سلسلۂ وحی و رسالت کو مانتے ہیں لیکن یہ یہودی عجیب قسم کے اہل کتاب ہیں کہ توحید اور شرک کی جنگ میں کھلم کھلا مشرکین کا ساتھ دے رہے ہیں، اقرارِ نبوت اور انکارِ نبوت کی لڑائی میں علانیہ ان کی ہمدردیاں منکرینِ نبوت کے ساتھ ہیں، اور پھر بھی وہ بلا کسی شرم و حیا کے یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم خدا اور پیغمبروں اور کتابوں کے ماننے والے ہیں۔ (۷۲)

یہودیوں کا اچھا عنصر

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ
وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

(آل عمران - آیت ۱۱۳ - ۱۱۴)

ترجمہ: "سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہِ راست پر قائم ہیں، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور ان کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائیوں کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں۔"

ضابطۂ سبت میں نقب زنی

وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ
اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ
كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ

قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى
رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ
يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا
يَفْسُقُوْنَ ۝ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝

(الاعراف ۔ آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶)

ترجمہ: ”اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے تھی ۔ انھیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں لوگ سبت کے دن احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن اُبھر اُبھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں ۔ اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں ۔ یہ اس لیے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے ۔ اور انھیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے ؟ تو انھوں نے جواب دیا تھا ، کہ ہم یہ سب کچھ تمھارے رب کے حضور معذرت پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں ۔ آخرکار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انھیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا ۔ پھر جب وہ پوری سرکشی کے وہی کام کیے چلے گئے جس سے انھیں روکا گیا تھا ، تو ہم نے کہا کہ بندر ہو جاؤ ذلیل اور خوار ۔“

محققین کا غالب میلان اس طرف ہے کہ یہ مقام اَیْلَہ ، یا اَیْلَات یا اَیْلُوت تھا جس کی جگہ آجکل عَقَبَہ کی مشہور بندرگاہ واقع ہے ، اس کی جائے وقوع بحرِ قُلزُم کی اُس شاخ کے انتہائی سرے پہ ہے جو جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے ۔ بنی اسرائیل کے زمانۂ عروج میں یہ بڑا اہم تجارتی مرکز تھا ۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنے بحرِ قلزم کے جنگی و تجارتی بیڑے کا صدر مقام اسی شہر کو بنایا تھا ۔

جس واقعہ کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اس کے متعلق یہودیوں کی کتبِ مقدسہ میں کوئی ذکر

ہمیں نہیں ملتا۔ اور ان کی تاریخیں بھی اس باب میں خاموش ہیں۔ مگر قرآن مجید میں جس انداز سے اس واقعہ کو بیان اور سورۂ بقرہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے دور میں بنی اسرائیل بالعموم اس واقعہ سے خوب واقف تھے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مدینہ کے یہودیوں نے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے قرآن کے اس بیان پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں کیا۔

"سبت" ہفتے کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ دن بنی اسرائیل کے لیے مقدس قرار دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور اولادِ اسرائیل کے درمیان پشت در پشت تک دائمی عہد کا نشان قرار دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ اس روز کوئی دنیوی کام نہ کیا جائے، گھروں میں آگ تک نہ جلائی جائے، جانوروں اور لونڈی غلاموں تک سے کوئی خدمت نہ لی جائے اور یہ کہ جو شخص اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرے اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن بنی اسرائیل نے آگے چل کر اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی شروع کر دی۔ یرمیاہ نبی کے زمانے میں (جو ۶۲۸ء اور ۵۸۶ء قبل مسیح کے درمیان گزرے ہیں) خاص یروشلم کے پھاٹکوں سے لوگ سبت کے دن مال اسباب لے لے کر گزرتے تھے۔ اس پر نبی موصوف نے خدا کی طرف سے یہودیوں کو دھمکی دی کہ اگر تم لوگ شریعت کی کھلم کھلا خلاف ورزی سے باز نہ آئے تو یروشلم نذرِ آتش کر دیا جائے گا۔ (یرمیاہ ۱۷ : ۲۱ : ۲۴) اسی کی شکایت حزقی ایل نبی بھی کرتے ہیں جن کا دور ۵۹۵ء اور ۵۳۶ء ق م کے درمیان گزرا ہے۔ چنانچہ ان کی کتاب میں سبت کی بے حرمتی کو یہودیوں کے قومی جرائم میں سے ایک بڑا جرم قرار دیا گیا ہے (حزقی ایل ۲۰ : ۱۲ - ۲۴) ان حوالوں سے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید یہاں جس واقعہ کا ذکر کر رہا ہے وہ بھی غالباً اسی دور کا واقعہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ بندوں کی آزمائش کے لیے جو طریقے اختیار فرماتا ہے ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب کسی شخص یا گروہ کے اندر فرماں برداری سے انحراف اور نافرمانی کی طرف میلان بڑھنے لگتا ہے تو اس کے سامنے نافرمانی کے مواقع کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، تاکہ اس کے وہ میلانات جو اندر چھپے ہوئے ہیں کھل کر پوری طرح نمایاں ہو جائیں، اور جن جرائم سے وہ اپنے دامن کو خود داغدار کرنا چاہتا ہے اس سے وہ صرف اس لیے باز نہ رہ جائے کہ ان کے ارتکاب کے مواقع اسے نہ مل رہے ہوں۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اس بستی میں تین قسم کے لوگ موجود تھے۔ ایک وہ جو دھڑلے سے

احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کر رہے تھے، دوسرے وہ جو خود خلاف ورزی نہیں کرتے تھے، مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے تھے اور ناصحوں سے کہتے تھے کہ ان کم بختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل۔ تیسرے وہ جن کی غیرتِ ایمانی حدود اللہ کی کھلم کھلا بے حرمتی کو برداشت نہ کر سکتی تھی اور وہ اس خیال سے نیکی کا حکم اور بدی کے روکنے میں سرگرم تھے کہ شاید وہ مجرم لوگ ان کی نصیحت سے راہِ راست پر آ جائیں، اور اگر وہ راہِ راست نہ اختیار کریں تب بھی ہم اپنی حد تک تو اپنا فرض ادا کر کے خدا کے سامنے اپنی برأت کا ثبوت پیش کر ہی دیں۔ اس صورتِ حال میں جب اس بستی پر اللہ کا عذاب آیا تو قرآن مجید کہتا ہے کہ ان تینوں گروہوں میں سے صرف تیسرا گروہ ہی اس سے بچا یا گیا، کیونکہ اسی نے خدا کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کی فکر کی تھی اور وہی تھا جس نے اپنی برأت کا ثبوت فراہم کر رکھا تھا۔ باقی دونوں گروہوں کا شمار ظالموں میں ہوا اور وہ اپنے جُرم کی حد تک مبتلائے عذاب ہوئے۔

بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے گروہ کے مبتلائے عذاب ہونے کی اور تیسرے گروہ کے نجات پانے کی تصریح کی ہے، لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نجات پانے والوں میں سے تھا، یا مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے۔ پھر ایک روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ وہ پہلے اس بات کے قائل تھے کہ دوسرا گروہ مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے تھا، بعد میں ان کے شاگرد عکرمہ نے ان کو مطمئن کر دیا کہ دوسرا گروہ نجات پانے والوں میں شامل تھا۔ لیکن قرآن کے بیان پر جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابنِ عباس کا پہلا خیال ہی ٹھیک تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی بستی پر خدا کا عذاب آنے کی صورت میں تمام بستی دو ہی گروہوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ ایک وہ جو عذاب میں مبتلا ہو۔ اور دوسرا وہ جو بچا لیا جائے۔ اب اگر قرآن کی تصریح کے مطابق بچنے والا گروہ صرف تیسرا تھا تو لامحالہ پہلے اور دوسرے دونوں گروہ نہ بچنے والوں میں شامل ہوں گے۔ اسی کی تائید مَعْذِرَةً اِلٰی رَبِّکُمْ کے فقرے سے بھی ہوتی ہے جس کی توثیق بعد کے فقرے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرما دی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس بستی میں علانیہ احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ہو رہی ہو وہ ساری کی ساری قابلِ مواخذہ ہوتی ہے، اور اس کا کوئی باشندہ محض اس بنا پر مواخذہ سے بری نہیں ہو سکتا کہ اس نے خود خلاف ورزی نہیں کی، بلکہ اسے خدا کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لازماً اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہو گا، کہ وہ اپنی حدِ استطاعت تک اصلاح اور اقامتِ حق کی کوشش کرتا رہا تھا۔

پھر قرآن اور حدیث کے دوسرے ارشادات سے بھی ہم کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی جرائم کے باب میں اللہ کا قانون یہی ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (ڈرو اُس فتنہ سے جس کے وبال میں خصوصیت کے ساتھ صرف وہی لوگ گرفتار نہیں ہوں گے جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو) اور اس کی تشریح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظہرانیہم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذا فعلوا ذلک عذب اللہ الخاصۃ والعامۃ۔ "یعنی اللہ عز وجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا جب تک عامۃ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بُرے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہارِ ناراضی کرنے پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہارِ ناراضی نہ کریں۔ پھر جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

مزید براں جو آیات اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی پر خدا کا عذاب دو قسطوں میں نازل ہوا تھا۔ پہلی قسط وہ جسے عذاب بئیس (سخت عذاب) فرمایا گیا اور دوسری قسط وہ جس میں نافرمانی پر اصرار کرنے والوں کو بندر بنا دیا گیا۔ ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ پہلی قسط کے عذاب میں پہلے دونوں گروہ شامل تھے اور دوسری قسط کا عذاب صرف پہلے گروہ کو دیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ان اصبتُ فمن اللہ وان اخطأتُ فمن نفسی، واللہ غفور رحیم۔ (٥٣)

قتلِ انبیاء کا جرم

> وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۚ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ (البقرہ۔ آیت ٦١)

ترجمہ: "ذلت و خواری اور پستی و بدحالی ان پر مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے لگے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگے۔ یہ نتیجہ تھا اُن کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ وہ حدودِ شرع سے نکل نکل جاتے تھے"

آیات سے ان کے کفر کی مختلف صورتیں تھیں۔ مثلاً یہ کہ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات میں سے جو بات

اپنے خیالات و خواہشات کے خلاف پائی اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ایک بات کو یہ جانتے ہوئے کہ خدا نے فرمائی ہے پوری ڈھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی اور حکمِ الٰہی کی کچھ پرواہ نہ کی۔ تیسرے یہ کہ ارشادِ الٰہی کے مطلب و مفہوم کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق اسے بدل ڈالا۔

رہا انبیاء کا قتل، تو بنی اسرائیل نے اپنے اس جرم کو اپنی تاریخ میں خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم بائبل سے چند واقعات یہاں نقل کرتے ہیں :۔

(۱) "حضرت سلیمانؑ کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہو کر دو ریاستوں (یروشلم کی دولت یہوؔدہ اور سامرؔیہ کی دولتِ اسرائیل) میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آئی کہ یہودیہ کی ریاست نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دمشق کی آرامی سلطنت سے مدد مانگی۔ اس پر خدا کے حکم سے حَنانی نبی نے یہودیہ کے فرمانروا آسا کو سخت تنبیہ کی مگر آسا نے اس تنبیہ کو قبول کرنے کے بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔" (۲۔ تواریخ، باب، ۱۔ آیت ۷۔۱۰)

(۲) "حضرت الیاس (ایلیاہ ELIJAH) علیہ السلام نے جب بعل کی پرستش پر یہودیوں کو ملامت کی اور ازسرِ نو توحید کی دعوت کا صور پھونکنا شروع کیا تو سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اَخی اَب اپنی مشرک بیوی کی خاطر ہاتھ دھو کر ان کی جان کے پیچھے پڑ گیا حتیٰ کہ ان کو جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینا پڑی۔ اس موقع پر جو دعا حضرت الیاسؑ نے مانگی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :۔ "بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا ...... تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں اکیلا بچا ہوں، سو وہ میری جان کے درپے ہیں۔" (۱۔ سلاطین۔ باب ۱۹۔ آیت ۱۔۱)

(۳) " ایک اور نبی حضرتِ میکایاہ کو اسی اَخی اَب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا۔" (۱۔ سلاطین۔ باب ۲۲۔ آیت ۲۶۔۲۷)

(۴) پھر جب یہودیہ کی ریاست میں عَلانیہ بت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور زکریاؔ نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی، تو شاہ یہوداہ یوآس کے حکم سے انھیں عین ہیکل سلیمانی میں مَقدِس، اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔ (۲۔ تواریخ۔ باب ۲۴۔ آیت ۲۱)

(۵) اس کے بعد جب سامرِیّہ کی اسرائیلی حکومت اَشوریوں کے ہاتھوں ختم ہو چکی اور یروشلم

کے یہودی ریاست کے سر پہ تباہی کا طوفان تلا کھڑا تھا تو یرمیاہ نبی اپنی قوم کے زوال پر ماتم کرنے اٹھے اور کوچے کوچے انھوں نے پکارنا شروع کیا کہ سنبھل جاؤ، ورنہ تمہارا انجام سامریہ سے بھی بدتر ہوگا۔ مگر قوم کی طرف سے جو جواب ملا وہ یہ تھا کہ ہر طرف سے ان پر لعنت اور پھٹکار کی بارش ہوئی، پیٹے گئے، قید کیے گئے، رسّی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیے گئے تاکہ بھوک اور پیاس سے وہیں سُوکھ سُوکھ کر مر جائیں، اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ قوم کے غدار ہیں، بیرونی دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں (یرمیاہ، باب ۱۵، آیت ۱۰۔ باب ۱۸، آیت ۲۰، ۲۳ - باب ۲۰، آیت ۱-۱۸ - باب ۲۶ تا باب ۴۰)

(۶) ایک اور نبی عامُوس کے متعلق لکھا ہے کہ جب انھوں نے سامریہ کی اسرائیلی ریاست کو اس کی گمراہیوں اور بدکاریوں پر ٹوکا اور ان حرکات کے برے انجام سے خبردار کیا تو انھیں نوٹس دیا گیا کہ ملک سے باہر نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوت کرو۔ (عاموس، باب ۷، آیت ۱۰-۱۳)

(۷) حضرت یحییٰ (یوحنا) علیہ السلام نے جب اُن بداخلاقیوں کے خلاف آواز اٹھائی جو یہودیہ کے فرمانروا، ہیرودیس کے دربار میں کھلم کھلا ہو رہی تھیں تو پہلے وہ قید کیے گئے، پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش پر قوم کے اس صالح ترین آدمی کا سر قلم کر کے، ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کر دیا (مرقس ۳، باب ۶، آیت ۱۷-۲۹)

(۸) آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل کے علماء اور سردارانِ قوم کا غصہ بھڑکا کیونکہ وہ انھیں ان کے گناہوں اور ان کی ریاکاریوں پر ٹوکتے تھے، اور ایمان اور راستی کی تلقین کرتے تھے۔ اس قصور پر ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا، رومی عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ حاصل کیا گیا، اور جب رومی حاکم پیلاطُس نے یہود سے کہا کہ عید کے روز میں تمہاری خاطر یسوع اور برابّا ڈاکو، دونوں میں سے کس کو رہا کروں؟ تو ان کے پورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ کہ برابّا کو چھوڑ دے اور یسوع کو پھانسی پر لٹکا (متی باب ۲۷، آیت ۲۰ تا ۲۶) (۴۲)

یہود کی طرف سے قتل انبیاء کا اقرار

وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ (النساء، آیت ۱۵۷)

ترجمہ: ”اور خود کہا کہ مسیح عیسیٰ ابن مریم، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے۔“

یعنی جرأت مجرمانہ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے تھے اور پھر اس کے قتل کا اقدام کیا اور فخریہ کہا کہ

ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران اور سورۂ مریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور گہوارے میں ان کے کلام کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السلام کی نبوت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ پھر جو روشن نشانیاں انھوں نے حضرت موصوف سے مشاہدہ کیں (جن کا ذکر سورۂ آل عمران رکوع ۵ میں آیا ہے) ان کے بعد تو یہ معاملہ بالکل ہی غیر مشتبہ ہو چکا تھا کہ آں جناب اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا، بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اس جرم کا ارتکاب اس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں جو اللہ کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہے۔

بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی قوم کسی شخص کو نبی جانتے اور مانتے ہوئے اسے قتل کر دے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی قوموں کے انداز و اطوار ہوتے ہی کچھ عجیب ہیں۔ وہ اپنے درمیان کسی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں جو ان کی برائیوں پر ان کو ٹوکے اور ناجائز کاموں سے ان کو روکے۔ ایسے لوگ چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہوں ہمیشہ بدکردار قوموں میں قید اور قتل کی سزائیں پاتے ہی رہے ہیں۔ تلمود نے لکھا ہے کہ بخت نصر نے جب بیت المقدس فتح کیا تو وہ ہیکل سلیمانی میں داخل ہوا اور اس کی سیر کرنے لگا۔ عین قربان گاہ کے سامنے ایک دیوار پر اسے تیر کا نشان نظر آیا۔ اس نے یہودیوں سے پوچھا یہ کیسا نشان ہے؟ انھوں نے جواب دیا۔ "یہاں زکریاہ نبی کو ہم نے قتل کیا تھا۔ وہ ہماری برائیوں پر ہمیں ملامت کرتا تھا۔ آخر جب ہم اس کی ملامتوں سے تنگ آ گئے تو ہم نے اسے مار ڈالا۔" بائبل میں یرمیاہ نبی کے متعلق لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل کی بد اخلاقیاں حد سے گزر گئیں اور حضرت یرمیاہ نے ان کو متنبہ کیا کہ ان اعمال کی پاداش میں خدا تم کو دوسری قوموں سے پامال کرا دے گا، تو ان پر الزام لگایا گیا کہ یہ شخص کسدیوں (کلدانیوں) سے ملا ہوا ہے اور قوم کا غدار ہے۔ اس الزام میں ان کو جیل بھیج دیا گیا۔ خود حضرت مسیحؑ کے واقعہ صلیب سے دو ڈھائی سال پہلے ہی حضرت یحییٰؑ کا معاملہ پیش آ چکا تھا۔ یہودی بالعموم ان کو نبی جانتے تھے اور کم از کم یہ تو مانتے ہی تھے کہ وہ ان کی قوم کے صالح ترین لوگوں میں سے ہیں۔ مگر جب انھوں نے ہیرودیس (والیٔ ریاستِ یہودیہ) کے دربار کی برائیوں پر تنقید کی تو اسے برداشت نہ کیا گیا۔ پہلے جیل بھیجے گئے اور پھر والیٔ ریاست کی معشوقہ کے مطالبہ پر ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ یہودیوں کے اس ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے زعم میں مسیح کو سولی پر چڑھانے کے بعد سینے پر ہاتھ مار کر کہا ہو: "ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔" (۷۵)

باب ۴

جنگ کے متعلق یہودیوں کے نظریات

فصل ۱

اُن کے مذہب کی رُو سے اُن کا

مقصدِ جنگ اور قوانینِ جنگ

یہودی مذہب کی تحقیق میں ہم کو وہ دقتیں پیش نہیں آئیں جو ہندو مذہب کے قوانین تلاش کرنے میں پیش آتی ہیں۔ صرف ایک کتاب تورات کو لے کر ہم اس مذہب کی تعلیم اور اس کے احکام و قوانین معلوم کر سکتے ہیں اور اس میں یہودیت کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ متاخرین علمائے یہود نے شریعتِ یہود کے قوانین کو مرتب کرنے کے لیے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جو جزئیات کی تفصیل پر حاوی ہیں۔ مثلاً عقیبہ بن یوسف کی مِشناہ اور مِدراش جو دوسری صدی عیسوی کی تصنیفیں ہیں، اور تالمود جو مشناہ اور گِمارا کو ملا کر چھٹی صدی عیسوی میں مرتب کی گئی، اور اسحاق الفاسی کی ہلاخوث جو گیارھویں صدی کے اواخر میں مرتب ہوئی اور تالمودی قوانین کی بہترین شرح سمجھی جاتی ہے، اور موسیٰ میمونی کی مِشنہ تورات جو بارھویں صدی کے اواخر میں مرتب ہوئی، اور یعقوب بن اشہر کی طور جو چودھویں صدی کی یادگار ہے، اور یوسف قارو کی شولحان اروخ جو سولھویں صدی میں لکھی گئی ہے اور جس میں یہودی احکام و عبادات کے سارے احکام روایاتِ قدیمہ کے مطابق مرتب کیے گئے ہیں۔ لیکن ہمارے لیے ان کتابوں سے استخراج چنداں مفید نہیں ہے، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو یہودیوں کے تمام فرقوں میں متفق علیہ ہو، اور نہ کسی کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ اسے یہودی مذہب کی اساس و بنیاد قرار دیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ بسا اوقات یہودیوں نے ان کتابوں سے بیزاری ظاہر کی ہے اور توراۃ کے سوا سب کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۰۶ء میں ربیّونِ امریکہ کی مرکزی مؤتمر کا جو اجتماع انڈیاناپولس میں ہوا تھا اس نے مذہبی ضوابط کی ہمہ گیری کے خلاف علانیہ اظہارِ بغاوت کر دیا تھا۔ لہٰذا ہمیں ان سب کتابوں کو نظر انداز کر کے مسئلہ جنگ میں صرف توراۃ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔[1] (۷۶)

---

[1] یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ تورات کے متعلق ہم جو کچھ کہیں گے وہ اس توراۃ کے متعلق نہیں ہوگا جو حضرت موسیٰؑ

مقصدِ جنگ

توراۃ میں نہایت کثرت سے لڑائیوں کا ذکر آیا ہے، اور جگہ جگہ جنگ کا حکم دیا گیا ہے، مگر سوائے اس ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) پر نازل ہوئی تھی، بلکہ اس تورات کے متعلق ہوگا جو آج عہد عتیق (OLD TESTAMENT) کے نام سے دنیا میں موجود ہے۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ "عہد عتیق" کی کتب خمسہ (PENTATEUCH) اصل توراۃ نہیں ہے۔ اصل توراۃ دنیا سے ناپید ہو چکی ہے۔ اس نظریہ کی تائید خود "عہد عتیق" سے ہوتی ہے۔ اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں حضرت یشوع کی مدد سے توراۃ کو مرتب کر کے ایک صندوق میں رکھوا دیا تھا (استثناء ۳۱: ۲۴-۲۶) ان کے انتقال کے بعد چھٹی صدی ق م میں جب بخت نصر نے بیت المقدس کو آگ لگا دی تو وہ مقدس صندوق ان تمام کتابوں سمیت جل گیا جو حضرت موسیٰ کے بعد شریعتِ موسویہ کے مجددین نے مرتب کی تھیں۔ اس تباہی کے دو ڈھائی سو برس بعد حضرت عزیرؑ نے بائیبل کی روایت کے مطابق بنی اسرائیل کے کاہنوں اور راویوں کے ساتھ مل کر آسمانی الہام سے اس کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا (ایزڈراس، جزو دوم باب چہاردہم) مگر حوادث زمانہ نے اس نئے نسخہ کو بھی اپنی اصلی صورت میں باقی نہ رہنے دیا۔ سکندرِ اعظم کی عالمگیر فتوحات کا سیلاب جب یونانی حکومت کے ساتھ اس کے علوم و آداب کو بھی لے کر شرقِ ادنیٰ پر پھیل گیا تو ۲۸۰ ق م میں توراۃ کی تمام کتابیں یونانی زبان میں منتقل کر دی گئیں، اور رفتہ رفتہ اصل عبرانی نسخہ متروک ہو کر یونانی ترجمہ رائج ہو گیا۔ پس آج جو توراۃ ہمارے سامنے ہے اس کی سند کسی طرح حضرت موسیٰ تک نہیں پہنچتی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موجودہ توراۃ میں اصلی توراۃ کا کوئی جز و بھی شامل نہیں، یا یہ سراسر جعلی ہے۔ دراصل جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس توراۃ میں اصل توراۃ کے ساتھ بہت سی دوسری چیزیں مل جل گئی ہیں، اور بعید نہیں کہ اس کی بعض چیزیں اس میں سے غائب بھی ہو گئی ہوں۔ آج جو شخص بھی محققانہ نظر سے اس کتاب کو پڑھے گا وہ صریح طور پر یہ محسوس کرے گا کہ اس میں خدا کے کلام کے ساتھ یہودی علماء کی تفسیریں، بنی اسرائیل کی قومی تاریخ، اسرائیلی فقہاء کے قانونی اجتہادات اور دوسری بہت سی چیزیں خلط ملط ہو گئی ہیں جنھیں الگ کر کے کلامِ الٰہی کو چھانٹ نکالنا بہت مشکل کام ہے۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ قرآن کی رو سے توراۃ کا دین وہی تھا جو خود قرآن کا دین ہے اور موسیٰ علیہ السلام اسی طرح اسلام کے پیغام بر تھے جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ بنی اسرائیل ابتداء میں اسی دین کے پیرو تھے، مگر بعد میں انھوں نے اصل دین میں اپنی خواہشات کے مطابق بہت کچھ کمی بیشی کر کے ایک نیا مذہبی نظام یہودیت کے نام سے بنا لیا۔ لہٰذا یہاں جس چیز پر ہم بحث کر رہے ہیں وہ یہی یہودیت ہے، نہ کہ وہ دین جو حضرت موسیٰ لائے تھے۔ (۷۷)

مقصد کے جو استثناء، باب ۲، اور اعداد (گنتی)، باب ۳۳ میں بیان کیا گیا ہے، کسی اور مقصد کا نشان ہم کو نہیں ملتا۔ یہ مقصد کتاب اعداد میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

"اور خداوند نے موآب کے میدانوں میں یردن کے کنارے یریحو کے مقابل موسیٰؑ کو خطاب کر کے فرمایا:

"بنی اسرائیل کو خطاب کر اور انھیں کہہ، جب تم یردن سے پار ہو کر زمینِ کنعان میں داخل ہو تو تم ان سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں، اپنے سامنے سے بھگاؤ، ان کی مورتیں فنا کر دو، اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو، اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھا دو، اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں خارج کر دو، اور وہاں آپ بسو، کیونکہ وہ سرزمین میں نے تم کو دی ہے کہ اس کے مالک ہو۔" (۳۳ : ۵۰-۵۴)

اور کتاب استثناء میں ہے:۔

"سو تم اٹھو، کوچ کرو، اور نہر اَرنون کے پار جاؤ، دیکھو میں نے حسبون کے بادشاہ اموری سیحون کو اس کی سرزمین سمیت تیرے ہاتھ میں دیا ہے، سو اس کی میراث لینا شروع کر اور جنگ میں اس کا مقابلہ کر۔" (۳ : ۲۴)

"لیکن حسبون کے بادشاہ سیحون نے ہم کو اپنے ہاں سے گزرنے نہیں دیا کیونکہ خداوند تیرے خدا نے اس کا مزاج کڑا کر دیا، اور اس کے دل کو سخت، تاکہ اسے تیرے ہاتھ میں دیوے جیسا آج ہے۔ پھر خداوند نے مجھے فرمایا، دیکھو میں نے سیحون کو اس کی سرزمین سمیت تجھے دینا شروع کیا، تو میراث لینا شروع کر، تاکہ اس کی زمین کا وارث ہو جائے۔ تب سیحون یہض میں ہمارے مقابلے کے لیے نکلا، وہ اور اس کی ساری قوم، تاکہ ہم سے لڑیں۔ سو خداوند ہمارے خدا نے اسے ہمارے حوالے کر دیا اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹوں کو اور اس کی سب قوم کو ہلاک کیا اور ہم نے اسی وقت اس کے سارے شہروں کو لے لیا اور مردوں اور عورتوں اور بچوں کو ہر ایک شہر میں حرم کیا (یعنی قتل کیا) اور کسی کو باقی نہ چھوڑا، سوا چارپایوں کے جنھیں ہم نے اپنے لیے غنیمت جان کر پکڑ لیا اور اس مال کے سوا جو ہم نے شہروں میں سے لوٹا۔" (۲ : ۳۰-۳۵)

تب ہم پھرے اور بسن کی راہ میں چڑھ گئے، اور بسن کا بادشاہ اوج اور ڈعی میں وہ اور

اس کی ساری قوم ہمارے مقابلے کے لیے نکلی، تاکہ ہم سے لڑے اور خداوند نے اس وقت مجھ سے فرمایا: اس سے مت ڈر کیونکہ میں اس کو اور اس کی ساری قوم کو اس کی سرزمین سمیت تیرے قبضے میں کر دوں گا تو اس سے وہی کر جو تو نے اموریوں کے بادشاہ سیحون سے جو حسبون میں رہتا تھا، کیا۔ چنانچہ خداوند ہمارے خدا نے بسن کے بادشاہ عوج کو بھی اس کی ساری قوم سمیت ہمارے قابو میں کر دیا، اور ہم نے انھیں یہاں تک مارا کہ ان میں سے کوئی باقی نہ رہا، اور ہم نے اسی وقت اس کے سب شہر لے لیے .... اور ہم نے ان کو یعنی ان کے مردوں اور عورتوں اور لڑکوں کو ہر ایک شہر میں حسبون کے بادشاہ سیحون کی طرح حرم کیا، لیکن سارے مواشی اور شہروں اور مال اسباب کو ہم نے اپنے واسطے لوٹ لیا۔" (۳ : ۱ - ۷)

ان عبارات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توراۃ کی جنگ کا مقصد ملک گیری ہے۔ ایک ملک کے باشندوں کو تلوار کے زور سے مغلوب کرنا، اور قوت کے حق کی بنا پر ان کے اموال و املاک اور خود ان کی جانوں کو اپنے قبضہ میں لے لینا، اس کی نگاہ میں جائز ہے، اور اس کے نزدیک یہی قہر و تسلط اس وراثتِ ارضی کا مفہوم ہے جس کے عطا کرنے کا خدا نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں بھی "وراثت ارضی" کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا گیا ہے۔

اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء - ۱۰۵)

ترجمہ: "زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔"

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ (الاعراف - ۱۲۸)

ترجمہ: "زمین خدا کی ہے، وہ اس کا وارث اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے بناتا ہے اور انجام کار کامیابی صرف پرہیزگاروں کا حصہ ہے۔"

لیکن اس وراثت کا تخیل توراۃ کے تخیل سے بالکل مختلف ہے۔ توراۃ زمین کی وراثت صرف بنی اسرائیل کو دیتی ہے۔ جیسا کہ اعداد (۳۳ : ۵۰) سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ مگر قرآن اسے کسی ایک نسل یا قوم کا نہیں بلکہ صالحین کا حق قرار دیتا ہے۔ توراۃ میں وراثت ارضی کا مفہوم یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے گھر بار، ملک و مال اور جان و آبرو کی مالک بن جائے، مگر قرآن میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی قوم کو

وراثتِ ارضی دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنی بداعمالیوں کے باعث ناکارہ ہو جاتی ہے اور زندہ رہنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے تو اللہ تعالیٰ دوسری قوم کو جو اس سے بہتر اور اصلح ہو اس کی جگہ کھڑا کر دیتا ہے۔ پھر توراۃ میں میراثِ زمین حاصل کرنے کے لیے جنگ کا حکم دیا گیا ہے، مگر قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ فلاں ملک تمھاری قومی میراث ہے لہٰذا تم اس کو لڑ کر فتح کر لو۔ پس توراۃ کی "وراثتِ ارضی" کھلی کھلی ملک گیری ہے۔ اسلام کے جہاد فی سبیل کے برعکس اس کی جنگ کا مقصد محض ملک و دولت کا حصول اور دوسری قوموں پر ایک خاص قوم کی برتری قائم کرنا ہے۔

حدودِ جنگ

جنگ کے حدود و ضوابط کے متعلق ہم کو توراۃ میں کچھ زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ تاہم اس سے اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہودی مذہب اپنے پیرؤوں کو دشمن کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس کے لیے ذیل کے احکام قابلِ مطالعہ ہیں:

کتابِ استثناء میں ہے:۔

> "اور جب تو کسی شہر کے پاس اُس سے لڑنے کے لیے آ پہنچے تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر۔ تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور ہے، اور دروازے تیرے لیے کھول دے، تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری خراج گزار ہوگی اور تیری خدمت کرے گی۔ اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ جنگ کرے، تو تُو اس کا محاصرہ کر، اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں دے دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو، اور جو کچھ اس شہر میں ہو اُس کی ساری لوٹ اپنے لیے لے اور تو اپنے دشمن کی اس لُوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے کھائیو۔" (۲۰ : ۱۰ - ۱۴)

> "جب تم کسی شہر کو اس ارادہ سے کہ لڑائی کر کے اسے لو، مدت تک محاصرہ کیے رہو، تو تیر چلا کر اس کے درختوں کو خراب مت کیجیو، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تو ان کا میوہ کھائے۔ سو تو انھیں محاصرہ کے کام میں لانے کے لیے کاٹ نہ ڈالیو، کیونکہ میدان کے درخت آدمی کی زندگی ہیں۔" (۲۰ - ۲۹)

> "لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنھیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے، کسی چیز کو

جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو، بلکہ تو ان کو حرم کیجیو۔ (۲۰ : ۱۶ - ۱۷)

"اور جبکہ خداوند تیرا خدا انھیں تیرے حوالے کر دے تو تو انھیں ماریو اور حرم کیجیو۔ نہ تو ان سے کوئی عہد کریو، اور نہ اُن پر رحم کریو۔ تم اُن کے مذبحوں کو ڈھا دو، اُن کے بتوں کو ڈھا دو، اُن کے گھنے باغوں کو کاٹ ڈالو اور اُن کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلا دو۔" (۷ : ۲ - ۵)

"تم ان سب جگہوں کو جہاں ان قوموں نے جن کے تم وارث ہو گے اپنے معبودوں کی بندگی کی ہے، اونچے پہاڑوں پر اور ٹیلوں پر، اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے نیست و نابود کر دیجیو، ان کے مذبحوں کو ڈھا دیجیو، اور ان کے ستونوں کو توڑ لیو، اور ان کے گھنے باغوں میں آگ لگائیو، اور ان کے معبودوں کی کھدی ہوئی مورتوں کو چکنا چور کیجیو، اور ان کے ناموں کو اس جگہ سے مٹا دیجیو۔" (۲ : ۲)

کتاب خروج میں ہے:۔

"آج کے دن جو حکم میں تجھے کرتا ہوں تو اسے یاد رکھیو کہ میں اموریوں اور کنعانیوں اور حتیوں اور فرزیوں اور حویوں اور یبوسیوں کو تیرے آگے سے ہانکتا ہوں۔ ہوشیار رہ تا نہ ہووے کہ تو اس سرزمین کے باشندوں کے ساتھ جس میں تو جاتا ہے، کچھ عہد باندھ لیوے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ عہد تیرے درمیان پھندا ہو۔ بلکہ تم ان کی قربان گاہوں کو ڈھا دو اور ان کے بتوں کو توڑ دو اور ان کی یسیرتوں کو کاٹ ڈالو" (۳۴ : ۱۱ - ۱۴)

کتاب اعداد میں ہے:۔

"پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اہلِ مدیان سے بنی اسرائیل کا انتقام لے اور تو بعد اِس کے اپنی قوم کے لوگوں سے مل جائے گا۔ تب موسیٰ نے لوگوں کو فرمایا کہ بعض تم میں سے لڑائی کے لیے تیار ہوں .... سو ہزاروں بنی اسرائیل میں سے ہر فرقہ کے ایک ایک ہزار حاضر ہو گئے۔ یہ سب لڑائی کے لیے ہتھیار بند تھے ۱۲ ہزار ہوئے۔ ...... اور انھوں نے مدیانیوں سے لڑائی کی جیسا خداوند نے موسیٰ سے فرمایا تھا، اور سارے مردوں کو قتل کیا .... اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا اور ان کے مواشی اور بھیڑ بکری اور مال و اسباب سب کچھ لوٹ لیا اور ان کے سارے شہروں کو جن

میں وہ رہتے تھے، اور ان کے سب قلعوں کو پھونک دیا، اور انھوں نے ساری غنیمت اور سارے اسیر انسان اور حیوان لیے، اور وہ قیدی اور غنیمت اور لوٹ موسیٰؑ اور الیعزر کاہن اور بنی اسرائیل کے پاس خیمہ گاہ میں، موآب کے میدانوں میں یردن کے کنارے جو یریحو کے مقابل ہے لائے، .... اور موسیٰ لشکر کے رئیسوں پر اور ان پر جو ہزاروں کے سردار تھے، اور ان پر جو سینکڑوں کے سردار تھے جو جنگ کر کے پھرے تھے، غصہ ہوا اور ان کو کہا کہ کیا تم نے سب عورتوں کو جیتا رکھا؟ .... سو تم ان بچوں کو جتنے لڑکے ہیں سب کو قتل کر ڈالو اور ہر ایک عورت جو مرد کی صحبت سے واقف تھی جان سے مارو، لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لیے زندہ رکھو۔"

کتاب یشوع میں ہے:۔

"اور انھوں نے ان سب کو جو شہر میں تھے کیا مرد، کیا عورت، کیا جوان، کیا بوڑھا، کیا بیل، کیا بھیڑ، کیا گدھا، سب کو یک لخت تہ تیغ کر کے حرم کیا۔ .... پھر انھوں نے شہر کو اس سب سمیت جو اس میں تھا پھونک دیا۔ مگر روپا اور سونا اور پیتل اور لوہے کے ظروف خداوند کے خزانہ میں داخل کیے" (۶ : ۲۱-۲۵)

"اور انھوں نے عی کے بادشاہ کو جیتا پکڑا اور اسے یشوع پاس لائے اور ایسا ہوا کہ جب اسرائیل میدان میں اس بیابان کے درمیان جہاں ان کا پیچھا کیا عی کے لوگوں کو قتل کر چکے اور وہ سب تہ تیغ ہو گئے یہاں تک کہ بالکل کھپ گئے، تو سارے بنی اسرائیل عی کو پھرے اور اسے تلوار کی دھار سے مارا۔ چنانچہ وہ جو اس دن مارے گئے مرد اور عورت ۱۲ ہزار تھے، یعنی عی کے سب لوگ۔ کیونکہ یشوع نے اپنا ہاتھ جس سے بھالا اٹھایا، جب تک عی کے سارے رہنے والوں کو حرم نہ کر لیا نہ کھینچا۔ اسرائیل نے اس شہر کے فقط مواشی اور اسباب کو اپنے لیے لوٹا، خداوند کے حکم کے مطابق جو اس نے یشوع کو فرمایا تھا" (۸ : ۲۲-۲۸)

ان عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودی مذہب اپنے دشمنوں کو دو قسموں پر تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جنھیں خداوند نے بنی اسرائیل کی میراث میں نہیں دیا ہے۔ دوسرے وہ جنھیں اس نے ان کی میراث میں

دیا ہے۔ اِن دونوں کے ساتھ اُس کا معاملہ جدا جدا رنگ کا ہے۔

پہلی قسم کے دشمنوں کے لیے اس کا حکم یہ ہے کہ پہلے انھیں صلح کا پیغام دیا جائے، اور اگر وہ اسے قبول کر کے اپنا ملک بنی اسرائیل کے سپرد کر دیں تو ان کو باجگذار اور خدمت گزار بنا لیا جائے۔ لیکن اگر وہ صلح نہ کریں تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے اور فتح پانے کے بعد ان کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے، اور مال اسباب پر قبضہ کر لیا جائے۔ دورانِ جنگ میں باغوں اور کھیتوں اور میوہ دار درختوں کو خراب کرنے کی ممانعت ہے، مگر اس لیے نہیں کہ ایک مفسدانہ فعل ہے، بلکہ اس لیے کہ انھیں اس طرح خراب کر دینے سے فتح حاصل کرنے کی صورت میں فاتح کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکے گا۔

دوسری قسم کے دشمنوں کو وہ تمام حقوق اور رعایات سے محروم کر دیتا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ ان قوموں سے کوئی صلح و معاہدہ نہ کیا جائے، ان کے خلاف بلا تامل جنگ چھیڑ دی جائے، ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کیا جائے، ان کی کھیتیاں اور باغات اور عمارتیں اور عبادت گاہیں سب تہس نہس کر دی جائیں، ان کی عورتیں، مرد، بچے، حتّٰی کہ جانور تک تہ تیغ کر دیے جائیں، اور روئے زمین سے ان کا نام نشان تک مٹا دیا جائے۔ اس جنگ کی غایت صرف یہ قرار دی گئی ہے کہ میراث میں دی ہوئی قومیں کلیتہً نیست و نابود کر دی جائیں۔ ان قوموں کے سامنے کوئی ایسی شرط پیش کی ہی نہیں گئی جسے پورا کرنے کے بعد ان کی جان بخشی ممکن ہو۔

اس تعلیم پر کسی تبصرہ کی حاجت نہیں، وہ اپنے اوپر آپ تبصرہ کر رہی ہے۔ اس پر جیتا جاگتا تبصرہ فلسطین کی اسرائیلی ریاست ہے جو اس میراثِ ارضی کے تخیل پر قائم ہوئی اور اس بیسویں صدی میں اس نے عربوں کے ساتھ وہی کچھ کر کے دکھا دیا جس کی ہدایت بائیبل میں دی گئی تھی۔ (۷۸)

باب ۵

حضرت موسیٰؑ سے حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ تک کا دور

فصل ۱

یہود کا مطالبۂ بادشاہت اور اس کے نتائج

سموئیل نبی سے بادشاہت کے تقرر کا تقاضا

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا .... (البقرہ ۔ ۲۴۶)

ترجمہ: "پھر تم نے اس معاملے پر بھی غور کیا، جو موسیٰؑ کے بعد سردارانِ بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا، انھوں نے اپنے نبی سے کہا، ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ نبی نے پوچھا، کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو؟ وہ کہنے لگے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہِ خدا میں نہ لڑیں جب کہ ہم کو اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیے گئے ہیں؟ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا سب پیٹھ موڑ گئے اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔"

یہ تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ اُس وقت بنی اسرائیل پر عمالقہ چیرہ دست ہو گئے تھے اور انھوں نے اسرائیلیوں سے فلسطین کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔ سموئیل نبی اس زمانے میں بنی اسرائیل کے درمیان حکومت کرتے تھے۔ مگر وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے، اس لیے سردارانِ بنی اسرائیل نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی اور شخص ان کا سربراہ کار ہو جس کی قیادت میں وہ جنگ کر سکیں۔ لیکن اس وقت بنی اسرائیل میں اس قدر جاہلیت آ چکی تھی، اور وہ غیر مسلم قوموں کے طور طریقوں سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ خلافت اور بادشاہی کا فرق ان کے ذہنوں سے نکل گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے درخواست جو کی وہ خلیفہ کے تقرر کی نہیں، بلکہ ایک بادشاہ کے تقرر کی تھی۔ اس سلسلے میں بائبل کی کتاب سموئیل اوّل میں جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

”سموئیل زندگی بھر اسرائیلیوں کی عدالت کرتا رہا .... تب سب اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس آئے اور اس سے کہنے لگے کہ دیکھ تو ضعیف ہے اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے، اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کردے جو اور قوموں کی طرح ہماری عدالت کرے۔

...... یہ بات سموئیل کو بری لگی اور سموئیل نے خداوند سے دعا کی اور خداوند نے سموئیل سے کہا کہ جو کچھ یہ لوگ تجھ سے کہتے ہیں تو اس کو مان، کیونکہ انھوں نے تیری نہیں بلکہ میری حقارت کی ہے کہ میں ان کا بادشاہ نہ رہوں ......“

سموئیل نبی کا انتباہ

”اور سموئیل نے ان لوگوں کو جو اس سے بادشاہ کے طالب تھے، خداوند کی سب باتیں کہہ سنائیں اور اس نے کہا کہ جو بادشاہ تم پر سلطنت کرے گا اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمھارے بیٹوں کو لے کر اپنے رتھوں کے لیے اور اپنے رسالے میں نوکر رکھے گا، اور وہ اس کے رتھوں کے آگے دوڑیں گے اور وہ ان کو ہزار ہزار کے سردار اور پچاس پچاس کے جمعدار بنائے گا۔ اور بعض سے ہل جتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لیے جنگ کے ہتھیار اور رتھوں کے ساز بنوائے گا۔ اور تمھاری بیٹیوں کو گندھن اور باورچن اور نان پز بنائے گا۔ اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کو جو اچھے سے اچھے ہوں گے لے کر اپنے خدمت گاروں کو عطا کرے گا۔ اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں کا دسواں حصہ لے کر اپنے خوجوں اور خادموں کو دے گا۔ اور تمھارے نوکر چاکروں اور لونڈیوں اور تمھارے شکیل جوانوں اور تمھارے گدھوں کو لے کر اپنے کام پر لگائے گا۔ اور وہ تمھاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصہ لے گا۔ سو تم اس کے غلام بن جاؤ گے، اور تم اس دن اس بادشاہ کے سبب سے، جسے تم نے اپنے لیے چنا ہوگا، فریاد کرو گے پر اس دن خداوند تم کو جواب نہ دے گا۔ تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات نہ سنی اور کہنے لگے نہیں، ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر ہو تاکہ ہم بھی اور قوموں کے مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے، ہمارے آگے آگے چلے، ہماری طرف سے لڑائی کرے .... خداوند نے سموئیل کو فرمایا تو ان کی بات مان لے اور ان کے لیے ایک بادشاہ مقرر کردے۔“ (باب ۷، آیت ۱۵ تا باب ۸۔ آیت ۲۲)

خدا کی طرف سے بادشاہ مقرر کر دیا گیا

"پھر سموئیل لوگوں سے کہنے لگا .... جب تم نے دیکھا کہ بنی عمون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا تو تم نے مجھ سے کہا کہ ہم پر کوئی بادشاہ سلطنت کرے، حالانکہ خداوند تمہارا خدا تمہارا بادشاہ تھا۔ سو اس بادشاہ کو دیکھو جسے تم نے چن لیا اور اس کے لیے تم نے درخواست کی تھی۔ دیکھو خداوند نے تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے، اگر تم خداوند سے ڈرتے اور اس کی پرستش کرتے اور اس کی بات مانتے رہو اور خداوند کے حکم سے سرکشی نہ کرو، اور تم اور تمہارا بادشاہ بھی، جو تم پر سلطنت کرتا ہے، خداوند اپنے خدا کے پیرو بنے رہو تو خیر، پر اگر تم خداوند کی بات نہ مانو، بلکہ خداوند کے حکم سے سرکشی کرو، تو خداوند کا ہاتھ تمہارے خلاف ہوگا جیسے وہ تمہارے باپ دادا کے خلاف ہوتا تھا .... اور تم جان لوگے اور دیکھ بھی لوگے کہ تم نے خداوند کے حضور اپنے لیے بادشاہ مانگنے سے کتنی بڑی شرارت کی ...... اب رہا میں سو خدا نہ کرے کہ تمہارے لیے دعا کرنے سے باز آکر خداوند کا گنہگار ٹھہروں، بلکہ میں وہی راہ جو اچھی اور سیدھی ہے تم کو بتاؤں گا۔" (باب ۱۲۔ آیت ۱۲ تا ۲۳)[1]

قرآن کا بیان

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا أَنّٰى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ

---

[1] کتاب سموئیل کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بادشاہت کے قیام کا یہ مطالبہ اللہ اور اس کے نبی کو پسند نہ تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ قرآن مجید میں اس مقام پر سرداران بنی اسرائیل کے اس مطالبے کی مذمت کیوں نہیں کی گئی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قصے کا ذکر یہاں جس غرض کے لیے کیا ہے اس سے یہ مسئلہ غیر متعلق ہے کہ ان کا مطالبہ صحیح تھا یا غلط تھا۔ یہاں تو یہ بتانا مقصود ہے کہ بنی اسرائیل کس قدر بزدل ہو گئے تھے، اور ان میں کس قدر نفسانیت آگئی تھی، اور ان کے اندر اخلاقی انضباط کی کتنی کمی تھی، جس کے سبب سے آخر کار وہ گر گئے۔ اور اس ذکر کی غرض یہ ہے کہ مسلمان اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے اندر یہ کمزوریاں پرورش نہ کریں۔ (مؤلف)

الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (البقرہ - آیت ۲۴۷)

ترجمہ: "ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے، ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حق دار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے۔ نبی نے جواب دیا کہ تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا گیا ہے اور اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے، اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے۔"

بائیبل میں طالوت کا نام ساؤل لکھا ہے یہ قبیلہ بن یمین کا ایک تیس سالہ نوجوان تھا۔ "بنی اسرائیل اسرائیل میں اس سے خوب صورت کوئی شخص نہ تھا، اور وہ ایسا قد آور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے۔" اپنے باپ کے گم شدہ گدھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ راستے میں جب سموئیل نبی کی قیام گاہ کے قریب پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے نبی کو اشارہ کیا کہ یہی شخص ہے جس کو ہم نے بنی اسرائیل کی بادشاہی کے لیے منتخب کیا ہے۔ چنانچہ سموئیل نبی اسے اپنے گھر لائے، تیل کی کپی لے کر اس کے سر پہ انڈیلی اور اسے چوما اور کہا کہ "خداوند نے تجھے مسح کیا[1] تاکہ تو اس کی میراث کا پیشوا ہو۔" اس کے بعد انھوں نے بنی اسرائیل کا اجتماعِ عام کر کے اس کی بادشاہی کا اعلان کیا۔ (۱ - سموئیل، باب ۹ - ۱۰) (۸۰)

تابوتِ سکینہ

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ

---

[1] یہ بنی اسرائیل میں دوسرا شخص تھا، جس کو خدا کے حکم سے "مسح" کر کے پیشوائی کے منصب پر مقرر کیا گیا۔ اس سے پہلے حضرت ہارون سردار کاہن (CHIET PRIEST) کی حیثیت سے مسح کیے گئے تھے۔ اس کے بعد تیسرے ممسوح یا مسیح حضرت داؤد علیہ السلام ہوئے، اور چوتھے مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ لیکن طالوت کے متعلق ایسی کوئی تصریح قرآن یا حدیث میں نہیں ہے کہ وہ نبوت کے منصب پر بھی سرفراز ہوا تھا۔ محض بادشاہی کے لیے نامزد کیا جانا اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اسے نبی تسلیم کیا جائے۔ (مؤلف)

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (البقرہ - آیت ۲۴۸)

ترجمہ: *"اس کے ساتھ ان کے نبی نے ان کو یہ بھی بتایا کہ خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمہیں واپس مل جائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے، جس میں آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں۔ اور جس کو اس وقت فرشتے سنبھالے ہوئے ہیں۔ اگر تم مومن ہو تو یہ تمہارے لیے بہت بڑی نشانی ہے۔"

بائبل کا بیان قرآن سے کسی حد تک مختلف ہے۔ تاہم اس سے اصل واقعہ کی تفصیلات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صندوق، جسے بنی اسرائیل اصطلاحاً "عہد کا صندوق" کہتے تھے، ایک لڑائی کے موقع پر فلسطینی مشرکین نے بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا، لیکن یہ مشرکین کے جس شہر اور جس بستی میں بھی رکھا گیا، وہاں وبائیں پھوٹ پڑیں۔ آخر کار انھوں نے خوف کے مارے اسے ایک بیل گاڑی میں رکھ کر گاڑی کو ہانک دیا۔ غالباً اسی معاملے کی طرف قرآن ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے کہ اس وقت وہ صندوق فرشتوں کی حفاظت میں تھا۔ کیونکہ وہ گاڑی بغیر کسی گاڑی بان کے ہانک دی گئی تھی اور اللہ کے حکم سے یہ فرشتوں ہی کا کام تھا کہ وہ اسے چلا کر بنی اسرائیل کی طرف لے آئے۔ رہا یہ ارشاد کہ اس صندوق میں تمہارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے، تو بائبل کے بیان سے اس کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل اس کو بڑا متبرک اور اپنے لیے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے۔ جب وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو پوری قوم کی ہمت ٹوٹ گئی اور ہر اسرائیلی یہ خیال کرنے لگا کہ خدا کی رحمت ہم سے پھر گئی ہے۔ اور اب ہمارے بُرے دن آگئے ہیں۔ پس اس صندوق کا واپس آنا اس قوم کے لیے بڑی تقویتِ قلب کا موجب تھا اور یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے ان کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں پھر بندھ سکتی تھیں۔

*آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے چھوڑے ہوئے تبرکات جو اس صندوق میں رکھے ہوئے تھے، اُن سے مراد وہ پتھر کی تختیاں ہیں جو طورِ سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو دی تھیں۔ اس کے علاوہ توراۃ کا وہ اصل نسخہ بھی اس میں تھا جسے حضرت موسیٰؑ نے خود لکھوا کر بنی لاوی کے سپرد کیا تھا۔ نیز ایک بوتل میں مَن بھی بھر کر اس میں رکھ دیا گیا تھا تاکہ آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یاد کریں جو صحرا میں

اس نے ان کے باپ دادا پر کیا تھا۔ اور غالباً حضرت موسیٰؑ کا وہ عصا بھی اس کے اندر تھا جو خدا کے عظیم الشان معجزات کا مظہر بنا تھا۔ (۸۱)

واقعہ نہر میں ان کی بے صبری کی مثال

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ
شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ
غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۔ (البقرہ ۔ آیت ۲۴۹)

ترجمہ: ”پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا، تو اس نے کہا ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمہاری آزمائش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پیئے گا وہ میرا ساتھی نہیں۔ میرا ساتھی صرف وہ ہے جو اس سے پیاس نہ بجھائے، ہاں ایک آدھ چلّو کوئی پی لے، تو پی لے۔ مگر ایک گروہِ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیراب ہوئے۔“

ممکن ہے اس سے مراد دریائے اُردن ہو یا کوئی اور ندی یا نالہ۔ طالوت بنی اسرائیل کے لشکر کو لے کر اس کے پار اترنا چاہتا تھا مگر چونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی قوم کے اندر اخلاقی انضباط بہت کم رہ گیا ہے، اس لیے اس نے کارآمد اور ناکارہ لوگوں کو ممیّز کرنے کے لیے یہ آزمائش تجویز کی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ تھوڑی دیر کے لیے اپنی پیاس تک ضبط نہ کر سکیں، ان پر کیا بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دشمن کے مقابلے میں پامردی دکھائیں گے جس سے پہلے ہی وہ شکست کھا چکے ہیں۔ (۸۲)

اسرائیلیوں کا جالوت پر غالب آنا

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ
بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ
قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَمَّا
بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا
وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۣ وَقَتَلَ دَاوٗدُ
جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَاۗءُ ۭ (البقرہ
آیات: ۲۴۹-۲۵۱)

ترجمہ: "پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انھوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے، انھوں نے کہا: بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے حکم سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔ اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ پر نکلے، تو انھوں نے دعا کی:۔

اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر، ہمارے قدم جمادے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔ آخر کار اللہ کے اذن سے انھوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا اس کو علم دیا۔"

حضرت داؤدؑ کی بہادری

داؤد علیہ السلام اُس وقت ایک کم سن نوجوان تھے۔ اتفاق سے طالوت کے لشکر میں عین اُس وقت پہنچے جب کہ فلسطیوں کی فوج کا گراں ڈیل پہلوان جالوت (جولیت) بنی اسرائیل کی فوج کو دعوتِ مبارزت دے رہا تھا اور اسرائیلیوں میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کے مقابلے کو نکلے۔ حضرت داؤدؑ یہ رنگ دیکھ کر بے محابا اُس کے مقابلے پر میدان میں جا پہنچے اور اس کو قتل کر دیا۔ اس واقعے نے انھیں تمام اسرائیلیوں کی آنکھ کا تارا بنا دیا۔ طالوت نے اپنی بیٹی بیاہ دی۔ اور آخر کار وہی اسرائیلیوں کے فرمانروا ہوئے۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سموئیل اول۔ باب ۱۷) (۸۳)

فصل ۲

غلبۂ فلسطین سے حملۂ بخت نصرؔ تک

(اس دور کا مجموعی جائزہ)

فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِىْ بَأْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ط وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ہ (بنی اسرائیل۔ آیت ۵)

ترجمہ: "آخر کار جب اُن میں سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا تو اے بنی اسرائیل ہم نے تمہارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا"

اس سے مراد وہ ہولناک تباہی ہے جو آشوریوں اور اہل بابل کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر نازل ہوئی۔ اس کا تاریخی پس منظر سمجھنے کے لیے ایک مختصر تاریخی بیان ضروری ہے تاکہ ایک طالب علم کے سامنے وہ تمام اسباب آجائیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک حامل کتاب قوم کو امامت اقوام کے منصب سے گرا کر ایک شکست خوردہ، غلام اور سخت پسماندہ قوم بنا کر رکھ دیا۔

فلسطین میں یہود کا ابتدائی دور

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف قومیں آباد تھیں، حِتّی، اَمُوری، کَنْعانی، فِرِزّی، حِوّی، یَبُوسی، فِلِستی وغیرہ۔ ان قوموں میں بدترین شرک پایا جاتا تھا۔ ان کے سب سے بڑے معبود کا نام ؔایلؔ تھا جسے یہ دیوتاؤں کا باپ کہتے تھے اور اسے عموماً سانڈ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ اس کی بیوی کا نام عشیرہ تھا۔ اور اس سے خداؤں اور خدائیوں کی پوری نسل چلی تھی، جس کی تعداد ۷۰ تک پہنچتی تھی۔ اس کی اولاد میں سب سے زبردست بَعل تھا۔ جس کو بارش اور روئیدگی کا خدا اور زمین و آسمان کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ شمالی علاقوں میں اس کی بیوی اُناث

کہلاتی تھی اور فلسطین میں عستارات۔ یہ دونوں خواتین عشق اور افزائش نسل کی دیویاں تھیں۔ ان کے علاوہ کوئی دیوتا موت کا مالک تھا، کسی دیوی کے قبضے میں صحت تھی، کسی دیوتا کو وبا اور قحط لانے کے اختیارات تفویض کیے گئے تھے، اور یوں ساری خدائی بہت سے معبودوں میں بٹ کر رہ گئی تھی۔ ان دیوتاؤں اور دیویوں کی طرف ایسے ایسے ذلیل اوصاف اور اعمال منسوب تھے کہ اخلاقی حیثیت سے بہت بدکردار انسان بھی ان کے ساتھ مشتہر ہونا پسند نہ کریں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسی کمینہ ہستیوں کو خدا بنائیں اور ان کی پرستش کریں وہ اخلاق کی ذلیل ترین پستیوں میں گرنے سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جو آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے دریافت ہوئے ہیں وہ شدید اخلاقی گراوٹ کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کے ہاں بچوں کی قربانی کا عام رواج تھا۔ ان کے معابد زنا کاری کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ عورتوں کو دیوداسیاں بنا کر عبادت گاہوں میں رکھنا اور ان سے بدکاری کرنا عبادت کے اجزا میں داخل تھا اور اسی طرح کی اور بہت سی بداخلاقیاں ان میں پھیلی ہوئی تھیں۔

توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو جو ہدایات دی گئی تھیں ان میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ تم ان قوموں کو ہلاک کر کے ان کے قبضے سے فلسطین کی سرزمین چھین لینا اور ان کے ساتھ رہنے بسنے اور ان کی اخلاقی و اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا۔

ہدایت کو فراموش کر دیا

لیکن بنی اسرائیل جب فلسطین میں داخل ہوئے تو وہ اس ہدایت کو بھول گئے۔ انھوں نے اپنی کوئی متحدہ سلطنت قائم نہ کی۔ وہ قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے۔ ان کے ہر قبیلے نے اس بات کو پسند کیا کہ مفتوح علاقے کا ایک حصہ لے کر الگ ہو جائے۔ اس تفرقے کی وجہ سے ان کا کوئی قبیلہ بھی اتنا طاقتور نہ ہو سکا کہ اپنے علاقے کو مشرکین سے پوری طرح پاک کر دیتا۔ آخر کار انھیں یہ گوارا کرنا پڑا کہ مشرکین ان کے ساتھ رہیں بسیں، نہ صرف یہ، بلکہ ان کے مفتوح علاقوں میں جگہ جگہ ان مشرک قوموں کی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں بھی موجود رہیں جن کو بنی اسرائیل مسخر نہ کر سکے۔

پہلا خمیازہ

اس کا پہلا خمیازہ تو بنی اسرائیل کو یہ بھگتنا پڑا کہ ان قوموں کے ذریعے سے ان کے اندر شرک گھس آیا، اور اس کے ساتھ بتدریج دوسری اخلاقی گندگیاں بھی راہ پانے لگیں۔ چنانچہ اس کی شکایت

بائبل کی کتاب قضاۃ میں یوں کی گئی ہے:

> "اور بنی اسرائیل نے خداوند کے آگے بدی کی اور بعلیم کی پرستش کرنے لگے۔ اور انھوں نے خداوند اپنے باپ دادا کے خدا کو جو انھیں ملک مصر سے نکال کر لایا تھا چھوڑ دیا اور دوسرے معبودوں کی جو ان کے گرداگرد کی قوموں کے دیوتاؤں میں سے تھے، پیروی کرنے اور ان کو سجدہ کرنے لگے اور خداوند کو غصہ دلایا۔ وہ خداوند کو چھوڑ کر عستارات کی پرستش کرنے لگے، اور خداوند کا قہر اسرائیل پر بھڑکا۔" (باب ۲۔ آیت ۱۱-۱۳)

دوسرا خمیازہ

اس کے بعد دوسرا خمیازہ انھیں یہ بھگتنا پڑا کہ جن قوموں کی شہری ریاستیں انھوں نے چھوڑ دی تھیں، انھوں نے اور فلستیوں نے، جن کا پورا علاقہ غیر مغلوب رہ گیا تھا، بنی اسرائیل کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور پے در پے حملے کر کے فلسطین کے بڑے حصے سے ان کو بے دخل کر دیا، حتّٰی کہ اُن سے خداوند کے عہد کا صندوق (تابوتِ سکینہ) تک چھین لیا۔ آخر بنی اسرائیل کو ایک فرمانروا کے تحت اپنی ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اُن کی درخواست پر حضرت سموئیل نبی نے ۱۰۲۰؁ قبل مسیح میں طالوت کو ان کا بادشاہ بنایا۔

اس متحدہ سلطنت کے تین فرمانروا ہوئے۔ طالوت (۱۰۲۰؁ تا ۱۰۰۴؁ ق م) حضرت داؤد علیہ السلام (۱۰۰۴؁ تا ۹۶۵؁ ق م) اور حضرت سلیمان علیہ السلام (۹۶۵؁ تا ۹۲۶؁ ق م) ان فرمانرواؤں نے اس کام کو مکمل کیا جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسٰی علیہ السلام کے بعد نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ صرف شمالی ساحل پر فنیقیوں کی اور جنوبی ساحل پر فلستیوں کی ریاستیں باقی رہ گئیں جنھیں مسخّر نہ کیا جا سکا اور محض باجگزار بنانے پر اکتفا کیا گیا۔

یہودی سلطنت دو ٹکڑوں میں بٹ گئی

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل پر دنیا پرستی کا پھر شدید غلبہ ہوا اور انھوں نے آپس میں لڑ کر اپنی دو الگ سلطنتیں قائم کر لیں۔ شمالی فلسطین اور شرقِ اردن میں سلطنتِ اسرائیل جس کا پایۂ تخت آخر کار سامریہ قرار پایا اور جنوبی فلسطین اور ادوم کے علاقے میں سلطنت یہودیہ جس کا پایہ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں سخت رقابت اور کشمکش اول روز سے شروع ہو گئی

اور آخر تک رہی۔

ان میں سے اسرائیلی ریاست کے فرمانروا اور باشندے ہمسایہ قوموں کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی فساد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اور یہ حالت اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب اس ریاست کے فرمانروا اخی اب نے صیدا کی مشرک شہزادی ایزبل سے شادی کر لی۔ اس وقت حکومت کی طاقت اور ذرائع سے شرک اور بداخلاقیاں سیلاب کی طرح اسرائیلیوں میں پھیلنی شروع ہوئیں۔ حضرت الیاسؑ[1] اور حضرت الیسع علیہما السلام نے اس سیلاب کو روکنے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر یہ قوم جس تنزل کی طرف جا رہی تھی اس سے باز نہ آئی۔ آخرکار اللہ کا غضب اشوریوں کی شکل میں دولت اسرائیل کی طرف متوجہ ہوا اور نویں صدی قبل مسیح سے فلسطین پر اشوری فاتحین کے مسلسل حملے شروع ہو گئے۔

ریاست سامریہ پر کیا گزری

اس دور میں عاموس نبی (۷۶۰ تا ۷۴۶ ق م) اور پھر ہوسیع نبی (۷۴۷ تا ۷۳۵ ق م) نے اٹھ کر اسرائیلیوں کو پے درپے تنبیہات کیں۔ مگر جس غفلت کے نشے میں وہ سرشار تھے، وہ تنبیہ کی ترشی سے اور زیادہ تیز ہو گیا، یہاں تک کہ عاموس نبی کو شاہ اسرائیل نے ملک سے نکل جانے اور دولت سامریہ کی حدود میں اپنی نبوت بند کر دینے کا نوٹس دے دیا۔ اس کے بعد کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ خدا کا عذاب اسرائیلی سلطنت اور اس کے باشندوں پر ٹوٹ پڑا۔ ۷۲۱ قبل مسیح میں اشور کے سخت گیر فرمانروا سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے دولت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا۔ ہزارہا اسرائیلی تہ تیغ کیے گئے۔ ۲۷ ہزار سے زیادہ بااثر اسرائیلیوں کو ملک سے نکال کر اشوری سلطنت کے مشرقی اضلاع میں تتر بتر کر دیا گیا۔ اور دوسرے علاقوں سے لا کر غیر قوموں کو اسرائیل کے علاقے میں بسایا گیا جن کے درمیان رہ بس کر بچا کھچا اسرائیلی عنصر بھی اپنی قومی تہذیب سے روز بروز زیادہ بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

یہودیہ پر بُخت نَصّر کا تباہ کن حملہ

بنی اسرائیل کی دوسری ریاست جو یہودیہ کے نام سے جنوبی فلسطین میں قائم ہوئی وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بہت جلدی شرک اور بداخلاقی میں مبتلا ہو گئی۔ لیکن نسبتاً اس کا اخلاقی زوال

---

[1] ان کی اصلاحی اور انتہائی کوششوں کی تفصیل اگلی فصل میں دی جا رہی ہے۔ (مرتبین)

دولتِ اسرائیل کی بہ نسبت سست رفتار تھا، اس لیے اس کو مہلت بھی کچھ زیادہ دی گئی۔ اگرچہ دولتِ اسرائیل کی طرح اس پر بھی اشوریوں نے پے درپے حملے کیے، اس کے شہروں کو تباہ کیا، اس کے پایۂ تخت کا محاصرہ کیا، لیکن یہ ریاست اشوریوں کے ہاتھوں ختم نہ ہو سکی بلکہ صرف باج گزار بن کر رہ گئی۔ پھر جب حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہودیہ کے لوگ بت پرستی اور بداخلاقیوں سے باز نہ آئے تو ۵۹۸ء قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نَصَّر نے یروشلم سمیت پوری دولت یہودیہ کو مسخر کر لیا۔ اور یہودیہ کا بادشاہ اس کے پاس قیدی بن کر رہا۔ یہودیوں کی بداعمالیوں کا سلسلہ اس پر بھی بند نہ ہوا اور حضرت یرمیاہ کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے اعمال درست کرنے کے بجائے بابل کے خلاف بغاوت کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر ۵۸۷ء قبل مسیح میں بخت نَصَّر نے ایک سخت حملہ کر کے یہودیہ کے تمام بڑے چھوٹے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یروشلم اور ہیکلِ سلیمانی کو اس طرح پیوندِ خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی۔ یہودیوں کی بہت بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک ملک میں تتر بتر کر دیا، اور جو یہودی اپنے علاقے میں رہ گئے وہ بھی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں بری طرح ذلیل اور پامال ہو کر رہے۔ یہ تھا وہ پہلا فساد جس سے بنی اسرائیل کو متنبہ کیا گیا تھا۔ اور یہ تھی وہ پہلی سزا جو اس کی پاداش میں ان کو دی گئی۔ (۱۸۳)

فصل ۳

حضرت الیاسؑ کی اصلاحی اور انتباہی مساعی

بنی اسرائیل کے جلیل القدر نبی

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝ (الصّٰفّٰت - آیت ۱۲۹)

ترجمہ: "اور الیاس کا ذکر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا"

حضرت الیاس علیہ السلام کو ان کی زندگی میں تو بنی اسرائیل نے جیسا کچھ ستایا اس کی داستان اوپر گزر چکی ہے۔ مگر بعد میں وہ ان کے ایسے گرویدہ و شیفتہ ہوئے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد کم ہی لوگوں کو انھوں نے ان سے بڑھ کر جلیل القدر مانا ہوگا۔ ان کے ہاں مشہور ہو گیا کہ الیاسؑ علیہ السلام ایک بگولے میں آسمان پر زندہ اٹھا لیے گئے ہیں۔ (۲۔ سلاطین، باب دوم) اور یہ کہ وہ پھر دنیا میں تشریف لائیں گے۔ چنانچہ بائیبل کی کتاب ملاکی میں لکھا ہے لہ (۸۴ب)

"دیکھو، خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پہلے میں ایلیاہ نبی کو تمھارے پاس بھیجوں گا" (۴: ۵)

لہ حضرت یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام کی بعثت کے زمانہ میں یہودی بالعموم تین آنے والوں کے منتظر تھے۔ ایک حضرت الیاسؑ دوسرے مسیحؑ۔ تیسرے "وہ نبی" (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)۔ جب حضرت یحییٰؑ کی نبوت شروع ہوئی تو انھوں نے لوگوں کو اصطباغ دینا شروع کیا تو یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں نے ان کے پاس جا کر پوچھا کیا تم مسیح ہو؟ انھوں نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا تم ایلیاہ (الیاس) ہو؟ انھوں نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا تم "وہ نبی" ہو؟ انھوں نے کہا میں وہ بھی نہیں ہوں، تب انھوں نے کہا اگر تم نہ مسیح ہو، نہ ایلیاہ ہو، اور نہ "وہ نبی" تو پھر تم بپتسمہ کیوں دیتے ہو؟ (یوحنا ۱: ۱۹-۲۶) پھر کچھ مدت بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا غلغلہ بلند ہوا تو یہودیوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ شاید ایلیاہ

(باقی بر صفحہ)

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اَتَدْعُوْنَ
بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ۝ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝
فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ
فِى الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۔

(الصّٰفّٰت ۔ آیات ۱۲۳ تا ۱۳۱)

ترجمہ: "اور الیاس بھی یقیناً مرسلین میں سے تھا۔ یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "تم لوگ ڈرتے نہیں ہو؟ کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو، اس اللہ کو جو تمھارا اور تمھارے اگلے پچھلے آباؤاجداد کا رب ہے"؟ مگر انھوں نے اسے جھٹلا دیا۔ سو اب یقیناً وہ سزا کے لیے پیش کیے جانے والے ہیں۔ بجز ان بندگانِ خدا کے جن کو خالص کر لیا گیا تھا۔ اور الیاس کا ذکرِ خیر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا۔ سلام ہے ال یاس پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔"

حضرت الیاس علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں صرف دو ہی مقامات پر آیا ہے۔ ایک یہ مقام اور دوسرا سورۂ انعام آیت ۸۵۔ موجودہ زمانے کے محققین ان کا زمانہ ۸۷۵؁ اور ۸۵۰؁ ق م کے درمیان متعین کرتے ہیں۔ وہ جلعاد کے رہنے والے تھے (قدیم زمانے میں جلعاد اس علاقے کو کہتے تھے، جو آج کل موجودہ ریاست اُردن کے شمالی اضلاع پر مشتمل ہے اور دریائے یرموک کے جنوب میں واقع ہے) بائبل میں ان کا ذکر ایلیاہ تشبی (ELIJAH THE TISHBITE) کے نام سے کیا گیا ہے۔ ان کے مختصر حالات حسب ذیل ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

نبی (یعنی حضرت الیاس) آ گئے ہیں (مرقس ۶: ۱۴-۱۵) خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں بھی یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ ایلیاہ نبی آنے والے ہیں مگر حضرت نے یہ فرما کر ان کی غلط فہمی کو رفع فرمایا کہ "ایلیاہ تو آ چکا، اور لوگوں نے اسے نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا"۔ اس سے حواری خود جان گئے کہ دراصل آنے والے حضرت یحییٰ تھے نہ کہ آٹھ سو برس پہلے گزرے ہوئے حضرت الیاس (متی ۱۱: ۱۴ اور متی ۱۷: ۱۰-۱۳) (۸۵)

بائبل میں حضرت الیاسؑ کا تذکرہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے بیٹے رُحبُعام (REHOBAAM) کی نااہلی کے باعث بنی اسرائیل کی سلطنت دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک حصہ جو بیت المقدس اور جنوبی فلسطین پر مشتمل تھا، آلِ داؤد کے قبضے میں رہا، اور دوسرا حصہ جو شمالی فلسطین پر مشتمل تھا۔ اس میں ایک مستقل ریاست اسرائیل کے نام سے قائم ہو گئی اور بعد میں سامریہ اس کا صدر مقام قرار پایا۔ اگرچہ حالات دونوں ہی ریاستوں کے دگرگوں تھے لیکن اسرائیل کی ریاست شروع ہی سے ایسے سخت بگاڑ کی راہ پر چل پڑی تھی، جس کی بدولت اس میں شرک و بت پرستی اور ظلم و ستم اور فسق و فجور کا زور بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جب اسرائیل کے بادشاہ اَخی اَب (AHAB) نے صیدا (موجودہ لبنان) کے بادشاہ کی لڑکی ایزبل (IEZEBAL) سے شادی کر لی تو یہ فساد اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اس مشرک شہزادی کے اثر میں آکر اَخی اَب خود بھی مشرک ہو گیا۔ اس نے سامریہ میں بَعل کا مندر اور مذبح تعمیر کیا، خدائے واحد کی پرستش کے بجائے بَعل کی پرستش رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اسرائیل کے شہروں میں علانیہ بَعل کے نام پر قربانیاں کی جانے لگیں۔

حضرت الیاسؑ کی دعوتِ انتباہ اور معجزات

یہی زمانہ تھا جب الیاس علیہ السلام یکایک منظرِ عام پر نمودار ہوئے اور انھوں نے بلعاد سے آکر اَخی اَب کو نوٹس دیا کہ تیرے گناہوں کی پاداش میں اب اسرائیل کے ملک پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسے گا حتیٰ کہ اوس تک نہ پڑے گی۔ خدا کے نبی کا یہ قول حرف بحرف صحیح ثابت ہوا اور ساڑھے تین سال بارش بالکل بند رہی۔ آخر کار اَخی اَب کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے اور انھوں نے حضرت الیاسؑ کو تلاش کرا کے بلوایا۔ انھوں نے بارش کے لیے دعا کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ اسرائیل کے باشندوں کو اللہ ربّ العالمین اور بَعل کا فرق اچھی طرح بتا دیں۔ اس غرض کے لیے انھوں نے حکم دیا کہ ایک مجمع عام میں بعل کے پجاری بھی آکر اپنے معبود کے نام پر قربانی کریں اور میں بھی اللہ ربّ العالمین کے نام پر قربانی کروں گا، دونوں میں سے کسی کی قربانی بھی انسان کے ہاتھوں سے آگ لگائے بغیر غیبی آگ سے بھسم ہو جائے، اس کے معبود کی سچائی ثابت ہو جائے گی۔ اخی اب نے نے یہ بات قبول کر لی۔ چنانچہ کوہ کرمل (CARMEL) پر بعل کے ساڑھے آٹھ سو پجاری جمع ہوئے

اور اسرائیلیوں کے مجمعِ عام میں ان کا اور حضرت الیاس علیہ السلام کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں بعل پرستوں نے شکست کھائی۔ اور حضرت الیاسؑ نے سب کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ بعل ایک جھوٹا خدا ہے، اصل خدا وہی ایک اکیلا خدا ہے جس کے نبی کی حیثیت سے وہ مامور ہو کر آئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت الیاسؑ نے اسی مجمعِ عام میں بعل کے پجاریوں کو قتل کرا دیا اور پھر بارش کے لیے دعا کی جو فوراً قبول ہوئی۔ یہاں تک کہ پورا ملکِ اسرائیل سیراب ہو گیا۔

حضرت الیاسؑ کو ملک بدر کر دیا گیا

لیکن ان معجزات کو دیکھ کر بھی زن مرید اَخی اَب اپنی بت پرست بیوی کے شکنجے سے نہ نکلا۔ اس کی بیوی ایزبل حضرت الیاسؑ کی دشمن ہو گئی اور اس نے قسم کھائی کہ جس طرح بعل کے پجاری قتل کیے گئے ہیں۔ اسی طرح الیاس علیہ السلام بھی قتل کیے جائیں گے۔ ان حالات میں حضرت الیاسؑ کو ملک چھوڑنا پڑا۔ اور چند سال تک وہ کوہِ سینا کے دامن میں پناہ گزیں رہے۔ اس موقع پر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے جو فریاد کی تھی۔ اسے بائیبل ان الفاظ میں نقل کرتی ہے:

> "بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا اور تیرے مذبحوں کو ڈھا دیا اور تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا۔ اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔" (۱ سلاطین ۱۹ : ۱)

یہودیہ میں حضرت الیاسؑ کی دعوتی مہم

اسی زمانہ میں بیتُ المَقدِس کی یہودی ریاست کے فرمانروا یہورام (JEHORAM) نے اسرائیل کے بادشاہ اَخی اَب کی بیٹی سے شادی کر لی اور مشرک شہزادی کے اثر سے وہی تمام خرابیاں جو اسرائیل میں پھیلی ہوئی تھیں، یہودیہ کی ریاست میں بھی پھیلنے لگیں۔ حضرت الیاسؑ نے یہاں بھی فریضۂ نبوت ادا کیا اور یہورام کو ایک خط لکھا جس کے الفاظ بائیبل میں نقل ہوئے ہیں:

> "خداوند تیرے باپ داؤد کا یوں فرماتا ہے، اس لیے کہ تو نہ اپنے باپ یہوسفط کی راہوں پر چلا اور نہ یہوداہ کے بادشاہ آسا کی راہوں پر چلا۔ بلکہ اسرائیل کے بادشاہوں کی راہوں پر چلا ہے۔ اور یہوداہ اور یروشلم کے باشندوں کو زنا کار بنایا جیسا اَخی اَب کے خاندان نے کیا تھا اور اپنے باپ کے گھرانے میں سے اپنے بھائیوں کو جو تجھ سے

اچھے تھے، قتل بھی کیا، سو دیکھ خداوند تیرے لوگوں کو اور تیری بیویوں کو اور تیرے سارے مال کو بڑی آفتوں سے مارے گا اور تو انتڑیوں کے مرض سے سخت بیمار ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ تیری انتڑیاں اس مرض کے سبب سے روز بروز نکلتی چلی جائیں گی۔" (۲۔تواریخ ۲۱: ۱۲-۱۵)

حضرت الیاسؑ کی پیشینگوئی پوری ہو کے رہی

اس خط میں حضرت الیاسؑ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ پورا ہوا۔ پہلے یہورام کی ریاست بیرونی حملہ آوروں کی تاخت سے تباہ ہوئی اور اس کی بیویوں تک کو دشمن پکڑ کرلے گئے۔ پھر وہ خود انتڑیوں کے مرض سے ہلاک ہوا۔

چند سال کے بعد حضرت الیاسؑ پھر اسرائیل تشریف لے گئے اور انھوں نے اخی اَب کو، اور اس کے بعد اس کے بیٹے اخزیاہ کو راہِ راست پر لانے کی مسلسل کوشش کی، مگر جو بدی سامریہ کے شاہی خاندان میں گھر کر چکی تھی وہ کسی طرح نہ نکلی۔ آخر حضرت کی بددعا سے اَخی اَب کا گھرانا ختم ہو گیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دنیا سے اٹھا لیا۔

ان واقعات کی تفصیل کے لیے بائبل کے حسب ذیل ابواب ملاحظہ ہوں:۔ ۱۔سلاطین، باب ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۱ ۔ ۲ سلاطین باب ۱-۲؛ تواریخ باب ۱۲-(۸۶)

یہودیوں کے دیوتا بَعل

بعل کے لغوی معنی آقا، سردار اور مالک کے ہیں۔ شوہر کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا۔ اور متعدد مقامات پر خود قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے، مثلاً سورۃ بقرہ آیت ۲۲۸، سورۃ نساء آیت ۱۲۷، سورۃ ہود آیت ۷۲، اور سورۃ نور آیت ۳۱ میں۔ لیکن قدیم زمانے کی سامی اقوام اس لفظ کو الٰہ یا خداوند کے معنی میں استعمال کرتی تھیں، اور انھوں نے ایک خاص دیوتا کو بعل کے نام سے موسوم کر رکھا تھا، خصوصیت کے ساتھ لبنان کی فینیقی قوم (PHOENICIANS) کا سب سے بڑا نر دیوتا بعل تھا اور اس کی بیوی عستارات (ASHTORETH) ان کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ محققین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا بعل سے مراد سورج ہے یا مشتری، اور عستارات سے مراد چاند ہے یا زہرہ۔ بہر حال یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ بابل سے لے کر مصر تک پورے مشرقِ اوسط میں بعل پرستی پھیلی ہوئی تھی، اور خصوصاً لبنان، اور شام و فلسطین کی مشرک اقوام بری طرح اس میں مبتلا تھیں۔ بنی اسرائیل جب مصر

سے نکلنے کے بعد فلسطین اور شرقِ اردن میں آکر آباد ہوئے، اور تورات کے سخت امتناعی احکام کی خلاف ورزی کرکے انھوں نے ان مشرک قوموں کے ساتھ شادی بیاہ اور معاشرت کے تعلقات قائم کرنے شروع کر دیے، تو ان کے اندر بھی یہ مرض پھیلنے لگا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفۂ اول حضرت یوشع بن نون کی وفات کے بعد ہی بنی اسرائیل میں یہ اخلاقی حس و دینی زوال رُونما ہونا شروع ہو گیا تھا۔

> ”اور بنی اسرائیل نے خدا کے آگے بدی کی اور بعلیم کی پرستش کرنے لگے …… …… اور وہ خداوند کو چھوڑ کر بعل اور عستارات کی پرستش کرنے لگے۔“ (قضاۃ ۲ : ۱۱ - ۱۲)

> ”سو بنی اسرائیل کنعانیوں اور حِتّیوں اور اموریوں اور فرزیوں اور حِوّیوں اور یبوسیوں کے درمیان بس گئے اور ان کی بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو دینے اور ان کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے۔“ (قضاۃ ۲ : ۵ - ۶)

اس زمانہ میں بعل پرستی اسرائیلیوں میں اس قدر گھس چکی تھی کہ بائیبل کے بیان کے مطابق ان کی ایک بستی میں علانیہ بعل کا مذبح بنا ہوا تھا جس پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ایک خدا پرست اسرائیلی اس حالت کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے رات کے وقت چپکے سے یہ مذبح توڑ دیا۔ دوسرے روز ایک مجمع کثیر اکٹھا ہو گیا اور اس شخص کے قتل کا مطالبہ کرنے لگا، جس نے شرک کے اس اڈے کو توڑا تھا (قضاۃ ۶ : ۲۵ - ۳۲) اس صورتِ حال کو آخر کار حضرت سموئیل، طالوت، داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے ختم کیا اور نہ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کی، بلکہ اپنی مملکت میں بالعموم شرک و بت پرستی کو دبا دیا، لیکن حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد یہ فتنہ پھر اُبھرا اور خاص طور پر شمالی فلسطین کی اسرائیلی ریاست بعل پرستی کے سیلاب میں بہہ گئی۔ (۸۷)

فصل ۴

دَورِ داؤدی و سلیمانی میں یہود کا عرُوج

حضرت داؤدؑ کے دور میں فولادی صنعت

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۔ (الانبیاء۔ آیت ۸۰)

ترجمہ: "اور ہم نے تمہارے فائدے کے لیے اس کو زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے۔ پھر کیا تم شکر گزار ہو؟"

سورۂ سبا میں اس کی مزید تفصیل یہ ہے:

وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۙ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِی السَّرْدِ ۔ (آیت ۱۱)

ترجمہ: "اور ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا (اور اس کی ہدایت کی) کہ پوری پوری زرہیں بنا اور ٹھیک اندازے سے کڑیاں جوڑ۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو لوہے کے استعمال پر قدرت عطا کی تھی اور خاص طور پر جنگی اغراض کے لیے زرہ سازی کا طریقہ سکھایا تھا۔

لوہے کے استعمال کا دور جدید تحقیقات کی روشنی میں

موجودہ زمانے کی تاریخی و اثری تحقیقات سے ان آیات کے معنی پر جو روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں لوہے کے استعمال کا دَور (IRON AGE) ۱۲۰۰؁ اور ۱۰۰۰؁ ق م کے درمیان شروع ہوا ہے، اور یہی حضرت داؤدؑ کا زمانہ ہے۔ اوّل اوّل شام اور ایشیائے کوچک کی حِتّی قوم (HITTITES) کو لوہے کے پگھلانے اور تیار کرنے کا ایک پیچیدہ طریقہ معلوم ہوا اور وہ شدّت کے ساتھ دنیا بھر سے اسے راز میں رکھے رہی۔ مگر اس طریقے سے جو لوہا تیار ہوتا تھا وہ سونے چاندی کی طرح اتنا قیمتی ہوتا

تھا کہ عام استعمال میں نہ آسکتا تھا۔ بعد میں فلستیوں نے یہ طریقہ معلوم کر لیا، اور وہ بھی اسے راز ہی میں رکھتے رہے۔ طالوت کی بادشاہی سے پہلے حتّیوں اور فلستیوں نے بنی اسرائیل کو پیہم شکستیں دے کر جس طرح فلسطین سے تقریباً بے دخل کر دیا تھا، بائبل کے بیان کے مطابق اس کے وجوہ میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ یہ لوگ لوہے کی رتھیں استعمال کرتے تھے اور ان کے پاس دوسرے آہنی ہتھیار بھی تھے (یشوع باب ۱۷۔ آیت ۱۶۔ قضاۃ باب ۱۔ آیت ۱۹۔ باب ۴۔ آیت ۲۔۳) سنہ ۱۰۲۰ ق م میں جب طالوت خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کا فرمانروا بنا تو اس نے پیہم شکستیں دے کر ان لوگوں سے فلسطین کا بڑا حصہ واپس لے لیا اور پھر حضرت داؤدؑ (سنہ ۱۰۰۴ تا سنہ ۹۶۵ ق م) نے نہ صرف فلسطین و شرقِ اُردن، بلکہ شام کے بھی بڑے حصے پر اسرائیلی سلطنت قائم کر دی۔ اس زمانے میں آہن سازی کا وہ راز جو حتّیوں اور فلستیوں کے قبضے میں تھا بے نقاب ہو گیا اور صرف بے نقاب ہی نہ ہوا بلکہ آہن سازی کے ایسے طریقے بھی نکل آئے جن سے عام استعمال کے لیے لوہے کی سستی چیزیں تیار ہونے لگیں۔ فلسطین کے جنوب میں اُدُوم کا علاقہ خام لوہے (IRON ORE) کی دولت سے مالا مال ہے اور حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں ان میں بکثرت ایسی جگہوں کے آثار ملے ہیں جہاں لوہا پگھلانے کی بھٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ عُقبہ اور اَیلَہ سے متصل حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کی بندرگاہ عصیون جابر کے آثارِ قدیمہ میں جو بھٹی ملی ہے اس کے معائنے سے اندازہ کیا گیا ہے کہ اس میں بعض وہ اصول استعمال کیے جاتے ہیں جو آج جدید ترین زمانے کی (BLAST FURNACE) میں استعمال ہوتے ہیں۔ اب یہ ایک قدرتی بات ہے کہ حضرت داؤدؑ نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اس جدید دریافت کو جنگی اغراض کے لیے استعمال کیا ہوگا کیونکہ تھوڑی ہی مدت پہلے آس پاس کی دشمن قوموں نے اسی لوہے کے ہتھیاروں سے ان کی قوم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ (۸۸)

حضرت سلیمانؑ کا دورِ نبوت و حکومت

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ
وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ (النمل۔ ۱۶)

ترجمہ: "اور داؤدؑ کا وارث[1] سلیمانؑ ہوا اور اس نے کہا۔ لوگو! ہمیں پرندوں کی

---

[1] وراثت سے مراد مال و جائداد کی وراثت نہیں بلکہ نبوت اور خلافت میں حضرت داؤدؑ کی (باقی برصفحہ)

بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں بے شک یہ (اللہ کا) نمایاں فضل ہے۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤدؑ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کا اصل عبرانی نام سولومون تھا جو سلیمؑ کا ہم معنی ہے۔ ۹۶۵ء قبل مسیح میں حضرت داؤدؑ کے جانشین ہوئے اور ۹۲۶ء قم تک تقریباً ۴۰ سال فرمانروا رہے۔ ان کی حدودِ سلطنت کے متعلق ہمارے مفسّرین نے بہت مبالغہ سے کام لیا ہے وہ انھیں دنیا کے بہت بڑے حصے کا حکمران بتاتے ہیں، حالانکہ ان کی مملکت صرف فلسطین اور شرقِ اُردن پر مشتمل تھی اور شام کا ایک حصہ بھی اس میں شامل تھا۔ (۸۹)

ہوائی تسخیر اور بحری بیڑہ

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِىْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۚ وَكُنَّا بِكُلِّ شَىْءٍ عٰلِمِيْنَ (الانبیاء ۸۱)

ترجمہ: "اور سلیمانؑ کے لیے ہم نے تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔ ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے ہیں۔"

اس کی تفصیل سورہ سبا میں یہ آئی ہے: وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ "اور سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، ایک مہینے کی راہ تک اس کا چلنا صبح کو اور ایک مہینے کی راہ تک اس کا چلنا شام کو۔" پھر اس کی مزید تفصیل سورہ صٓ میں یہ آئی ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِىْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ "پس ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے بسہولت چلتی تھی جدھر وہ جانا چاہتا۔" اس سے معلوم ہوا کہ ہوا کو حضرت سلیمانؑ کے لیے اس طرح

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جانشینی ہے۔ مال و جائداد کی میراث اگر بالفرض منتقل ہوئی بھی تو وہ تنہا حضرت سلیمانؑ ہی کی طرف منتقل نہیں ہو سکتی تھی۔ حضرت داؤدؑ کی دوسری اولاد بھی موجود تھی۔

اس لیے اس آیت کو اس حدیث کی تردید میں پیش نہیں کیا جا سکتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ "ہم انبیاء کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی، جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے" (بخاری، کتاب فرض الخمس) اور ان النبی لایورث انما میراثہ فی فقراء المسلمین والمساکین "نبی کا وارث کوئی نہیں ہوتا، جو کچھ وہ چھوڑتا ہے وہ مسلمانوں کے فقراء اور مساکین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔" (مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیقؓ حدیث ۶۰، ۷۸) (۹۰)

تابع امر کر دیا گیا تھا کہ ان کی مملکت سے ایک مہینے کی راہ تک کے مقامات کا سفر بسہولت کیا جا سکتا تھا۔ جانے میں بھی ہمیشہ ان کی مرضی کے مطابق بادِ موافق ملتی تھی اور واپسی پر بھی۔ بائیبل اور جدید تاریخی تحقیقات سے اس مضمون پر جو روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے دورِ سلطنت میں بہت بڑے پیمانے پر بحری تجارت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ایک طرف عِصیُون جابر سے ان کے تجارتی جہاز بحرِ احمر میں یمن اور دوسرے جنوبی و مشرقی ممالک کی طرف جاتے تھے، اور دوسری طرف بحرِ روم کی بندرگاہوں سے ان کا بیڑہ (جسے بائیبل میں "ترسیسی بیڑہ" کہا گیا ہے) مغربی ممالک کی طرف جایا کرتا تھا۔ عِصیُون جابر میں ان کے زمانے کی جو عظیم الشان بھٹی ملی ہے اس کے مقابلے کی کوئی بھٹی مغربی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ میں ابھی تک نہیں ملی۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہاں ادوم کے علاقہ عَرَبہ کی کانوں سے خام لوہا اور تانبا لایا جاتا تھا اور اس بھٹی میں پگھلا کر اسے دوسرے کاموں کے علاوہ جہاز سازی میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے قرآن مجید کی اس آیت کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے جو سورۂ سبا میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق آئی ہے کہ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ" اور ہم نے اس کے لیے پگھلی ہوئی دھات کا چشمہ بہا دیا۔" نیز اس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے لیے ایک مہینے کی راہ تک ہوا کی رفتار کو "مسخر" کرنے کا کیا مطلب ہے۔ اس زمانے میں بحری سفر کا سارا انحصار بادِ موافق ملنے پر تھا، اور اللہ تعالیٰ کا حضرت سلیمانؑ پر یہ کرمِ خاص تھا کہ وہ ہمیشہ ان کے دونوں بحری بیڑوں کو ان کی مرضی کے مطابق ملتی تھی۔ تاہم اگر ہوا پر حضرت سلیمانؑ کو حکم چلانے کا بھی کوئی اقتدار دیا گیا ہو، جیسا کہ تَجْرِىْ بِاَمْرِهٖ (اس کے حکم سے چلتی تھی) کے ظاہر الفاظ سے مترشح ہوتا ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں ہے۔ وہ اپنی مملکت کا آپ مالک ہے۔ اپنے جس بندے کو جو اختیارات چاہے دے سکتا ہے، جب وہ خود کسی کو کوئی اختیار دے تو ہمارا دل دکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ (۹۱)

حضرت سلیمانؑ کے لیے تسخیرِ جنّات

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ (الانبیاء ۸۲)

ترجمہ: "اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو اس کا تابع بنا دیا تھا جو اس

کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے ان سب کے نگران ہم ہی تھے۔"

سورۂ سبا میں اس کی تفصیل یہ آئی ہے۔

وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهٖ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا
نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ
تَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ...... فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ
الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ إِلَّا دَآبَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ
تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ

ترجمہ: "اور جنوں میں سے ایسے جن ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیے تھے جو اس کے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے اور جو ہمارے حکم سے کوئی ان میں سے انحراف کرتا تو ہم اس کو بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھاتے وہ اس کے لیے جیسے وہ چاہتا قصر اور مجسمے اور حوض جیسے بڑے بڑے لگن اور بھاری جمی ہوئی دیگیں بناتے تھے —— پھر جب ہم نے سلیمانؑ کو وفات دے دی تو ان جنوں کو پتہ چل گیا کہ اگر وہ واقعی غیب دان ہوتے تو اس ذلّت کے عذاب میں اتنی مدت مبتلا نہ رہتے۔"

اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو شیاطین حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخّر ہوئے تھے، اور جو ان کے لیے مختلف خدمات انجام دیتے تھے، وہ جن تھے، اور جن بھی وہ جن جن کے بارے میں مشرکین عرب کا عقیدہ تھا، اور جو خود اپنے بارے میں بھی یہ غلط فہمی رکھتے تھے کہ ان کو علمِ غیب حاصل ہے۔ اب ہر شخص جو قرآن کو آنکھیں کھول کر پڑھے، اور اس کو اپنے تعصبات اور پیشگی قائم کیے ہوئے نظریات کا تابع بنائے بغیر پڑھے، یہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جہاں قرآن مطلق "شیطان" اور "جن" کے الفاظ استعمال کرتا ہے وہاں اس کی مراد کون سی مخلوق ہے اور قرآن کی رُو سے وہ کون سے جن ہیں جن کو مشرکین عرب عالم الغیب سمجھتے تھے۔

جدید زمانے کا ایک مغالطہ

جدید زمانے کے مفسّرین یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں کہ وہ جن اور شیاطین جو حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخّر کیے گئے تھے، انسان تھے اور آس پاس کی قوموں میں سے فراہم ہوئے تھے۔

لیکن صرف یہی نہیں کہ قرآن کے الفاظ میں ان کی اس تاویل کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ قرآن میں جہاں جہاں بھی یہ قصہ آیا ہے وہاں کا سیاق و سباق اور اندازِ بیان اس تاویل کو راہ دینے سے صاف انکار کرتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے لیے عمارتیں بنانے والے اگر انسان ہی تھے تو آخر یہ انہی کی کون سی خصوصیت تھی جس کو اس شان سے قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ اہرامِ مصری سے لے کر نیویارک کی فلک شگاف عمارتوں تک کس چیز کو انسان نے نہیں بنایا ہے اور کس بادشاہ یا رئیس یا ملک التجار کے لیے وہ جن اور شیاطین فراہم نہیں ہوئے جو آپ حضرت سلیمانؑ کے لیے فراہم کر رہے ہیں۔ (۹۲)

ملکۂ سبا کا ایمان لانا

قِيۡلَ لَهَا ادۡخُلِي الصَّرۡحَ فَلَمَّا رَاَتۡهُ حَسِبَتۡهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتۡ عَنۡ سَاقَيۡهَا
قَالَ اِنَّهٗ صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِيۡرَ (النمل' آیت ۴۴)

ترجمہ: ”اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اترنے کے لیے اس نے اپنے پائنچے اٹھا لیے، سلیمانؑ نے کہا یہ شیشے کا چکنا فرش ہے۔“

یہ آخری چیز جس نے ملکہ کی آنکھیں کھول دیں۔ پہلی چیز حضرت سلیمانؑ کا وہ خط تھا جو عام بادشاہوں کے طریقے سے ہٹ کر اللہ رحمان و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا تھا۔ دوسری چیز اس کے بیش قیمت تحفوں کو رد کرنا تھا جس سے ملکہ کو اندازہ ہوا کہ یہ بادشاہ کسی اور طرز کا ہے۔ تیسری چیز ملکہ کی سفارت کا بیان تھا جس سے اس کو حضرت سلیمانؑ کی متقیانہ زندگی، ان کی حکمت اور ان کی دعوتِ حق کا علم ہوا۔ اسی چیز نے اسے آمادہ کیا کہ خود چل کر ان سے ملاقات کرے اور اسی کی طرف اس نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا کہ ”ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم مسلم ہو چکے تھے“، چوتھی چیز اس عظیم الشان تخت کا آناً فاناً مآرب سے بیت المقدس پہنچ جانا تھا جس سے ملکہ کو معلوم ہوا کہ اس شخص کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت ہے۔ اور اب آخری چیز یہ تھی کہ اس نے دیکھا جو شخص یہ سامانِ عیش و تنعّم رکھتا ہے اور ایسے شاندار محل میں رہتا ہے وہ کس قدر غرورِ نفس سے پاک ہے، کتنا خدا ترس اور نیک نفس ہے۔ کس طرح بات بات پر اس کا سر خدا کے آگے شکر گزاری میں جھکا جاتا ہے، اور اس کی زندگی فریفتگانِ حیاتِ دنیا کی زندگی سے کتنی مختلف ہے۔ یہی چیز تھی جس نے اسے وہ کچھ پکار اٹھنے پر مجبور کر دیا آگے اس کی زبان سے نقل کیا گیا ہے۔ (۹۳)

قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

(النمل: آیت ۴۴)

ترجمہ: "اس پر وہ پکار اٹھی، "اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی، اور اب میں نے سلیمانؑ کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کرلی"۔

حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کا یہ قصہ بائیبل کے عہدِ عتیق و جدید اور روایاتِ یہود، سب میں مختلف طریقوں سے آیا ہے۔ مگر قرآن کا بیان ان سب سے مختلف ہے۔

عہدِ عتیق میں مذکورہ قصے کا خلاصہ

عہدِ عتیق میں اس قصے کا خلاصہ یہ ہے:

"اور جب سبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمانؑ کی شہرت سنی تو وہ آئی تاکہ مشکل سوالوں سے اسے آزمائے اور وہ بہت بڑی جلو کے ساتھ یروشلم میں آئی ـــــ جب وہ سلیمانؑ کے پاس پہنچی تو اس نے ان سب باتوں کے بارہ میں جو اس کے دل میں تھیں اس سے گفتگو کی۔ سلیمانؑ نے ان سب کا جواب دیا ـــ اور جب سبا کی ملکہ نے سلیمانؑ کی ساری حکمت اور اس کے محل کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان کی نعمتوں اور اس کے ملازموں کی نشست اور ان کے خادموں کی حاضرباشی اور ان کی پوشاک اور اس کے ساقیوں اور اس کی سیڑھی کو جس سے وہ خداوند کے گھر کو جاتا تھا۔ دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ سچی خبر تھی جو میں نے تیرے کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی۔ تو بھی میں نے وہ باتیں باور نہ کیں جب تک خود آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیا اور مجھے تو آدھا بھی نہ بتایا گیا تھا کیونکہ تیری حکمت اور اقبالمندی اس شہرت سے جو میں نے سنی بہت زیادہ ہے۔ خوش نصیب ہیں تیرے لوگ اور خوش نصیب ہیں تیرے یہ ملازم جو برابر تیرے حضور کھڑے رہتے ہیں اور تیری حکمت سنتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے ایسا خوشنود ہوا کہ تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا ـــ اور اس نے بادشاہ کو ایک سو بیس قنطار سونا اور مسالے کا بہت بڑا انبار اور بیش بہا جواہر دیے اور جیسے مسالے سبا کی ملکہ نے سلیمان بادشاہ کو دیے ویسے پھر کبھی ایسی بہتات کے ساتھ نہ آئے ـــ اور سلیمان بادشاہ نے سبا کی ملکہ کو سب کچھ جس کی وہ مشتاق ہوئی اور جو کچھ اس نے مانگا

دیا۔ پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئی (۱ سلاطین ۱۰ : ۱ - ۱۳ اسی سے ملتا جلتا مضمون ۲ تواریخ ۹ : ۱ - ۱۲ میں بھی ہے)

عہد جدید میں حضرت عیسٰیؑ کی تقریر کا صرف یہ فقرہ ملکہ سبا کے متعلق منقول ہوا ہے۔

"دکھن کی ملکہ عدالت کے دن اس زمانہ کے لوگوں کے ساتھ اُٹھ کر ان کو مجرم ٹھہرائے گی کیونکہ وہ دنیا کے کنارے سے سلیمان کی حکمت سننے کو آئی اور دیکھو یہاں وہ ہے جو سلیمان سے بھی بڑا ہے۔" (متی ۱۲ : ۴۲ - لوقا ۱۱ : ۳۱)

قرآن اور عہد نامہ عتیق کے بیان میں مماثلت

یہودیوں ربیوں کی روایات میں حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کا قصہ اپنی بیشتر تفصیلات میں قرآن سے ملتا جلتا ہے۔ ہُدہُد کا غائب ہونا، پھر آکر سبا اور اس کی ملکہ کے حالات بیان کرنا، حضرت سلیمانؑ کا اس کے ذریعہ سے خط بھیجنا، ہُدہُد کا عین اس وقت وہ خط ملکہ کے آگے گرانا جب کہ وہ آفتاب کی پرستش کو جا رہی تھی۔ ملکہ کا اس خط کو دیکھ کر اپنے وزراء کی کونسل منعقد کرنا، پھر ملکہ کا ایک قیمتی ہدیہ حضرت سلیمانؑ کے پاس بھیجنا، خود یروشلم پہنچ کر ان سے ملنا۔ ان کے محل میں پہنچ کر یہ خیال کرنا کہ حضرت سلیمانؑ پانی کے حوض میں بیٹھے ہیں اور اس میں اترنے کے لیے پائنچے چڑھا لینا، یہ سب ان روایات میں اسی طرح مذکور ہے جس طرح قرآن میں بیان ہوا ہے۔ مگر ہدیہ وصول ہونے پر حضرت سلیمانؑ کا جواب، ملکہ کے تخت کو اٹھوا منگانا، ہر موقع پر ان کا خدا کے آگے جھکنا، اور آخرکار ملکہ کا ان کے ہاتھ پر ایمان لانا، یہ سب باتیں، بلکہ خدا پرستی اور توحید کی ساری باتیں ہی ان روایات میں ناپید ہیں۔ (۹۴)

فصل ۵

یہودی بابل کی اسیری کے زمانے میں

تعویذ گنڈوں کا دور دورہ

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ (البقرہ۔ ۱۰۲)

ترجمہ: "اور وہ لگے ان چیزوں کی پیروی کرنے جو شیاطین سلیمانؑ کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے، حالانکہ سلیمانؑ نے کبھی کفر نہیں کیا۔ کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔"

جب بنی اسرائیل پر اخلاقی و مادی انحطاط کا دور آیا اور غلامی، جہالت، نکبت و افلاس اور ذلّت و پستی نے ان کے اندر کوئی بلند حوصلگی و اولوالعزمی باقی نہ چھوڑی، تو ان کی توجہات جادو ٹونے، اور طلسمات و عملیات اور تعویذ گنڈوں کی طرف مبذول ہونے لگیں۔ وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے جن سے کسی مشقت اور جدوجہد کے بغیر محض پھونکوں اور منتروں کے زور پر سارے کام بن جایا کریں۔ اس وقت شیطان نے ان کو بہکانا شروع کیا کہ سلیمان علیہ السلام کی عظیم الشان سلطنت اور ان کی حیرت انگیز طاقتیں تو سب کچھ چند نقوش اور منتروں کا نتیجہ تھیں اور وہ ہم تمھیں بتائے دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑے اور پھر نہ کتاب اللہ سے ان کو کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعیٔ حق کی آواز انھوں نے سن کر دی۔ (۹۵)

---

[1] شیاطین سے مراد شیاطین جن اور شیاطین انس دونوں ہو سکتے ہیں (مؤلف)

قصہ ہاروت و ماروت

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ہَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ط وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ
حَتّٰی یَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَۃٌ فَلَا تَکْفُرْ ط فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْھُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ
بِہٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِہٖ ط وَمَا ھُمْ بِضَآرِّیْنَ بِہٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ
اللّٰہِ (البقرہ - آیت ۱۰۲)

ترجمہ: "وہ پیچھے پڑے اس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت و ماروت پر نازل کی گئی تھی، حالانکہ وہ (فرشتے) جب کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے کہ دیکھو ہم ایک آزمائش ہیں تو کفر میں مبتلا نہ ہو۔ پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ ظاہر تھا کہ اذنِ الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے۔"

اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے۔ کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں[لہ] کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لیے بھیجا ہوگا۔ جس طرح قومِ لوطؑ کے پاس فرشتے خوب صورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے، اُسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انھوں نے بازارِ ساحری میں اپنی دوکان لگائی ہوگی اور دوسری طرف وہ اتمامِ حجت کے لیے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم تمھارے لیے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہوں گے۔ (۹۶)

[لہ] فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز کا سکھانا جو بجائے خود بُری تھی تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اسے عین حالتِ ارتکابِ جرم میں پکڑیں اور اس کے لیے بے گناہی کے عذر کی گنجائش نہ رہنے دیں۔ (۹۷)

دوسروں کی بیویاں ہتھیانے کا فتنہ

اس منڈی میں سب سے زیادہ جس چیز کی مانگ تھی وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویذ مل جائے جس سے ایک آدمی دوسرے کی بیوی کو اس سے توڑ کر اپنے اوپر عاشق کرے۔ یہ اخلاقی زوال کا انتہائی درجہ تھا جس میں وہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ پست اخلاق کا اس سے زیادہ نیچا مرتبہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ پرائی عورتوں سے آنکھ لڑانا ہو جائے اور کسی منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے توڑ کر اپنا کر لینے کو وہ اپنی سب سے بڑی فتح سمجھنے لگیں۔[1] (۹۸)

---

[1] ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدن کی جڑ ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی درستی پر پورے انسانی تمدن کی درستی کا اور اس کی خرابی پر پورے تمدن کی خرابی کا مدار ہے۔ لہٰذا وہ شخص بدترین مُفسِد ہے جو اس درخت کی جڑ پر تیشہ چلاتا ہو جس کے قیام پر خود اس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ابلیس اپنے مرکز سے زمین کے ہر گوشے میں اپنے ایجنٹ روانہ کرتا ہے۔ پھر وہ ایجنٹ واپس آکر اپنی اپنی کارروائیاں اس کو سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے، میں نے فلاں فتنہ برپا کیا، کوئی کہتا ہے کہ میں نے فلاں شر کھڑا کیا۔ مگر ابلیس ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اس کے شوہر میں جدائی ڈال آیا ہوں۔ یہ سن کر ابلیس اس کو گلے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے تو کام کر کے آیا ہے۔ اس حدیث پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کو جو فرشتے بھیجے گئے تھے انھیں کیوں حکم دیا گیا کہ عورت اور مرد کے درمیان جدائی ڈالنے کا "عمل" ان کے سامنے پیش کریں۔ دراصل یہی ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے ان کے اخلاقی زوال کو ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا تھا۔ (۹۹)

فصل ۶

بابل کی اسیری سے نجات کے بعد

حضرت عیسٰیؑ تک کا دور

یہود کو ایک اور مہلتِ اصلاح دی گئی

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنٰكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ أَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ (بنی اسرآءیل - آیت ۶)

ترجمہ: "اور اس کے بعد ہم نے تمہیں ان پر غلبے کا موقع دے دیا اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔"

یہ اشارہ ہے اُس مہلت کی طرف جو یہودیوں (یعنی اہلِ یہودیہ) کو بابل کی اسیری سے رہائی کے بعد عطا کی گئی۔ جہاں تک سامریہ اور اسرائیل کے لوگوں کا تعلق ہے، وہ تو اخلاقی و اعتقادی پستیوں میں گرنے کے بعد پھر نہ اٹھے۔ مگر یہودیہ کے باشندوں میں ایک بقیہ ایسا موجود تھا جو خیر پر قائم اور خیر کی دعوت دینے والا تھا۔ اس نے ان لوگوں میں بھی اصلاح کا کام جاری رکھا جو یہودیہ میں بچے کھچے رہ گئے تھے، اور اُن لوگوں کو بھی توبہ و انابت کی ترغیب دی جو بابل اور دوسرے علاقوں میں جلا وطن کر دیے گئے تھے۔

نقشۂ احوال پلٹ گیا

آخر کار رحمتِ الٰہی ان کی مددگار ہوئی۔ بابل کی سلطنت کو زوال ہوا۔ ۵۳۹ ق م میں ایرانی فاتح سائرس (خورس یا خسرو) نے بابل کو فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے فرمان جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی عام اجازت ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہودیوں کے قافلے پر قافلے یہودیہ کی طرف جانے شروع ہو گئے جن کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔

ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر کیا گیا

سائرس نے یہودیوں کو ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کی اجازت بھی دی، مگر ایک عرصے تک ہمسایہ قومیں، جو اس علاقے میں آباد ہو گئی تھیں، مزاحمت کرتی رہیں۔ آخر کار داریوس (دارا) اول نے ۵۲۲ ق م میں یہودیہ کے آخری بادشاہ کے پوتے زرُوبابل کو یہودیہ کا گورنر مقرر کیا اور اس نے حجّی نبی، زکریاہ نبی اور سردار کاہن یشوع کی نگرانی میں ہیکل مقدس نئے سرے سے تعمیر کیا۔ پھر ۴۵۸ ق م میں ایک جلا وطن گروہ کے ساتھ حضرت عُزَیر[1] (عزرا) یہودیہ پہنچے اور شاہ ایران اَرْتَخْشَشْتَا (ارٹاکسرسیز یا اردشیر) نے ایک فرمان کی رو سے ان کو مجاز کیا کہ:

> "تو اپنے خدا کی اس دانش کے مطابق جو تجھ کو عنایت ہوئی، حاکموں اور قاضیوں کو مقرر کر تاکہ دریا پار کے سب لوگوں کا، جو تیرے خدا کی شریعت کو جانتے ہیں، انصاف کریں اور تم اس کو جو نہ جانتا ہو سکھاؤ، اور جو کوئی تیرے خدا کی شریعت پر اور بادشاہ کے فرمان پر عمل نہ کرے اس کو بلا توقف قانونی سزا دی جائے، خواہ موت ہو یا جلاوطنی، یا مال کی ضبطی، یا قید (عزرا۔ باب ۸۔ آیت ۲۵-۲۶)

---

[1] وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ (التوبہ۔ آیت ۳۰)

ترجمہ: "یہودی کہتے ہیں کہ عُزَیر اللہ کا بیٹا ہے۔"

عُزَیر سے مراد عزرا (EZRA) ہیں جن کو یہودی اپنے دین کا مجدد مانتے ہیں۔ ان کا زمانہ ۴۵۰ ق م کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جو دورِ ابتلا بنی اسرائیل پر آیا اس میں نہ صرف یہ کہ توراۃ دنیا سے گم ہو گئی تھی۔ بلکہ بابل کی اسیری نے اسرائیلی نسلوں کو اپنی شریعت، اپنی روایات اور اپنی قومی زبان، عبرانی تک سے ناآشنا کر دیا تھا۔ آخر کار انہی عُزَیر یا عزرا نے بائیبل کے پرانے عہد ناموں کو مرتب کیا اور شریعت کی تجدید کی۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل ان کی بہت تعظیم کرتے ہیں اور یہ تعظیم اس حد تک بڑھ گئی کہ بعض یہودی گروہوں نے ان کو ابن اللہ تک کہہ دیا۔ قرآن مجید کے ارشاد کا مقصود یہ نہیں ہے کہ تمام یہودیوں نے بالاتفاق عزرا کاہن کو خدا کا بیٹا بنایا ہے۔ بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ خدا کے متعلق یہودیوں کے اعتقادات میں جو خرابی رونما ہوئی وہ اس حد تک ترقی کر گئی کہ عزرا کو خدا کا بیٹا قرار دینے والے بھی ان میں پیدا ہوئے۔ (۱۰۰)

حضرت عُزَیرؑ کا کارنامۂ تجدید و اصلاح

اس فرمان سے فائدہ اٹھا کر حضرت عُزَیرؑ نے دینِ موسوی کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا۔ انھوں نے یہودی قوم کے تمام اہلِ خیر و صلاح کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ بائیبل کی کُتُبِ خمسہ کو، جن میں تورات تھی، مرتب کر کے شائع کیا، یہودیوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا، قوانینِ شریعت کو نافذ کر کے ان اعتقادی اور اخلاقی برائیوں کو دور کرنا شروع کیا جو بنی اسرائیل کے اندر غیر قوموں کے اثر سے گھس آئی تھیں، ان تمام مشرک عورتوں کو طلاق دلوائی جن سے یہودیوں نے بیاہ کر رکھے تھے اور بنی اسرائیل سے ازسرِ نو خدا کی بندگی اور اس کے آئین کی پیروی کا میثاق لیا۔

۴۴۵ ق م میں نحمیاہ کے زیرِ قیادت ایک اور جلاوطن گروہ یہودیہ واپس آیا اور شاہِ ایران نے نحمیاہ کو یروشلم کا حاکم مقرر کر کے اس امر کی اجازت دی کہ وہ اس کی شہر پناہ تعمیر کرے۔ اس طرح ڈیڑھ سو سال بعد بیت المَقدِس پھر سے آباد ہوا اور یہودی مذہب و تہذیب کا مرکز بن گیا۔ مگر شمالی فلسطین اور سامریہ کے اسرائیلیوں نے حضرت عُزَیرؑ کی اصلاح و تجدید سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا، بلکہ بیت المَقدِس کے مقابلہ میں اپنا ایک مذہبی مرکز کوہِ جرزیم پر تعمیر کر کے اس کو قبلۂ اہلِ کتاب بنانے کی کوشش کی۔ اس طرح یہودیوں اور سامریوں کے درمیان بُعد اور زیادہ بڑھ گیا۔

یونانیوں کا فلسطین پر قبضہ

ایرانی سلطنت کے زوال اور سکندرِ اعظم کی فتوحات اور پھر یونانیوں کے عروج سے یہودیوں کو کچھ مدت کے لیے ایک سخت دھکا لگا۔ سکندر کی وفات کے بعد اُس کی سلطنت جن تین سلطنتوں میں تقسیم ہوئی تھی، ان میں سے شام کا علاقہ اس سلجوقی سلطنت کے حصے میں آیا جس کا پایۂ تخت انطاکیہ تھا اور اس کے فرمانروا اَنطیوکس ثالث نے ۱۹۸ ق م میں فلسطین پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ یونانی فاتح جو مذہبًا مشرک اور اخلاقًا اباحیت پسند تھے، یہودی مذہب و تہذیب کو سخت ناگوار محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے اس کے مقابلے میں سیاسی اور معاشی دباؤ سے یونانی تہذیب کو فروغ دینا شروع کیا اور خود یہودیوں میں سے ایک اچھا خاصا عنصر ان کا آلۂ کار بن گیا۔ اس خارجی مداخلت نے یہودی قوم میں تفرقہ ڈال دیا۔ ایک گروہ نے یونانی لباس، یونانی زبان، یونانی طرزِ معاشرت اور یونانی کھیلوں کو اپنا لیا، اور دوسرا گروہ اپنی تہذیب پر سختی کے ساتھ قائم رہا۔

یہودی مذہب و تہذیب کی بیخ کنی کی مہم

۱۷۵ ق م میں انٹیوکس چہارم (جس کا لقب ایپی فانیس یعنی مظہرِ خدا) تھا، جب تخت نشین ہوا تو اس نے پوری جابرانہ طاقت سے کام لے کر یہودی مذہب و تہذیب کی بیخ کنی کرنی چاہی۔ اس نے بیت المقدس کے ہیکل میں زبردستی بت رکھوائے اور یہودیوں کو مجبور کیا کہ ان کو سجدہ کریں۔ اس نے قربان گاہ پر قربانی بند کرائی۔ اس نے یہودیوں کو مشرکانہ قربان گاہوں پر قربانیاں کرنے کا حکم دیا۔ اس نے ان سب لوگوں کے لیے سزائے موت تجویز کی جو اپنے گھروں میں توراۃ کا نسخہ رکھیں، یا سَبت کے احکام پر عمل کریں، یا اپنے بچوں کو ختنہ کرائیں۔

مکابی تحریک اور اس کی کامیابی

مگر یہودی اس جبر سے مغلوب نہ ہوئے اور ان کے اندر ایک زبردست تحریک اٹھی جو تاریخ میں مکابی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس کشمکش میں یونانیت زدہ یہودیوں کی ساری ہمدردیاں یونانیوں کے ساتھ تھیں اور انھوں نے عملاً مکابی بغاوت کو کچلنے کے لیے انطاکیہ کے ظالموں کا پورا ساتھ دیا۔ لیکن عام یہودیوں میں حضرت عُزَیر کی پھونکی ہوئی روحِ دینداری کا اتنا زبردست اثر تھا کہ وہ سب مکابیوں کے ساتھ ہو گئے اور آخرکار انھوں نے یونانیوں کو نکال کر اپنی ایک آزاد دینی ریاست قائم کر لی جو ۶۷ ق م تک قائم رہی۔ اس ریاست کے حدود پھیل کر رفتہ رفتہ اس پورے رقبے پر حاوی ہو گئے جو کبھی یہودیہ اور اسرائیل کی ریاستوں کے زیرِ نگین تھے۔ بلکہ فِلِستیہ کا بھی ایک بڑا حصہ اس کے قبضے میں آگیا جو حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں بھی مُسَخَّر نہ ہوا تھا۔ (۱۰۱)

مکابی تحریک کا زوال اور رومی دورِ اقتدار

(اس دوسرے فساد اور اس کی سزا کا تاریخی پس منظر یہ ہے:)

مکابیوں کی تحریک جس اخلاقی و دینی روح کے ساتھ اٹھی تھی۔ وہ بتدریج فنا ہوتی چلی گئی۔ اور اس کی جگہ خالص دنیا پرستی اور بے روح ظاہرداری نے لے لی۔ آخرکار ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی۔ اور انھوں نے خود رومی فاتح پومپی کو فلسطین آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ پومپی ۶۳ ق م میں اس ملک کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن رومی فاتحین کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ وہ مفتوح علاقوں پر براہِ راست اپنا نظم و نسق

قائم کرنے کی بہ نسبت مقامی حکمرانوں کے ذریعے سے بالواسطہ اپنا کام نکلوانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے فلسطین میں اپنے زیر سایہ ایک دیسی ریاست قائم کر دی۔

یہ ریاست بالآخر ۴۰؁ ق م میں ایک ہوشیار یہودی، ہیرود نامی کے قبضے میں آئی۔ یہ شخص ہیرود اعظم کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی فرمانروائی پورے فلسطین اور شرق اردن پر ۴۰؁ سے ۴؁ قبل مسیح تک رہی۔ اس نے ایک طرف مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی کر کے یہودیوں کو خوش رکھا، اور دوسری طرف رومی تہذیب کو فروغ دے کر اور رومی سلطنت کی وفاداری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر کے قیصر کی بھی خوشنودی حاصل کی، اس زمانے میں یہودیوں کی دینی و اخلاقی حالت گرتے گرتے زوال کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ (۱۰۲)

باب ٦

حضرت یحییٰؑ اور عیسیٰؑ کا دور

اور یہود کا دوسرا فسادِ عظیم

فصل ۱

یہودیوں کی اصلاح کے لیے حضرت یحییٰؑ کی مساعی

حضرت زکریاؑ کو بیٹے کی بشارت

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۣ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ (سورہ مریم۔ آیت ۷)

ترجمہ: "اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ ہم نے اس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا۔"

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَّاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝ (سورہ مریم۔ آیت ۱۲-۱۵)

ترجمہ: "اے یحییٰ، کتاب الٰہی کو مضبوط تھام لے۔" ہم نے اسے بچپن ہی میں "حکم" سے نوازا، اور اپنی طرف سے اسے نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی، اور وہ بڑا پرہیزگار اور اپنے والدین کا حق شناس تھا۔ وہ جبار نہ تھا اور نہ نافرمان۔ سلام اس پر جس روز کہ وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ مرے اور جس روز وہ زندہ کرکے اٹھایا جائے۔"

بیابان میں پکارنے والے کی آواز

حضرت یحییٰؑ کے جو حالات مختلف انجیلوں میں بکھرے ہوئے ہیں، انھیں جمع کرکے ہم یہاں ان کی سیرتِ پاک کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے سورۂ آل عمران اور اس سورہ کے مختصر اشارات کی توضیح ہوگی۔

لوقا کے بیان کے مطابق حضرت یحییٰؑ حضرت عیسیٰؑ سے ۶ مہینے بڑے تھے۔ ان کی والدہ اور حضرت عیسیٰؑ کی والدہ آپس میں قریبی رشتہ دار تھیں۔ تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں وہ نبوت کے منصب پر عملاً مامور ہوئے

اور یوحنا کی روایت کے مطابق انھوں نے شرقِ اُردن کے علاقے میں دعوت اللہ کا کام شروع کیا۔ وہ کہتے تھے۔

" میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو۔" (یوحنا ۱ : ۲۳)

یُوحنّا بپتسمہ دینے والا

مرقس کا بیان ہے کہ وہ لوگوں سے گناہوں کی توبہ کراتے تھے، اور توبہ کرنے والوں کو بپتسمہ دیتے تھے: یعنی توبہ کے بعد غسل کراتے تھے، تاکہ روح اور جسم دونوں پاک ہوجائیں۔ یہودیاہ اور یروشلم کے بکثرت لوگ ان کے معتقد ہوگئے تھے، اور ان کے پاس جاکر بپتسمہ لیتے تھے۔ (مرقس ۱ : ۴-۵)

اسی بنا پر ان کا نام "یُوحنّا بپتسمہ دینے والا" (JOHN THE BAPTIST) مشہور ہوگیا تھا۔ عام طور پر بنی اسرائیل ان کی نبوت تسلیم کرچکے تھے۔ (متی ۲۱ : ۲۶)

مسیح علیہ السلام کا قول تھا کہ "جو عورتوں سے پیدا ہوئے، ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا۔" (متی ۱۱ : ۱۱)

وہ اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنتے، اور چمڑے کا پٹکا کمر سے باندھے رہتے تھے اور ان کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا۔ (متی ۳ : ۴)

ان کی تعلیمات

اس فقیرانہ زندگی کے ساتھ وہ منادی کرتے پھرتے تھے کہ "توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی قریب آگئی ہے" (متی ۳ : ۲) یعنی مسیح علیہ السلام کی دعوت نبوت کا آغاز ہونے والا ہے۔ اسی بنا پر ان کو عموماً حضرت مسیح کا "ارہاص" کہا جاتا ہے، اور یہی بات ان کے متعلق قرآن میں کہی گئی ہے کہ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللهِ (آلِ عمران : ۳۹)

وہ لوگوں کو روزے اور نماز کی تلقین کرتے تھے (متی ۹ : ۱۴۔ لوقا ۵ : ۳۳۔ لوقا ۱۱ : ۱) وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ "جس کے پاس دو کرتے ہوں وہ اس کو جس کے پاس نہ ہو، بانٹ دے۔ اور جس کے پاس کھانا ہو وہ بھی ایسا ہی کرے۔"

محصول لینے والوں نے پوچھا کہ استاد "ہم کیا کریں؟" تو انھوں نے فرمایا "جو تمہارے لیے مقرر ہے اس سے زیادہ نہ لینا۔" سپاہیوں نے پوچھا ہمارے لیے کیا ہدایت ہے؟ فرمایا "نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ناحق کسی سے کچھ

لو اور اپنی تنخواہ پر کفایت کرو۔" (لوقا ۳: ۱۰-۱۴) بنی اسرائیل کے بگڑے ہوئے علماء، فریسی اور صدوقی ان کے پاس بپتسمہ لینے آئے تو ڈانٹ کر فرمایا "اے سانپ کے بچو! تم کو کس نے جتا دیا کہ آنے والے غضب سے بھاگو؟ .... اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابراہام ہمارا باپ ہے .... اب درخت کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے، پس جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔" (متی ۳: ۷-۱۰)

یہودی فرمانروا کے ہاتھ حضرت یحییٰؑ کا قتل

ان کے عہد کا یہودی فرمانروا، ہیرود اینٹی پاس، جس کی ریاست میں وہ دعوتِ حق کی خدمت انجام دیتے تھے، سرتاپا رومی تہذیب میں غرق تھا اور اس کی وجہ سے سارے ملک میں فسق و فجور پھیل رہا تھا۔ اس نے خود اپنے بھائی فلپ کی بیوی ہیرودیاس کو اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ حضرت یحییٰؑ نے اس پر ہیرود کو ملامت کی اور اس کی فاسقانہ حرکات کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس جرم میں ہیرود نے ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ تاہم وہ ان کو ایک مقدس اور راستباز آدمی سمجھ کر ان کا احترام بھی کرتا تھا اور پبلک میں ان کے غیر معمولی اثر سے ڈرتا بھی تھا۔ لیکن ہیرودیاس یہ سمجھتی تھی کہ یحییٰ علیہ السلام جو اخلاقی روح قوم میں پھونک رہے ہیں وہ لوگوں کی نگاہ میں اس جیسی عورتوں کو ذلیل کیے دے رہی ہے۔ اس لیے وہ ان کی جان کے درپے ہو گئی۔ آخر کار ہیرودیاس کی سالگرہ کے جشن میں اس نے وہ موقع پا لیا جس کی وہ تاک میں تھی۔ جشن کے دربار میں اس کی بیٹی نے خوب رقص کیا۔ جس پر خوش ہو کر ہیرود نے کہا۔ "مانگ کیا مانگتی ہے؟" بیٹی نے اپنی فاحشہ ماں سے پوچھا کیا مانگوں؟ ماں نے کہا کہ یحییٰؑ کا سر مانگ لے۔ چنانچہ اس نے ہیرود کے سامنے ہاتھ باندھ کر عرض کیا مجھے یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر ایک تھال میں رکھوا کر ابھی منگوا دیجیے۔ ہیرود یہ سن کر بہت غمگین ہوا، مگر محبوبہ کی بیٹی کا تقاضا کیسے رد کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً قید خانے سے یحییٰ علیہ السلام کا سر کٹوا کر منگوایا اور ایک تھال میں رکھوا کر رقاصہ کی نذر کر دیا (متی ۱۴: ۳-۱۲ - مرقس ۶: ۱۷-۲۹ لوقا ۳: ۱۹-۲۰) (۱۰۴)

فصل ۲

حضرت عیسیٰؑ کی مساعئ اصلاح اور یہود کا معاندانہ رویہ

حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش کی ولادت

قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً لِّلنَّاسِ
وَرَحْمَةً مِّنَّا (آیت-۲۱)

ترجمہ: فرشتے نے کہا۔ ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بڑا آسان ہے۔ ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔

حضرت مریم کے استعجاب پر فرشتے کا یہ کہنا کہ "ایسا ہی ہوگا" ہرگز اس معنی میں نہیں ہو سکتا کہ بشر تجھ کو چھوئے گا اور اس سے تیرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا، بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تیرے ہاں لڑکا ہوگا باوجود اس کے کہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا ہے۔ اوپر انہی الفاظ میں حضرت زکریا کا استعجاب نقل ہو چکا ہے اور وہاں بھی فرشتے نے یہی جواب دیا۔ ظاہر کہ جو مطلب اس جواب کا وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے۔ اسی طرح سورۂ ذاریات، آیت ۲۸-۳۰ میں جب فرشتہ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتا ہے اور حضرت سارہ کہتی ہیں کہ مجھ بوڑھی بانجھ کے ہاں بیٹا کیسے ہوگا تو فرشتہ ان کو جواب دیتا ہے کہ کَذٰلِكِ "ایسا ہی ہوگا"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد بڑھاپے اور بانجھ پن کے باوجود ان کے ہاں اولاد ہونا ہے۔ علاوہ بریں اگر کَذٰلِكِ کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ بشر تجھ کو چھوئے گا اور تیرے ہاں اسی طرح لڑکا ہوگا جس طرح دنیا بھر کی عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے تو پھر بعد کے دونوں فقرے بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ تیرا رب کہتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے اور یہ کہ ہم اس لڑکے کو ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ نشانی کا لفظ یہاں صریحاً معجزے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اسی معنی پر یہ فقرہ بھی دلالت کرتا ہے کہ "ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے" لہٰذا اس ارشاد کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے،

کہ ہم اس لڑکے کی ذات ہی کو ایک معجزے کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بعد کی تفصیلات اس بات کی خود تشریح کر رہی ہیں، کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ذات کو کس طرح معجزہ بنا کر پیش کیا گیا۔ (۱۰۴)

حضرت مریم کہیں دور چلی جاتی ہیں

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ (مریم ۔ آیت ۲۲)

ترجمہ: "مریم کو اس بچے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دور کے مقام پر چلی گئی۔"

دور کے مقام سے مراد بیت لحم ہے۔ حضرت مریم کا اپنے اعتکاف سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو بیت المقدس میں خدا کی عبادت کے لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اس حالت میں اگر وہ اپنے جائے اعتکاف میں بیٹھی رہتیں اور ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان والے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ اس لیے بے چاری اس شدید آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں۔ تاکہ جب اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بدنامی سے تو بچی رہیں۔ یہ واقعہ بجائے خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور سسرال، سب کو چھوڑ چھاڑ کر وہ زچگی کے لیے تن تنہا ایک دور دراز مقام پر چلی جاتیں۔ (۱۰۵)

حضرت مریم کی پریشانی

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ، قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا (مریم ۔ آیت ۲۳)

ترجمہ: "پھر زچگی کی تکلیف نے اسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام و نشان نہ رہتا۔"

ان الفاظ سے اس پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں حضرت مریم اس وقت مبتلا تھیں۔ موقع

کی نزاکت ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ دردِ زہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، بلکہ یہ فکر ان کو کھائے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزمائش میں انھیں ڈالا ہے۔ اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب کسی نہ کسی طرح چھپا لیا۔ اب اس بچے کو کہاں لے جائیں۔ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے ان سے کہا "غم نہ کر" اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ حضرت مریمؑ نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے۔ شادی شدہ لڑکی کے ہاں جب پہلا بچہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے، اسے رنج و غم کبھی لاحق نہیں ہوا کرتا۔ (۱۰۶)

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے بعد حضرت مریمؑ کو ہدایت

فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ
نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا (مریم۔ آیت ۲۶)

ترجمہ: "پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہہ دے کہ میں نے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مانی ہے، اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی"

مطلب یہ ہے کہ بچے کے معاملے میں تجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی پیدائش پر جو کوئی بھی معترض ہو اس کا جواب اب ہمارے ذمے ہے (واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں چپ کا روزہ رکھنے کا طریقہ رائج تھا) یہ الفاظ بھی صاف بتا رہے ہیں کہ حضرت مریمؑ کی اصل پریشانی کیا تھی، نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شادی شدہ لڑکی کے ہاں پہلوٹھی کا بچہ اگر دنیا کے معروف طریقہ پر پیدا ہو تو آخر اسے چپ کا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے۔ (۱۰۷)

حضرت مریمؑ اپنی قوم کے سامنے

يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ
بَغِيًّا (مریم۔ آیت ۲۸)

ترجمہ: "اے ہارون کی بہن نہ تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی"

ان الفاظ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انھیں ظاہری معنی میں لیا جائے کہ حضرت مریمؑ کا

کوئی بھائی ہارون نامی ہو۔ دوسرے یہ کہ عربی محاورے کے مطابق اُختِ ہارون کے معنی "ہارون کے خاندان کی لڑکی" لیے جائیں۔ کیوں کہ عربی میں یہ ایک معروف طرزِ بیان ہے۔ مثلاً قبیلہ مضر کے آدمی کو یا اخا مُضر (اے مضر کے بھائی) اور قبیلہ ہمدان کے آدمی کو یا اخا ھمدان (اے ہمدان کے بھائی) کہہ کر پکارتے ہیں۔ پہلے معنی کے حق میں دلیلِ ترجیح یہ ہے کہ بعض روایات میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنی منقول ہوئے ہیں۔ اور دوسرے معنی کی تائید میں دلیل یہ ہے کہ موقع و محل اس معنی کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ اس واقعہ سے قوم میں جو ہیجان برپا ہوا تھا اس کی وجہ بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہارون نامی ایک گمنام شخص کی کنواری بہن گود میں بچہ لیے ہوئے آئی تھی، بلکہ جس چیز نے لوگوں کا ایک ہجوم حضرت مریم کے گرد جمع کر دیا تھا۔ وہ یہی ہو سکتی تھی کہ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے، خانوادہ ہارون کی ایک لڑکی اس حالت میں پائی گئی۔ اگرچہ ایک حدیثِ مرفوع کی موجودگی میں کوئی دوسری تاویل اصولاً قابلِ لحاظ نہیں ہو سکتی، لیکن مسلم، نسائی اور ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ان الفاظ کے معنی لازماً "ہارون کی بہن" ہی ہیں۔ مغیرہؓ بن شعبہ کی روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں نے حضرت مغیرہ کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا کہ قرآن میں حضرت مریم کو ہارون کی بہن کہا گیا ہے، حالانکہ حضرت ہارون ان سے سینکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے۔ حضرت مغیرہ ان کے اس اعتراض کا جواب نہ دے سکے اور انھوں نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ ماجرا عرض کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ "تم نے یہ جواب کیوں نہ دے دیا کہ بنی اسرائیل اپنے نام انبیاء اور صلحاء کے نام پر رکھتے تھے"۔ حضورؐ کے اس ارشاد سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ لاجواب ہونے کے بجائے یہ جواب دے کر اعتراض رفع کیا جا سکتا تھا۔

جو لوگ حضرت عیسٰی کی معجزانہ پیدائش کے منکر ہیں وہ آخر اس بات کی کیا معقول توجیہہ کر سکتے ہیں کہ حضرت مریم کے بچہ لیے ہوئے آنے پر قوم کیوں چڑھ کر آئی اور ان پر یہ طعن اور ملامت کی بوچھاڑ اس نے کیوں کی ہ۔ (۱۰۸)

گہوارے میں حضرت عیسٰیؑ کا قوم کو جواب دینا

فَاَشَارَتْ اِلَیْہِ قَالُوْا کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ صَبِیًّا ۝

(مریم۔ آیت ۲۹)

ترجمہ: "مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ لوگوں نے کہا۔ ہم اس سے کیا بات کریں۔ جو گھوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے؟"

قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے۔ کہ "ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے" یعنی ان کے نزدیک یہ گفتگو حضرت عیسیٰؑ کی جوانی کے زمانے میں ہوئی۔ اور بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں نے کہا کہ بھلا اس لڑکے سے کیا بات کریں جو کل ہمارے سامنے گہوارے میں پڑا ہوا تھا۔ مگر جو شخص موقع محل اور سیاق و سباق پر کچھ بھی غور کرے گا وہ محسوس کر لے گا کہ یہ محض ایک مہمل تاویل ہے جو معجزے سے بچنے کے لیے کی گئی ہے۔ اور کچھ نہیں تو ظالموں نے یہی سوچا ہوتا، کہ جس بات پر اعتراض کرنے کے لیے وہ لوگ آئے تھے وہ تو بچے کی پیدائش کے وقت پیش آئی تھی۔ نہ کہ اس کے جوان ہونے کے وقت۔ علاوہ بریں سورۂ آل عمران کی آیت ۴۶، اور سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰۔ دونوں اس بات کی قطعی صراحت کرتی ہیں۔ کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ کلام جوانی میں نہیں بلکہ گہوارے میں ایک نوزائیدہ بچے کی حیثیت ہی سے کیا تھا۔ پہلی آیت میں فرشتہ حضرت مریم کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگوں سے گہوارے میں بات کرے گا اور جوان ہو کر بھی۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ خود حضرت عیسیٰ سے فرماتا ہے کہ تو لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرتا تھا، اور جوانی میں بھی۔ (۱۰۹)

وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا (مریم۔ آیت ۲۳)

ترجمہ: "اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا، اور مجھ کو جبّار اور شقی نہیں بنایا۔"

یہ نہیں فرمایا کہ والدین کا حق ادا کرنے والا۔ صرف والدہ کا حق ادا کرنے والا فرمایا ہے، یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا باپ کوئی نہ تھا۔ اور اسی کی ایک صریح دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہر جگہ ان کو عیسیٰ ابنِ مریم کہا گیا ہے۔ (۱۱۰)

وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا (مریم آیت ۳۳)

ترجمہ: "سلام ہے مجھ پر جب کہ میں پیدا ہوا اور جب کہ میں مروں اور جب کہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں۔"

یہ ہے وہ "نشانی" جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کی مسلسل بدکرداریوں پر عبرتناک سزا دینے سے پہلے ان پر حجت تمام کرنا چاہتا تھا۔ اس

کے لیے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ نبی ہارون کی ایک ایسی زاہدہ و عابدہ لڑکی کو جو بیت المقدس میں معتکف اور حضرت زکریا کے زیرِ تربیت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا۔ تاکہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے۔ اور لوگوں کی توجہات یک لخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک ہجوم حضرت مریم پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا، تاکہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نبوّت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود رہیں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوّت کا انکار کرے اور اس کی پیروی قبول کرنے کے بجائے اسے مجرم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے۔ تو پھر اس کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے جو دنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔ (۱۶۱)

حضرت عیسیٰؑ یہودیوں کے لیے رسول اور نمونہ مقرر کیے گئے

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ

(آل عمران۔ آیت ۴۹)

ترجمہ: (اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو اس نے کہا) میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

(الزخرف۔ آیت ۵۹)

ترجمہ: "ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا دیا۔"

قدرت کا نمونہ بنانے سے مراد حضرت عیسیٰؑ کو بے باپ کے پیدا کرنا، پھر ان کو وہ معجزے عطا کرنا ہے جو نہ ان سے پہلے کسی کو دیے گئے تھے نہ ان کے بعد۔ وہ مٹی کا پرندہ بناتے اور اس میں پھونک مارتے تو وہ جیتا جاگتا پرندہ بن جاتا۔ وہ مادرزاد اندھے کو بینا کر دیتے۔ وہ کوڑھ کے مریض کو تندرست کر دیتے حتیٰ کہ وہ مردے کو جلا دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا یہ منشا ہے کہ محض اس غیر معمولی پیدائش اور ان عظیم معجزات کی وجہ سے ان کو بندگی سے بالاتر سمجھنا اور خدا کا بیٹا قرار دے کر اس کی عبادت کرنا غلط ہے

اس کی حیثیت ایک بندے سے زیادہ کچھ نہ تھی جسے ہم نے اپنے انعامات سے نواز کر اپنی قدرت کاملہ کا نمونہ بنا دیا تھا۔ ⑪③

حضرت عیسیٰؑ کی دعوت

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۔ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ۔

(آل عمران ۔ آیت ۵۱)

ترجمہ: اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، لہٰذا تم اس کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بنیادی نکات یہی تین تھے۔

ایک یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ جس کے مقابلہ میں بندگی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کی اطاعت پر اخلاق و تمدن کا پورا نظام قائم ہوتا ہے صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو، دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیے جائیں۔

تیسرے یہ کہ اس مقتدرِ اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

پس درحقیقت حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کے مشن میں یک سرِ مو فرق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیے ہیں اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے انھوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اس کی رعیت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود مختاری سے روکے اور شرک سے (یعنی اس بات سے کہ وہ اقتدارِ اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کریں) منع کرے اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔

افسوس یہ ہے کہ موجودہ اناجیل میں مسیح علیہ السلام کے مشن کو اس وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا

گیا جس طرح اوپر قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم منتشر طور پر اشارات کی شکل میں وہ تینوں بنیادی نکات ہمیں ان کے اندر ملتے ہیں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مسیح صرف اللہ کی بندگی کے قائل تھے، آن کے اس ارشاد سے صاف ظاہر ہوتی ہے:

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔" (متی ۴ : ۱۰)

اور صرف یہی نہیں کہ وہ اس کے قائل تھے بلکہ ان کی ساری کوششوں کا مقصود یہ تھا کہ زمین پر خدا کے امر شرعی کی اسی طرح اطاعت ہو جس طرح آسمان پر اس کے امر تکوینی کی اطاعت ہو رہی ہے:

"تیری بادشاہی آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔" (متی ۶ : ۱۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام اپنے آپ کو نبی اور آسمانی بادشاہت کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، اور اسی حیثیت سے لوگوں کو اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیتے تھے، ان کے متعدد اقوال سے معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے جب اپنے وطن ناصرہ سے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کے اپنے ہی بھائی بند اور اہل شہر ان کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس پر متی، مرقس اور لوقا تینوں کی متفقہ روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا "نبی اپنے وطن میں مقبول نہیں ہوتا۔" اور جب یروشلم میں ان کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں اور لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ کہیں اور چلے جائیں تو انھوں نے جواب دیا، "ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو۔" لوقا ۱۳ : ۳۳) آخری مرتبہ جب وہ یروشلم میں داخل ہو رہے تھے تو ان کے شاگردوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا۔ مبارک ہے وہ بادشاہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔" اس پر یہودی علما ناراض ہوئے اور انھوں نے حضرت مسیحؑ سے کہا کہ آپ اپنے شاگردوں کو چپ کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا "اگر یہ چپ رہیں گے تو پتھر پکار اٹھیں گے۔" (لوقا ۱۹ : ۳۸ - ۴۰)
ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

"اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ۔ میں تمھیں آرام دوں گا، میرا جُوا اپنے اوپر اٹھا لو........ میرا جُوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا۔"

(متی : ۱۱ - ۲۸ - ۳۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام انسانی ساخت کے قوانین کے بجائے خدائی قانون کی اطاعت کروانا چاہتے تھے، متی اور مرقس کی اس روایت سے صاف طور پر مترشح ہوتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودی علما نے

اعتراض کیا کہ آپ کے شاگرد بزرگوں کی روایات کے خلاف ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کیوں کھا لیتے ہیں۔ اس پر حضرت مسیح نے فرمایا: تم ریاکاروں کی حالت وہی ہے جس پر یسعیاہ نبی کی زبان سے یہ طعنہ دیا گیا ہے کہ "یہ امت زبان سے تو میری تعظیم کرتی ہے مگر ان کے دل مجھ سے دور ہیں۔ کیونکہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں"۔ تم لوگ خدا کے حکم کو تو باطل کرتے ہو اور اپنے گھڑے ہوئے قوانین کو برقرار رکھتے ہو۔ خدا نے تو توراہ میں حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی عزت کرو اور جو کوئی ماں باپ کو برا کہے وہ جان سے مارا جائے۔ مگر تم کہتے ہو کہ جو شخص اپنی ماں یا باپ سے یہ کہہ دے کہ میری جو خدمات تمہارے کام آ سکتی تھیں انھیں میں خدا کی نذر کر چکا ہوں، اس کے لیے بالکل جائز ہے کہ پھر ماں باپ کی کوئی خدمت نہ کرے۔

(متی ۱۵ : ۳ ۔ مرقس ۷ : ۵ - ۱۳) (۱۴۳)

حضرت عیسیٰؑ دینِ موسیٰؑ کے مصدق تھے

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِاٰيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ (اٰلِ عمران : اٰیت ۵۰)

ترجمہ: "اور میں اس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو توراۃ میں اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔ دیکھو، میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔"

یعنی یہ میرے فرستادۂ خدا ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ اگر میں اس کی طرف سے بھیجا ہوا نہ ہوتا بلکہ جھوٹا مدعی ہوتا تو خود ایک مستقل مذہب کی بنا ڈالتا اور اپنے ان کمالات کے زور سے تمھیں سابق دین سے ہٹا کر اپنے ایجاد کردہ دین کی طرف لانے کی کوشش کرتا۔ لیکن میں تو اسی اصل دین کو مانتا ہوں اور اسی تعلیم کو صحیح قرار دے رہا ہوں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر مجھ سے پہلے لائے تھے۔

یہ بات کہ مسیح علیہ السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاءؑ نے پیش کیا تھا، رائج الوقت اناجیل میں بھی واضح طور پر ہمیں ملتی ہے۔ مثلاً متی کی روایت کے مطابق پہاڑی کے وعظ میں مسیح علیہ السلام صاف فرماتے ہیں:

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ

پورا کرنے آیا ہوں" (۵ : ۱۷)

ایک یہودی عالم نے مسیح علیہ السلام سے پوچھا کہ احکامِ دین میں اوّلین حکم کون سا ہے، جواب میں آپ نے فرمایا:

"خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اس کے مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے" (متی ۲۲ : ۳۷ - ۴۰)

پھر مسیح اپنے شاگردوں سے فرماتے ہیں:

"فقیہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ جو کچھ وہ تمھیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو، مگر ان سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں" (متی ۲۳ : ۲ - ۳) (۱۱۲)

علمائے یہود پر حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تنقید

یہ بات کہ مسیح علیہ السلام انسانی ساخت کے قوانین کے بجائے خدائی قانون کی اطاعت کرانا چاہتے تھے، متی اور مرقس کی اس روایت سے صاف طور پر مترشح ہوتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودی علما نے اعتراض کیا کہ آپ کے شاگرد بزرگوں کی روایات کے خلاف ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کیوں کھا لیتے ہیں۔ اس پر حضرت مسیحؑ نے فرمایا۔ تم ریاکاروں کی حالت وہی ہے، یسعیاہ نبی کی زبان سے یہ طعنہ دیا گیا ہے کہ "یہ اُمت زبان سے تو میری تعظیم کرتی ہے مگر ان کے دل مجھ سے دور ہیں کیونکہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں"۔ تم لوگ خدا کے حکم کو تو باطل کرتے ہو اور اپنے گھڑے ہوئے قوانین کو برقرار رکھتے ہو۔ خدا نے تورات میں حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی عزت کرو اور جو کوئی ماں باپ کو برا کہے وہ جان سے مارا جائے۔ مگر تم کہتے ہو کہ جو شخص اپنی ماں یا باپ سے یہ کہہ دے کہ میری جو خدمات تمہارے کام آ سکتی تھیں انھیں میں خدا کی نذر کر چکا ہوں، اس کے لیے بالکل جائز ہے کہ پھر ماں یا باپ کی کوئی خدمت نہ کرے (متی ۱۵ : ۲ - ۹ ، مرقس ۷ : ۵ - ۱۳)

(تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حاشیہ ۴۸)

شریعت سے یہودیوں کے انحراف کی ایک مثال

یہودی قانون میں زنا بزنِ غیر کے متعلق جو احکام پائے جاتے ہیں وہ یہ ہیں:

"اگر کوئی کسی ایسی عورت سے صحبت کرے جو لونڈی اور کسی کی منگیتر ہو اور نہ تو اس کا فدیہ ہی دیا گیا ہو اور نہ وہ آزاد کی گئی ہو تو ان دونوں کو سزا ملے۔ لیکن وہ جان سے نہ مارے جائیں اس لیے کہ عورت آزاد نہ تھی" (احبار ۱۹ - ۲۰)

"جو شخص دوسرے کی بیوی سے یعنی اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے وہ زانی اور زانیہ دونوں ضرور مار دیے جائیں۔" (احبار ۲۰-۱۰)

"اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے ہوئے پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں۔" (استثناء ۲۲-۲۲)

"اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہو گئی ہو (یعنی اس کی منگنی ہو گئی ہو) اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے تو تم اُن دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں۔ لڑکی کو اس لیے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے نہ چلائی۔ اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنے ہمسائے کی بیوی کو بے حرمت کیا۔ پر اگر اس آدمی کو وہی لڑکی جس کی نسبت ہو چکی ہو کسی میدان یا کھیت میں مل جائے اور وہ آدمی جبراً اس سے صحبت کرے، تو فقط وہ آدمی ہی جس نے صحبت کی مار ڈالا جائے پر اس لڑکی سے کچھ نہ کرنا۔" (استثناء ۲۲-۲۳ تا ۲۶)

لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے بہت پہلے یہودی علماء، فقہاء، امراء اور عوام سب اس قانون کو منسوخ کر چکے تھے۔ یہ اگرچہ بائیبل میں لکھا ہوا تھا اور خدائی حکم اسی کو سمجھا جاتا تھا، مگر اسے عملاً نافذ کرنے کا کوئی روادار نہ تھا، حتیٰ کہ یہودیوں کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر تک نہ پائی جاتی تھی کہ یہ حکم کبھی نافذ کیا گیا ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دعوتِ حق لے کر اٹھے اور علمائے یہود نے دیکھا کہ اس سیلاب کو روکنے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی ہے تو وہ ایک چال کے طور پر ایک زانیہ عورت کو آپ کے پاس پکڑ لائے اور کہا کہ اس کا فیصلہ فرمائیے (یوحنا باب ۸ آیت ۱-۱۱) اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو کنوئیں یا کھائی دونوں میں سے کسی ایک میں کُودنے پر مجبور کر دیں۔ اگر آپ رجم کے سوا کوئی اور سزا تجویز کریں تو آپ کو یہ کہہ کر بدنام کیا جائے کہ لیجیے یہ نرالے پیغمبر صاحب تشریف لائے ہیں جنھوں نے دنیوی مصلحتوں کی خاطر خدائی قانون بدل ڈالا۔ اور اگر آپ رجم کا حکم دیں تو ایک طرف رومی قانون سے آپ کو ٹکرا دیا جائے اور دوسری طرف قوم سے کہا جائے کہ مانو ان پیغمبر صاحب کو، دیکھ لینا اب تورات کی پوری شریعت تمھاری پیٹھوں اور جانوں پر برسے گی۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ نے ایک ہی فقرے میں ان کی چال کو انہی پر اُلٹ دیا۔ آپ نے فرمایا تم میں سے جو خود پاک دامن ہے، وہ آگے بڑھ کر اسے پتھر مارے۔ یہ سنتے ہی فقیہوں کی ساری بھیڑ چھٹ گئی۔ ایک ایک منہ چھپا کر رخصت ہو گیا۔ اور "حاملانِ شرعِ متین"

کی اخلاقی حالت بالکل برہنہ ہو کر رہ گئی ۔ پھر جب عورت تنہا کھڑی رہ گئی تو آپ نے اسے نصیحت فرمائی اور توبہ کرا کے رخصت کر دیا، کیونکہ نہ آپ قاضی تھے کہ آپ اس کے مقدمے کا فیصلہ کرتے، نہ اس پہ کوئی شہادت قائم ہوئی تھی، اور نہ کوئی اسلامی حکومت قانونِ الٰہی نافذ کرنے کے لیے موجود تھی ۔ (۱۱۵)

یہودیوں نے دعوتِ عیسیٰؑ کو رد کر دیا

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (آل عمران ۔ آیت ۵۲)

ترجمہ: "جب عیسیٰؑ نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو انھوں نے کہا کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے ؟"

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۔

(آل عمران ۔ آیت ۵۵)

ترجمہ: "(وہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہی تھی) جب اس نے کہا کہ "اے عیسیٰؑ اب میں تجھے واپس لے لوں گا اور تجھ کو اپنی طرف اٹھا لوں گا اور جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے ان سے (یعنی ان کی معیت سے اور ان کے گندے ماحول میں ان کے ساتھ رہنے ۔ سے) تجھے پاک کر دوں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت کے دن ان لوگوں پر بالادست رکھوں گا جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے پھر تم سب کو آخر کار میرے پاس آنا ہے، اس وقت میں ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تمہارے درمیان اختلاف ہوا ہے ؟"

انکار کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایمان لانے کی دعوت دی اور انھوں نے رد کر دیا ۔ بخلاف اس کے پیروی کرنے والوں سے مراد اگر صحیح پیروی کرنے والے ہوں تو وہ صرف مسلمان ہیں اور اگر اس سے مراد فی الجملہ آنجناب کے ماننے والے ہوں تو ان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہیں ۔ (۱۱۶)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل اور سردارانِ قوم کا غصہ اس لیے بھڑکا تھا کہ وہ انھیں گناہوں اور ان کی ریاکاریوں پر ٹوکتے تھے اور ایمان اور راستی کی تلقین کرتے تھے ۔ اس قصور پر ان کے

خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا، رومی عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ حاصل کیا گیا، اور جب رومی حاکم پیلاطس نے یہود سے کہا کہ آج عید کے روز میں تمہاری خاطر یسوع اور برابا ڈاکو، دونوں میں سے کس کو رہا کروں، تو ان کے پورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ برابا کو چھوڑ دے اور یسوع کو پھانسی پر لٹکا۔

(متی باب ۲۷، آیت ۲۰ تا ۲۶) ⑴⑴⑺

یہودیوں کا زعمِ باطل کہ مسیح کو صلیب دی گئی

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (النساء- ۱۵۷)

ترجمہ: "اور خود کہا کہ ہم نے مسیح، عیسیٰ ابن مریم، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے — حالانکہ فی الواقع انھوں نے نہ اس کو قتل کیا ہے نہ صلیب پر چڑھایا مگر معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔

یہ آیت تصریح کرتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام سولی پر چڑھائے جانے سے پہلے اٹھا لیے گئے تھے اور یہ کہ مسیحیوں اور یہودیوں، دونوں کا یہ خیال کہ مسیح نے صلیب پر جان دی، محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ قرآن اور بائیبل کے بیانات کا تقابل مطالعہ کرنے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ غالباً پیلاطس کی عدالت میں تو پیشی آپ ہی کی ہوئی تھی۔ مگر جب وہ سزائے موت کا فیصلہ سنا چکا، اور جب یہودیوں نے مسیح جیسے پاک نفس انسان کے مقابلہ میں ایک ڈاکو کی جان کو زیادہ قیمتی ٹھہرا کر اپنی حق دشمنی و باطل پسندی پر آخری مہر بھی لگا دی، تب اللہ تعالیٰ نے کسی وقت آنجناب کو اٹھا لیا۔ بعد میں یہودیوں نے جس شخص کو صلیب پر چڑھایا وہ آپ کی ذاتِ مقدس نہ تھی، بلکہ کوئی اور شخص تھا جس کو نہ معلوم کس وجہ سے ان لوگوں نے عیسیٰؑ ابن مریم سمجھ لیا تاہم اُن کا جرم اس سے کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس کو انھوں نے کانٹوں کا تاج پہنایا، جس کے منہ پر تھوکا اور جسے ذلت کے ساتھ صلیب پر چڑھایا اس کو وہ عیسیٰؑ بن مریم ہی سمجھ رہے تھے۔ اب یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ معاملہ کس طرح ان کے لیے مشتبہ ہو گیا۔ چونکہ اس باب میں کوئی یقینی ذریعۂ معلومات نہیں ہے، اس لیے مجرد قیاس و گمان اور افواہوں کی بنیاد پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس شبہے کی نوعیت کیا تھی جس کی بنا پر یہودی یہ سمجھے کہ انھوں نے عیسیٰؑ ابنِ مریم کو سولی دی ہے۔ درانحالیکہ عیسیٰؑ ابن مریم ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ⑴⑴⑻

حضرت عیسیٰؑ کی دعوت اور یہود کی گمراہی

وَلَمَّا جَآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ

بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْہِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ۚ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْ بَیْنِهِمْ ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ۝ (الاحزاب: آیت ۶۳ تا ۶۵)

ترجمہ: "اور جب عیسیٰؑ صریح نشانی لیے ہوئے آیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ اسی کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔ مگر (اس کی اس صاف تعلیم کے باوجود) گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا، پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب سے۔"

اختلاف سے مراد یہ ہے کہ ایک گروہ نے ان کا انکار کیا تو مخالفت میں اس حد تک پہنچ گیا کہ ان پر ناجائز ولادت کی تہمت لگائی اور ان کو اپنے نزدیک سولی پر چڑھوا کر چھوڑا۔ دوسرے گروہ نے ان کا اقرار کیا تو عقیدت میں بے تحاشا غلو کر کے ان کو خدا بنا بیٹھا اور پھر ایک انسان کے خدا ہونے کا مسئلہ اس کے لیے ایسی گتھی بنا جسے سلجھاتے سلجھاتے اس میں بے شمار فرقے بن گئے۔ (۱۱۹)

یہودی حضرت عیسیٰؑ کا انکار کیوں کرتے ہیں

"دجال، جس کے فتنۂ عظیم کا استیصال کرنے کے لیے حضرت عیسیٰؑ ابن مریم علیہ السلام کو بھیجا جائے گا یہودیوں میں سے ہوگا، اور اپنے آپ کو "مسیح" کی حیثیت سے پیش کرے گا۔ اس معاملے کی حقیقت کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ یہودیوں کی تاریخ اور ان کے مذہبی تصورات سے واقف نہ ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل پے در پے تنزل کی حالت میں مبتلا ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخرکار بابل اور اسیریا کی سلطنتوں نے ان کو غلام بنا کر زمین میں تتر بتر کر دیا، تو انبیائے بنی اسرائیل نے ان کو خوش خبری دینی شروع کی کہ خدا کی طرف سے ایک "مسیح" آنے والا ہے جو ان کو اس ذلت سے نجات دلائے گا۔ ان پیشینگوئیوں کی بنا پر یہودی ایک ایسے مسیح کی آمد کے متوقع تھے جو بادشاہ ہو، لڑ کر ملک فتح کرے، بنی اسرائیل کو ملک ملک سے لا کر فلسطین میں جمع کر دے، اور ان کی ایک زبردست سلطنت قائم

کر دے لیکن ان کی ان توقعات کے خلاف جب حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام خدا کی طرف سے مسیح ہو کر آئے اور کوئی لشکر ساتھ نہ لائے، تو یہودیوں نے ان کی مسیحیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انھیں ہلاک کرنے کے درپے ہو گئے۔ اس وقت سے آج تک دنیا بھر کے یہودی اس مسیح موعود (PROMISED MESSIAH) کے منتظر ہیں جس کے آنے کی خوشخبریاں ان کو دی گئی تھیں[1]۔ ان کا لٹریچر اس آنے والے دور کے سہانے خوابوں سے بھرا پڑا ہے۔ تلمود اور ربیوں کے ادبیات میں اس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس کی خیالی لذت کے سہارے صدیوں سے یہودی جی رہے ہیں اور یہ امید لیے بیٹھے ہیں کہ یہ مسیح موعود ایک زبردست جنگی و سیاسی لیڈر ہو گا جو دریائے نیل سے دریائے فرات تک کا علاقہ (جسے یہودی اپنی میراث کا ملک سمجھتے ہیں) انھیں واپس دلائے گا اور دنیا کے گوشے گوشے سے یہودیوں کو لا کر اس میں پھر سے جمع کر دے گا۔ (۱۲۰)

---

[1] خود مسیح موعود کی اصطلاح بھی ایک یہودی اصطلاح ہے نہ کہ اسلامی اصطلاح۔ (مؤلف)

فصل ۳

یہودیوں کا دوسرا فسادِ عظیم

فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوٓءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا (بنی اسرائیل۔ آیت ۷)

ترجمہ: ”پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا۔ تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں۔ اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے۔ اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے، اسے تباہ کر کے رکھ دیں۔“

فلسطینی ریاست کی تقسیم

ہیرود[1] کے بعد اس کی ریاست تین حصّوں تقسیم ہوگئی۔

اس کا بیٹا ارخلاؤس سامریہ، یہودیہ اور شمالی اُدومیہ کا فرمانروا ہوا، مگر ۶ء میں قیصر آگسٹس نے اس کو معزول کرکے اس کی پوری ریاست اپنے گورنر کے ماتحت کردی۔ اور ۴۱ء تک یہی انتظام قائم رہا۔ یہی زمانہ تھا جب حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے اٹھے۔ اور یہودیوں کے تمام مذہبی پیشواؤں نے مل کر ان کی مخالفت کی اور رومی گورنر پونتس پیلاطس سے ان کو سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔

ہیرود کا دوسرا بیٹا اینٹی پاس شمالی فلسطین کے علاقہ گلیل اور شرقِ اُردن کا مالک ہوا۔ اور یہی وہ شخص ہے جس نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم کرکے اس کی نذر کیا۔

اس کا تیسرا بیٹا فلپ، کوہ حرمون سے دریائے یرموک تک کے علاقے کا مالک ہو۔ اور یہ اپنے باپ اور بھائیوں سے بھی بڑھ کر رومی و یونانی تہذیب میں غرق تھا۔ اس کے علاقے میں کسی کلمۂ خیر کے پنپنے کی اتنی گنجائش بھی نہ تھی، جتنی فلسطین کے دوسرے علاقوں میں تھی۔

۴۱ء میں ہیرودِ اعظم کے پوتے ہیرود اگرپا کو رومیوں نے ان تمام علاقوں کا فرمانروا بنا دیا۔ جن پر ہیرودِ اعظم اپنے زمانے میں حکمران تھا۔ اس شخص نے برسرِاقتدار آنے کے بعد مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر مظالم

---

[1] ہیرود کا تذکرہ اور متعلقہ تاریخی صورت واقعہ کو پچھلے باب کے آخر میں بیان کیا جاچکا ہے (مرتبین)

کی انتہا کر دی، اور اپنا پورا زور خدا ترسی و اصلاحِ خلق کی اس تحریک کو کچلنے میں صرف کر ڈالا۔ جو حواریوں کی رہنمائی میں چل رہی تھی۔

اس دور میں عام یہودیوں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی جو حالت تھی، اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ان تنقیدوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جو مسیح علیہ السلام نے اپنے خطبوں میں ان پر کی ہیں۔ یہ سب خطبے اناجیل اربعہ میں موجود ہیں۔ پھر اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اس قوم کی آنکھوں کے سامنے یحییٰ علیہ السلام جیسے پاکیزہ انسان کا سر قلم کر دیا گیا۔ مگر ایک آواز بھی اس ظلمِ عظیم کے خلاف نہ اٹھی۔ اور پوری قوم کے مذہبی پیشواؤں نے مسیح علیہ السلام کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا۔ مگر تھوڑے سے راستباز انسانوں کے سوا کوئی نہ تھا جو اس بدبختی پر ماتم کرتا۔ حد یہ ہے کہ جب پونتس پیلاطُس نے ان شامت زدہ لوگوں سے پوچھا کہ آج تمھاری عید کا دن ہے اور قاعدے کے مطابق میں سزائے موت کے مجرموں میں سے ایک کو چھوڑ دینے کا مجاز ہوں، بتاؤ مسیح کو چھوڑوں یا برابا کو؟ تو ان کے پورے مجمع نے بیک آواز ہو کر کہا کہ برابا کو چھوڑ دے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری حجت تھی جو اس قوم پر کی گئی۔

دوسرا فسادِ عظیم اور اس کی پاداش

اس پر تھوڑا زمانہ ہی گزرا تھا کہ یہودیوں اور رومیوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہو گئی اور ۶۴ء اور ۶۶ء کے درمیان یہودیوں نے کھلی بغاوت کر دی۔ ہیرود اگرپا ثانی اور رومی پروکیوریٹر فلورس دونوں اس بغاوت کو فرو کرنے میں ناکام ہوئے۔ آخر کار رومی سلطنت نے ایک سخت فوجی کارروائی سے اس بغاوت کو کچل ڈالا اور ۷۰ء میں ٹیٹس نے بزورِ شمشیر یروشلم کو فتح کر لیا۔ اس موقع پر قتلِ عام میں ایک لاکھ تینتیس ہزار آدمی مارے گئے، ۶۷ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بنائے گئے، ہزارہا آدمی پکڑ پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیے گئے، ہزاروں آدمیوں کو پکڑ کر مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ایمفی تھیٹروں اور کلوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لیے استعمال کیا جائے۔ تمام دراز قامت اور حسین لڑکیاں فاتحین کے لیے چن لی گئیں، اور یروشلم کے شہر اور ہیکل کو مسمار کر کے پیوندِ خاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد فلسطین سے یہودی اثر و اقتدار ایسا مٹا کہ دو ہزار برس تک اس کو پھر سر اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ اور یروشلم کا ہیکل مقدس پھر کبھی تعمیر نہ ہو سکا۔ بعد میں قیصر ہیڈریان نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا، مگر اب اس کا نام ایلیا تھا۔ اور اس میں مدت ہائے دراز تک یہودیوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

یہ تھی وہ سزا جو بنی اسرائیل کو دوسرے فسادِ عظیم کی پاداش میں ملی۔ (۱۳۱)

باب ۷

اپنے انبیاء کے متعلّق یہودؔ کی تہمتیں اور غلط بیانیاں

فصل ۱

انبیاء پر یہودیوں کے لگائے ہوئے داغ اور قرآن

بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل جن لوگوں کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں ان میں سے کسی کی سیرت کو بھی انھوں نے داغدار کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ اور داغ بھی ایسے سخت لگائے ہیں جو اخلاق اور شریعت کی نگاہ میں بدترین جرائم شمار کیے جاتے ہیں، مثلاً شرک، جادوگری، زنا، جھوٹ، دغابازی اور ایسے ہی دوسرے شدید معاصی جن سے آلودہ ہونا پیغمبر تو درکنار ایک معمولی مومن اور شریف انسان کے لیے بھی سخت شرمناک ہے۔ یہ بات بجائے خود نہایت عجیب ہے لیکن بنی اسرائیل کی اخلاقی تاریخ پہ غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فی الحقیقت اس قوم کے معاملہ میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ قوم جب اخلاقی اور مذہبی انحطاط میں مبتلا ہوئی اور عوام سے گزر کر ان کے خواص تک کو، حتّٰی کہ علماء و مشائخ اور دینی منصب داروں کو بھی گمراہیوں اور بداخلاقیوں کا سیلاب بہا لے گیا تو ان کے مجرم ضمیر نے اپنی اس حالت کے لیے عذرات تراشنے شروع کیے اور اسی سلسلہ میں انھوں نے وہ تمام جرائم، جو یہ خود کرتے تھے انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کر ڈالے تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب نبی تک ان چیزوں سے نہ بچ سکے تو بھلا اور کون بچ سکتا ہے۔ اس معاملہ میں یہودیوں کا حال ہندوؤں سے ملتا جلتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی اخلاقی انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تو وہ لٹریچر تیار ہوا جس میں دیوتاؤں کی، رشیوں، منیوں اور اوتاروں کی، غرض جو بلند ترین آئیڈیل قوم کے سامنے ہو سکتے تھے ان سب کی زندگیاں بداخلاقی کے تارکول سے سیاہ کر ڈالی گئیں تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب ایسی ایسی عظیم ہستیاں ان قبائح میں مبتلا ہو سکتی ہیں تو بھلا ہم معمولی فانی انسان ان میں مبتلا ہونے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں، اور پھر جب یہ افعال اتنے اونچے مرتبے والوں کے لیے بھی شرمناک نہیں ہیں تو ہمارے لیے کیوں ہوں؟ (۱۲۲)

یہود کے متعلق معلوم ہے کہ انھوں نے خود اپنی قوم کے انبیاء پر ناپاک الزامات لگائے، اور ان

کی سیرتوں کو داغدار کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا ہے۔ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت اسحاقؑ حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارون (علیہم السلام) غرض کوئی ان کی بدگوئیوں سے نہ بچ سکا[1]۔ لیکن سب سے زیادہ ظلم انھوں نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام پر کیا کہ ان کو انبیاء کی صف سے نکال کر معمولی بادشاہوں کی صف میں آتار لائے، اور ان کو اس حیثیت سے پیش کیا کہ وہ ڈپلومیٹ ہیں، فاتح اور مدبر ہیں، جھوٹ، فریب، ظلم، اور ان تمام وسائل سے توسیع مملکت کرتے ہیں جن سے دنیا کے دوسرے فاتحوں اور جہانگیروں نے کام لیا ہے، اور اپنے نفس کی خواہشات پوری کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو عام بادشاہوں کا شیوہ ہے۔ حد یہ ہے کہ ان لوگوں نے حضرت داؤدؑ پر زنا اور حضرت سلیمانؑ پر شرک کا الزام لگانے میں بھی باک نہیں کیا[2]۔ یہ اس قسم کا برتاؤ اپنے ان بزرگوں کے ساتھ ہے جنھوں نے اس کو ذلت کی خاک سے اٹھا کر عزت کے آسمان پر پہنچایا۔ آج جن تاریخی مفاخر پر یہ قوم ناز کرتی ہے وہ سب انھیں بزرگوں کی بدولت اسے نصیب ہوئے ہیں، اور انہی کی پاک سیرت پر اس نے سیاہی کے چھینٹے پھینکے ہیں۔

دنیا میں صرف ایک قرآن ایسی کتاب ہے جس نے ان انبیاء میں سے ایک ایک کی پوزیشن صاف کی، اور ان کے اصل مرتبہ و مقام سے دنیا کو روشناس کیا۔ اگر قرآن نہ آتا تو آج کوئی شخص ان بزرگوں کو نبی ماننا تو درکنار، عزت سے ان کا نام لینا بھی گوارا نہ کرتا۔ بنی اسرائیل چاہے اس احسان کو نہ مانیں، مگر

---

[1] جو اصحاب اس کی تفصیل معلوم کرنا چاہیں وہ بائیبل کے حسب ذیل مقامات نکال کر دیکھیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں، پیدائش باب ۹ - آیت ۲۰ - ۲۵ - حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق، کتاب پیدائش باب ۱۲ - آیت ۱۰ - ۲۰ - باب ۲۰ - آیت ۱ - ۱۳ - حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق، پیدائش باب ۱۹ - آیت ۳۰ - ۳۸ - حضرت اسحاق علیہ السلام کے متعلق، پیدائش باب ۲۶ - آیت ۷ - ۱۱ - حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق، پیدائش باب ۲۷ - آیت ۱ - ۳۸ - باب ۲۹ - آیت ۱۲ - ۲۹ - باب ۳۴ مکمل - باب ۳۶ - آیت ۲۲ - حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق، پیدائش باب ۳۷ - آیت ۲ - ۴ - حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق، گنتی باب ۳۱ - آیت ۱ - ۱۸ - حضرت ہارون علیہ السلام کے متعلق، خروج باب ۳۲ - آیت ۱ - ۲۴ -

[2] ملاحظہ ہو سلاطین اول - باب ۱۱ - آیت ۱ - ۱۰ - (از مؤلف)

احسان کا احسان ہونا اس کا محتاج نہیں کہ اس کا اعتراف بھی ہو۔

قرآن اور بائبل میں اتنا نمایاں فرق ہو جاتا ہے جتنا روشنی اور تاریکی کا فرق ہے۔ قرآن بنی اسرائیل کے ایک ہیرو کی زندگی کو روشن کر کے دکھاتا ہے اور اس کے دامن پر ایک معمولی لغزش کا داغ بھی دھوئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ مگر خود بنی اسرائیل جس کتاب کو کتابِ مقدس کہہ کر پیش کرتے ہیں وہ ان کے ہیرو کی وہ تصویر بھی پیش نہیں کرتی جو پاک طینت انسانوں کے ذہن میں آنی چاہیے، بلکہ ایسی تصویر پیش کرتی ہے جسے اس اس قوم کے نہایت بد طینت سفہا نے کھینچا تھا۔ یہودی اور عیسائی اس کتاب کو خدا کی کتاب کہتے ہیں، حالانکہ اس میں ایک جگہ نہیں سینکڑوں مقامات پر ایسے بیانات اور ایسے خیالات ملتے ہیں جو خدا تو درکنار شریف انسانوں کے نفس کی بھی ترجمانی نہیں کرتے۔

اسرائیلی کیریکٹر کے کمالات یہیں ختم نہیں ہوتے۔ اس کی معراج آپ کو دیکھنی ہو تو یہ دیکھیے کہ جب قرآن نے اس قوم کے انبیاء کی صفائی پیش کی، اور اس کا لگایا ہوا ایک ایک داغ ان کے دامنوں پر سے دھویا تو یہ خوش ہونے کے بجائے اُلٹے کبیدہ خاطر ہوئے، احسان مند ہونے کے بجائے مقابلے پر اُتر آئے، اور انھوں نے ان سب دامنوں کو، جنھیں قرآن نے دھویا تھا، پھر سے داغدار کرنے کی کوشش کی۔ قرآن جب نازل ہوا تو مدینہ میں یہودی موجود تھے، اور نزولِ قرآن کے چند سال بعد جب مسلمان ایشیا اور افریقہ کے وسیع علاقوں پر پھیلے ہوئے تھے تو یہودیوں کی ایک کثیر تعداد کو ان سے میل جول کا موقع ملا۔ ان لوگوں نے ہر نبی کے متعلق وہی تمام پرانے قصے جو ان کے ہاں مشہور تھے، مسلمانوں میں بھی پھیلا دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کی بہت تفسیریں جو مسلمانوں نے لکھیں، ان کے اثر سے مسموم ہو کر رہ گئیں۔ یہ معاملہ متداول تفاسیر کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ (١٢٣)

فصل ۲

حضرت لُوط علیہ السّلام

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الاعراف۔ آیت ۸۰)

ترجمہ: "اور لُوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا، پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے ہو کر وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔"

یہ قوم اس علاقہ میں رہتی تھی جسے آج کل شرقِ اُردن (FRANS JORDAN) کہا جاتا ہے اور عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس قوم کے صدر مقام کا نام "سَدُوم" بتایا گیا ہے۔ جو بحیرۂ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا۔ تلمُود میں لکھا ہے کہ سدوم کے علاوہ ان کے چار بڑے بڑے شہر اور بھی تھے اور ان شہروں کے درمیان کا علاقہ ایسا گلزار بنا ہوا تھا کہ میلوں تک بس ایک باغ ہی باغ تھا جس کے جمال کو دیکھ کر انسان پر مستی طاری ہونے لگتی تھی۔ مگر آج اس قوم کا نام و نشان بالکل ناپید ہو گیا ہے اور یہ بھی مُتعیّن نہیں ہے کہ اس کی بستیاں ٹھیک کس مقام پر واقع تھیں۔ اب صرف بُحیرۂ مُردار ہی اس کی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے، جسے آج کل بُحیرِ لوط کہا جاتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اپنے چچا کے ساتھ عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام و فلسطین و مصر میں گشت لگا کر دعوت و تبلیغ کا تجربہ حاصل کرتے رہے۔ پھر مستقل پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہو کر اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح پر مامور ہوئے۔ اہل سدوم کو ان کی قوم اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ شاید ان کا رشتہ داری کا تعلق اس قوم سے ہو گا۔

یہودیوں کی تحریف کردہ بائبل میں حضرت لوط علیہ السلام کی سیرت پر جہاں اور بہت سے

سیاہ دھبے لگائے گئے ہیں[1]۔ وہاں ایک دھبہ یہ بھی ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لڑکر سدُوم کے علاقے میں چلے گئے تھے (پیدائش، باب ۱۳۔ آیت ۱۔ ۱۲) مگر قرآن اس غلط بیانی کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ نے انھیں رسول بنا کر اس قوم کی طرف بھیجا تھا۔ (۱۴۲)

---

[1] اور لوط ضُغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اُس کی دونوں بیٹیاں اُس کے ساتھ تھیں کیونکہ اُسے ضُغر میں بستے ڈر لگا اور وہ اور اُس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے۔ تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بُڈھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اُس سے ہم آغوش ہوں تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اُنھوں نے اُسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی پر اُس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اُٹھ گئی۔ اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔ آؤ آج رات بھی اُس کو مے پلائیں اور تو بھی جا کر اس سے ہم آغوش ہو تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اُس رات بھی اُنھوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی گئی اور اُس سے ہم آغوش ہوئی پر اُس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اُٹھ گئی۔ سو لُوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور بڑی کے ایک بیٹا ہوا اور اُس نے اُس کا نام موآب رکھا۔ وہی موآبیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں۔ اور چھوٹی کے بھی ایک بیٹا ہوا اور اُس نے اُس کا نام بِن عَمّی رکھا۔ وہی بنی عمّون کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں۔

(پیدائش، باب ۱۹۔ ۳۰، ۳۸)

فصل ۳

حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام

قرآن حضرت اسمٰعیل کو ذبیح قرار دیتا ہے

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ز سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ ....

.... وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ (الصّٰٓفّٰت ۔ اٰیات ۱۰۰ تا ۱۱۳)

ترجمہ: "(ابراہیم نے دعا کی) اے پروردگار مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو (اس دعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بُردبار) لڑکے کی بشارت دی۔ وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیم نے کہا، بیٹا میں خواب دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا ابّا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔" آخر کو جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔ اور اس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیم پر، ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ

ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے اور اسے اور اسحاق کو برکت دی۔"

بائیبل کی تضاد بیانی

یہاں یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے جن صاحبزادے کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے اور جنہوں نے اپنے آپ کو خود اس قربانی کے لیے پیش کر دیا تھا، وہ کون تھے، سب سے پہلے اس سوال کا جواب ہمارے سامنے بائیبل کی طرف سے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

> "خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا کہ اے ابراہام ...... تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا" (پیدائش، ۲۲: ۱-۲)

اس بیان میں ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ کی قربانی مانگی تھی، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ اکلوتے تھے، حالانکہ خود بائیبل ہی کے دوسرے بیانات سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسحاقؑ اکلوتے نہ تھے۔ اس کے لیے ذرا بائیبل ہی کی حسب ذیل تصریحات ملاحظہ ہوں:

> "اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا اور ساری نے ابرام سے کہا کہ دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے، سو تو میری لونڈی کے پاس جا، شاید اس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابرام نے ساری کی بات مانی۔ اور ابرام کو ملک کنعان میں رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اس کی بیوی ساری نے مصری لونڈی اسے دی کہ اس کی بیوی بنے اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی۔" (پیدائش ۱۶: ۱-۳)
>
> "خداوند کے فرشتے نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا پیدا ہو گا، اس کا نام اسمٰعیل رکھنا" (۱۶: ۱۱)
>
> "جب ابرام سے ہاجرہ کے اسماعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔" (۱۶: ۱۶)
>
> "اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے ...... اس سے بھی تجھے ایک

بیٹا بخشوں گا...... تو اس کا نام اضحاق رکھنا...... جو اگلے سال اسی وقت معیّن پر سارہ سے پیدا ہوگا...... تب ابرام نے اپنے بیٹے اسماعیل کو اور...... گھر کے سب مردوں کو لیا اور اسی روز خدا کے حکم کے مطابق ان کا ختنہ کیا۔ ابرام ننانوے برس کا تھا جب اس کا ختنہ ہوا اور جب اسماعیل کا ختنہ ہوا تو وہ تیرہ برس کا تھا۔" (پیدائش ١٧ : ١٥ - ٢٥)

"اور جب اس کا بیٹا اضحاق اس سے پیدا ہوا تو ابراہام سو برس کا تھا۔" (پیدائش ۔ ٢١ : ٥)

اس سے بائبل کی تضاد بیانی صاف کھل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ چودہ برس تک تنہا حضرت اسمٰعیلؑ ہی حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ اب اگر قربانی اکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی تو وہ حضرت اسحاقؑ کی نہیں حضرت اسمٰعیلؑ کی تھی کیونکہ وہی اکلوتے تھے۔ اور اگر حضرت اسحاق کی قربانی مانگی گئی تھی کہ پھر یہ کہنا غلط ہے کہ اکلوتے بیٹے کی قربانی مانگی گئی تھی۔

اسلامی روایات میں اختلافات کی حقیقت

اس کے بعد ہم اسلامی روایات کو دیکھتے ہیں اور ان میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ مفسّرین نے صحابہ و تابعین کی جو روایات نقل کی ہیں ان میں ایک گروہ کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاق تھے، اور اس گروہ میں حسب ذیل بزرگوں کے نام ملتے ہیں۔

حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس۔ حضرت ابوہریرہ۔ قتادہؒ۔ عکرمہؒ۔ حسن بصریؒ۔ سعید بن جبیرؒ۔ مجاہدؒ۔ شعبیؒ۔ مسروقؒ۔ مکحولؒ۔ زہریؒ۔ عطاؒ۔ مقاتلؒ۔ سدیؒ۔ کعب احبارؒ۔ زیدؒ بن اسلم وغیرہم۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ حضرت اسماعیل تھے اور اس گروہ میں حسب ذیل بزرگوں کے نام نظر آتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ حضرت ابوہریرہؓ۔ حضرت معاویہؓ۔ عکرمہؓ۔ مجاہدؒ۔ یوسف بن مہرانؒ۔ حسن بصریؒ۔ محمد بن کعب القرظیؒ۔ شعبی۔ سعید بن المسیّبؒ۔ ضحّاک۔ محمد بن علی بن حسینؒ (محمد الباقر) ربیع بن انسؒ۔ احمد بن حنبلؒ وغیرہم۔

ان دونوں فہرستوں کا تقابل کیا جائے تو متعدد نام ان میں مشترک نظر آئیں گے۔ یعنی ایک ہی بزرگ سے دو مختلف قول منقول ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے عکرمہؓ یہ قول نقل کرتے ہیں کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاق تھے لیکن انہی سے عطا بن ابی رباحؒ یہ بات نقل کرتے ہیں زَعَمَتِ الیھود انہ

اسحق وکذبت الیهود "یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اسحاق تھے مگر یہودی جھوٹ کہتے ہیں"۔ اسی طرح حضرت حسن بصریؒ سے ایک روایت ہے کہ وہ حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کے قائل تھے۔ مگر عمرو بن عُبید کہتے ہیں کہ حسن بصری کو اس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ اسماعیل علیہ السلام تھے۔

حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح ہونے کے واضح دلائل

لیکن اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ امر ہر شک سے بالاتر نظر آتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح تھے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے ایک صالح بیٹے کے لیے دعا کی تھی اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک حلیم لڑکے کی بشارت دی۔ فحوائے کلام صاف بتا رہا ہے کہ دعا اس وقت کی گئی تھی جب آپ بے اولاد تھے۔ اور بشارت جس لڑکے کی دی گئی تھی وہ آپ کا پہلوٹا بچہ تھا۔ پھر یہ بھی قرآن ہی کے سلسلۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی بچہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا اشارہ فرمایا گیا۔ اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلوٹھے صاحبزادے اسماعیل تھے نہ کہ اسحاق۔ خود قرآن مجید میں صاحبزادوں کی ترتیب اس طرح بیان ہوتی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ (ابراهیم - آیت - ۳۹)

(۲) قرآن مجید میں جہاں حضرت اسحاقؑ کی بشارت دی گئی ہے وہاں ان کے لیے غلامٍ علیمٍ (علم والے لڑکے) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ فَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الذاریات - ۲۸) لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الحجر - ۵۳) مگر یہاں جس لڑکے کی بشارت دی گئی ہے اس کے غلامٍ حلیمٍ (بردبار لڑکے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صاحبزادوں کی دو نمایاں صفات الگ الگ تھیں اور ذبح کا حکم غلامِ علیم کے لیے نہیں بلکہ غلامِ حلیم کے لیے تھا۔

(۳) قرآن مجید میں حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کی خوشخبری دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ حضرت سارہ کو یہ خوشخبری بھی دی گئی تھی کہ ان کے ہاں یعقوبؑ جیسا بیٹا پیدا ہوگا۔ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ (هود - ۷۱) اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کی پیدائش کی خبر دینے کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی جا چکی ہو

کہ اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا، اس کے متعلق اگر حضرت ابراہیمؑ کو یہ خواب دکھایا جاتا کہ آپ اسے ذبح کر رہے ہیں، تو حضرت ابراہیمؑ اس سے کبھی یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اس بیٹے کو قربان کر دینے کا اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔ علامہ ابن جریر اس دلیل کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ممکن ہے یہ خواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت دکھایا گیا ہو جب حضرت اسحاقؑ کے ہاں حضرت یعقوبؑ پیدا ہو چکے ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ اس دلیل کا نہایت بودا سا جواب ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب وہ لڑکا باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہو گیا" تب یہ خواب دکھایا گیا۔ ان الفاظ کو جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اس کے سامنے آٹھ دس برس کے بچے کی تصویر آئے گی۔ کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا جوان صاحبِ اولاد بیٹے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہوں گے۔

(۴) اللہ تعالیٰ سارا قصہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتا ہے کہ "ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی بیٹا نہیں ہے جسے ذبح کرنے کا اشارہ کیا گیا تھا، بلکہ پہلے کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی، پھر جب وہ باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا حکم ہوا، پھر جب حضرت ابراہیمؑ اپنے امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ تب ان کو ایک اور بیٹے اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی۔ یہ ترتیبِ واقعات قطعی طور پر فیصلہ کر دیتی ہے کہ جن صاحبزادے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت اسحاقؑ نہ تھے بلکہ وہ ان سے کئی برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ علامہ ابن جریر اس صریح دلیل کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ پہلے صرف اسحاقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی، پھر جب وہ خدا کی خوشنودی پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو گئے تو اس کا انعام اس شکل میں دیا گیا کہ ان کے نبی ہونے کی خوش خبری دی گئی۔ لیکن یہ ان کے پہلے جواب سے بھی زیادہ کمزور جواب ہے، اگر فی الواقع بات یہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یوں نہ فرماتا کہ "ہم نے اس کو اسحاق کی بشارت دی ایک نبی صالحین میں سے۔" بلکہ یوں فرماتا کہ ہم نے اس کو یہ بشارت دی کہ تمہارا یہی لڑکا ایک نبی ہوگا صالحین میں سے۔

(۵) معتبر روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے فدیہ میں جو مینڈھا ذبح کیا گیا تھا اس کے سینگ خانہ کعبہ میں حضرت عبداللہؓ بن زبیر کے زمانے تک محفوظ تھے۔ بعد میں جب حجاج بن یوسف نے حرم میں ابن زبیر کا محاصرہ کیا، اور خانہ کعبہ کو مسمار کر دیا، تو وہ سینگ بھی ضائع ہو گئے۔ ابن عباسؓ اور عامر شعبی دونوں اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انھوں نے خود خانہ کعبہ کے اندر یہ سینگ دیکھے ہیں (ابن کثیر) یہ اس بات کا ثبوت

ہے کہ قربانی کا واقعہ شام میں نہیں بلکہ مکہ معظمہ میں پیش آیا تھا اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اسی لیے تو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے تعمیر کردہ خانہ کعبہ میں اس کی یادگار محفوظ رکھی گئی تھی۔

(۶) یہ بات صدیوں سے عرب کی روایات میں محفوظ تھی کہ قربانی کا یہ واقعہ منٰی میں پیش آیا تھا اور یہ صرف روایت ہی نہ تھی بلکہ اُس وقت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک مناسکِ حج میں یہ کام بھی برابر شامل چلا آرہا تھا کہ اُسی مقام منٰی میں جاکر لوگ اُسی جگہ پر جہاں حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی تھی، جانور قربان کیا کرتے تھے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ نے بھی اسی طریقے کو جاری رکھا۔ حتّٰی کہ آج تک حج کے موقع پر دس ذی الحجہ کو منٰی میں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ساڑھے چار ہزار برس کا یہ متواتر عمل اس امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس قربانی کے وارث بنی اسماعیلؑ ہوئے ہیں نہ کہ بنی اسحٰقؑ۔ حضرت اسحٰقؑ کی نسل میں ایسی کوئی رسم کبھی جاری نہیں رہی جس میں ساری قوم بیک وقت قربانی کرتی ہو اور اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یادگار کہتی ہو۔

یہ ایسے دلائل ہیں جن کو دیکھنے کے بعد یہ بات قابلِ تعجب نظر آتی ہے کہ خود اُمتِ مُسلمہ میں حضرت اسحٰقؑ کے ذبیح ہونے کا خیال آخر پھیل کیسے گیا۔ یہودیوں نے اگر حضرت اسمٰعیلؑ کو اس شرف سے محروم کرکے اپنے دادا اسحٰقؑ کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کی تو یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن آخر مسلمانوں کے ایک گروہ کثیر نے ان کی اس دھاندلی کو کیسے قبول کر لیا؟ اس سوال کا بہت شافی جواب علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں دیا ہے وہ کہتے ہیں:

> "حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ سارے اقوال (جو حضرت اسحٰقؑ کے ذبیح ہونے کے حق میں ہیں) کعب احبار سے منقول ہیں۔ یہ صاحب حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمان ہوئے تو کبھی کبھی یہ یہود و نصارٰی کے قدیم مندرجات ان کو سنایا کرتے تھے، اور حضرت عمرؓ ان کو سن لیا کرتے تھے۔ اس بنا پر دوسرے لوگ بھی ان کی باتیں سننے لگے، اور سب رطب و یابس جو بیان کرتے تھے انھیں روایت کرنے لگے۔ حالانکہ اس امت کو ان کے اس ذخیرۂ معلومات میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کی ایک مجلسی بحث

اس سوال پر مزید روشنی محمد بن کعب قُرظی کی ایک روایت سے پڑتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ

میری موجودگی میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ہاں یہ سوال چھڑا کہ ذبیح حضرت اسحٰقؑ تھے یا حضرت اسمٰعیلؑ۔ اس وقت ایک ایسے صاحب بھی مجلس میں موجود تھے جو پہلے یہودی علماء میں سے تھے اور بعد میں سچے دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔ انھوں نے کہا: "امیر المومنین خدا کی قسم وہ اسمٰعیلؑ ہی تھے۔ اور یہودی اس بات کو جانتے ہیں مگر وہ عربوں سے حسد کی بنا پر یہ دعوے کرتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسحٰقؑ تھے۔" (ابن جریر) ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ یہودی پراپیگنڈے کا اثر تھا جو مسلمانوں میں پھیل گیا، اور مسلمان چونکہ علمی معلومات میں ہمیشہ غیر متعصب رہے ہیں، اس لیے ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہودیوں کے ان بیانات کو، جو وہ قدیم صحیفوں کے حوالہ سے تاریخی روایات کے بھیس میں پیش کرتے تھے، محض ایک علمی حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا اور یہ محسوس نہ کیا کہ اس میں علم کے بجائے تعصب کارفرما ہے۔ (۱۲۵)

فصل سم

حضرت یعقوب علیہ السّلام

وَجَآءُوٓ أَبَاهُمْ عِشَآءً يَبْكُونَ قَالُوا يَٰٓأَبَانَآ إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِندَ مَتَٰعِنَا فَأَكَلَهُ ٱلذِّئْبُ وَمَآ أَنتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَٰدِقِينَ ۝ (یوسف۔ آیت ۱۶-۱۷)

ترجمہ: "شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا "ابا جان، ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آکر اُسے کھا گیا۔ آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں۔"

وَجَآءُو عَلَىٰ قَمِيصِهِۦ بِدَمٍ كَذِبٍ ۚ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَٱللَّهُ ٱلْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ (یوسف۔ آیت ۱۸)

ترجمہ: "اور وہ یوسف کے قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے تھے۔ یہ سن کر ان کے باپ نے کہا بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا، صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔ جو بات تم بنا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے۔"

بائبل اور تلمود بیان حضرت یعقوبؑ کے تاثر کا نقشہ بھی کچھ ایسا کھینچتی ہیں جو کسی معمولی باپ کے تاثر سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ بائبل کا بیان یہ ہے کہ تب یعقوب نے اپنا پیراہن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹا اور بہت دنوں تک اپنے بیٹے کے لیے ماتم کرتا رہا۔" اور تلمود کا بیان ہے کہ "یعقوب بیٹے کا قمیص پہچانتے ہی اوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر بڑے زور سے چیخا کہ ہاں یہ میرے بیٹے ہی کا قمیص ہے .... اور وہ سالہا سال تک یوسف کا ماتم کرتا رہا۔" اس نقشے میں حضرت یعقوب وہی کچھ کرتے نظر آتے ہیں جو ہر باپ ایسے موقع پر کرے گا۔ لیکن قرآن جو نقشہ پیش

کر رہا ہے اس سے ہمارے سامنے ایک ایسے غیر معمولی انسان کی تصویر آتی ہے جو کمال درجہ بردبار و باوقار ہے، اتنی بڑی غم انگیز خبر سن کر بھی اپنے دماغ کا توازن نہیں کھوتا، اپنی فراست سے ٹھیک ٹھیک نوعیت کو بھانپ جاتا ہے کہ یہ ایک بناوٹی بات ہے جو ان حاسد بیٹوں نے بنا کر پیش کی ہے، اور پھر عالی ظرف انسان کی طرح صبر کرتا ہے اور خدا پر بھروسہ کرتا ہے۔ (۱۲۶)

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَن تُفَنِّدُونِ ۝ (یوسف - ۹۴)

ترجمہ: "جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں۔"

ایک طرف قرآن حضرت یعقوبؑ کو اس پیغمبرانہ شان کے ساتھ پیش کر رہا ہے اور دوسری طرف بنی اسرائیل ان کو ایسے رنگ میں دکھاتے ہیں جیسا عرب کا ہر معمولی بدو ہو سکتا ہے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ جب بیٹوں نے آکر خبر دی کہ یوسفؑ اب تک جیتا ہے اور وہی سارے ملکِ مصر کا حاکم ہے تو یعقوب کا دل دھک سے رہ گیا، کیونکہ اس نے ان کا یقین نہ کیا .... اور جب ان کے باپ یعقوبؑ نے وہ گاڑیاں دیکھیں جو یوسف نے ان کو لانے کے لیے بھیجی تھیں تب اس کی جان میں جان آئی۔ (پیدائش، ۴۵: ۲۶-۲۷) (۱۲۷)

فصل ۵

حضرت یوسف علیہ السّلام

حضرت یوسفؑ کے پہلے خواب کا قصہ

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (یوسف۔ آیات ۵۔۶)

ترجمہ: "جواب میں اس کے (یعنی حضرت یوسف) باپ نے کہا، بیٹا اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے۔ ہوشیار رہنا کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے۔ اور ایسا ہی ہوگا (جیسا تو نے خواب میں دیکھا ہے کہ) تیرا رب تجھے (اپنے کام کے لیے) منتخب کرے گا اور تجھے باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آلِ یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح وہ اس سے پہلے تیرے بزرگوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر کر چکا ہے یقیناً تیرا رب علیم اور حکیم ہے۔"

بائیبل اور تلمود کا بیان قرآن کے بیان سے مختلف ہے۔ ان کا بیان یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے خواب سن کر بیٹے کو خوب ڈانٹا اور کہا، اچھا اب تو یہ خواب دیکھنے لگا ہے کہ میں اور تیری ماں اور تیرے سب بھائی تجھے سجدہ کریں گے۔

لیکن ذرا غور کرنے سے بآسانی یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ حضرت یعقوب کی پیغمبرانہ سیرت سے قرآن کا بیان زیادہ مناسبت رکھتا ہے، نہ کہ بائیبل اور تلمود کا۔ حضرت یوسفؑ نے خواب بیان کیا تھا کوئی اپنی تمنا اور خواہش نہیں بیان کی تھی۔ خواب اگر سچا تھا، اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب نے جو تعبیر نکالی وہ سچا خواب

سمجھ کر نکالی تھی، تو اس کے صاف معنی یہ تھے کہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش نہیں تھی بلکہ تقدیرِ الٰہی کا فیصلہ تھا کہ ایک وقت ان کو یہ عروج حاصل ہو۔ پھر کیا ایک پیغمبر تو درکنار ایک معقول آدمی کا بھی یہ کام ہو سکتا ہے کہ ایسی بات پر برا مانے اور خواب دیکھنے والے کو الٹی ڈانٹ پلائے؟ اور کیا کوئی شریف باپ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے بیٹے کے آئندہ عروج کی بشارت سن کر خوش ہونے کے بجائے الٹا جل بھن جائے؟ (۱۲۸)

بھائیوں کے خلاف چغلیاں کھانے کا الزام

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ط إِنَّ
أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ہ (یوسف - ۸)

ترجمہ: اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا یہ یوسف اور اس کا بھائی دونوں ہمارے والد کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں، حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ابا جان بالکل ہی بہک گئے ہیں۔"

حضرت یوسفؑ کے حقیقی بھائی بن یمین تھے جو ان سے کئی سال چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت یعقوبؑ ان دونوں بے ماں کے بچوں کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ خاص طور پر حضرت یوسفؑ سے ان کی محبت کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی ساری اولاد میں صرف وہی ایسے تھے جن کے اندر ان کو آثارِ رشد و سعادت نظر آتے تھے۔ اوپر حضرت یوسفؑ کا خواب سن کر انھوں نے جو کچھ فرمایا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس بیٹے کی غیر معمولی صلاحیتوں سے خوب واقف تھے۔ دوسری طرف ان دس بڑے صاحبزادوں کی سیرت کا جو حال تھا اس کا اندازہ بھی آگے کے واقعات سے ہو جاتا ہے۔ پھر کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک نیک انسان ایسی اولاد سے خوش رہ سکے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ بائیبل میں برادرانِ یوسفؑ کے حسد کی ایک ایسی وجہ بیان کی گئی ہے جس سے الٹا الزام حضرت یوسفؑ پر عائد ہوتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ بھائیوں کی چغلیاں باپ سے کھایا کرتے تھے اس وجہ سے بھائی ان سے ناراض تھے۔ (۱۲۹)

کنوئیں میں ڈالے جانے پر حضرت یوسفؑ کی کیفیت۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَن يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ
لَتُنَبِّئَنَّهُم بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (یوسف - ۵۱)

ترجمہ: "اس طرح اصرار کر کے جب وہ اسے لے گئے اور انھوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے کنوئیں میں چھوڑ دیں گے تو ہم نے یوسف کو وحی کی کہ ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا، یہ اپنے فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں۔"

تمن میں وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ کے الفاظ کچھ ایسے انداز سے آئے ہیں کہ ان سے تین معنی نکلتے ہیں اور تینوں ہی لگتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم یوسف کو یہ تسلی دے رہے تھے اور اس کے بھائیوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ اس پر وحی کی جا رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ تو ایسے حالات میں یہ خبر ان کو جتائے گا جہاں تیرے ہونے کا انھیں وہم و گمان تک نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ آج یہ بے سمجھے بوجھے ایک حرکت کر رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ آئندہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں۔

بائیبل اور تلمود اس ذکر سے خالی ہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوسف علیہ السلام کو کوئی تسلی بھی دی گئی تھی۔ اس کے بجائے تلمود میں جو روایت بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کنوئیں میں ڈالے گئے تو وہ بہت بلبلائے اور خوب چیخ چیخ کر انھوں نے بھائیوں سے فریاد کی۔

قرآن کا بیان پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ ایک ایسے نوجوان کا بیان ہو رہا ہے جو آگے چل کر تاریخ انسانی کی عظیم ترین شخصیتوں میں شمار ہونے والا ہے۔ تلمود کو پڑھیے تو کچھ ایسا نقشہ سامنے آئے گا کہ صحرا میں چند بدو ایک لڑکے کو کنوئیں میں پھینک رہے ہیں اور وہ وہی کچھ کر رہا ہے جو ہر لڑکا ایسے موقع پر کرے گا۔ (۱۳۰)

رہائی کے موقع کی غلط تصویر

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۚ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ۝ (یوسف۔ آیت ۵۰)

ترجمہ: "بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ۔ مگر جب شاہی فرستادہ یوسف کے پاس پہنچا تو اس نے کہا اپنے رب کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاری سے واقف ہی ہے۔"

یہاں سے لے کر بادشاہ کی ملاقات تک جو کچھ قرآن نے بیان کیا ہے — جو اس قصے کا بڑا ہی اہم مضمون ہے — اس کا ذکر تلمود اور بائیبل میں نہیں ہے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ بادشاہ کی طلبی پر حضرت یوسف

فوراً چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حجامت بنوائی، کپڑے بدلے اور دربار میں جا حاضر ہوئے۔ تلمود اس سے بھی گھٹیا صورت میں اس واقعے کو پیش کرتی ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ "بادشاہ نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ یوسفؑ کو میرے حضور پیش کرو۔ اور یہ بھی ہدایت کر دی کہ دیکھو ایسا کوئی کام نہ کرنا کہ لڑکا گھبرا جائے اور صحیح تعبیر نہ دے سکے۔ چنانچہ شاہی ملازموں نے یوسفؑ کو قید خانے سے نکالا۔ حجامت بنوائی، کپڑے بدلوائے اور دربار میں لا کر پیش کر دیا۔ بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا تھا۔ وہاں زر و جواہر کی چمک دمک اور دربار کی شان دیکھ کر یوسف ہکا بکا رہ گیا اور اُس کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ شاہی تخت کی سات سیڑھیاں تھیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی معزز آدمی بادشاہ سے کچھ عرض کرنا چاہتا تو وہ چھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتا اور بادشاہ سے ہم کلام ہوتا تھا۔ اور جب ادنیٰ طبقے کا کوئی آدمی شاہی مخاطبے کے لیے بلایا جاتا تو وہ نیچے کھڑا رہتا اور بادشاہ تیسری سیڑھی تک اتر کر اس سے بات کرتا۔ یوسف اسی قاعدے کے مطابق نیچے کھڑا ہوا اور زمیں بوس ہو کر اس نے بادشاہ کو سلامی دی اور بادشاہ نے تیسری سیڑھی تک اتر کر اس سے گفتگو کی۔" اس تصویر میں بنی اسرائیل نے اپنے جلیل القدر پیغمبر کو جتنا گرا کر پیش کیا ہے، اس میں نگاہ میں رکھیے اور پھر دیکھیے کہ قرآن ان کے قید سے نکلنے اور بادشاہ سے ملنے کا واقعہ کس شان اور کس آن بان سے پیش کرتا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا ہر صاحبِ نظر کا کام ہے کہ ان دونوں تصویروں میں سے کون سی تصویر پیغمبری کے مرتبے سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ علاوہ بریں یہ بات بھی عقل عام کو کھٹکتی ہے کہ اگر بادشاہ کی ملاقات کے وقت تک حضرت یوسفؑ کی حیثیت اتنی ہی گری ہوئی تھی جتنی تلمود کے بیان سے معلوم ہوتی ہے، تو خواب کی تعبیر سنتے ہی یکایک ان کو تمام سلطنت کا مختارِ کل کیسے بنا دیا گیا۔ ایک مہذّب و متمدّن ملک میں اتنا بڑا مرتبہ تو آدمی کو اسی وقت ملا کرتا ہے جب کہ وہ اپنی اخلاقی اور ذہنی برتری کا سکہ لوگوں پر بٹھا چکا ہو۔ پس عقل کی رُو سے بھی بائبل اور تلمود کی بہ نسبت قرآن ہی کا بیان زیادہ مطابقِ حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ (۱۳۱)

فصل ۶

حضرت موسیٰ علیہ السلام

ان پر قتلِ عمد کا الزام

فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۔ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِىْ (القصص۔ آیت ۱۵-۱۶)

ترجمہ: "موسیٰؑ نے اس کو گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا (یہ حرکت سرزد ہوتے ہی) موسیٰؑ نے کہا یہ شیطان کی کارفرمائی ہے، وہ سخت دشمن اور کھلا گمراہ کن ہے۔ پھر وہ کہنے لگا میرے رب، میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا، میری مغفرت فرما دے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گھونسا کھا کر جب مصری گرا ہو گا اور اس نے دم توڑ دیا ہو گا تو کیسی سخت ندامت اور گھبراہٹ کی حالت میں یہ الفاظ حضرت موسیٰؑ کی زبان سے نکلے ہوں گے۔ ان کا کوئی ارادہ قتل کا نہ تھا۔ نہ قتل کے لیے گھونسا مارا جاتا ہے۔ نہ کوئی شخص یہ توقع رکھتا ہے کہ ایک گھونسا کھاتے ہی ایک بھلا چنگا آدمی پران چھوڑ دے گا۔ اس بنا پر حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ یہ شیطان کا کوئی شریرانہ منصوبہ معلوم ہوتا ہے، اس نے ایک بڑا فساد کھڑا کرنے کے لیے مجھ سے یہ کام کرایا ہے تاکہ ایک اسرائیلی کی حمایت میں ایک قبطی کو مار ڈالنے کا الزام مجھ پر عائد ہو، اور صرف میرے ہی خلاف نہیں بلکہ تمام بنی اسرائیل کے خلاف مصر میں ایک طوفانِ عظیم اٹھ کھڑا ہو۔

اس معاملے میں بائیبل کا بیان قرآن سے مختلف ہے۔ وہ حضرت موسیٰؑ کو قتلِ عمد کا مجرم ٹھہراتی ہے۔ اس کی روایت یہ ہے کہ مصری اور اسرائیلی کو لڑتے دیکھ کر حضرت موسیٰؑ نے ادھر ادھر نگاہ کی، اور جب دیکھا کہ وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے تو اس مصری کو جان سے مار کر اسے ریت میں چھپا دیا۔ (خروج ۲ : ۱۲) یہی بات تلمود میں بھی بیان کی گئی ہے۔

اب یہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ بنی اسرائیل اپنے اکابر کی سیرتوں کو خود کس طرح داغدار کرتے ہیں اور قرآن کس طرح ان کی پوزیشن صاف کرتا ہے۔ عقل بھی یہی کہتی ہے کہ ایک حکیم و دانا آدمی، جسے آگے چل کر ایک اولوالعزم پیغمبر ہونا تھا، اور جسے انسان کو عدل و انصاف کا ایک عظیم الشان قانون دینا تھا، ایسا اندھا قوم پرست نہیں ہو سکتا کہ اپنی قوم کے ایک فرد سے کسی شخص کو لڑتے دیکھ کر آپے سے باہر ہو جائے اور جان بوجھ کر اسے قتل کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایک اسرائیلی کو مصری کے پنجے سے چھڑانے کے لیے اسے "قتل کر دینا تو روا نہ ہو سکتا تھا۔ (۱۳۲)

مدین میں قید کا افسانہ اور بدکاری کا الزام

قَالَتْ إِحْدٰىهُمَا يٰٓأَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِيْنُ
قَالَ إِنِّيْٓ أُرِيْدُ أَنْ أُنْكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ (القصص۔ آیات۔ ۲۶-۲۷)

ترجمہ: "ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا۔ ابا جان، اس شخص کو نوکر رکھ لیجیے۔ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔ اس کے باپ نے (موسیٰؑ سے) کہا، میں چاہتا ہوں کہ اپنی دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں"۔

ضروری نہیں ہے کہ بیٹی کی بات سنتے ہی باپ نے فوراً حضرت موسیٰؑ سے یہ بات کہہ دی ہو۔ قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے بیٹی کے مشورے پر غور کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہوگی کہ آدمی شریف سہی مگر جوان بیٹیوں کے گھر میں ایک جوان تندرست و توانا آدمی کو یونہی ملازم رکھ چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ جب یہ شریف، تعلیم یافتہ اور مہذب اور خاندانی آدمی ہے (جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کا قصہ سن کر انھیں معلوم ہو چکا ہوگا) تو کیوں نہ اسے داماد بنا کر ہی گھر میں رکھا جائے۔ اس رائے پر پہنچنے کے بعد انھوں نے کسی مناسب وقت پر حضرت موسیٰؑ سے یہ بات کہی ہوگی۔

یہاں پھر بنی اسرائیل کی ایک کرم فرمائی ملاحظہ ہو جو انھوں نے اپنے جلیل القدر نبی، اپنے سب سے بڑے محسن اور قومی ہیرو پر کی ہے۔ تلمود میں کہا گیا ہے کہ "موسیٰؑ رعویل کے ہاں رہنے لگا اور وہ میزبان کی بیٹی صفورہ پر نظرِ عنایت رکھتے تھے، یہاں تک کہ آخر کار انھوں نے اس سے بیاہ کر لیا۔" ایک اور یہودی روایت جو جیوش انسائیکلوپیڈیا میں نقل کی گئی ہے یہ ہے کہ "حضرت موسیٰؑ نے جب یتھرو کو اپنا ماجرا سنایا تو اس نے سمجھ لیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت تباہ ہونے کی پیشین گوئیاں کی گئی تھیں۔ اس لیے

اس نے فوراً حضرت موسیٰ کو قید کر لیا تاکہ انھیں فرعون کے حوالے کر کے انعام حاصل کرے۔ سات یا دس سال تک وہ اس کی قید میں رہے۔ ایک تاریک تہ خانہ تھا جس میں وہ بند تھے۔ مگر یتھرو کی بیٹی زفورا (یا صفورا) جس سے کنویں پر ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی، چپکے چپکے ان سے قید خانے میں ملتی رہی اور انھیں کھانا پینا بھی پہنچاتی رہی۔ ان دونوں میں شادی کی خفیہ قرارداد ہو چکی تھی۔ سات یا دس سال بعد زفورا نے اپنے باپ سے کہا کہ اتنی مدت ہوئی آپ نے ایک شخص کو قید میں ڈال دیا تھا اور پھر اس کی خبر تک نہ لی۔ اب تک اسے مر جانا چاہیے تھا۔ لیکن اگر وہ اب بھی زندہ ہو تو ضرور کوئی خدا رسیدہ آدمی ہے۔ یتھرو اس کی یہ بات سن کر جب قید خانے میں گیا تو حضرت موسیٰ کو زندہ دیکھ کر اسے یقین آ گیا کہ وہ معجزے سے زندہ ہیں۔ تب اس نے زفورا سے ان کی شادی کر دی۔" (۱۳۲)

مفروضہ بیوی سے چالیس سال تک قطع تعلق کا الزام

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ.

(القصص۔ آیت ۲۲)

ترجمہ: "(مصر سے نکل کر) جب موسیٰ نے مدین کا رخ کیا تو اس نے کہا، امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا۔"

بائیبل کا بیان اس امر میں قرآن سے متفق ہے کہ حضرت موسیٰ نے مصر سے نکل کر مدین کا رخ کیا تھا۔ مگر تلمود بے سر و پا قصہ بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ مصر سے بھاگ کر حبش چلے گئے اور وہاں بادشاہ کے مقرب ہو گئے۔ پھر اس کے مرنے کے بعد لوگوں نے ان کو اپنا بادشاہ بنا لیا اور اس کی بیوہ سے ان کی شادی کر دی۔ چالیس سال تک انھوں نے وہاں حکومت کی، مگر اس پوری مدت میں اپنی حبشی بیوی سے کبھی مقاربت نہ کی۔ چالیس سال گزر جانے کے بعد اس عورت نے حبش کے باشندوں سے شکایت کی کہ اس شخص نے آج تک نہ تو مجھ سے زن و شو کا تعلق رکھا ہے اور نہ کبھی حبش کے دیوتاؤں کی پرستش کی ہے۔ اس پر امرائے سلطنت نے انھیں معزول کر کے اور بہت سا مال دے کر ملک سے باحترام رخصت کر دیا۔ تب وہ حبش سے مدین پہنچے۔ اس وقت ان کی عمر ۶۷ سال تھی۔

اس قصے کے بے سر و پا ہونے کی کھلی دلیل یہ ہے کہ اسی قصے میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اس زمانے میں اسیریا (شمالی عراق) پر حبش کی حکومت تھی اور اسیریا والوں کی بغاوت میں کچلنے کے لیے حضرت موسیٰ نے بھی

اور ان کے پیش رو بادشاموں نے بھی فوجی چڑھائیاں کی تھیں۔ اب جو شخص بھی تاریخ و جغرافیہ سے کوئی واقفیت رکھتا ہو وہ نقشے پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھ سکتا ہے کہ اسیریا پر حبش کا تسلط اور حبشی فوج کا حملہ یا تو اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ مصر اور فلسطین و سام پر اس کا قبضہ ہوتا یا پورا ملک عرب ان کے زیر نگیں ہوتا یا پھر حبش کا بیڑا ایسا زبردست ہوتا کہ وہ بحرِ ہند اور خلیج فارس کو عبور کر کے عراق فتح کر لیتا۔ تاریخ اس ذکر سے خالی ہے کہ کبھی حبشیوں کو ان ممالک پر تسلط حاصل ہوا ہو، یا ان کی بحری طاقت اتنی زبردست رہی ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا علم خود اپنی تاریخ کے بارے میں کتنا ناقص ہے اور قرآن ان کی غلطیوں کی تصحیح کر کے صحیح واقعات کیسی منقح صورت میں پیش ظاہر ہے۔ لیکن عیسائی اور یہودی مستشرقین کو یہ کہتے ہوئے ذرا شرم نہیں آتی کہ قرآن نے یہ قصے بنی اسرائیل کی تاریخ سے نقل کیے ہیں۔ (۱۴۴)

پیغمبرانہ معجزات کے مقابلے میں جادوگروں کے مساویانہ طلسمات

وَمَا نُرِيهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ز وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ (الزخرف - آیت ۴۸)

ترجمہ: "ہم ایک پر ایک ایسی نشانی ان کو دکھاتے چلے گئے جو پہلی سے بڑھ چڑھ کر تھی اور ہم نے ان کو عذاب میں دھر لیا تاکہ وہ اپنی روش سے باز آئیں۔"

ان سے مراد وہ ابتدائی نشانیاں بھی ہیں جنھیں لے کر حضرت موسیٰ فرعون کے دربار میں گئے تھے، یعنی عصا اور ید بیضا، اور پھر وہ نشانیاں بھی جو بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ذریعے سے ان کو دکھائیں۔

یعنی یہ کہ:

(۱) جادوگروں سے اللہ کے نبی کا برسرِ عام مقابلہ ہوا اور وہ شکست کھا کر ایمان لے آئے۔

(۲) حضرت موسیٰ کے پیشگی اعلان کے مطابق مصر کی سرزمین میں شدید قحط برپا ہو گیا اور وہ ان کی دعا پر ہی دور ہوا۔

(۳) ان کے پیشگی اعلان کے بعد سارے ملک میں ہولناک بارشوں اور ژالہ باری اور گرج اور کڑک کے طوفان آئے جنھوں نے بستیوں اور کھیتوں کو تباہ کر ڈالا، اور یہ بلا بھی ان کی دعا سے ہی دفع ہوئی۔

(۴) پورے ملک پر ان کے اعلان کے مطابق ٹڈی دلوں کا خوفناک حملہ ہوا اور یہ آفت بھی اس وقت تک نہ ٹلی جب تک انھوں نے اسے ٹالنے کے لیے اللہ سے دعا نہ کی۔

(۵) ملک بھر میں ان کے اعلان کے مطابق جوئیں اور سُرسُریاں پھیل گئیں جن سے ایک طرف آدمی

اور جانور سخت مبتلائے عذاب ہوئے اور دوسری طرف غلوں کے گودام تباہ ہو گئے۔ یہ عذاب بھی اس وقت ٹلا جب حضرت موسٰیؑ سے درخواست کر کے دعا کرائی گئی۔

(۷) ٹھیک اُن کے اعلان کے مطابق خون کا عذاب رونما ہوا، جس سے تمام نہروں، کنوؤں، چشموں، تالابوں اور حوضوں کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا، مچھلیاں مر گئیں، ہر جگہ پانی کے ذخیروں میں عفونت پیدا ہو گئی اور پورے ایک ہفتہ تک مصر کے لوگ صاف پانی کو ترس گئے۔ یہ آفت بھی اُسی وقت ٹلی جب اس سے نجات پانے کے لیے حضرت موسٰیؑ سے دعا کرائی گئی۔

بائیبل کی کتاب خروج باب ۷، ۸، ۹، ۱۰ اور ۱۲ میں بھی ان عذابوں کی مفصل رُوداد درج ہے۔ مگر وہ گپ اور حقیقت کا مجموعہ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جب خون کا عذاب آیا تو جادوگروں نے بھی ویسا ہی لا کر دکھا دیا۔ مگر جب جوؤں کا عذاب آیا تو جادوگر جواب میں جوئیں پیدا نہ کر سکے اور انھوں نے کہا کہ یہ خدا کا کام ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مینڈکوں کا عذاب اٹھا تو جادوگر بھی جواب میں مینڈک چڑھا لائے۔ مگر اس کے باوجود فرعون نے حضرت موسٰیؑ ہی سے یہ درخواست کی کہ اللہ سے دُعا کر کے اس عذاب کو دفع کرائیے۔

سوال یہ ہے کہ جب جادوگر مینڈک چڑھانے پر قادر تھے تو فرعون نے ان ہی کے ذریعے سے عذاب دور کیوں نہ کرا لیا؟ اور آخر یہ کیسے معلوم ہوا کہ مینڈکوں کی اس فوج میں اللہ کے مینڈک کون سے ہیں اور جادوگروں کے مینڈک کون سے؟ یہی سوال خون کے بارے میں پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت موسٰیؑ کی تنبیہ کے مطابق ہر طرف پانی کے ذخیرے خون میں تبدیل ہو چکے تھے تو جادوگروں نے کس پانی کو خون بنایا؟ اور کیسے پتہ چلا کہ فلاں جگہ کا پانی جادوگروں کے کرتب سے خون بنا ہے؟ ایسی ہی باتوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ بائیبل خالص کلامِ الٰہی پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ اس کو جن لوگوں نے تصنیف کیا ہے انھوں نے اس کے اندر اپنی طرف سے بھی بہت کچھ ملا دیا ہے اور غضب یہ ہے کہ یہ مصنفین کچھ ایسے ہی واجبی سی عقل کے لوگ تھے جنھیں بات گھڑنے کا سلیقہ بھی نہ تھا۔ (۱۳۵)

دوسروں کے زیورات ہتھیانے کے حکم کا الزام

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ
فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ (طٰہٰ۔ آیت ۸۷)

ترجمہ: انھوں نے جواب دیا "ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی، معاملہ یہ ہوا کہ لوگوں کے زیورات سے ہم لد گئے تھے اور، ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا" ———
پھر اس طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا۔

یہ ان لوگوں کا عذر تھا جو سامری کے فتنے میں مبتلا ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم نے زیورات پھینک دیے تھے۔ نہ ہماری کوئی نیت بچھڑا بنانے کی تھی، نہ ہمیں معلوم تھا کہ کیا بننے والا ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ پیش آیا وہ تھا ہی کچھ ایسا کہ اسے دیکھ کر ہم بے اختیار شرک میں مبتلا ہو گئے۔

"لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لد گئے تھے": اس کا سیدھا مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں نے مصر کی رسموں کے مطابق جو بھاری بھاری زیورات پہن رکھے تھے، وہ اس صحرا نوردی میں ہم پر بار ہو گئے تھے، اور ہم پریشان تھے کہ اس بوجھ کو کہاں تک لادے پھریں۔ لیکن بائیبل کا بیان ہے کہ یہ زیورات مصر سے چلتے وقت ہر اسرائیلی گھرانے کی عورتوں اور مردوں نے اپنے مصری پڑوسی سے مانگے کو لے لیے تھے اور اس طرح ہر ایک اپنے پڑوسی کو لوٹ کر راتوں رات "ہجرت" کے لیے چل کھڑا ہوا تھا۔ یہ اخلاقی کارنامہ صرف اس حد تک نہ تھا کہ ہر اسرائیلی نے بطورِ خود اسے انجام دیا ہو، بلکہ یہ کارِ خیر اللہ کے نبی حضرت موسیٰ نے ان کو سکھایا تھا، اور نبی کو بھی اس کی ہدایت خود اللہ میاں نے دی تھی۔ بائیبل کی کتاب خروج میں ارشاد ہوتا ہے:

> "خدا نے موسیٰ سے کہا ..... جا کر اسرائیلی بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر اور ان کو کہہ۔ کہ جب تم نکلو گے تو خالی ہاتھ نہ نکلو گے بلکہ تمھاری ایک ایک عورت اپنی پڑوسن سے اور اپنے اپنے گھر کی مہمان سے سونے چاندی کے زیور اور لباس مانگ لے گی۔ ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو لوٹو گے۔"
>
> (باب ۳۔ آیت ۱۴-۲۲)
>
> "اور خداوند نے موسیٰ سے کہا۔ سو اب تو لوگوں کے کان میں یہ بات ڈال دے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے پڑوسی اور ہر عورت اپنی پڑوسن سے سونے چاندی کے زیور لے لے اور خداوند نے ان لوگوں پر مصریوں کو مہربان کر دیا۔" (باب ۱۱ آیت ۲-۳)
>
> "اور بنی اسرائیل نے موسیٰ کے کہنے کے موافق یہ بھی کیا کہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیور اور کپڑے مانگ لیے اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ جو کچھ انھوں نے دیا سو انھوں نے مصریوں کو لوٹ لیا۔" (باب ۱۲۔ آیت ۳۵-۳۶)

افسوس کہ ہمارے مفسرین نے بھی قرآن کی اس آیت کی تفسیر میں بنی اسرائیل کی اس روایت کو آنکھیں بند کر کے نقل کر دیا ہے اور ان کی اس غلطی سے مسلمانوں میں بھی یہ خیال پھیل گیا ہے کہ زیورات کا یہ بوجھ اسی لوٹ کا بوجھ تھا۔ (۱۳۶)

فصل ۷

حضرت ہارون علیہ السّلام

حضرت ہارونؑ پر بچھڑا بنانے اور اسے معبود بنانے کا الزام

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى (طہ۔ ایت ۹۱)

ترجمہ: "مگر انھوں نے اس سے کہہ دیا کہ ہم تو اسی کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ واپس نہ آ جائے۔"

بائیبل اس کے برعکس حضرت ہارونؑ پر الزام رکھتی ہے کہ بچھڑا بنانے اور اسے معبود قرار دینے کا گناہِ عظیم انہی سے سرزد ہوا تھا:

"اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰؑ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو ہارون کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے چلے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اِس مرد موسیٰؑ کو، جو ہم کو ملکِ مصر سے نکال کر لایا، کیا ہو گیا۔ ہارون نے ان سے کہا تمھاری بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اتار کر میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار اتار کر ہارون کے پاس لے آئے اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی، تب وہ کہنے لگے اے اسرائیل، یہی تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملکِ مصر سے نکال کر لایا۔ یہ دیکھ کر ہارون نے اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور اس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لیے عید ہو گی۔" (خروج باب ۳۲۔ آیت ۱-۵)

بہت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ غلط روایت اس وجہ سے مشہور ہوئی ہو کہ سامری کا نام بھی ہارون ہی ہو، بعد کے لوگوں نے اس ہارون کو ہارون نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہو۔

لیکن آج عیسائی مشنریوں اور مغربی مستشرقوں کو اصرار ہے کہ قرآن یہاں بھی ضرور غلطی پر ہے، بچھڑے کو خدا ان کے مقدس نبی نے ہی بنایا تھا اور ان کے دامن سے اس داغ کو صاف کر کے قرآن نے ایک احسان نہیں بلکہ اُلٹا قصور کیا ہے۔ یہ ہے ان لوگوں کی ہٹ دھرمی کا حال۔ اور ان کو نظر نہیں آتا کہ اسی باب میں چند سطر آگے چل کر خود بائیبل اپنی غلط بیانی کا راز کس طرح فاش کر رہی ہے۔ اس باب کی آخری دس آیتوں میں بائیبل یہ بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کے بعد بنی لاوِی کو جمع کیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا کہ جن لوگوں نے شرک کا یہ گناہِ عظیم کیا ہے، انھیں قتل کیا جائے اور ہر ایک مومن خود اپنے ہاتھ سے اپنے اس بھائی اور ساتھی اور پڑوسی کو قتل کرے جو گوسالہ پرستی کا مرتکب ہوا تھا۔ چنانچہ اس روز تین ہزار آدمی قتل کیے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت ہارون کیوں چھوڑ دیے گئے؟ اگر وہی اس جرم کے بانی مبانی تھے تو انھیں اس قتلِ عام سے کس طرح معاف کیا جا سکتا تھا؟ کیا بنی لاوِی یہ نہ کہتے کہ موسیٰ، ہم کو تو حکم دیتے ہو کہ ہم اپنے گناہ ہگار بھائیوں اور ساتھیوں اور پڑوسیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں، مگر خود اپنے بھائی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے حالانکہ اصل گناہگار وہی تھا۔ آگے چل کر بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰؑ نے خداوند کے پاس جا کر عرض کیا کہ اب بنی اسرائیل کا گناہ معاف کر دے، ورنہ میرا نام اپنی کتاب میں سے مٹا دے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اسی کا نام اپنی کتاب میں سے مٹاؤں گا۔" لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ہارونؑ کا نام نہ مٹایا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس ان کو اور اُن کی اولاد کو بنی اسرائیل میں بزرگ ترین منصب یعنی بنی لاوِی کی سرداری اور مُقدس کی کہانت سے سرفراز کیا گیا (باب ۱۸۔ آیت ۱۔۷) کیا بائیبل کی یہ اندرونی شہادت خود اس کے اپنے سابق بیان کی تردید اور قرآن کے بیان کی تصدیق نہیں کر رہی ہے۔ (۱۴۷)

قومی اتحاد کی خاطر شرک کو گوارا کرنے کا الزام

یَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ، اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ (طٰہٰ ۔ آیت ۹۴)

ترجمہ: "ہارون نے جواب دیا۔ "اے میری ماں کے بیٹے، میری ڈاڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آ کر کہے گا تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔"

حضرت ہارونؑ کے اس جواب کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قوم کا مجتمع رہنا اس کے راہِ راست پر رہنے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اور اتحاد چاہے وہ شرک پر ہی کیوں نہ ہو، افتراق سے بہتر ہے خواہ اس کی بنا حق اور باطل ہی کا اختلاف ہو۔ اس آیت کا یہ مطلب اگر کوئی شخص لے گا تو قرآن سے ہدایت کے بجائے گمراہی اخذ کرے گا۔ حضرت ہارون کی پوری بات سمجھنے کے لیے اس آیت کو سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۰ کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے۔ وہاں وہ فرماتے ہیں کہ قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ "میری ماں کے بیٹے، ان لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مار ڈالتے۔ پس تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اس ظالم گروہ میں مجھے شمار نہ کر" گویا ان دونوں آیتوں کو جمع کر کے دیکھیے تو صورتِ واقعہ کی یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ حضرت ہارونؑ نے لوگوں کو اس گمراہی سے روکنے کی پوری کوشش کی، مگر انھوں نے آنجناب کے خلاف سخت فساد کھڑا کر دیا اور آپ کو مار ڈالنے پر تُل گئے۔ مجبوراً آپ اس اندیشے سے خاموش ہو گئے کہ کہیں حضرت موسیٰؑ کے آنے سے پہلے یہاں خانہ جنگی برپا نہ ہو جائے، اور وہ بعد میں آ کر شکایت کریں کہ تم اگر اس صورتِ حال سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تھے تو تم نے معاملات کو اس حد تک کیوں بگڑنے دیا؟ میرے آنے کا انتظار کیوں نہ کیا۔ سورۂ اعراف والی آیت کے آخری فقرے سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ قوم میں دونوں بھائیوں کے دشمنوں کی ایک تعداد موجود تھی۔ (۱۳۸)

حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے دور میں سامری کے وجود کا انکار

وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (طٰہٰ: ۸۵)

ترجمہ: "اور سامری نے انھیں گمراہ کر ڈالا۔"

یہ اس شخص کا نام نہیں ہے، بلکہ یائے نسبتی کی صریح علامت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہرحال کوئی نہ کوئی نسبت ہی ہے، خواہ قبیلے کی طرف ہو یا نسل کی طرف یا مقام کی طرف۔ پھر قرآن جس طرح السّامری کہہ کر اس کا ذکر کر رہا ہے اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سامری قبیلے یا نسل یا مقام کے بہت سے لوگ موجود تھے جن میں سے ایک خاص سامری وہ شخص تھا جس نے بنی اسرائیل میں سنہری بچھڑے کی پرستش پھیلائی۔ اس سے زیادہ کوئی تشریح قرآن کے اس مقام کی تفسیر کے لیے فی الحقیقت درکار نہیں ہے لیکن یہ مقام ان اہم مقامات میں سے ہے جہاں عیسائی مشنریوں اور خصوصاً مغربی مستشرقین نے قرآن پر حرف گیری کی حد کر

دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ، معاذ اللہ قرآن کے مصنف کی جہالت کا صریح ثبوت ہے، اس لیے کہ دولتِ اسرائیل کا دارالسلطنت "سامریہ" اس واقعہ کے کئی صدی بعد ۹۲۵ ق م کے قریب زمانے میں تعمیر ہوا، پھر اس کے بھی کئی صدی بعد اسرائیلیوں اور غیر اسرائیلیوں کی وہ مخلوط نسل پیدا ہوئی جس نے "سامریوں" کے نام سے شہرت پائی۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ان سامریوں میں چونکہ دوسری مشرکانہ بدعات کے ساتھ ساتھ سنہری بچھڑے کی پرستش کا رواج بھی تھا، اور یہودیوں کے ذریعہ سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس بات کی سُن گُن پالی ہوگی، اس لیے انھوں نے لے جا کر اس کا تعلق حضرت موسیٰؑ کے عہد سے جوڑ دیا اور یہ قصّہ تصنیف کر ڈالا کہ وہاں سنہری بچھڑے کی پرستش کرنے والا ایک سامری شخص تھا۔ اسی طرح کی باتیں ان لوگوں نے ہامان کے معاملہ میں بنائی ہیں جسے قرآن فرعون کے وزیر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور عیسائی مشنری اور مستشرقین اسے اخویرس (شاہِ ایران) کے درباری امیر "ہامان" سے لے جا کر ملا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کے مصنّف کی جہالت کا ایک اور ثبوت ہے۔ شاید ان مدعیانِ علم و تحقیق کا گمان یہ ہے کہ قدیم زمانے میں ایک نام کا ایک ہی شخص یا قبیلہ یا مقام ہوا کرتا تھا اور ایک نام کے دو یا زائد اشخاص یا قبیلہ و مقام ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہ تھا۔ حالانکہ سُمیری قدیم تاریخ کی ایک نہایت مشہور قوم تھی۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دَور میں عراق اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر چھائی ہوئی تھی، اور اس بات کا بہت امکان ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں اس قوم کے، یا اس کی کسی شاخ کے لوگ مصر میں سامری کہلاتے ہوں۔ پھر خود اس سامریہ کی اصل کو بھی دیکھ لیجیے۔ جس کی نسبت سے شمالی فلسطین کے لوگ بعد میں سامری کہلانے لگے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ دولتِ اسرائیل کے فرمانروا عمری نے ایک شخص "سمر" نامی سے وہ پہاڑ خریدا تھا جس پر اس نے بعد میں اپنا دارالسلطنت تعمیر کیا۔ اور چونکہ پہاڑ کے سابق مالک کا نام "سمر" تھا اس لیے اس شہر کا نام سامریہ رکھا گیا (سلاطین ۱۔ باب ۱۶۔ آیت ۲۴) اس سے صاف ظاہر ہے کہ سامریہ کے وجود میں آنے سے پہلے "سمر" نام کے اشخاص پائے جاتے تھے اور ان سے نسبت پا کر ان کی نسل، قبیلے کا نام سامری، اور مقامات کا نام سامریہ ہونا کم از کم ممکن ضرور تھا۔ (۱۲۹)

فصل ۸

حضرت داؤد علیہ السّلام

اُوریاہ حتّی کی بیوی کے متعلق گھناؤنا الزام

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ
وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ (ص، آیت ۲۶)

ترجمہ: "اے داؤد، ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً ان کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے۔"

یہ وہ تنبیہ ہے جو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے اور بلندی درجات کی بشارت دینے کے ساتھ حضرت داؤد کو فرمائی۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو فعل ان سے صادر ہوا تھا اس کے اندر خواہشِ نفس کا کچھ دخل نہ تھا۔ اس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا۔

یہاں پہنچ کر تین سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ کونسا فعل تھا؟ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صاف صاف بیان کرنے کے بجائے اس طرح پردے پردے ہی میں اس کی طرف کیوں اشارہ کیا؟ تیسرے یہ کہ اس سیاق و سباق میں اس کا ذکر کس مناسبت سے کیا گیا ہے؟

جن لوگوں نے بائیبل (عیسائیوں اور یہودیوں کی کتاب مقدس) کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں حضرت داؤدؑ پر اُوریاہ حتّی (URIAH THE HITTITE) کی بیوی سے زنا کرنے، اور پھر اُوریاہ کو قصداً ہلاک کروا کر اس کی بیوی سے نکاح کر لینے کا صاف صاف الزام لگایا گیا

ہے ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہی عورت، جس نے ایک شخص کی بیوی ہوتے ہوئے اپنے آپ کو حضرت داؤدؑ کے حوالے کیا تھا، حضرت سلیمانؑ کی ماں تھی ۔ یہ پورا قصہ بائیبل کی کتاب سموئیل دوم ۔ باب ۱۱ - ۱۲ میں نہایت تفصیل کے ساتھ درج ہے ۔ نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے یہ بائیبل میں درج ہو چکا تھا ۔ دنیا بھر کے یہودیوں اور عیسائیوں میں جو بھی اس کتابِ مقدس کی تلاوت کرتا، یا اسے سنتا تھا، وہ اس قصے سے نہ صرف واقف تھا بلکہ اس پر ایمان بھی لاتا تھا ۔ انہی لوگوں کے ذریعہ سے یہ دنیا میں مشہور ہوا اور آج تک حال یہ ہے کہ مغربی ممالک میں بنی اسرائیل اور عبرانی مذہب کی تاریخ پر کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی جاتی جس میں حضرت داؤدؑ کے خلاف اس الزام کو دہرایا نہ جاتا ہو ۔ اس مشہور قصے میں یہ بات بھی درج ہے کہ :

> "خداوند نے ناتنؑ کو داؤد کے پاس بھیجا ۔ اس نے اس کے پاس آ کر اس سے کہا کسی شہر میں دو شخص تھے، ایک امیر، دوسرا غریب ۔ اس امیر کے پاس بہت سے ریوڑ اور گلے تھے ۔ پر اس غریب کے پاس بھیڑ کی ایک پٹھیا کے سوا کچھ نہ تھا جسے اس نے خرید کر پالا تھا اور وہ اس کے بال بچوں کے ساتھ بڑھی تھی ۔ وہ اسی کے نوالے میں سے کھاتی اور اس کے پیالہ سے پیتی اور اس کی گود میں سوتی تھی ۔ اور اس کے لیے بطور بیٹی کے تھی ۔ اور اس امیر آدمی کے ہاں کوئی مسافر آیا ۔ سو اس نے اس مسافر کے لیے جو اس کے ہاں آیا تھا پکانے کو اپنے ریوڑ اور گلے میں سے کچھ نہ لیا بلکہ اس غریب کی بھیڑ لے لی اور اس شخص کے لیے جو اس کے ہاں آیا تھا، پکائی ۔ تب داؤد کا غضب اس شخص پر بشدت بھڑکا اور اس نے ناتنؑ سے کہا کہ خداوند کی حیات کی قسم، وہ شخص جس نے یہ کام کیا واجب القتل ہے ۔ اس شخص کو اس بھیڑ کا چوگنا بھرنا پڑے گا کیونکہ اس نے ایسا کام کیا اور اسے ترس نہ آیا ۔ تب ناتنؑ نے داؤد سے کہا وہ شخص تو ہی ہے .... تو نے حتّی اُوریاہ کو تلوار سے مارا اور اس کی بیوی لے لی تا کہ وہ تیری بیوی بنے اور اس کو بنی عمون کی تلوار سے قتل کروایا ۔"
>
> (۲ سموئیل باب ۱۲ ۔ فقرات ۱ تا ۱۱)

اس قصے اور اس شہرت کی موجودگی میں یہ ضرورت باقی نہ تھی کہ قرآن مجید میں اس کے متعلق کوئی تفصیلی بیان دیا جاتا ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ بھی نہیں کہ وہ اپنی کتابِ پاک میں ایسی باتوں کو کھول کر بیان کرے اس لیے بیان پردے پردے ہی میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا اور اہلِ کتاب نے اسے بنا کیا دیا ہے ۔

قرآن کی بیان کردہ صحیح صورتِ واقعہ

اصل واقعہ جو قرآن مجید کے مذکورہ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریاہ (یا جو کچھ بھی اس شخص کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ اور چونکہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک جلیل القدر فرمانروا اور ایک زبردست دینی عظمت رکھنے والی شخصیت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی، اس لیے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا۔ اس موقع پر قبل اس کے کہ وہ حضرت داؤدؑ کی فرمائش کی تعمیل کرتا، قوم کے دو نیک آدمی اچانک حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچ گئے اور انھوں نے ایک فرضی مقدمے کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت داؤدؑ ابتدا میں تو یہ سمجھے کہ یہ واقعی کوئی مقدمہ ہے چنانچہ انھوں نے سن کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ لیکن زبان سے فیصلہ نکلتے ہی ان کے ضمیر نے تنبیہ کی کہ یہ تمثیل پوری طرح ان کے اور اس شخص کے معاملہ پر چسپاں ہوتی ہے، اور جس فعل کو وہ ظلم قرار دے رہے ہیں، اس کا صدور خود ان سے اس شخص کے معاملہ میں ہو رہا ہے۔

یہ احساس دل میں پیدا ہوتے ہی وہ سجدے میں گر گئے اور توبہ کی اور اپنے اس فعل سے رجوع فرما لیا۔

بائیبل میں اس کی وہ گھناؤنی شکل کیسے بنی؟ یہ بات بھی تھوڑے سے غور کے بعد سمجھ میں آ جاتی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کو اس خاتون کی خوبیوں کا کسی ذریعہ سے علم ہو گیا تھا اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ایسی لائق عورت ایک معمولی افسر کی بیوی ہونے کے بجائے ملک کی ملکہ ہونی چاہیے۔ اس خیال سے مغلوب ہو کر انھوں نے اس کے شوہر سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ اس میں کوئی قباحت اُنھوں نے اس لیے محسوس نہ کی کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ کوئی معیوب بات نہ سمجھی جاتی تھی۔ ان کے ہاں یہ ایک معمولی بات تھی کہ اگر ایک شخص کسی کی بیوی کو پسند کرتا تو بے تکلف اس سے درخواست کر دیتا تھا کہ اسے میرے لیے چھوڑ دے۔ ایسی درخواست پر کوئی برا نہ مانتا تھا بلکہ بسا اوقات ایک دوسرے کے پاسِ خاطر سے بیوی کو خود طلاق دے دیتے تھے تاکہ دوسرا اس سے شادی کر لے۔ لیکن یہ بات کرتے وقت حضرت داؤدؑ کو اس امر کا احساس نہ ہوا کہ ایک عام آدمی کی طرف سے اس طرح کی خواہش کا اظہار تو جبر و ظلم کے عنصر سے خالی ہو سکتا ہے مگر ایک فرمانروا کی طرف سے جب ایسی خواہش ظاہر کی جائے تو وہ جبر سے کسی طرح بھی خالی نہیں ہو سکتی۔ اس پہلو کی طرف جب اس

تمثیلی مقدمہ کے ذریعے سے ان کو توجہ دلائی گئی تو وہ بلا تامّل اپنی خواہش سے دست بردار ہوگئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ مگر بعد میں کسی وقت جب ان کی خواہش اور کوشش کے بغیر اُس خاتون کا شوہر کسی جنگ میں شہید ہوگیا اور انھوں نے اس سے نکاح کرلیا، تو یہودیوں کے خبیث ذہن نے افسانہ تراشی شروع کردی، اور یہ خبثِ نفس اُس وقت اور زیادہ تیزی سے کام کرنے لگا جب بنی اسرائیل کا ایک گروہ حضرت سلیمانؑ کا دشمن ہوگیا۔ ان محرکات کے زیرِ اثر یہ قصہ تصنیف کر ڈالا گیا کہ حضرت داؤدؑ نے معاذ اللہ، اُوریاہ کی بیوی کو اپنے محل کی چھت پر سے اس حالت میں دیکھ لیا جب کہ وہ برہنہ نہارہی تھی، انھوں نے اس کو اپنے ہاں بلوایا اور اس سے زنا کا ارتکاب کیا جس سے وہ حاملہ ہوگئی، پھر انھوں نے اوریاہ کو بنی عمّون کے مقابلے پر جنگ میں بھیج دیا اور فوج کے کمانڈر یوآب کو حکم دیا کہ اسے لڑائی میں ایسی جگہ مقرر کردے جہاں وہ لازماً مارا جائے، اور جب وہ مارا گیا تو انھوں نے اس کی بیوی سے شادی کرلی، اور اس عورت کے پیٹ سے سلیمان (علیہ السلام) پیدا ہوئے۔ یہ تمام جھوٹے الزامات ظالموں نے اپنی "کتاب مقدس" میں ثبت کردیے ہیں تاکہ نسلاً بعد نسل اسے پڑھتے رہیں اور اپنی قوم کے دو بزرگ ترین انسانوں کی تذلیل کرتے رہیں جو حضرت موسیٰؑ کے بعد ان کے سب سے بڑے محسن تھے۔ (۱۴۰)

اس بیان کو سامنے رکھ کر جب ہم توراۃ کی روایت کو دیکھتے ہیں تو بادنیٰ تامّل یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ اصل واقعہ جب مشہور ہوا ہوگا تو اس پر حاشیے کس طرح چڑھ گئے ہوں گے۔

شریر النفس لوگوں کی حاشیہ آرائی۔

شریر النفس اور خبیث طینت لوگوں کا قاعدہ ہے کہ جب کسی آدمی، خصوصاً بڑے آدمی کے متعلق چھوٹی سی بات کی بھنک ان کے کان میں پڑ جاتی ہے تو فوراً ان کی قوتِ متخیلہ اپنا کام شروع کردیتی ہے اور وہ محض اپنے ذہن سے بہت سی امکانی صورتیں فرض کرکے ان کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا یہ محقق واقعات ہیں، ہر انسان سے خواہ وہ کیسے ہی بڑے درجہ کا آدمی ہو، کبھی نہ کبھی کوئی ایسا فعل ضرور ہوجاتا ہے جس کو آسانی کے ساتھ برے معنی پہنائے جاسکتے ہیں۔ حضرت داؤدؑ نے جو کچھ کیا تھا اگرچہ وہ بنی اسرائیل کے ہاں ایک عام دستور تھا[1] اور اسی دستور سے متاثر ہوکر ان سے یہ لغزش سرزد ہوگئی تھی۔ مگر

---

[1] اسرائیلیوں کے ہاں یہ کوئی معیوب بات نہ تھی کہ کوئی شخص کسی کی بیوی کو پسند کرکے اس سے طلاق کی درخواست کرے۔

(باقی برصفحہ ،

چونکہ ایک بڑے آدمی کا فعل تھا اس لیے فوراً شہرت پکڑ گیا، اور اس پر لوگوں نے حاشیے چڑھانے شروع کردیے، اُوریاہ سے طلاق کا مطالبہ یہ گمان کرنے کے لیے کافی تھا کہ حضرت داؤدؑ اس کی بیوی کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ اب لوگوں کے ذہن نے ٹٹولنا شروع کیا کہ یہ میلان آخر ہوا کیونکر؟ کسی ذاتِ شریف کو یہ بات سوجھ گئی کہ غالباً اپنے محل پر سے اس کو نہاتے دیکھ لیا ہوگا۔ مگر ان کی صداقت شعاری نے "ہوگا" کو محض "ہوگا" کی صورت میں بیان کرنا پسند نہ کیا، اس لیے انھوں نے "ہوگا" کو "ہے" میں تبدیل کرکے لوگوں سے بیان کیا۔ رفتہ رفتہ یہ ایک واقعہ بن گیا۔ حالانکہ میلان ہونے کے بہت سے اسباب ہوسکتے تھے ممکن ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اس خاتون کی قابلیت اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کا حال سن کر اسے پسند کیا ہو۔ لیکن برے نفوس کی شرارت ہمیشہ ایسے واقعات میں برے امکانات ہی کی طرف مائل ہوتی ہے۔

پھر جب لوگوں کو یقین ہوگیا کہ حضرت داؤدؑ اس عورت کی طرف مائل ہیں، تو ان کی نالائق فطرت یہ بات ماننے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوئی کہ ایک بادشاہ کسی عورت کی طرف مائل ہو، اور وہ اسے حاصل نہ کرے۔ چنانچہ انھوں نے یہ بھی فرض کرلیا کہ بادشاہ نے اس عورت کو بلا لیا ہوگا اور اس سے زنا کی ہوگی۔ یہ "ہوگا" بھی بہت جلدی "ہے" میں تبدیل ہوگیا اور اس پر حمل کا مزید حاشیہ چڑھا دیا گیا۔

توضیح مزید

اسرائیلی قوم اس وقت تک ایک زندہ قوم تھی اور اس میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی اس کی غلطی پر ٹوکنے میں تأمل نہیں کرتے تھے۔ جب یہ قصہ مشہور ہوا تو اس قسم کے لوگوں میں سے دو آدمی حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچ گئے اور انھوں نے تمثیل کے پیرایہ میں ان کو متنبہ کیا۔ چنانچہ آنجناب فوراً اپنے فعل سے تائب ہوگئے۔ لیکن یا تو اس توبہ کا علم لوگوں کو نہیں ہوا، یا اگر ہوا بھی تو بدفطرت لوگوں کو اس کا یقین نہ آیا۔ بہرحال توبہ کے بعد حضرت داؤدؑ تو اپنی جگہ اوریاہ کی بیوی کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نہ درخواست کرنے والا اس میں تکلف کرتا تھا، اور نہ وہ شخص جس سے درخواست کی جاتی، اس پر برا مانتا تھا۔ اور یہ تو ایک عمدہ اخلاق کی بات سمجھی جاتی تھی کہ کوئی شخص کسی دوست کو خوش کرنے یا اس کی تکلیف رفع کرنے کے لیے اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس کے نکاح میں دے دے۔ چنانچہ یہ یہودی اخلاق ہی کا اثر تھا کہ مدینہ میں بعض انصار اپنے مہاجر بھائیوں کی خاطر اپنی بیویوں کو طلاق دے کر ان سے بیاہ دینے پر آمادہ ہوگئے تھے۔

خیال چھوڑ چکے تھے مگر لوگوں نے اس کا خیال نہ چھوڑا۔ اوریاہ ایک فوجی افسر تھا۔ اس کا کسی مہم پر جانا کوئی انوکھا فعل نہ تھا، اور جنگ میں اس کا مارا جانا بھی کوئی نرالی بات نہ تھی۔ مگر چونکہ لوگوں کے ذہن میں وہ واقعہ تازہ تھا، اور وہ ایک نبی کی بادشاہت اور ایک نفس پرست آدمی کی بادشاہت میں فرق کرنے سے اپنی طبیعت کی افتاد کی بنا پر عاجز تھے، اس لیے جب اوریاہ جنگ میں گیا اور مارا گیا، تو انھوں نے اس طرح قیاس قائم کیا کہ داؤد علیہ السلام اس کی بیوی پر مائل تھے، اور وہ بادشاہ ہونے کی حیثیت سے اوریاہ کا قصہ پاک کر کے اس کی بیوی کو حاصل کرنے کی قدرت بھی رکھتے تھے، اس لیے ضرور انھوں نے قصداً اوریاہ کو جنگ پر بھجوایا ہوگا اور قصداً ایسی تدبیر کی ہوگی کہ مارا جائے۔ "یہ ہوگا" بھی بآسانی "ہے" میں تبدیل کر دیا گیا اور بڑھتے بڑھتے یوآب کو خط لکھنے کا قصہ تصنیف ہو گیا۔

کوئی شخص کسی عورت کو پسند کرتا ہو، اور وہ عورت بیوہ ہو جائے، تو اس شخص کا اس عورت سے نکاح کر لینا کوئی نرالی یا معیوب بات نہیں ہے۔ مگر جب حضرت داؤدؑ نے بت سبع سے نکاح کیا (جیسا کہ بائیبل کا بیان ہے) تو اسرائیلی عوام نے سمجھا کہ یہ ان تمام افواہوں کی صداقت کا قطعی ثبوت ہے جو اس سلسلہ میں اڑ رہی تھیں۔ یہاں پھر اسرائیلیوں نے اپنی اصل طینت کا اظہار کیا۔ گر ایسے معاملہ میں ہمیشہ دو مساوی الدرجہ امکان ہوا کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص نے اپنی پسندیدہ عورت کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کی ہو، اور اس کے بیوہ ہو جانے کے بعد کوئی اخلاقی و قانونی مانع نہ پا کر اس سے نکاح کر لیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اسے حاصل کرنے کے لیے مجرمانہ تدبیریں کی ہوں۔ کسی ثبوت کی غیر موجودگی میں ایک امکان کو دوسرے امکان پر قطعی ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ لیکن ایسے مواقع پر انسان کی طینت اپنے آپ کو بے نقاب کرتی ہے۔ نیک طینت آدمی کا میلان ہمیشہ اچھے امکان کی طرف ہوتا ہے، اور اگر وہ شخص جس سے ایسا واقعہ متعلق ہو، صالح اور نیک چلن ہو تو نیک طینت یہی حکم لگائے گا کہ اس کا دامن پاک ہے۔ لیکن بد طینت آدمی ہمیشہ ہر طرف گندگی ہی گندگی ڈھونڈتا ہے۔ اس کی

---

[1] اور نیک گمان کرنے کے لیے حضرت داؤدؑ کی پوری سیرت کافی گواہ تھی۔ خود بائیبل میں جہاں یہ قصہ بیان ہوا ہے اس سے پہلے اور اس کے بعد حضرت داؤدؑ کی پوری سوانح عمری درج ہے۔ ہر شخص اس کو دیکھ کر اندازہ کر سکتا ہے کہ جو شخص ایسا عالی ظرف اور خدا ترس تھا اس سے وہ حرکات کیسے سرزد ہو سکتی تھیں جو اس بائیبل میں اس مردِ خدا کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔

فطرت خود گندگی مانگتی ہے، اس لیے معاملات میں وہ ہمیشہ برے امکان ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر شہادت سے اس کی تردید ہو جائے۔ تب بھی اندر سے اس کا دل نہیں مانتا۔

مدینہ کے یہودیوں نے اوریاہ کی بیوی کا قصہ اس کثرت سے مسلمانوں میں پھیلایا تھا کہ عام طور پر لوگ قرآن پاک کے اس رکوع کی تفسیر، بائبل اور اسرائیلی خرافات ہی کے رنگ میں کرنے لگے تھے، حتیٰ کہ قرآن کی معنوی تحریف کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ آخر کار سیدنا علی رضی اللہ عنہ، کو یہ اعلان کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ جو شخص اوریاہ حِتّی کا قصہ[سه] بیان کرے گا اس کو ۱۶۰ کوڑے لگائے جائیں گے۔ ۸۰ کوڑے حدِ قذف کے اور مزید ۸۰ کوڑے ایک نبی کی توہین کے۔ (۱۴۱)

[سه] ملاحظہ ہو کشاف۔ تفسیر کبیر اور تفسیر بیضاوی۔

فصل ۹

حضرت سلیمان علیہ السّلام

قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

(النمل ۔ ایت ۴۴)

ترجمہ: "اس پر وہ پکار اٹھی ۔ اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اللہ رب العٰلمین کی اطاعت قبول کرلی۔"

یہودی ربیوں کی روایات میں حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کا قصہ اپنی بیشتر تفصیلات میں قرآن سے ملتا جلتا ہے ۔ ہدہد کا غائب ہونا، پھر آکر سبا اور اس کی ملکہ کے حالات بیان کرنا، حضرت سلیمانؑ کا اس کے ذریعہ سے خط بھیجنا، ہدہد کا عین اس وقت وہ خط ملکہ کے آگے گرانا جب کہ وہ آفتاب کی پرستش کو جا رہی تھی، ملکہ کا اس خط کو دیکھ کر اپنے وزراء کی کونسل منعقد کرنا، پھر ملکہ کا قیمتی ہدیہ سلیمان علیہ السلام کے پاس بھیجنا خود یروشلم پہنچ کر ان سے ملنا، ان کے محل میں پہنچ کر یہ خیال کرنا کہ حضرت سلیمانؑ پانی کے حوض میں بیٹھے ہیں۔ اور اس میں اترنے کے لیے پائنچے چڑھا لینا یہ سب ان روایات میں اسی طرح مذکور ہے جس طرح قرآن میں بیان ہوا ہے ۔ مگر ہدیہ وصول ہونے پر حضرت سلیمانؑ کا جواب، ملکہ کے تخت کو اٹھوا منگانا، ہر موقع پر ان کا خدا کے آگے جھکنا اور آخر کار ملکہ کا ان کے ہاتھ پر ایمان لانا، یہ سب باتیں، بلکہ خدا پرستی اور توحید کی ساری باتیں ان روایات میں ناپید ہیں۔ سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ ان ظالموں نے حضرت سلیمانؑ پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے ملکہ سبا کے ساتھ معاذ اللہ زنا کا ارتکاب کیا، اور اسی حرامی نسل سے بابل کا بادشاہ بُخت نَصر پیدا ہوا جس نے بیت المقدس کو تباہ کیا (جیوش انسائیکلوپیڈیا ج ۱۱ ص ۴۴۳)

اصل معاملہ یہ ہے کہ یہودی علماء کا ایک گروہ حضرت سلیمانؑ کا سخت مخالف رہا ہے۔ ان لوگوں نے ان پر تورات کے احکام کی خلاف ورزی، غرورِ حکومت، غرورِ عقل و دانش، زن مریدی، عیش پرستی اور

شرک و بت پرستی کے گھناؤنے الزامات لگائے ہیں (جیوش انسائیکلوپیڈیا ج ۱۱ ص ۴۳۹-۴۴۱) اور یہ اسی پروپگنڈے کا اثر ہے کہ بائیبل انھیں نبی کے بجائے محض ایک بادشاہ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور بادشاہ بھی ایسا جو معاذ اللہ احکامِ الٰہی کے خلاف مشرک عورتوں کے عشق میں گم ہو گیا۔ جس کا دل خدا سے پھر گیا، اور جو خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی طرف مائل ہو گیا (۱ سلاطین ۱۱: ۱-۱۱)

ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے بنی اسرائیل پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے اکابر کا دامن خود ان کی پھینکی ہوئی گندگیوں سے صاف کیا اور یہ بنی اسرائیل کتنے احسان فراموش ہیں کہ اس پر بھی یہ قرآن اور اس کے لانے والے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ (۱۴۲)

حضرت سلیمانؑ پر تصویر سازی کا الزام

یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ
قُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا (سورۂ سبا۔ آیت ۱۳)

ترجمہ: "وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا، اونچی عمارتیں، تصویریں، بڑے بڑے حوض جیسے لگن، اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں ــــ اے آل داؤد عمل کرو شکر کے طریقے پر۔"

اصل میں لفظ تَمَاثِیل استعمال ہوا ہے جو تمثال کی جمع ہے۔ تمثال عربی زبان میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قدرتی شے کے مشابہ بنائی جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا حیوان، کوئی درخت ہو یا پھول یا دریا یا کوئی دوسری بے جان چیز۔ "التمثال اسم للشیء المصنوع مشبہا بخلق من خلق اللہ" (لسان العرب) "تمثال نام ہے ہر اس مصنوعی چیز کا جو خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے مانند بنائی گئی ہو۔" "التمثال کل ما صُوِّرَ علی صورۃ غیرہٖ من حیوان وغیر حیوان" (تفسیر کشاف) "تمثال ہر اس تصویر کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی صورت کے مُماثِل بنائی گئی ہو خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان۔"

اس بنا پر قرآن مجید کے اس بیان سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جو "تماثیل" بنائی جاتی تھیں وہ ضرور انسانوں اور حیوانوں کی تصاویر یا ان کے مجسمے ہی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے وہ پھول، پتیاں اور قدرتی مناظر اور مختلف قسم کے نقش و نگار ہوں جن سے حضرت سلیمانؑ نے اپنی عمارتوں کو آراستہ کر لیا ہو۔ غلط فہمی کا منشا بعض مفسرین کے یہ بیانات ہیں کہ حضرت سلیمانؑ نے انبیاء اور ملائکہ کی تصویریں بنوائی

تھیں۔ یہ باتیں ان حضرات نے بنی اسرائیل کی روایات سے اخذ کرلیں اور پھر ان کی توجیہہ یہ کی کہ پچھلی شریعتوں میں اس قسم کی تصویریں بنانا ممنوع نہ تھا۔ لیکن ان روایات کو بلا تحقیق نقل کرتے ہوئے ان بزرگوں کو خیال نہ رہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جس شریعت موسوی کے پیرو تھے اس میں بھی انسانی اور حیوانی تصاویر اور مجسمے اسی طرح حرام تھے جس طرح شریعتِ محمدیہ میں حرام ہیں۔ اور وہ یہ بھی بھول گئے کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو حضرت سلیمانؑ سے جو عداوت تھی اس کی بنا پر انھوں نے آں جناب کو شرک و بت پرستی اور جادوگری اور زنا کے بدترین الزامات سے متہم کیا ہے۔ اس لیے ان کی روایات پر اعتماد کرکے اس جلیل القدر پیغمبر کے بارے میں کوئی ایسی بات، ہرگز قبول نہ کرنی چاہیے جو خدا کی بھیجی ہوئی کسی شریعت کے خلاف پڑتی ہو۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء بھی آئے ہیں وہ تورات کے پیرو تھے اور ان میں سے کوئی بھی نئی شریعت نہ لایا تھا جو تورات کے قانون کی ناسخ ہوتی۔ اب تورات کو دیکھیے تو اس میں بار بار بصراحت یہ حکم ملتا ہے کہ انسانی اور حیوانی تصویریں اور مجسمے قطعاً حرام ہیں۔

”تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔“ (خروج۔ باب ۲۰۔ آیت ۴)

”تم اپنے لیے بت نہ بنانا اور نہ تراشی ہوئی مورت یا لاٹ اپنے لیے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اسے سجدہ کرو۔“ (احبار۔ باب ۲۶، آیت ۱)

”تا نہ ہو کہ تم بگڑ کر کسی شکل یا صورت کی کھودی ہوئی مورت اپنے لیے بنالو جس کی شبیہ کسی مرد یا عورت یا زمین کے کسی حیوان یا ہوا میں اڑنے والے کسی پرند یا زمین پر رینگنے والے جاندار یا مچھلی سے جو زمین کے نیچے پانی میں رہتی ہے، ملتی ہو۔“ (استثناء باب ۴۔ آیت ۱۶-۱۸)

”لعنت اس آدمی پر جو کاریگری کی صنعت کی طرح کھودی یا ڈھالی ہوئی مورت بنا کر جو خدا کے نزدیک مکروہ ہے، اس کو کسی پوشیدہ جگہ میں نصب کرے۔“ (استثناء باب ۲۷۔ آیت ۱۵)

ان صاف اور صریح احکام کے بعد یہ بات کیسے مانی جاسکتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے انبیاء اور ملائکہ کی تصویریں یا ان کے مجسمے بنانے کا کام جنوں سے لیا ہوگا؟ یہ بات آخر ان یہودیوں کے بیان پر اعتماد کرکے کیسے تسلیم کرلیا جائے جو حضرت سلیمانؑ پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنی مشرک بیویوں کے عشق میں مبتلا ہو کر بت پرستی کرنے لگے تھے۔ (۱۔ سلاطین۔ باب ۱۱) (۱۴۳)

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ۝
قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ
الْوَهَّابُ ۝ (ص - آیات ۳۴ - ۳۵)

ترجمہ: "اور (دیکھو کہ) سلیمانؑ کو بھی ہم نے آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لاکر ڈال دیا۔ پھر اس نے رُجوع کیا اور کہا کہ اے میرے رب مجھے معاف کردے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو۔ بے شک تو ہی اصل داتا ہے۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ فتنہ کیا تھا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام پڑ گئے تھے؟ اور ان کی کرسی پر ایک جسد ڈال دینے کا کیا مطلب؟ اور اس جسد کا لاکر ڈالا جانا ان کے لیے کس نوعیت کی تنبیہ تھی جس پر انھوں نے توبہ کی؟ اس کے جواب میں مختلف گروہوں نے مختلف مسلک اختیار کیے۔

انگوٹھی کا افسانہ

ایک گروہ نے ایک لمبا چوڑا افسانہ بیان کیا ہے جس کی تفصیلات میں اُن کے درمیان بہت کچھ اختلافات ہیں۔ مگر سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ سے یا تو یہ قصور ہوا تھا کہ ان کے محل میں ایک بیگم چالیس دن تک بت پرستی کرتی رہی اور وہ اس سے بے خبر رہے، یا یہ کہ وہ چند روز تک گھر میں بیٹھے رہے اور کسی مظلوم کی دادرسی نہ کی۔ اس پر ان کو یہ سزا ملی کہ ایک شیطان کسی نہ کسی طرح ان کی وہ انگوٹھی اڑا لے گیا جس کی بدولت وہ جن و انس اور ہواؤں پر حکومت کرتے تھے۔ انگوٹھی ہاتھ سے جاتے ہی حضرت سلیمانؑ کا سارا اقتدار چھن گیا اور وہ چالیس دن تک دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ اور اس دوران میں وہ شیطان، سلیمانؑ بنا ہوا حکمرانی کرتا رہا۔ سلیمانؑ کی کرسی پر ایک جسد لاکر ڈال دینے سے مراد یہی شیطان ہے جو ان کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ بعض حضرات یہاں تک بھی کہہ گزرتے ہیں کہ اُس زمانے میں اس شیطان سے حرمِ سلیمانی کی خواتین تک کی عصمت محفوظ نہ رہی۔ آخر کار سلطنت کے اعیان و اکابر اور علماء کو اس کی کارروائیاں دیکھ کر شک ہو گیا کہ یہ سلیمانؑ نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے سامنے تورات کھولی اور وہ دوڑ کر بھاگ نکلا۔ راستے میں انگوٹھی اس کے ہاتھ سے گر گئی، یا خود اسی نے پھینک دی، اور اسے ایک مچھلی نے نگل لیا۔ پھر اتفاق سے وہ مچھلی حضرت سلیمانؑ کو مل گئی۔ اسے پکانے کے لیے انھوں نے اس کا پیٹ چاک کیا تو انگوٹھی نکل آئی اور اس کا ہاتھ آنا تھا کہ جن و انس سب سلام کرتے ہوئے ان کے

سامنے حاضر ہو گئے۔

تلمودی روایات

یہ پورا افسانہ سرتاپا خرافات پر مشتمل ہے جنھیں نو مسلم اہلِ کتاب نے تلمود اور دوسری اسرائیلی روایات سے اخذ کر کے مسلمانوں میں پھیلا دیا تھا، اور حیرت ہے کہ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے لوگوں نے ان کو قرآن کے مجملات کی تفصیلات سمجھ کر اپنی زبان سے نقل کر دیا۔ حالانکہ نہ انگشتری سلیمانی کی کوئی حقیقت ہے، نہ حضرت سلیمانؑ کے کمالات کسی انگشتری کے کرشمے تھے، نہ شیاطین کو اللہ نے یہ قدرت دی ہے کہ انبیاء کی شکل بنا کر آئیں اور خلقِ خدا کو گمراہ کریں، اور نہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نبی کے قصور کی سزا ایسی فتنہ انگیز شکل میں دے جس سے شیطان نبی بن کر ایک پوری امت کا ستیاناس کر دے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن خود اس تفسیر کی تردید کر رہا ہے۔ آگے کی آیات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب یہ آزمائش حضرت سلیمانؑ کو پیش آئی اور انھوں نے ہم سے معافی مانگ لی تب ہم نے ہوا اور شیاطین کو ان کے لیے مسخر کر دیا۔ لیکن یہ تفسیر اس کے برعکس یہ بتا رہی ہے کہ شیاطین پہلے ہی انگشتری کے طفیل حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع فرمان تھے۔ تعجب ہے کہ جن بزرگوں نے یہ تفسیر بیان کی ہے انھوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ بعد کی آیات کیا کہہ رہی ہیں۔ (۱۴۲)

فصل ۱۰

حضرت ایوب علیہ السّلام

پیکر صبر کو پیکر اضطراب بنا دیا گیا

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۚ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۚ (الانبیاء۔ آیات ۸۳-۸۴)

ترجمہ: "اور یہی (ہوشمندی اور حکم و علم کی نعمت) ہم نے ایوب کو دی تھی۔ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو تکلیف اسے تھی اس کو دور کر دیا، اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیے بلکہ ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیے، اپنی خاص رحمت کے طور پر، اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گزاروں کے لیے۔"

اس قصے میں قرآن مجید حضرت ایوبؑ کو اس شان سے پیش کرتا ہے کہ وہ صبر کی تصویر نظر آتے ہیں، اور پھر کہتا ہے کہ ان کی زندگی عبادت گزاروں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ لیکن دوسری طرف بائبل کی سفر ایوب پڑھیے تو وہاں آپ کو ایک ایسے شخص کی تصویر نظر آئے گی جو خدا کے خلاف مجسم شکایت اور اپنی مصیبت پر ہمہ تن فریاد بنا ہوا ہے۔ بار بار اس کی زبان سے یہ فقرے ادا ہوتے ہیں: "نابود ہو وہ دن جس دن میں پیدا ہوا۔" "میں رحم ہی میں کیوں نہ مر گیا۔" "میں نے پیٹ سے نکلتے ہی کیوں نہ جان دے دی۔" اور بار بار وہ خدا کے خلاف شکایتیں کرتا ہے کہ "قادر مطلق کے تیر میرے اندر لگے ہوئے ہیں، میری روح انہی کے زہر کو پی رہی ہے، خدا کی ڈراؤنی باتیں میرے خلاف صف باندھے ہوتے ہیں۔" "اے بنی آدم کے ناظر، اگر میں نے گناہ کیا ہے تو تیرا کیا بگاڑتا ہوں؟ تو نے کیوں مجھے اپنا نشانہ بنا لیا ہے۔ یہاں تک کہ میں اپنے آپ پر بوجھ ہوں؟ تو میرا گناہ کیوں نہیں

معاف کرتا اور میری بدکاری کیوں نہیں دور کر دیتا؟ میں خدا سے کہوں گا کہ مجھے ملزم نہ ٹھہرا۔ مجھے بتا کہ تو مجھ سے کیوں جھگڑتا ہے؟ کیا تجھے اچھا لگتا ہے کہ اندھیر کرے اور اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز کو حقیر جانے اور شریروں کی مشورت کو روشن کرے؟" اس کے تین دوست آکر اسے تسلی دیتے ہیں اور اس کو صبر و رضا کی تلقین کرتے ہیں، مگر وہ نہیں مانتا۔ وہ ان کی تلقین کے جواب میں پے در پے خدا پر الزام رکھے چلا جاتا ہے۔ اور ان کے سمجھانے کے باوجود اصرار کرتا ہے کہ خدا کے اس فعل میں کوئی حکمت و مصلحت نہیں ہے، صرف ایک ظلم ہے جو مجھ جیسے ایک متقی و عبادت گزار آدمی پر کیا جا رہا ہے۔ وہ خدا کے اس انتظام پر سخت اعتراضات کرتا ہے کہ ایک طرف بدکار نوازے جاتے ہیں اور دوسری طرف نیکوکار ستائے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک کر کے اپنی نیکیاں گناتا ہے اور پھر وہ تکلیفیں بیان کرتا ہے جو ان کے بدلے میں خدا نے اس پر ڈالیں، اور پھر کہتا ہے کہ خدا کے پاس اگر کوئی جواب ہے تو وہ مجھے بتائے کہ یہ سلوک میرے ساتھ کس قصور کی پاداش میں کیا گیا ہے۔ اس کی یہ زبان درازی اپنے خالق کے مقابلے میں اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ آخر کار اس کے دوست اس کی باتوں کا جواب دینا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ چپ ہوتے ہیں تو ایک چوتھا آدمی جو ان کی باتیں خاموش سن رہا تھا، بیچ میں داخل دیتا ہے اور ایوب کو بے تحاشا اس بات پر ڈانٹتا ہے کہ "اس نے خدا کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو راست ٹھہرایا۔" اس کی تقریر ختم نہیں ہوتی کہ بیچ میں اللہ میاں خود بول پڑتے ہیں۔ اور پھر اُن کے اور ایوب کے درمیان خوب دوبدو بحث ہوتی ہے۔ اس ساری داستان کو پڑھتے ہوئے کسی جگہ بھی ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اس صبرِ مجسم کا حال اور کلام پڑھ رہے ہیں جس کی تصویر عبادت گزاروں کے لیے سبق بنا کر قرآن نے پیش کی ہے۔

سِفرِ ایوب کے تین حصوں کا تضاد

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کا ابتدائی حصہ کچھ کہہ رہا ہے، بیچ کا حصہ کچھ، اور آخر میں نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے۔ تینوں حصوں میں کوئی تناسب نہیں ہے۔ ابتدائی حصہ کہتا ہے کہ ایوب ایک انتہائی راست باز، خدا ترس اور نیک شخص تھا اور اس کے ساتھ اتنا دولت مند کہ اہلِ مشرق میں وہ سب سے بڑا آدمی تھا۔" ایک روز خدا کے ہاں اس کے (یعنی خود اللہ میاں کے) بیٹے حاضر ہوئے اور ان کے ساتھ شیطان بھی آیا۔ خدا نے اس محفل میں اپنے بندے ایوب پر فخر کیا۔ شیطان نے کہا کہ آپ نے جو کچھ اسے دے رکھا ہے اس کے بعد وہ شکر نہ کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ ذرا اس کی نعمت چھین کر دیکھیے۔ وہ آپ

کے منہ پر آپ کی تکفیر نہ کرے تو میرا نام شیطان نہیں۔ خدا نے کہا۔ اچھا اس کا سب کچھ تیرے اختیار میں دیا جاتا ہے۔ البتہ اس کی ذات کو کوئی نقصان نہ پہنچا ہو۔ شیطان نے جا کر ایوبؑ کے تمام مال و دولت اور پورے خاندان کا صفایا کر دیا اور ایوب ہر چیز سے محروم ہو کر اکیلا رہ گیا۔ مگر ایوب کی آنکھ پر میل نہ آیا۔ اس نے خدا کو سجدہ کیا اور کہا ننگا ہی میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور ننگا ہی واپس جاؤں گا۔ خداوند نے دیا اور خداوند نے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو" پھر ایک دن ویسی ہی محفل اللہ میاں کے ہاں جمی۔ ان کے بیٹے بھی آئے اور شیطان بھی حاضر ہوا۔ اللہ میاں نے شیطان کو جتایا کہ دیکھ لے، ایوب کیسا راست باز آدمی ثابت ہوا۔ شیطان نے کہا، جناب اس کے جسم پر ذرا مصیبت ڈال کر دیکھیے وہ آپ کے منہ پر آپ کی تکفیر کرے گا۔ اللہ میاں نے فرمایا، اچھا جا، اس کو تیرے اختیار میں دیا گیا۔ بس اس کی جان محفوظ رہے۔ چنانچہ شیطان واپس ہوا اور آ کر اس نے ایوب کو تلوے سے چاند تک پھوڑوں سے دکھ دیا"* اس کی بیوی نے اس سے کہا۔ کیا تو اب بھی اپنی راست بازی پر قائم رہے گا؟ خدا کی تکفیر کر اور مر جا۔" اس نے جواب دیا۔ "تو نادان عورتوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ کیا ہم خدا کے ہاتھ سے سکھ پائیں اور دکھ نہ پائیں؟"

یہ ہے سفرِ ایوب کے پہلے اور دوسرے باب کا خلاصہ۔ لیکن اس کے بعد تیسرے باب سے ایک دوسرا ہی مضمون شروع ہوتا ہے جو بیالیسویں باب تک ایوبؑ کی بے صبری اور خدا کے خلاف شکایات و الزامات کی ایک مسلسل داستان ہے، اور اس سے پوری طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایوبؑ کے بارے میں خدا کا اندازہ غلط اور شیطان کا اندازہ صحیح تھا۔ پھر بیالیسویں باب میں خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ اللہ میاں سے خوب دو بدو بحث کر لینے کے بعد صبر و شکر اور توکل کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ میاں کی ڈانٹ کھا کر ایوبؑ ان سے معافی مانگ لیتا ہے اور وہ اسے قبول کر کے اس کی تکلیفیں دور کر دیتے ہیں، اور جتنا کچھ پہلے اس کے پاس تھا اس سے دو چند اسے دیتے ہیں۔ اس آخری حصے کو پڑھتے وقت آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایوبؑ اور اللہ میاں دونوں شیطان کے چیلنج کے مقابلے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں، اور پھر محض اپنی بات رکھنے کے لیے اللہ میاں نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے معافی مانگنے پر مجبور کیا ہے، اور اس کے معافی مانگتے ہی اسے قبول کر لیا ہے، تاکہ شیطان کے سامنے ان کی ہیٹی نہ ہو

سفرِ ایوب محض شاعرانہ داستان طرازی ہے

یہ کتاب خود اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ یہ نہ خدا کا کلام ہے نہ خود حضرت ایوبؑ کا، بلکہ یہ حضرت ایوبؑ

کے زمانے کا بھی نہیں ہے، اس کے صدیوں بعد کسی شخص نے قصہ ایوب کو بنیاد بنا کر ''یوسف زلیخا'' کی طرح ایک داستان لکھی ہے اور اس میں ایوب الیفز تیمانی، سوخی بلدد، نعماتی ضوفر، براکیل بوزی کا بیٹا الیہو چند کیریکٹر ہیں جن کی زبان سے نظام کائنات کے متعلق دراصل وہ خود اپنا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ اس کی شاعری اور اس کے زور بیان کی جس قدر چاہیے داد دے لیجیے۔ مگر کتب مقدسہ کے مجموعے میں ایک صحیفۂ آسمانی کی حیثیت سے اس کو جگہ دینے کے کوئی معنی نہیں۔ ایوب علیہ السلام کی سیرت سے اس کا بس اتنا ہی تعلق ہے جتنا ''یوسف زلیخا'' کا تعلق سیرت یوسفیؑ سے ہے، بلکہ شاید اتنا بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کے ابتدائی اور آخری حصے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں صحیح تاریخ کا ایک عنصر پایا جاتا ہے اور وہ شاعر نے یا تو زبانی روایات سے لیا ہوگا جو اس کے زمانے میں مشہور ہوں گی، یا پھر کسی صحیفے سے اخذ کیا ہوگا۔ (۱۳۵)

باب ۸

ظہورِ اسلام اور یہودِ عرب

فصل ۱

عرب کے یہودیوں کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر

اس موقع پر ضروری ہے کہ مدینہ طیبہ اور حجاز کے یہودیوں کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لی جائے، کیونکہ اس کے بغیر آدمی ٹھیک ٹھیک یہ نہیں جان سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر کار ان کے مختلف قبائل کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کے حقیقی اسباب کیا تھے۔

یہودِ عرب کی کوئی مستند تاریخ موجود نہیں

عرب کے یہودیوں کی کوئی مستند تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے۔ انھوں نے خود اپنی کوئی ایسی تحریر کسی کتاب یا کتبے کی شکل میں نہیں چھوڑی ہے جس سے اُن کے ماضی پر روشنی پڑسکے اور عرب کے باہر کے یہودی مؤرخین و مصنفین نے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے، کہ جزیرۃ العرب میں آکر وہ اپنے بقیہ ابنائے ملت سے بچھڑ گئے تھے، اور دنیا کے یہودی سرے سے ان کو اپنوں میں شمار ہی نہیں کرتے تھے کیونکہ انھوں نے عبرانی تہذیب، زبان، حتّٰی کہ نام تک چھوڑ کر عربیت اختیار کر لی تھی۔ حجاز کے آثارِ قدیمہ میں جو کتبات ملے ہیں ان میں پہلی صدی عیسوی سے قبل یہودیوں کا کوئی نشان نہیں ملتا، اور ان میں بھی صرف چند یہودی نام ہی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہودِ عرب کی تاریخ کا بیشتر انحصار اُن زبانی روایات پر ہے جو اہلِ عرب میں مشہور تھیں، اور ان میں اچھا خاصا حصہ یہودیوں کا اپنا پھیلایا ہوا تھا۔

یہودِ عرب کا اپنے متعلق بیان

حجاز کے یہودیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ سب سے پہلے وہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے آخری عہد میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے، اس کا قصہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے ایک لشکر یثرب کے علاقے سے عمالقہ کو نکالنے کے لیے بھیجا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ اس قوم کے کسی شخص کو بھی

زندہ نہ چھوڑیں۔ بنی اسرائیل کے اس لشکر نے یہاں آکر فرمانِ نبی کی تعمیل کی مگر عمالقہ کے بادشاہ کا ایک لڑکا بڑا خوبصورت جوان تھا، اسے انھوں نے زندہ رہنے دیا اور اس کو ساتھ لیے ہوئے فلسطین واپس پہنچے۔ اس وقت حضرت موسیٰؑ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے جانشینوں نے اس بات پر سخت اعتراض کیا کہ ایک عمالیقی کو زندہ چھوڑ دینا نبی کے فرمان اور شریعت موسوی کے احکام کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس بنا پر انھوں نے اس لشکر کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا اور اسے مجبوراً یثرب آکر یہیں بس جانا پڑا (کتاب الاغانی، ج ۱۹، صفحہ ۹۴)

اس طرح یہودی گویا اس بات کے مدعی تھے کہ وہ بارہ سو برس قبل مسیح سے یہاں آباد ہیں۔ لیکن درحقیقت اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے اور اغلب یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ افسانہ اس لیے گھڑا تھا کہ اہلِ عرب پر اپنے قدیم الاصل اور عالی نسب ہونے کی دھونس جمائیں۔

دوسری یہودی مہاجرت، خود یہودیوں کی اپنی روایت کے مطابق ۵۸۷ء قبل مسیح میں ہوئی جب کہ بابل کے بادشاہ بخت نَصَّر نے بیت المَقْدِس کو تباہ کر کے یہودیوں کو دنیا بھر میں تِتَر بِتَر کر دیا۔ عرب کے یہودی کہتے تھے کہ اس زمانے میں ہمارے متعدد قبائل آکر وادی القُریٰ، تَیماء اور یثرب میں آباد ہو گئے تھے۔ (فتوح البلدان، البَلاذُری) لیکن اس کا بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ بعید نہیں کہ اس سے بھی وہ اپنی قدامت ثابت کرنا چاہتے ہوں

اصل صورتِ واقعہ

درحقیقت جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جب ۷۰ء میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتلِ عام کیا، اور پھر ۱۳۲ء میں انھیں اس سرزمین سے بالکل نکال باہر کیا، اس دَور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حجاز میں پناہ گزیں ہوئے تھے، کیونکہ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع تھا۔ یہاں آکر انھوں نے جہاں جہاں چشمے اور سرسبز مقامات دیکھے وہاں ٹھہر گئے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑ توڑ اور سُود خواری کے ذریعہ سے ان پر قبضہ جما لیا۔ اَیْلَہ، مَقنا، تبوک، تیماء، وادی القُریٰ، فَدَک اور خیبر پر ان کا تسلط اسی دور میں قائم ہوا، اور بنی قُرَیظہ، بنی نَضِیر، بنی بَہْدَل، اور بنی قَیْنُقاع بھی اسی دَور میں آکر یثرب پر قابض ہوئے۔

یثرب میں آباد ہونے والے قبائل میں سے بنی نَضِیر اور بنی قُرَیظہ زیادہ ممتاز تھے، کیونکہ وہ کاہنوں

(COHENS یا PRIESTS) کے طبقہ میں سے تھے ، انھیں یہودیوں میں عالی نسب مانا جاتا تھا ، اور ان کو اپنی ملت میں مذہبی ریاست حاصل تھی ۔ یہ لوگ جب مدینہ میں آکر آباد ہوئے اُس وقت کچھ دوسرے عرب قبائل یہاں رہتے تھے جن کو انھوں نے دبا لیا اور عملاً اس سرسبز و شاداب مقام کے مالک بن بیٹھے ۔ اس کے تقریباً تین صدی بعد سنہ ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء میں یمن کے اس سیلابِ عظیم کا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورۂ سبا کے دوسرے رکوع میں آیا ہے ۔ اس سیلاب کی وجہ سے قومِ سبا کے مختلف قبیلے یمن سے نکل کر عرب کے اطراف میں پھیل جانے پر مجبور ہوئے ۔ ان میں سے غَسّانی شام میں ، لَخمی حیرہ (عراق) میں ، بنی خُزاعہ جدہ و مکہ کے درمیان ، اور اَوس و خَزرج یثرب میں جا کر آباد ہوئے ، یثرب پر چونکہ یہودی چھائے ہوئے تھے اس لیے انھوں نے اوّل اوّل اوس و خزرج کی دال نہ گلنے دی ، اور یہ دونوں عرب قبیلے چار و ناچار بنجر زمینوں پر بس گئے جہاں ان کو قُوتِ لایموت بھی مشکل سے حاصل ہوتا تھا ۔ آخر کار ان کے سرداروں میں سے ایک شخص اپنے غَسّانی بھائیوں سے مدد مانگنے کے لیے شام گیا اور وہاں سے ایک لشکر لا کر اس نے یہودیوں کا زور توڑ دیا ۔ اس طرح اُوس و خزرج کو یثرب پر پورا غلبہ حاصل ہو گیا ، یہودیوں کے دو بڑے قبیلے بنی نضیر اور بنی قُرَیظہ شہر کے باہر جا کر بسنے پر مجبور ہو گئے ، تیسرے قبیلے بنی قَینُقاع کی چونکہ ان دونوں یہودی قبیلوں سے اَن بَن تھی ، اس لیے وہ شہر کے اندر ہی مقیم رہا مگر یہاں رہنے کے لیے اسے قبیلہ خَزرج کی پناہ لینا پڑی ، اور اس کے مقابلہ میں بنی نَضیر و بنی قُرَیظہ نے قبیلہ اوس کی پناہ لی تاکہ اطرافِ یثرب میں امن کے ساتھ رہ سکیں ۔ منسلکہ نقشہ سے واضح ہوگا کہ اس نئے انتظام کے ماتحت اور اس کے نواح میں یہودی بستیاں کہاں کہاں تھیں ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے حجاز اور یثرب میں یہودیوں کی پوزیشن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے آغازِ ہجرت تک حجاز میں عموماً اور یثرب میں خصوصاً یہودیوں کی پوزیشن کے نمایاں خدوخال یہ تھے ۔

زبان ، لباس ، تہذیب ، تمدن ہر لحاظ سے انھوں نے پوری طرح عربیت کا رنگ اختیار کر لیا تھا ، حتیٰ کہ ان کی غالب اکثریت کے نام تک عربی ہو گئے تھے ۔ ۱۲ یہودی قبیلے جو حجاز میں آباد ہوئے تھے ، اُن میں سے بنی زَعُورا کے سوا کسی قبیلے کا نام عبرانی نہ تھا ۔ ان کے چند گِنے چُنے علماء کے سوا کوئی عبرانی جانتا تک نہ تھا ۔ زمانۂ جاہلیت کے یہودی شاعروں کا جو کلام ہمیں ملتا ہے اس کی زبان اور خیالات اور مضامین

میں شعرائے عرب سے الگ کوئی امتیازی شان نہیں پائی جاتی جو انھیں ممیز کرتی ہو۔ ان کے اور عربوں کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ درحقیقت ان میں اور عام عربوں میں دین کے سوا کوئی فرق باقی نہ رہا تھا۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود وہ عربوں میں جذب بالکل نہ ہوئے تھے اور انھوں نے شدت کے ساتھ اپنی یہودی عصبیت برقرار رکھی تھی۔ یہ ظاہری عربیت انھوں نے صرف اس لیے اختیار کی تھی کہ اس کے بغیر وہ عرب میں نہ رہ سکتے تھے۔

ان کی اس عربیت کی وجہ سے مغربی مستشرقین کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ شاید یہ بنی اسرائیل نہ تھے بلکہ یہودی مذہب قبول کرنے والے عرب تھے یا کم از کم ان کی اکثریت عرب یہودیوں پر مشتمل تھی۔ مگر اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ یہودیوں نے حجاز میں کبھی کوئی تبلیغی سرگرمی دکھائی ہو، یا ان کے علماء نصرانی پادریوں اور مشنریوں کی طرح اہلِ عرب کو دینِ یہود کی طرف دعوت دیتے ہوں۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر اسرائیلیت کا شدید تعصب اور نسلی فخر و غرور پایا جاتا تھا۔ اہلِ عرب کو وہ اُمّی (GENTILES) کہتے تھے جس کے معنی صرف اَن پڑھ کے نہیں بلکہ وحشی اور جاہل کے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان امیوں کو وہ انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں جو اسرائیلیوں کے لیے ہیں اور ان کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے مار کھانا اسرائیلیوں کے لیے حلال و طیب ہے۔ سردارانِ عرب کے ماسوا عام عربوں کو وہ اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ انھیں دینِ یہود میں داخل کر کے برابر کا درجہ دے دیں۔ تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، نہ روایاتِ عرب میں کوئی شہادت ملتی ہے کہ کسی عرب قبیلے یا کسی بڑے خاندان نے یہودیت قبول کی ہو۔ البتہ بعض افراد کا ذکر ضرور ملتا ہے جو یہودی ہو گئے تھے۔ ویسے بھی یہودیوں کو تبلیغِ دین کے بجائے صرف اپنے کاروبار سے دلچسپی تھی۔ اسی لیے حجاز میں یہودیت ایک دین کی حیثیت سے نہیں پھیلی بلکہ محض چند اسرائیلی قبیلوں کا سرمایۂ فخر و ناز ہی بنی رہی۔ البتہ یہودی علماء نے تعویذ گنڈوں اور فال گیری اور جادوگری کا کاروبار خوب چمکا رکھا تھا، جس کی وجہ سے عربوں پر ان کے "علم" اور "عمل" کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

معاشی حالت

معاشی حیثیت سے ان کی پوزیشن عرب قبائل کی بہ نسبت زیادہ مضبوط تھی، کیونکہ وہ فلسطین اور شام کے زیادہ متمدن علاقوں سے آئے تھے، اس لیے وہ بہت سے ایسے فنون جانتے تھے

جو اہلِ عرب میں رائج نہ تھے، اور باہر کی دنیا سے ان کے کاروباری تعلقات بھی تھے۔ ان وجوہ سے یثرب اور بالائی حجاز میں غلے کی درآمد اور یہاں سے چھوہاروں کی برآمد ان کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ مرغبانی اور ماہی گیری پر بھی زیادہ تر اُن ہی کا قبضہ تھا۔ پارچہ بافی کا کام بھی اُن کے ہاں ہوتا تھا۔ جگہ جگہ میخانے بھی انھوں نے قائم کر رکھے تھے جہاں شام سے شراب لا کر فروخت کی جاتی تھی۔ بنی قَینُقاع زیادہ تر سُنار، لوہار اور ظروف سازی کا پیشہ کرتے تھے۔ اس سارے بَنج بیوپار میں یہ یہودی بے تحاشا منافع خوری کرتے تھے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کاروبار سُود خوری کا تھا جس کے جال میں انھوں نے گردوپیش کی عرب آبادیوں کو پھانس رکھا تھا اور خاص طور پر عرب قبائل کے شیوخ اور سردار، جنھیں قرض لے لے کر ٹھاٹھ جمانے اور شیخی بگھارنے کی بیماری لگی ہوئی تھی، اُن کے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہ بھاری شرحِ سود پر قرضے دیتے اور پھر سُود در سُود کا چکر چلاتے تھے جس کی گرفت میں آجانے کے بعد مشکل ہی سے کوئی نکل سکتا تھا۔ اس طرح انھوں نے عربوں کو معاشی حیثیت سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ مگر اس کا فطری نتیجہ یہ بھی تھا کہ عربوں میں بالعموم ان کے خلاف ایک گہری نفرت پائی جاتی تھی۔

ان کے تجارتی اور مالی مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ عربوں کو باہم متحد نہ ہونے دیں اور انھیں ایک دوسرے سے لڑاتے رہیں۔ کیونکہ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ جب بھی عرب قبیلے باہم متحد ہوئے، وہ ان بڑی بڑی جائدادوں اور باغات اور سرسبز زمینوں پر انھیں قابض نہ رہنے دیں گے جو انھوں نے اپنی منافع خوری اور سود خواری سے پیدا کی ہیں۔ مزید برآں اپنی حفاظت کے لیے ان کے ہر قبیلے کو کسی نہ کسی طاقت ور عرب قبیلے سے حلیفانہ تعلقات بھی قائم کرنے پڑتے تھے، تاکہ کوئی دوسرا زبردست قبیلہ ان پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اس بنا پر بارہا انھیں نہ صرف ان عرب قبائل کی باہمی لڑائیوں میں حصہ لینا پڑتا تھا، بلکہ بسا اوقات ایک یہودی قبیلہ اپنے حلیف عرب قبیلے کے ساتھ مل کر کسی دوسرے یہودی قبیلے کے خلاف جنگ آزما بھی ہو جاتا تھا جس کے حلیفانہ تعلقات فریقِ مخالف سے ہوتے تھے۔ یثرب میں بنی قُرَیظہ اور بنی نَضِیر اَوس کے حلیف تھے اور بنی قَینُقاع خَزرَج کے۔ ہجرت سے تھوڑی مدت پہلے اوس اور خزرج کے درمیان جو خونریز لڑائی بُعاث کے مقام پر ہوئی تھی اس میں یہ اپنے اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ (۱۴۶)

فصل ۲

نزولِ قرآن کے وقت یہود کی مذہبی و اخلاقی حالت

ایک سرسری جائزہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد یہودیوں سے براہِ راست سابقہ پیش آیا جن کی بستیاں مدینہ سے بالکل متصل ہی واقع تھیں۔ یہ لوگ توحید، رسالت، وحی، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے۔ اُس ضابطۂ شرعی کو تسلیم کرتے تھے جو خدا کی طرف سے ان کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا اور اصولاً اُن کا دین وہی اسلام تھا جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے، لیکن صدیوں کے مسلسل انحطاط نے ان کو اصل دین سے بہت دُور ہٹا دیا تھا[1]۔ ان کے عقائد میں بہت سے غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہوگئی تھی جن کے لیے توراۃ میں کوئی سند موجود نہ تھی۔ ان کی عملی زندگی میں بکثرت ایسے رسوم اور طریقے رواج پاگئے تھے جو اصل دین میں نہ تھے اور جن کے لیے تورات میں کوئی ثبوت نہ تھا۔ خود تورات کو انھوں نے انسانی کلام کے اندر خَلط مُلط کر دیا تھا، اور خدا کا کلام جس حد تک لفظاً یا معناً محفوظ تھا، اس کو بھی انھوں نے اپنی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے مسخ کر رکھا تھا۔ دین کی حقیقی روح اُن میں سے نکل چکی تھی اور ظاہری مذہبیت کا محض ایک بے جان ڈھانچہ باقی تھا جس کو وہ سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کے علماء و مشائخ، ان کے سردارانِ قوم، اور ان کے عوام سب کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی حالت بگڑ گئی تھی اور اپنے اس بگاڑ سے ان کو ایسی محبت تھی کہ وہ کسی اصلاح کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ صدیوں سے ایسا ہو رہا تھا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ دین کا سیدھا راستہ انھیں بتانے آتا تو وہ اسے اپنا سب

---

[1] اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گزرے ہوئے تقریباً ۱۹ صدیاں گزر چکی تھیں۔ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت موسیٰؑ نے ۱۲۷۲ ق م میں وفات پائی، اور حضور ۶۱۰ بعد مسیح میں منصب نبوت پر سرفراز ہوئے۔ (مؤلف)

سے بجا دشمن سمجھتے اور ہر ممکن طریقہ سے کوشش کرتے تھے کہ وہ کسی طرح اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے مسلمان تھے جن کے ہاں بدعتوں اور تحریفوں، موشگافیوں اور فرقہ بندیوں، استخواں گیری و مغز افگنی، خدا فراموشی و دنیا پرستی کی بدولت انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا اصل نام "مسلم" تک بھول گئے تھے، محض "یہودی" بن کر رہ گئے تھے اور اللہ کے دین کو انھوں نے نسلِ اسرائیل کی آبائی وراثت بنا کر رکھ دیا تھا[1]

نہ خدا پر ایمان نہ آخرت پر

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ
مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبۃ - آیت ۲۹)

ترجمہ: "جنگ کرو اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔"

اگرچہ اہلِ کتاب خدا اور آخرت پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں لیکن فی الواقع نہ وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر۔ خدا پر ایمان رکھنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی بس اس بات کو مان لے کہ خدا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی خدا کو الٰہِ واحد اور ربِ واحد تسلیم کرے اور اس کی ذات، اس کی صفات، اس کے

---

[1] پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ ان کو اصل دین کی طرف دعوت دیں۔ چنانچہ سورۂ البقرہ کے ابتدائی پندرہ سولہ رکوع اسی دعوت پر مشتمل ہیں۔ ان میں یہودیوں کی تاریخ اور ان کی اخلاق اور مذہبی حالت پر جس طرح تنقید کی گئی ہے، اور جس طرح ان کے بگڑے ہوئے مذہب و اخلاق کی نمایاں خصوصیات کے مقابلہ میں حقیقی دین کے اصول پہلو بہ پہلو پیش کیے گئے ہیں، اس سے یہ بات بالکل آئینے کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک پیغمبر کی امت کے بگاڑ کی نوعیت کیا ہوتی ہے، رسمی دینداری کے مقابلہ میں حقیقی دینداری کس چیز کا نام ہے، دینِ حق کے بنیادی اصول کیا ہیں اور خدا کی نگاہ میں اصل اہمیت کس چیز کی ہے۔ (از مؤلف) (۱۴۶)

حقوق اور اس کے اختیارات میں نہ خود شریک بنے نہ کسی کو شریک ٹھہرائے۔ لیکن نصاریٰ اور یہود دونوں اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں جیسا کہ بعد والی آیت میں بتصریح بیان فرمایا گیا ہے۔ اس لیے ان کا خدا کو ماننا بے معنی ہے اور اسے ہرگز ایمان باللہ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح آخرت کو ماننے کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی یہ بات مان لے کہ ہم مرنے کے بعد پھر اٹھائے جائیں گے۔ بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ماننا ضروری ہے کہ وہاں کوئی سعی سفارش، کوئی فدیہ، اور کسی بزرگ سے منتسب ہونا کام نہ آئے گا اور نہ کوئی کسی کا کفارہ بن سکے گا۔ خدا کی عدالت میں بے لاگ انصاف ہوگا، اور آدمی کے ایمان و عمل کے سوا کسی چیز کا لحاظ نہ کیا جائے گا۔ اس عقیدے کے بغیر آخرت کو ماننا لاحاصل ہے لیکن یہود و نصاریٰ نے اسی پہلو سے اپنے عقیدے کو خراب کر لیا ہے۔ لہٰذا ان کا ایمان بالآخرت بھی مسلم نہیں ہے۔ (۱۴۸)

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (التوبة - آیت ۳۳)

ترجمہ: "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں ہے۔ خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

ان کا مذہبی تعصب

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ - آیت ۸۹)

ترجمہ: "اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے اس کے ساتھ اُن کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہ چیز آ گئی جسے وہ پہچان بھی گئے، تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہودی بے چینی کے ساتھ اُس نبی کے منتظر تھے۔ جس کی بعثت کی پیشینگوئیاں ان کے انبیاء نے کی تھیں۔ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی وہ آئے اور کفار کا غلبہ مٹے اور پھر ہمارے عروج کا دور شروع ہو۔ خود اہلِ مدینہ اس بات کے شاہد تھے کہ بعثتِ محمدیؐ سے پہلے

یہود کا خدائی قانون پر عمل پیرا ہونے سے اعراض

وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ وَمَا أُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ (سورۃ المائدہ ۔ آیت ۴۳)

ترجمہ: "اور یہ تمھیں کیسے حکم بناتے ہیں جب کہ ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بددیانتی کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ مذہبی لوگ جنھوں نے تمام عرب پر اپنی دینداری اور اپنے علم کتاب کا سکہ جما رکھا تھا، ان کی حالت یہ تھی کہ جس کتاب کو خود کتاب اللہ مانتے تھے، اور جس پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے، اس کے حکم کو چھوڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا مقدمہ لائے تھے جن کے پیغمبر ہونے سے بہ شدت ان کو انکار تھا۔ اس سے یہ راز بالکل فاش ہو گیا کہ یہ کسی چیز پر بھی صداقت کے ساتھ ایمان نہیں رکھتے۔ دراصل ان کا ایمان ان کے اپنے نفس اور خواہشات پر ہے، جسے کتاب اللہ مانتے ہیں اس سے صرف اس لیے منہ موڑتے ہیں کہ اس کا حکم ان کے نفس کو ناگوار ہے اور جسے معاذ اللہ جھوٹا مدعی نبوت کہتے ہیں اس کے پاس صرف اس امید پر جاتے ہیں کہ شاید وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ حاصل ہو جائے جو ان کے منشا کے مطابق ہو۔ (۱۵۲)

فصل ۳

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہود کے مخالفانہ ہتھکنڈے

مسلمانوں کے خلاف مشرک قبائل سے ساز باز:

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ
قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ
رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (البقرہ آیت ۷۶)

ترجمہ: "محمد رسول اللہ کے ماننے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی انھیں مانتے ہیں، اور جب آپس میں ایک دوسرے سے تخلیے کی بات چیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں بے وقوف ہو گئے ہو، ان لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمھارے رب کے پاس تمھارے مقابلے میں انھیں حجت میں پیش کریں؟"

وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ تورات اور دیگر کتبِ آسمانی میں جو پیشینگوئیاں اس نبی کے متعلق موجود ہیں، یا جو آیات اور تعلیمات ہماری مقدس کتابوں میں ایسی ملتی ہیں جن سے ہماری موجودہ روش پر گرفت ہو سکتی ہے انھیں مسلمانوں کے سامنے بیان نہ کرو، ورنہ یہ تمھارے رب کے سامنے ان کو تمھارے خلاف حجت کے طور پر پیش کریں گے۔ یہ تھا اللہ کے متعلق ان ظالموں کے فسادِ عقیدہ کا حال۔ گویا وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ دنیا میں اپنی تحریفات اور اپنی حق پوشی کو چھپا لے گئے تو آخرت میں ان پر مقدمہ نہ چل سکے گا۔ (۵۳)

ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اطرافِ مدینہ کے یہودی قبائل کے ساتھ جو معاہدے کیے تھے، ان لوگوں نے ان معاہدات کا ذرہ برابر پاس نہ کیا۔ جنگِ بدر کے موقع پر ان اہلِ کتاب کی ہمدردیاں توحید و نبوت اور کتاب و آخرت کے ماننے والے مسلمانوں کے بجائے بت پوجنے والے مشرکین کے ساتھ

یہی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی امید پہ جیا کرتے تھے اور ان کا آئے دن کا تکیہ کلام یہی تھا کہ اچھا، اب تو جس جس کا جی چاہے ہم پر ظلم کرلے، جب وہ نبی آئے گا تو ہم ان سب ظالموں کو دیکھ لیں گے۔ اہل مدینہ یہ باتیں سنے ہوئے تھے، اسی لیے جب انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے آپس میں کہا کہ دیکھنا، کہیں یہ یہودی تم سے بازی نہ لے جائیں۔ چلو، پہلے ہم ہی اس نبی پر ایمان لے آئیں۔ مگر ان کے لیے یہ عجیب ماجرا تھا کہ وہی یہودی جو آنے والے نبی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے۔ اس کے آنے پر سب سے بڑھ کر اس کے مخالف بن گئے۔

یہ بات کہ یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان گئے تھے کہ آپ وہی نبی ہیں جن کا وہ انتظار کررہے تھے، اس کے متعدد ثبوت اسی زمانے میں مل گئے تھے۔ سب سے زیادہ معتبر شہادت اُمّ المومنین حضرت صفیہ کی ہے جو خود ایک بہت بڑے یہودی عالم کی بیٹی اور ایک دوسرے عالم کی بھتیجی تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو میرے باپ اور چچا دونوں آپ سے ملنے گئے۔ بڑی دیر تک آپ سے گفتگو کی۔ پھر جب گھر واپس آئے تو میں نے اپنے کانوں سے ان دونوں کو یہ گفتگو کرتے سنا:

چچا: کیا واقعی یہ وہی نبی ہے جس کی خبریں ہماری کتابوں میں دی گئی ہیں؟

والد: خدا کی قسم ہاں۔

چچا: کیا تم کو اس کا یقین ہے؟

والد: ہاں۔

چچا: پھر کیا ارادہ ہے؟

والد: جب تک جان میں جان ہے اس کی مخالفت کروں گا اور اس کی بات چلنے نہ دوں گا۔ (۱۲۹)

شرک سے لاپروائی اور جزئیات کا ناپ تول

اِنَّ اللہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ۚ
وَمَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللہِ فَقَدِ افۡتَرٰۤی اِثۡمًا عَظِیۡمًا (النساء۔ آیت ۴۸)

ترجمہ: "اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا

اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔"

جس سلسلۂ کلام میں یہ آیت ارشاد ہوئی ہے اس میں زیرِ بحث اہلِ کتاب کا رویہ ہی ہے۔ وہ اگرچہ انبیاء اور کتبِ آسمانی کی پیروی کے مدعی تھے مگر شرک میں مبتلا تھے۔ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بس شرک نہ کرے باقی دوسرے گناہ دل کھول کر کرتا رہے، بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک جس کو ان لوگوں نے بہت معمولی چیز سمجھ رکھا ہے تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے حتیٰ کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ معاف نہیں کیا جا سکتا۔ علماءِ یہود شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے تھے بلکہ ان کا سارا وقت ان جزئیات کی ناپ تول ہی میں گزرتا تھا جو ان کے فقیہوں نے استنباط در استنباط کر کے نکالے تھے، مگر شرک ان کی نگاہ میں ایسا ہلکا فعل تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے، نہ اپنی قوم کو مشرکانہ خیالات اور اعمال سے بچانے کی کوشش کرتے تھے، اور نہ مشرکین کی دوستی اور حمایت ہی میں انھیں کوئی مضائقہ نظر آتا تھا۔ (۱۵۰)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَ
الطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ
آمَنُوا سَبِيلًا (النساء - ۵۱)

ترجمہ: "کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور اُن کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔"

جبت سے مراد ہیں اوہام و خرافات اور طاغوت سے مراد ہر معبود غیر اللہ ہے۔ علماءِ یہود کی ہٹ دھرمی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ایک طرف تو وہ ان لغویات کو مانتے تھے اور دوسری طرف جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے ان کو وہ مشرکینِ عرب کی بہ نسبت زیادہ گمراہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان سے تو یہ مشرکین ہی زیادہ راہِ راست پر ہیں۔ حالانکہ وہ صریح طور پر دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف خالص توحید ہے جس میں شرک کا شائبہ تک نہیں اور دوسری طرف صریح بت پرستی جس کی مذمت سے ساری بائیبل بھری پڑی ہے۔ (۱۵۱)

ایک نبی کے پیرو ہیں اور ایک کتاب کو مانتے ہیں، آپ ہمیں بتائیں کہ یہ صاحب جو ہمارے اندر نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھے ہیں ان کے متعلق اور ان کی تعلیم کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ چنانچہ یہ سوال مکے کے لوگوں نے بھی یہودیوں سے بارہا کیا، اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو یہاں بھی بکثرت لوگ یہودی علماء کے پاس جا جا کر یہی بات پوچھتے تھے۔ مگر ان علماء نے کبھی لوگوں کو صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ توحید، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں غلط ہے، یا انبیاء اور کتبِ آسمانی اور ملائکہ اور آخرت کے بارے میں جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، اس میں کوئی غلطی ہے، یا وہ اخلاقی اصول جن کی آپ تعلیم دے رہے ہیں ان میں سے کوئی چیز غلط ہے۔ مگر وہ صاف صاف اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں وہ صحیح ہے۔ وہ نہ سچائی کی کھلی کھلی تردید کر سکتے تھے، نہ سیدھی طرح اس کو سچائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انھوں نے طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ ہر سائل کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف آپ کی جماعت کے خلاف، اور آپ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے تھے، کوئی الزام آپ پر چپاں کر دیتے تھے، کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے تھے تاکہ لوگ ان میں خود بھی الجھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں کو بھی الجھانے کی کوشش کریں۔

ان کا یہی رویہ تھا جس کی بنا پر ان سے قرآن میں فرمایا گیا کہ حق پر باطل کے پردے نہ ڈالو، اپنے جھوٹے پراپیگنڈے اور شریرانہ شبہات و اعتراضات سے حق کو دبانے اور چھپانے کی کوشش نہ کرو، اور حق و باطل کو خلط ملط کر کے دنیا کو دھوکا نہ دو۔ (۱۵۷)

ذومعنیین الفاظ کا شرپسندانہ استعمال

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ
وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (البقرہ - آیت ۱۰۴)

ترجمہ: "اے ایمان لانے والو، رَاعِنَا نہ کہا کرو، بلکہ اُنْظُرْنَا کہو اور توجہ سے بات سنو، یہ کافر تو عذاب الیم کے مستحق ہیں۔"

یہودی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو اپنے سلام اور کلام میں ہر ممکن طریقے سے اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذومعنی الفاظ بولتے، زور سے کچھ کہتے اور زیرِ لب کچھ اور

کہہ دیتے، ظاہری ادب آداب برقرار رکھتے ہوئے درپردہ آپ کی توہین کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔

قرآن میں اس کی متعدد مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں جس خاص لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے یہ ایک ذو معنی لفظ تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے دوران میں یہودیوں کو کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ٹھہریے، ذرا ہمیں یہ بات سمجھ لینے دیجیے تو وہ رَاعِنَا" کہتے تھے۔ اس لفظ کا ایک ظاہری مفہوم تو یہ تھا کہ ذرا ہماری رعایت کیجیے یا ہماری بات سن لیجیے۔ مگر اس میں کئی احتمالات اور بھی تھے۔ مثلاً عبرانی میں اس سے ملتا جلتا ایک لفظ تھا جس کے معنی تھے "سن، تو بہرا ہو جائے"۔ اور خود عربی میں اس کے ایک معنی صاحب رعونت اور جاہل و احمق کے بھی تھے۔ اور گفتگو میں یہ ایسے موقع پر بھی بولا جاتا تھا جب یہ کہنا ہو کہ تم ہماری سنو تو ہم تمہاری سنیں۔ اور ذرا زبان کو لچکا دے کر رَاعِیْنَا بھی بنا لیا جاتا تھا جس کے معنی "اے ہمارے چرواہے" کے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کرو اور اس کے بجائے "اُنْظُرْنَا کہا کرو، یعنی ہماری طرف توجہ فرمایئے، یا ذرا ہمیں سمجھ لینے دیجیے۔ پھر فرمایا کہ توجہ سے بات سنو۔" یعنی یہودیوں کو تو بار بار یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ نبی کی بات پر توجہ نہیں کرتے اور ان کی تقریر کے دوران میں وہ اپنے ہی خیالات میں الجھے رہتے ہیں۔ مگر تمہیں غور سے نبی کی باتیں سننی چاہئیں تاکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ (۱۵۸)

وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ (النساء - آیت ۴۶)

ترجمہ: "اور دین حق کے خلاف نیش زنی کرنے کے لیے وہ اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا اور اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا۔"

یعنی جب انہیں خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں تو زور سے کہتے ہیں سَمِعْنَا (ہم نے سن لیا) اور آہستہ کہتے ہیں عَصَيْنَا (ہم نے قبول نہیں کیا) یا اَطَعْنَا (ہم نے قبول کیا) کا تلفظ اس انداز سے زبان کو لچکا دے کر کرتے ہیں کہ عَصَيْنَا بن جاتا ہے۔

یعنی دورانِ گفتگو میں جب وہ کوئی بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں (اِسْمَعْ (سنیے) اور پھر ساتھ ہی غَيْرَ مُسْمَعٍ بھی کہتے ہیں جو ذو معنی ہے، اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ

صفحہ 261

تھیں۔ بدر کے بعد یہ لوگ کھلم کھلا قریش اور دوسرے قبائل عرب کو مسلمانوں کے خلاف جوش دِلا دلا کر بدلہ لینے پر اکسانے لگے۔ خصوصاً بنی نضیر کے سردار کعب بن اشرف نے تو اس سلسلے میں اپنی مخالفانہ کوششوں کو اندھی عداوت، بلکہ کمینہ پن کی حد تک پہنچا دیا۔ اہل مدینہ کے ساتھ ان یہودیوں کی ہمسائیگی اور دوستی کے جو تعلقات صدیوں سے چلے آ رہے تھے ان کا پاس و لحاظ بھی انھوں نے اٹھا دیا۔ آخر کار جب ان کی شرارتیں اور عہد شکنیاں حدِ برداشت سے گزر گئیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے چند مہینے بعد بنی قُینُقاع پر، جو ان یہودی قبیلوں میں سب سے زیادہ شریر لوگ تھے، حملہ کر دیا اور انھیں اطرافِ مدینہ سے نکال باہر کیا۔

لیکن اس سے دوسرے یہودی قبائل کی آتشِ عناد اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ انھوں نے مدینہ کے منافق مسلمانوں اور حجاز کے مشرک قبیلوں کے ساتھ ساز باز کر کے مسلمانوں کے لیے ہر طرف خطرات ہی خطرات پیدا کر دیے۔ حتیٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے متعلق ہر وقت یہ اندیشہ رہنے لگا کہ نہ معلوم کب آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جائے۔ صحابہ کرامؓ اس زمانے میں بالعموم ہتھیار بند سوتے تھے۔ شب خون کے ڈر سے راتوں کو پہرے دیے جاتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تو صحابہ کرامؓ گھبرا کر آپ کو ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ (۱۵۴)

مذہبی اثر کا معاندانہ استعمال

جو نو مسلم ہجرت سے کچھ پہلے یا اس کے بعد قریب کے زمانے ہی میں نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے ان کے کانوں میں پہلے سے نبوت، کتاب، ملائکہ، آخرت، شریعت وغیرہ کی جو باتیں پڑی ہوئی تھیں وہ سب انھوں نے اپنے ہمسایہ یہودیوں سے سنی تھیں۔ اور یہ بھی انھوں نے یہودیوں ہی سے سنا تھا کہ دنیا میں ایک پیغمبر اور آنے والے ہیں، اور یہ کہ جو لوگ ان کا ساتھ دیں گے وہ ساری دنیا پر چھا جائیں گے۔ یہی معلومات تھیں جن کی بنا پر اہلِ مدینہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چرچا سن کر آپ کی طرف خود متوجہ ہوئے اور جوق در جوق ایمان لائے۔ اب وہ متوقع تھے کہ جو لوگ پہلے ہی سے انبیاء اور کتبِ آسمانی کے پیرو ہیں اور جن کی دی ہوئی خبروں کی بدولت ہی ہم کو نعمتِ ایمان میسر آئی ہے وہ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ یہی توقعات لے کر یہ پُرجوش نو مسلم اپنے یہودی دوستوں اور ہمسایوں کے پاس جاتے اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ پھر جب وہ اس دعوت کا جواب انکار کی صورت میں دیتے تو منافقین اور مخالفینِ اسلام اس سے یہ استدلال کرتے تھے کہ معاملہ کچھ مشتبہ ہی معلوم ہوتا ہے،

ورنہ اگر یہ واقعی نبی ہوتے تو آخر کیسے ممکن تھا کہ اہلِ کتاب کے علماء اور مشائخ اور مقدس بزرگ جانتے بوجھتے ایمان لانے سے منہ موڑتے اور خواہ مخواہ اپنی عاقبت خراب کر لیتے۔ (۱۵۵)

تلبیسِ حق اور کتمانِ حق

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَ
لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ
بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ - آیات ۴۱ - ۴۲)

ترجمہ: "اور میں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اس کتاب کی تائید میں ہے، جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی۔ لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو، اور میرے غضب سے بچو۔ باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔"

تھوڑی قیمت سے مراد وہ دنیوی فائدے ہیں جن کی خاطر یہ لوگ اس کے احکام اور اس کی ہدایت کو رد کر رہے تھے۔ حق فروشی کے معاوضے میں خواہ انسان دنیا بھر کی دولت لے لے، بہرحال وہ تھوڑی قیمت ہی ہے کیونکہ حق یقیناً ایک گراں تر چیز ہے۔ (۱۵۶)

اہلِ عرب بالعموم ناخواندہ لوگ تھے، اور ان کے مقابلے میں یہودیوں کے اندر ویسے ہی تعلیم کا زیادہ چرچا تھا اور انفرادی طور پر ان میں ایسے جلیل القدر عالم پائے جاتے تھے جن کی شہرت عرب کے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے عربوں پر یہودیوں کا علمی رعب بہت زیادہ تھا۔ پھر ان کے علماء اور مشائخ نے اپنے مذہبی درباروں کی ظاہری شان جما کر اور اپنی جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کا کاروبار چلا کر اس رعب کو اور بھی گہرا اور وسیع کر دیا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ اہلِ مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے، کیونکہ ان کے آس پاس بڑے بڑے یہودی قبائل آباد تھے۔ رات دن ان سے میل جول تھا، اور اس میل جول میں وہ ان سے اسی طرح شدت کے ساتھ متاثر تھے جس طرح ایک ان پڑھ آبادی زیادہ تعلیم یافتہ زیادہ متمدن اور زیادہ نمایاں مذہبی تشخص رکھنے والے ہمسایوں سے متاثر ہوا کرتی ہے، ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کیا اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینی شروع کی تو قدرتی بات تھی کہ ان پڑھ عرب اہلِ کتاب یہودیوں سے جا کر پوچھتے کہ آپ لوگ بھی

محترم ہیں کہ آپ کو کوئی بات خلافِ مرضی نہیں سنائی جا سکتی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم اس قابل نہیں کہ تمھیں کوئی بات سنائے۔ ایک اور مطلب یہ ہے کہ خدا کرے کہ تم بہرے ہو جاؤ۔ (۱۵۹)

صبح اسلام لاؤ شام کفر کرو

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (اٰل عمران۔ اٰیت ۷۲)

ترجمہ: ”اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو، شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔“

یہ ان چالوں میں سے ایک چال تھی جو اطرافِ مدینہ کے رہنے والے یہودیوں کے لیڈر اور مذہبی پیشوا اسلام کی دعوت کو کمزور کرنے کے لیے چلتے رہتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو بددل کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عامۂ خلائق کو بدگمان کرنے کے لیے خفیہ طور پر آدمیوں کو تیار کر کے بھیجنا شروع کیا تاکہ پہلے وہ علانیہ اسلام قبول کریں، پھر مرتد ہو جائیں، پھر جگہ جگہ لوگوں میں یہ کہتے پھریں کہ ہم نے اسلام میں اور مسلمانوں میں اور ان کے پیغمبر میں یہ اور یہ خرابیاں دیکھی ہیں تب ہی تو ہم ان سے الگ ہو گئے۔ (۱۶۰)

مسلمانوں سے منافقانہ رویہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ
خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَ
مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝
هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَ
اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ
قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ
تَسُؤْهُمْ ؗ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا
يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ (اٰل عمران۔ اٰیات ۱۱۸ تا ۱۲۰)

ترجمہ: "اے ایمان لانے والو، اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے۔ تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے، ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے، اور وہ جو کچھ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمہیں صاف صاف ہدایت دے دی ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو (تو ان سے تعلق رکھنے میں احتیاط برتو گے)۔ تم اُن سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم تمام کتبِ آسمانی کو مانتے ہو۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی (تمہارے رسول اور تمہاری کتاب کو) مان لیا ہے۔ مگر جب جدا ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف ان کے غیظ و غضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں ـــــ ان سے کہہ دو اپنے غصہ میں آپ جل مرو، اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو بُرا معلوم ہوتا ہے، اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس پر حاوی ہے۔"

مدینہ کے اطراف میں جو یہودی آباد تھے ان کے ساتھ اَوس و خَزرَج کے لوگوں کی قدیم زمانہ سے دوستی چلی آتی تھی۔ انفرادی طور پر بھی ان قبیلوں کے افراد ان کے افراد سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، اور قبائلی حیثیت سے بھی یہ اور وہ ایک دوسرے کے ہمسایہ اور حلیف تھے۔ جب اَوس اور خزرج کے قبیلے مسلمان ہو گئے تو اس کے بعد بھی وہ یہودیوں کے ساتھ وہی پرانے تعلقات نباہتے رہے اور ان کے افراد اپنے سابق یہودی دوستوں سے اسی محبت و خلوص کے ساتھ ملتے رہے۔ مگر یہودیوں کو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مشن سے جو عداوت ہو گئی تھی اس کی بنا پر وہ کسی ایسے شخص سے مخلصانہ محبت رکھنے کے لیے تیار نہ تھے جو اس نئی تحریک میں شامل ہو گیا ہو۔ انھوں نے انصار کے ساتھ ظاہر میں تو وہی تعلقات رکھے جو پہلے سے چلے آتے تھے مگر دل میں وہ اب ان کے سخت دشمن ہو چکے تھے اور اس ظاہری دوستی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت میں اندرونی فتنہ فساد برپا کر دیں اور ان کے جماعتی راز معلوم کر کے ان کے

دشمنوں تک پہنچائیں۔ (۱۶۱)

شبہات پھیلانے کی کوشش

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (البقرہ۔ آیت ۱۰۶)

ترجمہ: ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، اس کی جگہ اس سے بہتر لاتے ہیں یا کم از کم ویسی ہی۔

یہودی مسلمانوں کے دلوں میں جو شبہات ڈالنے کی کوشش کرتے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے تو ان کے بعض احکام کی جگہ اس میں دوسرے احکام کیوں دیے گئے ہیں؟ ایک ہی خدا کی طرف مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر تمھارا قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی اور عیسائی اس تعلیم کے ایک حصے کو بھول گئے جو انھیں دی گئی تھی۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی خدا کی دی ہوئی تعلیم ہو اور وہ حافظوں سے محو ہو جائے؟ یہ ساری باتیں وہ تحقیق کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کرتے تھے کہ مسلمانوں کو قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہو جائے۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے[1] کہ میں مالک ہوں، میرے اختیارات غیر محدود ہیں، اپنے جس حکم کو چاہوں منسوخ کر دوں اور جس چیز کو چاہوں حافظوں سے محو کر دوں، مگر جس چیز کو میں منسوخ یا محو کرتا ہوں اس سے بہتر چیز اس کی جگہ پر لاتا ہوں۔ یا کم از کم وہ اپنے محل میں اتنی ہی مفید اور مناسب ہوتی ہے جتنی پہلی چیز اپنے محل میں تھی۔ (۱۶۲)

---

[1] اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (البقرہ۔ آیت ۱۰۶) مرتبین

فصل ۴

ایک مقدمۂ زنا میں یہود کا اپنے مذہب سے انحراف

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ
اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۝ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ
وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ
اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (المائدہ ۔ آیات ۴۲ - ۴۳)

ترجمہ: "یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں لہٰذا اگر یہ تمہارے پاس (اپنے مقدمات لے کر آئیں تو تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کرو ورنہ انکار کر دو۔ انکار کر دو تو یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ـــ اور یہ تمہیں کیسے حَکَم بناتے ہیں جب کہ ان کے پاس توراۃ موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔"

یہاں خاص طور پر ان کے مفتیوں اور قاضیوں کی طرف اشارہ ہے جو جھوٹی شہادتیں لے کر اور جھوٹی رودادیں سن کر ان لوگوں کے حق میں انصاف کے خلاف فیصلے کیا کرتے تھے جن سے انھیں رشوت پہنچ جاتی تھی، یا جن کے ساتھ ان کے ناجائز مفاد وابستہ تھے۔

یہودی اس وقت تک اسلامی حکومت کی باقاعدہ رعایا نہیں بنے تھے بلکہ اسلامی حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات معاہدات پر مبنی تھے۔ ان معاہدات کی رُو سے یہودیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل تھی، اور ان کے مقدمات کے فیصلے انہی کے قوانین کے مطابق ان کے جج کرتے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یا آپ کے مقرر کردہ قاضیوں کے پاس اپنے مقدمات لانے کے لیے ازروئے قانون مجبور نہ تھے۔ لیکن یہ لوگ جن معاملات میں خود اپنے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ کرانا نہیں چاہتے تھے اُن کا فیصلہ کرانے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس امید پر آ جاتے تھے کہ شاید آپ کی شریعت میں ان کے لیے کوئی دوسرا حکم ہو اور اس طرح وہ اپنے مذہبی قانون کی پیروی سے بچ جائیں۔

یہودیوں کا خفیہ مشورہ

یہاں خاص طور پر جس مقدمہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ تھا کہ خیبر کے معزز یہودی خاندانوں میں ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلق پایا گیا۔ تورات کی رُو سے ان کی سزا رجم تھی، یعنی یہ کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے (استثناء۔ باب ۲۲۔ آیت ۲۲ - ۲۴)۔ لیکن یہودی اس سزا کو نافذ کرنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدمہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پنچ بنایا جائے۔ اگر وہ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو قبول کر لیا جائے اور رجم ہی کا حکم دیں تو نہ قبول کیا جائے۔ چنانچہ مقدمہ آپ کے سامنے لایا گیا۔ آپؐ نے رجم کا حکم دیا۔ انھوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔

یہودیوں کا پول کھُل گیا

اس پر آپؐ نے پوچھا تمہارے مذہب میں اس کی سزا کیا ہے؟ انھوں نے کہا کوڑے مارنا اور منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرنا۔ آپؐ نے ان کے علما کو قسم دے کر ان سے پوچھا، کیا تورات میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کی یہی سزا ہے؟ انھوں نے پھر وہی جھوٹا جواب دیا۔ لیکن ان میں سے ایک شخص ابن صُوریا جو خود یہودیوں کے بیان کے مطابق اپنے وقت میں تورات کا سب سے بڑا عالم تھا، خاموش رہا۔ آپؐ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تجھے اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے تم لوگوں کو فرعون سے بچایا اور طور پر تمھیں شریعت عطا کی، کیا واقعی تورات میں زنا کی یہی سزا لکھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "اگر آپ مجھے ایسی بھاری قسم نہ دیتے تو میں نہ بتاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ زنا کی سزا تو رجم ہی ہے مگر ہمارے ہاں جب زنا کی کثرت ہوئی تو ہمارے حکام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ زنا کرتے تو انھیں چھوڑ دیا جاتا اور چھوٹے لوگوں سے یہی حرکت سرزد ہوتی تو انھیں رجم کر دیا جاتا۔ پھر جب اس سے عوام میں ناراضی پیدا ہونے لگی تو ہم نے تورات کے قانون کو بدل کر یہ قاعدہ بنا لیا کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے لگائے جائیں اور انھیں منہ کالا کر کے گدھے پر الٹے منہ سوار کیا جائے۔ اس کے بعد یہودیوں کے لیے کچھ بولنے کی گنجائش نہ رہی اور نبی

صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے زانی اور زانیہ کو سنگسار کر دیا گیا۔

یہود کی نمائشی مذہبیت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بد دیانتی کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ "مذہبی لوگ" جنھوں نے تمام عرب پر اپنی دینداری اور اپنے علمِ کتاب کا سکہ جما رکھا تھا، ان کی حالت یہ تھی کہ جس کتاب کو وہ خود کتاب اللہ مانتے تھے، اور جس پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے، اس کے حکم کو چھوڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا مقدمہ لائے تھے جن کے پیغمبر ہونے سے ان کو بشدت انکار تھا۔ اس سے یہ راز بالکل فاش ہو گیا کہ وہ کسی چیز پر بھی صداقت کے ساتھ ایمان نہیں رکھتے۔ دراصل ان کا ایمان اپنے نفس اور اس کی خواہشات پر ہے۔ جسے کتاب اللہ مانتے ہیں اس سے صرف اس لیے منہ موڑتے ہیں کہ اس کا حکم ان کے نفس کو ناگوار ہے اور جسے معاذ اللہ جھوٹا مدعی نبوت کہتے ہیں اس کے پاس صرف اس لیے جاتے ہیں کہ شاید وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ ہو جائے جو ان کے منشا کے مطابق ہو۔ (۱۶۳)

فصل ۵

نامعقول اعتراضات اور بے تکے مطالبات

یہود کو اسلامی اصلاحات سخت ناگوار تھیں

منافقین اور قدامت پسند جہلا اور نواحی مدینہ کے یہودیوں کو وہ اصلاحات سخت ناگوار تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد تمدن و معاشرت میں صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے تعصبات اور رسم و رواج کے خلاف جا رہی تھیں۔ میراث میں لڑکیوں کا حصہ، بیوہ عورت کا سسرال کی بندشوں سے رہائی پانا اور عدت کے بعد اس کا ہر شخص سے نکاح کے لیے آزاد ہو جانا۔ سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہونا۔ دو بہنوں کے ایک ساتھ نکاح میں جمع کیے جانے کو ناجائز قرار دینا۔ متبنّٰی کو وراثت سے محروم کرنا اور منہ بولے باپ کے متبنّٰی کی بیوہ اور مطلقہ کا حلال ہونا۔ یہ اور اس طرح کی دوسری اصلاحات میں سے ایک ایک چیز ایسی تھی جس پر بڑے بوڑھے اور آبائی رسوم کے پرستار چیخ اٹھتے تھے۔ قرآن کے احکام پر چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ شرارت پسند لوگ ان باتوں کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوتِ اصلاح کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے رہتے تھے۔ مثلاً جو شخص کسی ایسے نکاح سے پیدا ہوا تھا جسے اب اسلامی شریعت حرام قرار دے رہی تھی، اس کو یہ کہہ کر اشتعال دلایا جاتا تھا کہ لیجیے آج جو نئے احکام وہاں آئے ہیں ان کی رُو سے آپ کی ماں اور آپ کے باپ کا تعلق ناجائز ٹھہرا دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ نادان لوگ اس اصلاح کے کام میں رکاوٹیں ڈال رہے تھے جو اس وقت احکامِ الٰہی کے تحت انجام دیا جا رہا تھا۔

ایک ایک چیز پر سو سو اعتراضات

دوسری طرف یہودی تھے جنھوں نے صدیوں کی موشگافیوں سے اصل خدائی شریعت پر اپنے خودساختہ احکام و قوانین کا ایک بھاری خول چڑھا رکھا تھا۔ بے شمار پابندیاں اور باریکیاں اور سختیاں تھیں جو

انھوں نے شریعت میں بڑھالی تھیں۔ بکثرت حلال چیزیں ایسی تھیں جنھیں وہ حرام کر بیٹھے تھے۔ بہت سے اوہام تھے جن کو انھوں نے قوانینِ خداوندی میں داخل کرلیا تھا۔ اب یہ بات ان کے علماء اور عوام دونوں کی ذہنیت اور مذاق کے بالکل خلاف تھی کہ وہ اس سیدھی سادی شریعت کی قدر پہچان سکتے جو قرآن پیش کر رہا تھا۔ وہ قرآن کے احکام کو سن کر بے تاب ہو ہو جاتے تھے۔ ایک ایک چیز پر سو سو اعتراضات کرتے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ یا تو قرآن ان کے فقہاء کے تمام اجتہادات اور ان کے اسلاف کے سارے اوہام و خرافات کو شریعتِ الٰہی قرار دے، ورنہ یہ ہرگز کتابِ الٰہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہودیوں کے ہاں دستور تھا کہ ایامِ ماہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا، نہ اس کا پکا ہوا کھانا کھاتے، نہ اس کے ہاتھ کا پانی پیتے، نہ اس کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھتے، بلکہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ ان چند دنوں میں عورت خود اپنے گھر میں اچھوت بن کر رہ جاتی۔[لہ] (١٦٤)

کعبہ کو قبلہ بنانے پر ان کا اعتراض

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ہ

(آل عمران ۔ آیت ۹۶)

ترجمہ: "بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسان کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا۔"

یہودیوں کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تم نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ کیوں بنایا۔ حالانکہ پچھلے

[لہ] یہی رواج یہودیوں کے اثر سے مدینہ کے انصار میں بھی چل پڑا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا۔ جواب میں وہ آیت آئی جو سورہ بقرہ آیت ۲۲۲ میں درج ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی رُو سے حکم دیا کہ ایامِ ماہواری میں صرف مباشرت ناجائز ہے، باقی تمام تعلقات عورت کے ساتھ اسی طرح رکھے جائیں جس طرح دوسرے دنوں میں ہوتے ہیں۔ اس پر یہودیوں میں شور مچ گیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ شخص تو قسم کھا کر بیٹھا ہے کہ جو جو کچھ ہمارے ہاں حرام ہے اسے حلال کرکے رہے گا اور جس جس چیز کو ہم ناپاک کہتے ہیں اسے پاک قرار دے گا۔ (١٦٥)

انبیاء کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ اس کا جواب سورۂ بقرہ میں دیا جا چکا تھا[1]۔ لیکن یہودی اس کے بعد بھی اپنے اعتراض پر مصر رہے۔ لہٰذا پھر اس کا جواب دیا گیا بیت المُقدس کے متعلق خود بائیبل ہی کی شہادت موجود ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساڑھے چار سو برس بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو تعمیر کیا (۱۔ سلاطین، باب ۶۔ آیت ۱) اور حضرت سلیمانؑ ہی کے زمانہ میں وہ قبلۂ اہلِ توحید قرار دیا گیا۔ (کتاب مذکور، باب ۸، آیت ۲۹۔ ۳۰) برعکس اس کے یہ تمام عرب کی متواتر اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا، اور وہ حضرت موسیٰؑ سے آٹھ نو سو برس پہلے گزرے ہیں۔ لہٰذا کعبہ کی اولیت ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں۔ (۱۲۶)

رسول اللہ کی بشریت پر اعتراض

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰى (الانعام۔ آیت ۹۱)

ترجمہ: "ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے۔ ان سے پوچھو، پھر وہ کتاب جسے موسیٰؑ لایا تھا اس کو کس نے نازل کیا تھا؟"

سلسلۂ بیان سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ یہ قول یہودیوں کا تھا۔ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ تھا کہ میں نبی ہوں اور مجھ پر کتاب نازل ہوئی ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر کفارِ قریش اور دوسرے مشرکینِ عرب اس دعوے کی تحقیق کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے پوچھتے تھے کہ تم بھی اہلِ کتاب ہو۔ پیغمبروں کو مانتے ہو، بتاؤ واقعی اس شخص پر اللہ کا کلام نازل ہوا ہے؟ پھر جو کچھ جواب وہ دیتے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین جگہ جگہ بیان کرکے لوگوں کو برگشتہ کرتے پھرتے تھے۔

اسی لیے یہاں یہودیوں کے اس قول کو جسے مخالفینِ اسلام نے حجت بنا رکھا تھا نقل کرکے اس کا یہ جواب دیا جا رہا ہے کہ اگر اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے تو موسیٰؑ پر کتاب کس

---

[1] ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ، آیت ۱۴۲۔ تشریح کے لیے دیکھیں تفہیم القرآن، البقرہ، حاشیہ ۱۴۸ (از مؤلف)

نے نازل کی تھی۔[1]

حلّت و حرمت کے متعلق فقہی اعتراض

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ ۗ (آل عمران - آیت - ۹۳)

ترجمہ: کھانے کی یہ ساری چیزیں (جو شریعتِ محمدی میں حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں۔ البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنھیں تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔"

قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر جب علماء یہود کوئی اصولی اعتراض نہ کر سکے (کیونکہ اساسِ دین جن امور پر ہے ان میں انبیاء سابقین کی تعلیمات اور نبی عربی کی تعلیم میں یک سرِ مو فرق نہ تھا) تو انھوں نے فقہی اعتراضات شروع کیے۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ آپ نے کھانے پینے کی بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جو پچھلے انبیاء کے زمانے سے حرام چلی آ رہی ہیں۔

---

[1] شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک یہودی جو خود تورات کو خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب مانتا ہے، یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر بسا اوقات آدمی کسی دوسرے کی سچی باتوں کو رد کرنے کے لیے ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جن سے خود اس کی مسلمہ صداقتوں پر بھی زد پڑ جاتی ہے۔ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو رد کرنے پر تلے ہوئے تھے، اور اپنی مخالفت کے جوش میں اس قدر اندھے ہو جاتے تھے، کہ حضورؐ کی رسالت کی تردید کرتے کرتے خود رسالت ہی کی تردید کر گزرتے تھے (مؤلف)

اور یہ جو فرمایا کہ لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب یہ کہا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کی حکمت اور اس کی قدرت کا اندازہ کرنے میں غلطی کی ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر علمِ حق اور ہدایت نامۂ زندگی نازل نہیں کیا ہے وہ یا تو بشر پر نزولِ وحی کو ناممکن سمجھتا ہے، اور یہ خدا کی قدرت کا غلط اندازہ ہے۔ یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا نے انسان کو ذہانت کے ہتھیار اور تصرف کے اختیارات دے دیے مگر اس کی صحیح رہنمائی کا کوئی انتظام نہ کیا بلکہ اسے دنیا میں اندھا دھند کام کرنے کے لیے یونہی چھوڑ دیا، اور یہ خدا کی حکمت کا غلط اندازہ ہے۔ (۱۶۷)

اسرائیل سے مراد اگر بنی اسرائیل لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ نزولِ تورات سے قبل بعض چیزیں بنی اسرائیل نے محض رسماً حرام قرار دے لی تھیں۔ اور اگر اس سے مراد حضرت یعقوبؑ لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنجناب نے بعض چیزوں سے طبعی کراہت کی بنا پر یا کسی مرض کی بنا پر احتراز فرمایا تھا اور ان کی اولاد نے بعد میں انھیں ممنوع سمجھ لیا۔ یہی موخرالذکر روایت زیادہ مشہور ہے۔ اور بعد والی آیت سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ اونٹ اور خرگوش وغیرہ کی حرمت کا جو حکم بائیبل میں لکھا ہے وہ اصل تورات کا حکم نہیں ہے بلکہ یہودی علما نے اسے بعد میں داخلِ کتاب کر دیا ہے۔ (۱۶۹)

حضرت زینبؓ کے نکاح پر مفسدانہ پروپیگنڈہ

کمینہ خصلت لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے کہ جب وہ دوسرے کی خوبیاں اور اپنی کمزوریاں صریح طور پر دیکھ لیتے ہیں، اور یہ بھی جان لیتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اسے بڑھا رہی ہیں اور ان کی اپنی کمزوریاں انھیں گرا رہی ہیں تو انھیں یہ فکر لاحق نہیں ہوتی کہ اپنی کمزوریاں دور کریں اور اس کی خوبیاں اخذ کریں، بلکہ وہ اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے اس کے اندر بھی اپنے ہی جیسی برائیاں پیدا کر دیں، اور یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کے اوپر خوب گندگی اچھالیں تاکہ دنیا کو اس کی خوبیاں بے داغ نظر نہ آئیں۔ یہی ذہنیت تھی جس نے اس مرحلے پر دشمنانِ اسلام کی سرگرمیوں کا رخ جنگی کارروائیوں سے ہٹا کر ذلیلانہ حملوں اور داخلی فتنہ انگیزیوں کی طرف پھیر دیا۔ اور چونکہ یہ خدمت باہر کے دشمنوں کی بہ نسبت خود مسلمانوں کے اندر کے منافقین زیادہ اچھی طرح انجام دے سکتے تھے اس لیے بالارادہ یا بلاارادہ طریق کار یہ قرار پایا کہ مدینہ کے منافقین اندر سے فتنے اٹھائیں اور یہود و مشرکین باہر سے ان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

اس نئی تدبیر کا پہلا ظہور ذی قعدہ ۵ھ میں ہوا جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب سے تَبَنِّیت کی جاہلانہ رسم کا خاتمہ کرنے کے لیے خود اپنے متبنّٰی (زیدؓ بن حارثہ) کی مُطلقہ بیوی (زینب بنت جَحش) سے نکاح کیا۔ اس موقع پر مدینہ کے منافقین پروپیگنڈا کا ایک طوفانِ عظیم لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر سے یہود و مشرکین نے بھی ان کی آواز میں آواز ملا کر افترا پردازیاں شروع کر دیں۔ انھوں نے عجیب عجیب قصے گھڑ گھڑ کر پھیلا دیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کس طرح اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئے اور کس طرح بیٹے کو ان کے عشق کا علم ہوا اور وہ طلاق دے کر بیوی

سے دستبردار ہو گیا اور پھر کس طرح انھوں نے اپنی بہو سے بیاہ کر لیا۔۔۔۔۔ حالانکہ حضرت زینب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی اُمیمہ بنت عبدالمطلب کی صاحب زادی تھیں، بچپن سے جوانی تک ان کی ساری عمر حضور کی آنکھوں کے سامنے گزری تھی، ان کو ایک روز اتفاقاً دیکھ لینے اور معاذ اللہ ان پر عاشق ہو جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اس واقعہ سے ایک ہی سال پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو مجبور کر کے حضرت زید سے ان کی شادی کی تھی۔ (۱۶۹)

اللہ کا مذاق اڑانے کی جسارت

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ

(آل عمران - ۱۸۱)

ترجمہ: "اللہ نے ان لوگوں کا قول سنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔"

یہ یہودیوں کا قول تھا۔ قرآن مجید میں جب یہ آیت آئی کہ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے) تو اس کا مذاق اڑاتے ہوئے یہودیوں نے کہنا شروع کہ جی ہاں اللہ میاں مفلس ہو گئے ہیں، اب وہ بندوں سے قرض مانگ رہے ہیں۔ (۱۷۰)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ (سورۃ المائدہ - آیت ۶۴)

ترجمہ: "یہودی کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔"

عربی محاورے کے مطابق کسی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بخیل ہے، عطا اور بخشش سے اس کا ہاتھ رکا ہوا ہے۔ پس یہود کے اس قول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقعی اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ بخیل ہے۔ چونکہ صدیوں سے یہودی قوم ذلت اور نکبت کی حالت میں مبتلا تھی اور اس کی گزشتہ عظمت محض ایک افسانۂ پارینہ بن کر رہ گئی تھی، جس کے واپس آنے کا کوئی امکان ان کو نظر نہ آتا تھا اس لیے بالعموم قومی مصائب پر ماتم کرتے ہوئے اس قوم کے نادان لوگ یہ بیہودہ فقرہ کہا کرتے تھے کہ معاذ اللہ خدا بخیل ہو گیا ہے، اس کے خزانے کا منہ بند ہے، ہمیں دینے کے لیے اب اس کے پاس آفات اور مصائب کے سوا کچھ نہیں رہا۔ (۱۷۱)

جبریلؑ سے عداوت

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰي قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ، آیت ۹۷)

ترجمہ: "ان سے کہو کہ جو کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبریل نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمھارے قلب پر نازل کیا ہے۔"

یہودی صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ پر ایمان لانے والوں ہی کو برا نہ کہتے تھے بلکہ خدا کے برگزیدہ فرشتے جبرئیل کو بھی گالیاں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ ہمارا دشمن ہے وہ رحمت کا نہیں بلکہ عذاب کا فرشتہ ہے۔ اس بنا پر فرمایا گیا کہ تمھاری گالیاں جبرئیل پر نہیں بلکہ خداوند برتر کی ذات پر پڑتی ہیں۔ (۱۴۲)

لکھی لکھائی کتاب آسمان سے اتار کر دکھلائے

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا
مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (النساء۔ آیت ۱۵۳)

ترجمہ: "یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کراؤ تو اس سے بڑھ چڑھ کر مطالبے یہ پہلے موسیٰ سے کر چکے ہیں اس سے تو انھوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو۔"

مدینہ کے یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپ کی رسالت اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو، یا ہم میں سے ایک ایک شخص کے نام اوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ آجائے کہ یہ محمد ہمارے رسول ہیں ان پر ایمان لاؤ۔ (۱۴۳)

سوختی قربانی کا مطالبہ

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ
تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ
قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (آل عمران۔ آیت ۱۸۳)

ترجمہ: "جو لوگ کہتے ہیں اللہ نے ہم کو ہدایت کر دی ہے کہ ہم کسی رسول کو تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آکر) آگ کھائے۔ ان سے کہو تمھارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا تم ذکر کرتے ہو۔ پھر اگر ایمان لانے کے لیے یہ شرط پیش کرنے میں تم

سچے ہو تو ان رسولوں کو تم نے کیوں قتل کیا؟"

بائیبل میں متعدد مقامات پر یہ ذکر آیا ہے کہ خدا کے ہاں کسی کی قربانی کے مقبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ غیب سے ایک آگ نمودار ہو کر اسے بھسم کر دیتی تھی (قضاۃ ۶ : ۲۰ - ۲۱ ، ۱۳ : ۱۹ - ۲۰) نیز یہ ذکر بھی بائیبل میں آتا ہے کہ بعض مواقع پر کوئی نبی سوختنی قربانی کرتا تھا اور ایک غیبی آگ آ کر اسے کھا لیتی تھی۔ (احبار۔ ۹ : ۲۴ - ۲ - تواریخ - ۷ : ۱ - ۲) لیکن یہ کسی جگہ بھی نہیں لکھا کہ اس طرح کی قربانی نبوت کی ضروری علامت ہے، یا یہ کہ جس شخص کو یہ معجزہ نہ دیا گیا ہو وہ ہرگز نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ محض ایک من گھڑت بہانہ تھا۔ جو یہودیوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے کے لیے تصنیف کر لیا تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر ان کی حق دشمنی کا ثبوت یہ تھا کہ خود انبیاء بنی اسرائیل میں سے بعض نبی ایسے گزرے ہیں جنھوں نے آتشیں قربانی کا یہ معجزہ پیش کیا اور پھر بھی یہ جرائم پیشہ لوگ ان کے قتل سے باز نہ آئے۔ مثال کے طور پر بائیبل میں حضرت الیاسؑ (ایلیاہ تشبی) کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے بعل کے پجاریوں کو چیلنج دیا کہ مجمعِ عام میں ایک بیل کی قربانی تم کرو اور ایک کی قربانی میں کرتا ہوں، جس کی قربانی غیبی آگ کھا لے وہی حق پر ہے۔ چنانچہ ایک خلقِ کثیر کے سامنے یہ مقابلہ ہوا اور غیبی آگ نے حضرت الیاسؑ کی قربانی کھائی۔ لیکن اس کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ اسرائیل کے بادشاہ کی بعل پرست ملکہ حضرت الیاسؑ کی دشمن ہو گئی اور وہ زن پرست بادشاہ اپنی ملکہ کی خاطر ان کے قتل کے درپے ہوا، اور ان کو مجبوراً ملک سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی (۱ - سلاطین - باب ۱۸، ۱۹) اسی بنا پر ارشاد ہوا ہے کہ حق کے دشمنو! تم کس منہ سے آتشیں قربانی کا معجزہ مانگتے ہو؟ جن پیغمبروں نے یہ معجزہ دکھایا تھا انہی کے قتل سے تم کب باز رہے۔ (۱۴۳)

فصل ۶

معاہدۂ مدینہ اور یہود کی خلاف ورزیاں

جب مدینے میں اسلام پہنچا اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد وہاں ایک اسلامی ریاست وجود میں آئی تو آپ نے اس ریاست کو قائم کرتے ہی جو اولین کام کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اوس اور خزرج اور مہاجرین کو ملا کر ایک برادری بنائی۔ اور دوسرا یہ تھا کہ اس مسلم معاشرے میں اور یہودیوں کے درمیان واضح شرائط پر ایک معاہدہ طے کیا جس میں اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ کوئی کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کرے گا اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں یہ سب متحدہ دفاع کریں گے۔ اس معاہدے کے چند اہم فقرے یہ ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہودی اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات میں کن امور کی پابندی قبول کی تھی۔

ان على اليهود نفقتهم وعلى المسلمين نفقتهم، وان بينهم النصر على من حارب اهل هذه الصحيفة، وان بينهم النصح والنصيحة والبر دون الاثم، وانه لم يأثم امرؤ بحليفه، وان النصر للمظلوم وان اليهود ينفقون مع المومنين ما داموا محاربين وان يثرب حرام جوفها لاهل هذه الصحيفة .... وانه ما كان بين اهل هذه الصحيفة من حدثٍ او اشتجار يخاف فساده فان مردّه الى الله عز وجل والى محمد رسول الله .... وانه لا تجار قريش ولا من نصرها، وان بينهم النصر على من دهم يثرب .... على كل اناس حصتهم من جانبهم الذى قبلهم (ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۴۷ تا ۱۵۰)

ترجمہ: "یہ کہ یہودی اپنا خرچ اٹھائیں گے اور مسلمان اپنا خرچ، اور یہ کہ معاہدے کے

> شرکاء حملہ آور کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی مدد کے پابند ہوں گے۔ اور یہ کہ وہ خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں گے اور ان کے درمیان نیکی و حق رسانی کا تعلق ہوگا نہ کہ گناہ اور زیادتی کا، اور یہ کہ کوئی اپنے حلیف کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گا۔ اور یہ کہ مظلوم کی حمایت کی جائے گی، اور یہ کہ جب تک جنگ رہے یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کے مصارف اٹھائیں گے اور یہ کہ اس معاہدے کے شرکاء پر یثرب میں کسی نوعیت کا فتنہ و فساد کرنا حرام ہے، اور یہ کہ اس معاہدے کے شرکاء کے درمیان اگر کوئی ایسا قضیہ یا اختلاف رونما ہو جس سے فساد کا خطرہ ہو تو اس کا فیصلہ اللہ کے قانون کے مطابق محمد رسول اللہ کریں گے۔۔
>
> ۔۔۔۔۔۔ اور یہ کہ قریش اور اس کے حامیوں کو پناہ نہیں دی جائے گی، اور یہ کہ یثرب پر جو بھی حملہ آور ہو اس کے مقابلے میں شرکاءِ معاہدہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے ۔۔۔۔۔۔ ہر فریق اپنی جانب کے علاقے کی مدافعت کا ذمہ دار ہوگا۔"

یہ ایک قطعی اور واضح معاہدہ تھا جس کی شرائط یہودیوں نے خود قبول کی تھیں لیکن بہت جلدی انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ روش کا اظہار شروع کر دیا اور ان کا عناد روز بروز سخت سے سخت ہوتا چلا گیا۔

یہود کی عہد شکنی کے تین وجوہ

اس کے بڑے بڑے وجوہ تین تھے:

ایک یہ کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک رئیسِ قوم دیکھنا چاہتے تھے جو ان کے ساتھ بس ایک سیاسی معاہدہ کر کے رہ جائے اور صرف اپنے گروہ کے دنیوی مفادات سے سروکار رکھے مگر انھوں نے دیکھا کہ آپ اللہ اور آخرت اور رسالت اور کتاب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ (جس میں خود ان کے اپنے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانا بھی شامل تھا) اور معصیت چھوڑ کر ان احکامِ الٰہی کی اطاعت اختیار کرنے اور ان اخلاقی حدود کی پابندی کرنے کی طرف بلا رہے ہیں جن کی طرف خود ان کے انبیاء بھی دنیا کو بلاتے رہے ہیں۔ یہ چیز ان کو سخت ناگوار تھی۔ ان کو خطرہ پیدا ہوگیا کہ یہ عالمگیر اصولی تحریک اگر چل پڑی تو اس کا سیلاب ان کی جامد مذہبیت اور ان کی نسلی قومیت کو بہالے جائے گا۔

دوسری یہ کہ اوس اور خزرج اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنتے دیکھ کر، اور یہ دیکھ کر کہ گرد و پیش

کے عرب قبائل میں سے بھی جو لوگ اسلام کی اس دعوت کو قبول کر رہے ہیں وہ سب مدینے کی اس اسلامی برادری میں شامل ہو کر ایک ملت بنتے جا رہے ہیں، انھیں یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ صدیوں سے اپنی سلامتی اور اپنے مفادات کی ترقی کے لیے انھوں نے عرب قبائل میں پھوٹ ڈالنے اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی وہ اب اس نئے نظام میں نہ چل سکے گی، بلکہ اب ان کو عربوں کی ایک متحدہ طاقت سے سابقہ پیش آئے گا جس کے آگے ان کی چالیں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔

تیسرے یہ کہ معاشرے اور تمدّن کی جو اصلاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے تھے اس میں کاروبار اور لین دین کے تمام ناجائز طریقوں کا سدِّباب شامل تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سود کو بھی آپ ناپاک کمائی اور حرام خوری قرار دے رہے تھے جس سے انھیں خطرہ تھا کہ اگر عرب پر آپ کی فرمانروائی قائم ہو گئی تو آپ اُسے قانوناً ممنوع کر دیں گے اس میں ان کو اپنی موت نظر آتی تھی۔

ان وجوہ سے انھوں نے حضورؐ کی مخالفت کو اپنا قومی نصب العین بنا لیا اور آپ کو زک دینے کے لیے کوئی چال، کوئی تدبیر اور کوئی ہتھکنڈا استعمال کرنے میں ان کو ذرہ برابر تامّل نہ تھا۔ وہ آپ کے خلاف طرح طرح کی جھوٹی باتیں پھیلاتے تھے تاکہ لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں۔ اسلام قبول کرنے والوں کے دلوں میں ہر قسم کے شکوک و شبہات اور وسوسے ڈالتے تھے تاکہ وہ اس دین سے برگشتہ ہو جائیں۔ خود جھوٹ موٹ کا اسلام قبول کر کے مرتد ہو جاتے تھے تاکہ لوگوں میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف زیادہ سے زیادہ غلط فہمیاں پھیلائی جا سکیں۔ فتنے برپا کرنے کے لیے منافقین سے ساز باز کرتے تھے۔ ہر اُس شخص اور گروہ اور قبیلے سے رابطہ پیدا کرتے تھے جو اسلام کا دشمن ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈالنے اور ان کو آپس میں لڑا دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے تھے۔ اَوس اور خَزرَج کے لوگ خاص طور پر ان کے ہدف تھے جن سے ان کے مدّت ہائے دراز سے تعلقات چلے آ رہے تھے۔ جنگِ بُعاث کے تذکرے چھیڑ چھاڑ کر وہ ان کو پرانی دشمنیاں یاد دلانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ ان کے درمیان پھر ایک دفعہ تلوار چل جائے اور اُخوّت کا وہ رشتہ تار تار ہو جائے جس میں اسلام نے ان کو باندھ دیا تھا۔ مسلمانوں کو مالی حیثیت سے بھی تنگ کرنے کے لیے وہ ہر قسم کی دھاندلیاں کرتے تھے۔ جن لوگوں سے ان کا پہلے سے لین دین تھا ان میں سے جونہی کوئی شخص اسلام قبول کرتا وہ اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاتے تھے۔ اگر اس سے کچھ لینا ہوتا تو تقاضے کر کر کے اس کا ناک میں دم کر دیتے

تھے۔ اور اگر اسے کچھ دینا ہوتا تو اس کی رقم مار کھاتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ جب ہم نے تم سے معاملہ کیا تھا اس وقت تمہارا دین کچھ اور تھا۔ اب چونکہ تم نے اپنا دین بدل دیا ہے اس لیے ہم پر تمہارا کوئی حق باقی نہیں ہے۔ اس کی متعدد مثالیں تفسیر طبری، تفسیر نیساپوری، تفسیر طبرسی اور تفسیر روح المعانی میں سورۂ آل عمران، آیت ۷۵، کی تشریح کرتے ہوئے نقل کی گئی ہیں۔

چند واقعاتی شواہد

معاہدے کے خلاف یہ کھلی کھلی معاندانہ روش تو جنگِ بدر سے پہلے ہی وہ اختیار کر چکے تھے، مگر جب بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو قریش پر فتح مبین حاصل ہوئی تو وہ تلملا اٹھے اور اُن کے بُغض کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ اس جنگ سے وہ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ قریش کی طاقت سے ٹکرا کر مسلمانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی لیے انھوں نے فتحِ اسلام کی خبر پہنچنے سے پہلے مدینے میں یہ افواہیں اڑانی شروع کر دی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں، مسلمانوں کو شکست فاش ہوئی ہے اور اب ابوجہل کی قیادت میں قریش کا لشکر مدینے کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ لیکن جب نتیجہ ان کی امیدوں اور تمناؤں کے خلاف نکلا تو وہ غم اور غصّے کے مارے پھٹ پڑے۔ بنی نضیر کا سردار کعب بن اشرف چیخ اٹھا کہ "خدا کی قسم اگر محمدؐ نے ان اشرافِ عرب کو قتل کر دیا ہے تو زمین کا پیٹ ہمارے لیے اس کی پیٹھ سے زیادہ بہتر ہے۔" پھر وہ مکہ پہنچا اور بدر میں جو سردارانِ قریش مارے گئے تھے ان کے نہایت اشتعال انگیز مرثیے کہہ کر مکہ والوں کو انتقام پر اکسایا۔ پھر مدینہ آکر اس نے اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے ایسی غزلیں کہنی شروع کیں جن میں مسلمان شرفا کی بہو بیٹیوں کے ساتھ اظہارِ عشق کیا گیا تھا۔ آخر کار اس کی شرارتوں سے تنگ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیع الاوّل ۳ھ میں محمد بن مسلمہ انصاری کو بھیج کر اسے قتل کرا دیا (ابن سعد، ابن ہشام، تاریخ طبری)

یہودیوں کا پہلا قبیلہ جس نے اجتماعی طور پر جنگِ بدر کے بعد کھلم کھلا معاہدہ توڑ دیا بنی قَینُقاع تھا۔ یہ لوگ خود شہر مدینہ کے اندر ایک محلہ میں آباد تھے، اور چونکہ یہ سنار، لوہار اور ظروف ساز تھے اس لیے ان کے بازار میں اہلِ مدینہ کو کثرت سے جانا آنا پڑتا تھا۔ ان کو اپنی شجاعت پر بڑا ناز تھا۔ آہن گر ہونے کی وجہ سے ان کا بچہ بچہ مسلح تھا۔ سات سو مردانِ جنگی اُن کے اندر موجود تھے اور ان کو اس بات کا بھی زعم تھا کہ قبیلہ خزرج سے ان کے پرانے حلیفانہ تعلقات تھے اور خزرج کا سردار عبداللہ

بن ابی اُن کا پُشتیبان تھا۔ بدر کے واقعہ سے یہ اس قدر مشتعل ہوئے کہ انھوں نے اپنے بازار میں آنے جانے والے مسلمانوں کو ستانا اور خاص طور پر ان کی عورتوں کو چھیڑنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز ان کے بازار میں ایک مسلمان عورت کو برسرِ بازار برہنہ کر دیا گیا۔ اس پر سخت جھگڑا ہوا اور ہنگامے میں ایک مسلمان اور ایک یہودی قتل ہو گیا۔ جب حالات اس حد کو پہنچ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے محلے میں تشریف لے گئے اور ان کو جمع کر کے آپ نے ان کو راہِ راست پر آنے کی تلقین فرمائی۔ مگر انھوں نے جواب دیا: "اے محمدؐ، تم نے شاید ہمیں بھی قریش سمجھا ہے؟ وہ لڑنا نہیں جانتے تھے اس لیے تم نے انھیں مار لیا۔ ہم سے سابقہ پیش آئے گا تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔" یہ گویا صاف صاف اعلانِ جنگ تھا۔ آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوال (اور بروایت بعض ذی القعدہ) ۲ھ کے آخر میں ان کے محلے کا محاصرہ کر لیا۔ صرف پندرہ روز ہی یہ محاصرہ رہا تھا کہ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور ان کے تمام قابلِ جنگ آدمی باندھ لیے گئے۔ اب عبداللہ بن اُبی ان کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے سخت اصرار کیا کہ آپ انھیں معاف کر دیں۔ چنانچہ حضورؐ نے اس کی درخواست قبول کر کے یہ فیصلہ فرما دیا کہ بنی قَینُقاع اپنا سب مال، اسلحہ اور آلاتِ صنعت چھوڑ کر مدینہ سے نکل جائیں۔ (ابن سعد، ابن ہشام، تاریخ طبری) (۱۷۵)

باب ۹

یہُودِ مدینہ کے مُفسدانہ رویّے کی چند واقعاتی تفاصیل

فصل ۱

یہود اپنے کیفرِ کردار تک کیسے پہنچے

کعب بن اشرف کا قتل

یہ شخص[1] یہودِ بنی نضیر میں سے تھا اور اپنی قوم کے ساتھ اس معاہدہ میں شریک تھا جو ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ان کے درمیان ہوا تھا۔ مگر اسے اسلام اور خاص کر داعیٔ اسلام سے سخت عداوت تھی، آپ کی شان میں ہجویہ اشعار کہتا، مسلمان عورتوں کے متعلق نہایت گندے عشقیہ اشعار کہتا[2] اور کفارِ قریش کو آنحضرتؐ کے خلاف اشتعال دلاتا تھا۔[3] جب جنگِ بدر میں آنحضرتؐ کو فتح ہوئی تو اس کو سخت رنج ہوا اور وہ شدّتِ غضب سے پکار اٹھا کہ:

واللہ لئن کان محمد اصاب ھؤلاء القوم لبطن الارض خیر لنا من ظھرھا۔

ترجمہ: "خدا کی قسم اگر محمدؐ نے قریش کو واقعی شکست دے دی ہے تو زمین کا پیٹ ہمارے لیے اس کی پیٹھ سے زیادہ بہتر ہے۔"

پھر وہ مدینے سے مکہ پہنچا اور وہاں نہایت دردانگیز طریقہ سے قریش کے مقتولوں کے مرثیے کہہ کہہ کر ان

---

[1] عہدِ رسالت کا ایک واقعہ جس پر سخت اعتراضات کیے جاتے ہیں، یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے ایک دشمن کعب بن اشرف کو خفیہ طریقہ سے قتل کرادیا۔ مخالفین کا اعتراض یہ ہے کہ یہ وہی جاہلیت کا "فتک" تھا، اور بزدلی کے علاوہ آدابِ جنگ کے بھی خلاف تھا لیکن اس واقعہ کے چند مخصوص اسباب تھے جن کو معترضین نے نظرانداز کردیا ہے۔

[2] ابن الاثیر ج ۲ ص ۵۲۔ فتح الباری ج، ص ۲۳۶ میں ہے کہ وتشبب بنساء المسلمین حتی اذاھم۔

[3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب کیف کان اخراج الیھود میں ہے ویحرض علیہ کفار قریش۔

کے عوام اور سرداروں کو انتقام کا جوش دلانے لگا۔ اس کی یہ سب حرکات اس معاہدہ کے خلاف تھیں جو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا اور جس میں وہ بھی اپنی قوم کے ساتھ شریک تھا۔ تاہم انھیں کسی نہ کسی طرح معاف کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ان سب سے گزر کر وہ اپنے جذبۂ عناد میں یہاں تک پہنچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جان تک لینے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے ایک سازش کی تیاری کی جس کا مقصد آپ کو دھوکے سے قتل کرنا تھا۔ علامہ ابن اثیر نے ابو مالک کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اس نے ایک جماعت کے ساتھ مل کر یہ انتظام کیا تھا کہ آنحضرتؐ کو اپنے گھر بلائے اور چپکے سے قتل کرا دے۔ چنانچہ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ:

إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ

(المائدہ۔ آیت ۱۱)

ترجمہ: "جب کہ ایک جماعت نے تم پر دست درازی کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے ان کے ہاتھ تم پر اٹھنے سے روک دیے۔"

ابن حجرؒ بھی اس روایت کو فتح الباری میں لائے ہیں، مگر جس طریق سے انھوں نے اسے لیا ہے وہ ضعیف ہے، تاہم یعقوبی نے جو ایک بڑا مؤرخ ہے بنو نضیر کا حال بیان کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ:

اراد ان یمکر برسول اللہ۔

ترجمہ: "اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ سے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔"

ان تمام بیانات سے اس واقعہ کی صداقت مسلّم ہو جاتی ہے کہ اس کے جرائم کی فہرست کو اس سازشِ قتل نے مکمل کر دیا ہے اور اس کے بعد اس کے کشتنی ہونے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایک شخص معاہدہ کو توڑتا ہے، مسلمانوں کے دشمنوں سے ساز باز کرتا ہے، مسلمانوں کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکاتا ہے، اور مسلمانوں کے امام کو قتل کرنے کی خفیہ سازشیں کرتا ہے۔ ایسے شخص کی سزا بجز قتل کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ تنہا اس کے فعل کی بنا پر اس کی قوم کے خلاف تو اعلانِ جنگ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کھلے میدان میں اس سے مقابلہ ہوتا اور اسے قتل کیا جاتا۔ خود اس کی قوم سے بھی یہ امید رکھنی فضول تھی کہ وہ اس کو ان حرکات سے روکے گی، کیونکہ ساری قوم کا رویہ اس کی طرح عداوت و بغض سے بھرا ہوا تھا۔ پھر وہ دوسرے اعدائے اسلام کے ساتھ بھی مل کر کبھی کھلے میدان میں لڑنے کے لیے نہیں آیا، بلکہ ہمیشہ پردہ کے پیچھے بیٹھ کر ہی سازشیں کرتا رہا۔ اس لیے اس کے شر کے استیصال کی صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ پردہ کے

پیچھے ہی اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے مجبوراً اسی آخری تدبیر کو اختیار کیا اور محمدؓ بن مسلمہ کو بھیج کر اسے قتل کرا دیا۔[لہ] (۱۷۶)

ابو رافع کے قتل کا واقعہ

ابو رافع کے متعلق صحیح بخاری میں صرف اتنا بیان کیا گیا ہے کہ کان ابو رافع یوذی رسول اللہ صلعم و یعین علیہ۔ "ابو رافع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچاتا تھا اور آپؐ کے خلاف دشمنوں کی اعانت کرتا تھا" (کتاب المغازی، باب قتل ابی رافع)۔ لیکن ابن عائد نے عروہ کے طریق سے یہ روایت نقل کی ہے کہ کان ممن اعان غطفان وغیرھم من مشرکی العرب بالمال الکثیر۔ "اس نے غطفان وغیرہ مشرکین عرب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ میں بہت روپیہ سے مدد دی تھی" (فتح الباری ج ۷، ص ۲۴۰)۔ طبری نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ کان حزب الاحزاب علی رسول اللہ، "اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگِ احزاب میں فوجیں اکٹھی کی تھیں" (ج ۳ ص ۷)۔ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ قد اجلب فی غطفان و من حولہ من مشرکی العرب و جعل لھم الحفل العظیم لحرب رسول اللہ، "اس نے غطفان اور دوسرے مشرکین عرب کی ایک بہت بڑی جمعیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لیے اکٹھی کی تھیں" (ج ۲ ص ۶۶)۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ کان یظاھر کعب ابن اشرف علی رسول اللہ۔ "وہ کعب بن اشرف کو رسولؐ اللہ کے خلاف مدد دیتا تھا" (ج ۲ ص ۱۱۲ طبع یورپ) ان تمام بیانات کے ساتھ

[لہ] اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ خفیہ طریقہ سے دشمن کے سرداروں کو قتل کرا دینا اسلام کے قانونِ جنگ کی کوئی مستقل دفعہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً آنحضرتؐ سب سے پہلے ابو جہل اور ابو سفیان جیسے دشمنوں کو قتل کراتے اور صحابہؓ میں ایسے فدائیوں کی کمی نہ تھی جو اس قسم کے تمام دشمنوں کو ایک ایک کر کے قتل کر سکتے تھے۔ لیکن عہدِ رسالت و عہدِ صحابہؓ کی پوری تاریخ میں ہم کو کعب بن اشرف اور ابو رافع کے سوا کسی اور شخص کا نام نہیں ملتا جسے اس طرح خفیہ طریقہ سے قتل کیا گیا ہو، حالانکہ آپؐ کے دشمن صرف یہی دو شخص نہ تھے۔ پس یہ واقعہ خود اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ خفیہ طریقے سے دشمن کو قتل کرنا اسلام کی کوئی مستقل جنگی پالیسی نہیں ہے، بلکہ ایسے مخصوص حالات میں اس کی اجازت ہے جبکہ دشمن خود سامنے نہ آتا ہو اور پردے کے پیچھے بیٹھ کر خفیہ سازشیں کیا کرتا ہو۔ (۱۷۷)

یہ بھی ثابت ہے کہ وہ بھی کعب کی طرح خود کبھی کھلے میدان میں لڑنے نہیں آیا اور پردے کے پیچھے سے دشمنوں کو مال اور فوجوں سے مدد دے کر رسولؐ اللہ کے خلاف استعمال کرتا رہا۔ (۱۷۸)

جنگِ اُحد کے موقع پر غداری

حضورؐ کے دو سخت اقدامات (یعنی بنی قینُقاع کے اخراج اور کعب بن اشرف کے قتل سے) کچھ مدت تک یہودی اتنے خوف زدہ رہے کہ انھیں کوئی مزید شرارت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن اس کے بعد شوال ۳ھ میں جب قریش کے لوگ جنگِ بدر کا بدلہ لینے کے لیے بڑی تیاریوں کے ساتھ مدینہ پر چڑھ آئے اور ان یہودیوں نے دیکھا کہ قریش کی تین ہزار فوج کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ایک ہزار آدمی لڑنے کے لیے نکلے ہیں، اور ان میں سے بھی تین سو منافقین الگ ہو کر پلٹ آئے ہیں، تو انھوں نے معاہدے کی پہلی اور صریح خلاف ورزی اس طرح کی کہ مدینہ کی مدافعت میں آپ کے ساتھ شریک نہ ہوئے، حالانکہ وہ اس کے پابند تھے۔ پھر جب معرکۂ اُحد میں مسلمانوں کو نقصانِ عظیم پہنچا تو ان کی جرأتیں اور بڑھ گئیں، یہاں تک کہ بنی نضیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک سازش کی جو عین وقت پر ناکام ہو گئی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ بئرِ مَعُونہ کے سانحہ (صفر ۴ھ) کے بعد عَمْرو بن اُمَیّہ ضَمری نے انتقامی کارروائی کے طور پر غلطی سے بنی عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا جو دراصل ایک معاہد قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس غلطی کا خونبہا مسلمانوں پر واجب آگیا تھا، اور چونکہ بنی عامر کے ساتھ معاہدے میں بنی نضیر بھی شریک تھے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہ کے ساتھ خود ان کی بستی میں تشریف لے گئے تاکہ خونبہا کی ادائیگی میں ان کو بھی شرکت کی دعوت دیں۔

حضورؐ کے قتل کی سازش

وہاں انھوں نے آپ کو چکنی چپڑی باتوں میں لگایا اور اندر ہی اندر یہ سازش کی کہ ایک شخص اس مکان کی چھت پر سے آپ کے اوپر ایک بھاری پتھر گرا دے جس کی دیوار کے سائے میں آپ تشریف فرما تھے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اپنی اس تدبیر پر عمل کرتے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بروقت خبردار کر دیا اور آپ فوراً وہاں سے اُٹھ کر مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

بنو نُضیر کو حضورؐ کی طرف سے الٹی میٹم

اب ان کے ساتھ کسی رعایت کا سوال باقی نہ رہا۔ حضورؐ نے ان کو بلا تاخیر الٹی میٹم بھیج دیا کہ

تم نے جو غداری کرنی چاہی تھی وہ میرے علم میں آگئی ہے۔ لہٰذا دس دن کے اندر اندر مدینہ سے نکل جاؤ۔ اس کے بعد اگر تم یہاں ٹھہرے رہے تو جو شخص بھی تمہاری بستی میں پایا جائے گا اس کی گردن مار دی جائے گی۔ دوسری طرف عبداللہ بن اُبَیّ نے ان کو پیغام بھیجا کہ میں دو ہزار آدمیوں سے تمہاری مدد کروں گا۔ اور بنی قریظہ اور بنی غَطفان بھی تمہاری مدد کو آئیں گے۔ تم ڈٹ جاؤ اور ہرگز اپنی جگہ نہ چھوڑو۔

حضورؐ کے الٹی میٹم کے جواب میں مقابلہ کا اعلان

اس جھوٹے بھروسے پر انھوں نے حضورؐ کے الٹی میٹم کا یہ جواب دیا کہ ہم یہاں سے نہیں نکلیں گے آپ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجیے۔ اس پر ربیع الاول ۴ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کر لیا اور صرف چند روز کے محاصرے کے بعد (جس کی مدت بعض روایات میں چھ دن اور بعض میں پندرہ دن آئی ہے) وہ اس شرط پر مدینہ چھوڑ دینے پر راضی ہو گئے کہ اسلحہ کے سوا جو کچھ بھی وہ اونٹوں پر لاد کر لے جا سکیں گے لے جائیں گے۔ اس طرح یہودیوں کے اس دوسرے شریر قبیلے سے مدینہ کی سرزمین خالی کرالی گئی۔ ان میں سے صرف دو آدمی مسلمان ہو کر یہاں ٹھہر گئے۔ باقی شام اور مصر کی طرف نکل گئے۔ (١٤٩)

مخالفینِ اسلام کا اعتراض اور اس کا جواب

بنی نضیر یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا جو صدیوں سے یثرب میں آباد تھا۔ ہجرت کے بعد آنحضرتؐ کا ان سے معاہدہ ہوا، اور جنگِ اُحد کے بعد آپ نے ان کو مدینہ سے نکال دیا۔ مخالفین اس واقعہ کو یہ معنی پہناتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے بنی نضیر کے ساتھ نعوذ باللہ مکر کیا، یعنی جب کمزور تھے تو ان سے معاہدہ کر لیا اور جب طاقتور ہو گئے تو عہد توڑ کر انھیں جلا وطن کر دیا۔ لیکن یہ واقعہ کی محض ایک سادہ صورت فرض کر لینے کا نتیجہ ہے، ورنہ اگر اس کی تمام تفصیلات پر نظر کی جائے تو صورتِ واقعہ بالکل برعکس نظر آئے گی۔ عہد شکنی کے مجرم رسول اللہؐ نہیں بلکہ خود بنی نُضیر نکلیں گے، اور ان کے خلاف آنحضرتؐ کی جنگی کارروائی ظلم نہیں بلکہ عین حق ثابت ہو گی۔

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے تو آپ نے یہودیوں کے دوسرے قبائل کی طرح بنو نضیر سے بھی ایک معاہدہ[1] کیا تھا جس کی بنیادی شرط یہ تھی کہ فریقین ایک

---

[1] ابن ہشام نے سیرت میں اس معاہدہ کو بتفصیل نقل کیا ہے۔ (از مؤلف)

دوسرے کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کاروائی نہ کریں گے نہ ایک دوسرے کے دشمنوں کی امداد کریں گے۔ حافظ ابنِ حجر نے لکھا ہے کہ:

> وادعهم على ان لا يحاربوه ولا يمالئوا عليه عدوه۔[1]

ترجمہ: "ان سے مصالحت کی تھی اس بات پر کہ نہ وہ آپ سے جنگ کریں گے اور نہ آپ کے خلاف آپ کے دشمنوں کی اعانت کریں گے۔"

اس معاہدہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمان ان کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے اور ان سے دوستانہ میل جول شروع کر دیا تھا لیکن شرائط معاہدہ کے بالکل خلاف وہ کفارِ قریش سے ساز باز کرتے رہے اور چپکے چپکے ان کو مسلمانوں کے متعلق خفیہ اطلاعات فراہم کرنے لگے۔ موسیٰ بن عُقبَہ نے مغازی میں لکھا ہے:

> كانت نضير قد دسّوا الى قريش وحضّوهم على قتال رسول الله صلى الله عليه وسلم ودلّوهم على العورة۔[2]

ترجمہ: "بنی نضیر قریش سے سازشیں کرتے تھے، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ پر ابھارتے اور انھیں خفیہ خبریں دیتے تھے۔"

پھر انھوں نے اسی پر بس نہ کی بلکہ آنحضرتؐ کو قتل کرنے کی بھی متعدد مرتبہ کوشش کی۔ ایک مرتبہ آپؐ کو کہلا کر بھیجا کہ آپؐ اپنے ساتھ تین آدمی لے کر آئیے اور ہم بھی اپنے تین عالم بھیجتے ہیں، ایک درمیانی مقام پر ان سے آپؐ کی بحث ہو، اور اگر آپؐ ان پر اپنے دین کی حقانیت ثابت کر دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ آنحضرت صلعم نے اس دعوت کو منظور کر لیا۔ مگر ابھی جائے معیّنہ کی جانب روانہ نہ ہوئے تھے کہ خود بنی نضیر کی ایک عورت نے اپنے بھائی کو جو مسلمان تھا، یہ اطلاع دی کہ یہودی خنجر لے کر آ رہے ہیں اور تمھارے نبی کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ سُن کر آپؐ نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔[3]

ایک دوسرے موقع پر آنحضرت بنی عامر کے دو آدمیوں کی دیت کا معاملہ طے کرنے کے لیے بنو نضیر کے

---

[1] فتح الباری ج ۷، ص ۳۳۱ [2] فتح الباری ج ۷، ص ۳۳۲

[3] اس واقعہ کو تھوڑے اختلاف کے ساتھ ابوداؤد فی خبرالنضیر اور فتح الباری ج ۷ ص ۳۳۲ میں بیان کیا گیا ہے۔ (از مؤلف)

ہاں تشریف لے گئے۔ ان لوگوں نے بظاہر دوستانہ برتاؤ کیا اور آپؐ سے کہا کہ ہم مدد دینے کو حاضر ہیں۔ مگر آپس میں جاکر مشورہ کیا کہ "یہ شخص تم کو ایسی حالت میں پھر نہ ملے گا، بہتر یہ ہے کہ ہم میں کا ایک آدمی مکان کی چھت پر چڑھے اور اس پر ایک بھاری پتھر پھینک دے۔" چنانچہ یہ بات طے ہوگئی، اور اس کام کے لیے عمرو بن جحّاش بن کعب مقرر کیا گیا۔ مگر عین وقت پر آپ کو اطلاع ہوگئی اور آپ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔[1]

اب پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ مسلسل بدعہدیوں اور سازشوں کے باعث اندیشہ تھا کہ کہیں یہ آستین کے سانپ کسی بیرونی حملہ کے وقت مدینہ کی سلامتی کو خطرہ میں نہ ڈال دیں۔ یہی نہیں بلکہ یہاں تک اندیشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ خفیہ طریقہ سے آنحضرتؐ کو شہید نہ کر دیں۔ مسلمان ان سے ایسے خوفزدہ ہو گئے تھے کہ ایک مرتبہ جب ایک صحابی کا انتقال ہونے لگا تو انھوں نے اپنے عزیزوں کو وصیت کی کہ میرے مرنے کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے وقت نہ دینا، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ جنازہ کی شرکت کے لیے نکلیں اور کوئی یہودی آپ کو قتل کر دے۔[2] ایسی حالت میں ان عہد شکن دشمنوں سے مزید چشم پوشی نہیں کی جا سکتی تھی۔ مگر آنحضرتؐ نے پھر بھی ان کے ساتھ رعایت کی اور دفعۃً ان پر حملہ کر دینے کے بجائے محمد بن مَسلَمہ کے ذریعہ سے ان کو یہ الٹی میٹم دیا کہ:

"تم نے میرے ساتھ غدر کیا ہے، لہٰذا تم یا تو خود دس دن کے اندر مدینہ خالی کر دو، ورنہ میں مجبوراً تم سے جنگ کروں گا۔"

دوسری طرف عبداللہ بن اُبی سردارِ منافقین نے انھیں کہلا بھیجا کہ تم ہرگز نہ نکلنا ہم تمھاری مدد کریں گے چنانچہ انھوں نے آنحضرتؐ کے الٹی میٹم کا جواب یہ دیا کہ:

انا لا نُبرِح دارنا فاصنع ما بدا لك[3]

ترجمہ: "ہم اپنا وطن نہ چھوڑیں گے۔ تمھارا جو جی چاہے کرو۔"

اس کاروائی پر کیسے اعتراض کیا جا سکتا ہے

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خلاف جنگ کرنے میں حق بجانب

---

[1] طبری مطبوعہ مصر ج ۳ ص ۳۷، فتح الباری ج ۷، ص ۲۲۲، فتوح البلدان ص ۲۴۔

[2] اُسد الغابہ ج ۳ ص ۵۷، ذکر طلحہ بن براء،

[3] طبری ج ۳ ص ۳۸، فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۳، فتوح البلدان ص ۲۴۔

نہ تھے، آپ نے اتمامِ حجّت کا پورا پورا حق ادا کر دیا تھا اور معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کے مقابلہ میں جو زیادہ سے زیادہ نرمی کی جا سکتی تھی وہ بھی کر چکے تھے۔ اب مجبوراً جنگ کے لیے نکلے اور ان کا محاصرہ کر لیا قبل اس کے کہ خونریزی کی نوبت آتی صرف محاصرہ ہی کی شدت نے بنی نضیر کو بدحواس کر دیا۔ انھوں نے خود ہی تجویز پیش کی کہ آپ ہمارے خون معاف کر دیں، ہم مدینہ سے نکل کر اذرعات (شام) نکل جائیں گے، اور جو کچھ مال ہمارے اونٹ اٹھا سکیں گے وہ تو لے جائیں گے باقی سب کچھ یہیں چھوڑ جائیں گے۔ اس شرط کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور کر لیا اور بغیر کسی ادنیٰ ضرر کے بنو نضیر اسلامی علاقہ سے گزر کر شام کی طرف چلے گئے۔ اس مصالحت کے متعلق بلاذُری لکھتا ہے،

ثم صالحوه علىٰ ان يخرجوا من بلده ولهم ما حملت الابل الا الحلقة والآلة۔[2]

ترجمہ: "پھر انھوں نے اس شرط پر آپ سے صلح کر لی کہ وہ آپ کے شہر سے نکل جائیں گے اور سوائے اسلحہ اور زرہوں کے باقی جو مال ان کے اونٹ اٹھا سکیں گے وہ ان کا ہے۔"

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے،

فسئلوا ان يجلو عن ارضهم علىٰ ان لهم ما حملت الابل فصولحوا علىٰ ذلك۔[3]

ترجمہ: "پھر انھوں نے درخواست کی کہ ہمیں اپنے علاقہ سے نکل جانے دیا جائے اور جو کچھ ہمارے اونٹ اٹھا سکیں وہ ہمارا ہو۔ چنانچہ اسی پر ان کی صلح ہو گئی۔"

اب یہ ظاہر ہے کہ اعلانِ جنگ ہونے کے بعد، ایسی حالت میں جبکہ ان کو آسانی کے ساتھ مغلوب کر کے پورا پورا انتقام لیا جا سکتا تھا، ان کی شرائط مان لینا اور ان کو امن و سلامتی کے ساتھ صرف اپنی جانیں ہی نہیں بلکہ اپنا مال بھی لے کر نکل جانے دینا۔ بجز رحم دلی اور صلح پسندی کے اور کسی چیز کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف وہی شخص ایسا کر سکتا تھا جس کا مقصد خونریزی و غارت گری نہ ہو بلکہ محض دفعِ شر ہو۔ مگر اس احسان کا

طبری ج ۳ ص ۳۸

[2] فتوح البلدان ص ۲۴

[3] فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۲

جو بدلہ آنحضرتؐ کو ملا وہ بہت ہی تلخ تھا۔ جن دشمنوں کو آپ نے قابو میں آ جانے کے بعد محض رحم کھا کر چھوڑ دیا تھا، انھوں نے مدینہ سے نکل کر تمام عرب میں آپ کے خلاف سازش کا جال پھیلا دیا، اور دو ہی سال بعد وہ ۲۴ ہزار کا لشکرِ جرار اکٹھا کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوئے[1]۔ اگر آپ اسی وقت ان سانپوں کا سر کچل دیتے تو یہ طوفان ہرگز نہ اٹھتا۔ لیکن رحمۃ للعالمینؐ کی شان اس سے بالاتر تھی کہ کسی مغلوب دشمن کی التجائے رحم کو رد کر دیتے۔ آپؐ کو ان کے جذبۂ عناد کا حال خوب معلوم تھا، اور آپؐ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ فتنہ پرداز چین سے نہ بیٹھیں گے، مگر اس کے باوجود جب انھوں نے جان بخشی کی درخواست کی تو آپؐ نے اسے قبول کر لیا۔ (۱۸۰)

---

[1] اس سے مراد جنگ احزاب (یا جنگ خندق) ہے جس میں یہودیوں کے ساتھ مشرکین مکہ اور دوسرے مشرک قبائل بھی شریک تھے۔ (مؤلف)

فصل ٢

غزوۂ خندق کے وقت بنو قُریظہ کی بدعہدی

غزوۂ بنی قریظہ ذی القعدہ ۵ھ میں پیش آیا۔ خندق کے معرکہ میں جب کفار کو منہ کی کھانی پڑی، کیونکہ کفارِ عرب اس طریقِ دفاع، یعنی خندق کھود کر مدافعت کرنے سے ناآشنا تھے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا، تو ناچار انھیں جاڑے کے زمانے میں ایک طویل محاصرے کے لیے تیار ہونا پڑا جس کے لیے وہ گھروں سے تیار ہو کر نہ آئے تھے۔

اس کے بعد کفار کے لیے صرف ایک ہی تدبیر باقی رہ گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ بنی قریظہ کے یہودی قبیلے کو غداری پر آمادہ کریں جو مدینہ طیبہ کے جنوب مشرقی گوشے میں رہتا تھا۔ چونکہ اس قبیلے سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ تھا جس کی رو سے مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدافعت کرنے کا پابند تھا، اس لیے مسلمانوں نے اس طرف سے بے فکر ہو کر اپنے بال بچے ان گڑھیوں میں بھجوا دیے تھے جو بنی قریظہ کی جانب تھیں اور اُدھر مدافعت کا کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ کفار نے اسلامی دفاع کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا۔ ان کی طرف سے بنی نضیر کا یہودی سردار حُیَیّ بن اَخطب بنی قریظہ کے پاس بھیجا گیا تاکہ انھیں معاہدہ توڑ کر جنگ میں شامل ہونے پر آمادہ کرے۔ ابتداءً انھوں نے اس سے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاہدہ ہے اور آج تک کبھی ہمیں ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لیکن جب ابنِ اَخطب نے ان سے کہا کہ دیکھو، میں اس وقت عرب کی متحدہ طاقت اس شخص پر چڑھا لایا ہوں، یہ اسے ختم کر دینے کا نادر موقع ہے، اس کو اگر تم نے کھو دیا تو پھر دوسرا کوئی موقع نہ مل سکے گا، تو یہودی ذہن کی اسلام دشمنی اخلاق کے پاس و لحاظ پر غالب آ گئی اور بنی قُریظہ عہد توڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

حضور کو بروقت اطلاع مل گئی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے سے بھی بے خبر نہ تھے۔ آپ کو بروقت اس کی اطلاع مل گئی اور

آپ نے فوراً انصار کے سرداروں (سعدؓ بن عُبَادَہ، سَعدؓ بن مُعاذ، عبداللہؓ بن رواحہ اور خَوّاتؓ بن جُبَیر) کو ان کے پاس تحقیقِ حال اور فہمائش کے لیے بھیجا۔ چلتے وقت آپ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ اگر بنی قُریظہ عہد پر قائم رہیں تو آ کر سارے لشکر کے سامنے علی الاعلان یہ خبر سنا دینا۔ لیکن اگر وہ نقضِ عہد پر مُصر ہوں تو صرف مجھ کو اشارۃً اس کی اطلاع دے دینا تاکہ عام مسلمان یہ بات سن کر پست ہمت نہ ہو جائیں۔ یہ حضرات وہاں پہنچے تو بنی قریظہ کو پوری خباثت پر آمادہ پایا اور انھوں نے برملا ان سے کہہ دیا کہ لاعقد بیننا وبین محمد ولا عھد "۔ ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں ہے"۔ اس جواب کو سن کر وہ لشکرِ اسلام میں واپس آئے اور اشارۃً حضورؐ سے عرض کر دیا۔ عَضَل وَ قَارَہ۔ یعنی قبیلۂ عَضَل اور قارہ نے رَجیع کے مقام پر مبلغینِ اسلام کے وفد سے جو غداری کی تھی، وہی کچھ اب بنی قریظہ کر رہے ہیں۔

یہ خبر بہت جلدی مدینہ کے مسلمانوں میں پھیل گئی اور ان کے اندر اس سے سخت اضطراب پیدا ہو گیا، کیونکہ اب وہ دونوں طرف سے گھیرے میں آ گئے تھے اور شہر کا وہ حصّہ خطرے میں پڑ گیا تھا جدھر دفاع کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اور سب کے بال بچے بھی اسی جانب تھے۔ اس پر منافقین کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں اور انھوں نے اہلِ ایمان کے حوصلے پست کرنے کے لیے طرح طرح کے نفسیاتی حملے شروع کر دیے۔ کسی نے کہا کہ "ہم سے وعدے تو قیصر و کسریٰ کے ملک فتح ہو جانے کے کیے جاتے ہیں اور حال یہ ہے کہ ہم رفعِ حاجت کے لیے بھی نہیں نکل سکتے"۔ کسی نے یہ کہہ کر خندق کے محاذ سے رخصت مانگی کہ "اب تو ہمارے گھر ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں، ہمیں جا کر ان کی حفاظت کرنی ہے"۔ کسی نے یہاں تک خفیہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ حملہ آوروں سے اپنا معاملہ درست کر لو اور محمدؐ کو ان کے حوالے کر دو۔ یہ ایسی شدید آزمائش کا وقت تھا جس میں ہر اس شخص کا پردہ فاش ہو گیا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی نفاق موجود تھا۔ صرف صادق و مخلص اہلِ ایمان ہی تھے جو اس کڑے وقت میں بھی فداکاری کے عزم پر ثابت قدم رہے۔

بنی غَطَفان سے صلح کی تجویز اور اس کا ترک

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نازک موقع پر بنی غَطَفان سے صلح کی بات چیت شروع کی اور ان کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ مدینہ کے پھلوں کی پیداوار کا ۱/۳ حصّہ لے کر واپس چلے جائیں۔ لیکن جب انصار کے سرداروں (سعدؓ بن عُبَادَہ اور سعدؓ بن مُعاذ) سے آپ نے ان شرائطِ صلح کے متعلق مشورہ طلب

فرمایا تو انھوں نے عرض کی۔ "یا رسول اللہ، یہ آپ کی خواہش ہے کہ ہم ایسا کریں؟ یا یہ اللہ کا حکم ہے کہ ہمارے لیے اسے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے؟ یا آپ صرف ہمیں بچانے کے لیے یہ تجویز فرما رہے ہیں؟" آپ نے جواب دیا "میں صرف تم لوگوں کو بچانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں، کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سارا عرب متحد ہو کر تم پر پل پڑا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انھیں ایک دوسرے سے توڑ دوں" اس پر دونوں سرداروں نے بالاتفاق کہا کہ "اگر آپ ہماری خاطر یہ معاہدہ کر رہے ہیں تو اسے ختم کر دیجیے۔ یہ قبیلے اس وقت بھی ہم سے ایک حبّہ خراج کے طور پر کبھی نہ لے سکے تھے جب ہم مشرک تھے۔ اور اب اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا شرف ہمیں حاصل ہے۔ کیا اب یہ ہم سے خراج لیں گے؟ ہمارے اور ان کے درمیان صرف تلوار ہے، یہاں تک کہ اللہ ہمارا اور ان کا فیصلہ کر دے" یہ کہہ کر انھوں نے معاہدے کے اس مسودے کو چاک کر دیا جس پر ابھی فریقین کے دستخط نہ ہوئے تھے۔

نُعَیم بن مسعود کا پارٹ

اسی دوران میں قبیلۂ غَطفان کی شاخ اَشجَع کے ایک صاحب نُعیم بن مسعود مسلمان ہو کر حضورؐ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابھی تک کسی کو بھی میرے قبولِ اسلام کا علم نہیں ہے، آپ اس وقت مجھ سے جو خدمت لینا چاہیں میں اسے انجام دے سکتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "تم جا کر دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوئی تدبیر کرو"[1] چنانچہ وہ پہلے بنی قریظہ کے پاس گئے جن سے ان کا بہت میل جول تھا اور ان سے کہا کہ قریش اور بنی غَطفان محاصرے سے تنگ آ کر واپس بھی جا سکتے ہیں، ان کا کچھ نہ بگڑے گا۔ مگر تمھیں اسی جگہ رہنا ہے۔ وہ لوگ اگر چلے گئے تو تمھارا کیا بنے گا؟ میری رائے یہ ہے کہ تم اس وقت تک جنگ میں حصہ نہ لو جب تک ان باہر سے آئے ہوئے قبائل کے چند نمایاں آدمی تمھارے پاس یرغمال کے طور پر نہ بھیج دیے جائیں۔ یہ بات بنی قریظہ کے دل میں اُتر گئی۔ انھوں نے متحدہ محاذ کے قبائل سے یرغمال طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غطفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ بنی قریظہ کچھ ڈھیلے پڑتے نظر آ رہے ہیں، بعید نہیں کہ وہ تم سے یرغمال کے طور پر آدمی مانگیں اور انھیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالے کر کے اپنا معاملہ صاف کر لیں۔ اس لیے ان کے ساتھ ذرا

---

[1] اسی موقع پر آپ نے فرمایا تھا اَلْحَرْبُ خُدْعَۃٌ یعنی جنگ میں دھوکا دینا جائز ہے۔

ہوشیاری سے معاملہ کرنا۔ اس سے متحدہ محاذ کے لیڈر بنی قریظہ کی طرف سے کھٹک گئے اور انھوں نے قُریشی سرداروں کو پیغام بھیجا کہ "اس طویل محاصرے سے اب ہم تنگ آ گئے ہیں، اب ایک فیصلہ کن لڑائی ہو جانی چاہیے۔ کل تم اُدھر سے حملہ کرو ہم اِدھر سے یکبارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔" بنی قریظہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ لوگ جب تک اپنے چند نمایاں آدمی یرغمال کے طور پر ہمارے حوالے نہ کر دیں، ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس جواب سے متحدہ محاذ کے لیڈروں کو یقین ہو گیا کہ نعیم کی بات سچی تھی۔ انھوں نے یرغمال دینے سے صاف انکار کر دیا اور اس سے بنی قریظہ نے سمجھ لیا کہ نعیم نے ہم کو ٹھیک مشورہ دیا تھا۔ اس طرح یہ جنگی چال بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس نے دشمنوں کے کیمپ میں پھوٹ ڈال دی۔ (۱۸۱)

فصل ۳

بنو قُریظہ پر چڑھائی اور محاصرہ

خندق سے پلٹ کر جب حضور گھر پہنچے تو ظہر کے وقت جبرائیلؑ نے آکر حکم سنایا کہ ابھی ہتھیار نہ کھولے جائیں، بنی قُریظہ کا معاملہ باقی ہے۔ اُن سے بھی اسی وقت نمٹ لینا چاہیے۔ یہ حکم پاتے ہی حضورؐ نے فوراً اعلان فرمایا کہ "جو کوئی سمع وطاعت پر قائم ہو وہ عصر کی نماز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک دیارِ بنی قریظہ پر نہ پہنچ جائے"۔ اس اعلان کے ساتھ ہی آپؐ نے حضرت علیؓ کو ایک دستے کے ساتھ مقدمۃ الجیش کے طور پر بنی قریظہ کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ جب وہاں پہنچے تو یہودیوں نے کوٹھوں پر چڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ لیکن یہ بدزبانی ان کو اس جرمِ عظیم کے خمیازے سے کیسے بچا سکتی تھی کہ انھوں نے عین لڑائی کے وقت معاہدہ توڑ ڈالا اور حملہ آوروں سے مل کر مدینے کی پوری آبادی کو ہلاکت کے خطرے میں مبتلا کر دیا۔

حضرت علیؓ کے دستے کو دیکھ کر وہ سمجھے تھے کہ یہ محض دھمکانے آئے ہیں۔ لیکن جب حضورؐ کی قیادت میں پورا اسلامی لشکر وہاں پہنچ گیا اور ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا گیا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

بنو قریظہ کی طرف سے صلح کی درخواست

محاصرہ کی شدّت کو وہ دو تین ہفتوں سے زیادہ برداشت نہ کر سکے اور آخر کار انھوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا کہ قبیلۂ اَوس کے سردار حضرت سعد بن مُعاذ رضی اللہ عنہ ان کے حق میں جو فیصلہ بھی دیں گے اسے فریقین مان لیں گے۔ اُنھوں نے حضرت سعدؓ کو اس اُمید پر حَکَم بنایا تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں اوس اور بنی قریظہ کے درمیان جو حلیفانہ تعلقات مُدّتوں سے چلے آ رہے تھے وہ ان کا لحاظ کریں گے اور انھیں بھی اسی طرح مدینہ سے نکل جانے دیں گے جس طرح

پہلے بنی قَینُقاع اور بنی نَضیر کو نکل جانے دیا گیا تھا۔ خود قبیلۂ اَوس کے لوگ بھی حضرت سعدؓ سے تقاضا کر رہے تھے کہ اپنے حلیفوں کے ساتھ نرمی برتیں۔ لیکن حضرت سعدؓ ابھی ابھی دیکھ چکے تھے کہ پہلے جن یہودی قبیلوں کو مدینہ سے نکل جانے کا موقع دیا گیا تھا وہ کس طرح سارے گرد و پیش کے قبائل کو بھڑکا کر مدینے پر دس بارہ ہزار کا لشکر[لہ] چڑھا لائے تھے۔ اور یہ معاملہ بھی ان کے سامنے تھا کہ اس آخری یہودی قبیلے نے عین بیرونی حملے کے موقع پر بدعہدی کر کے اہلِ مدینہ کو تباہ کر دینے کا کیا سامان کیا تھا۔

بنو قُرَیظہ کے مقرر کردہ ثالث کا فیصلہ

اس لیے انھوں نے فیصلہ دیا کہ بنی قریظہ کے تمام مرد قتل کر دیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے، اور ان کی تمام اَملاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس فیصلے پر عمل کیا گیا اور جب بنی قریظہ کی گڑھیوں میں مسلمان داخل ہوئے تو انھیں پتہ چلا کہ جنگ احزاب میں حصّہ لینے کے لیے ان غدّاروں نے ۱۵سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے اور پندرہ سو ڈھالیں فراہم کی تھیں۔ اگر اللہ کی تائید مسلمانوں کے شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ سارا جنگی سامان عین اس وقت مدینہ پر عقب سے حملہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا جبکہ مشرکین یکبارگی خندق پار کر کے ٹوٹ پڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس انکشاف کے بعد تو اس امر میں شک کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی کہ حضرت سعدؓ نے ان لوگوں کے معاملہ میں جو فیصلہ دیا وہ بالکل حق تھا۔ (۱۸۲)

[لہ] مختلف روایتوں میں غزوۂ احزاب کے موقع پر حملہ آور ہونے والے لشکر کی تعداد مختلف بیان ہوئی ہے۔

(مؤلف)

فصل ۴

مخالفین کے اعتراضات اور ان کا جواب

مخالفینِ اسلام نے بنو قُریظہ کے اس واقعہ کو سخت اعتراضات کا ہدف بنایا ہے۔ یہ لوگ بھی ان یہودی قبائل میں سے تھے جن سے ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ ہوا تھا۔ پھر جب بنو نَضیر سے جنگ ہوئی تو آپؐ نے دوبارہ ان کو معاہدہ کی دعوت دی اور قدیم معاہدہ کی تجدید کر لی[1]۔ مگر جب جنگِ احزاب میں انھوں نے کھلم کھلا دشمنوں کا ساتھ دیا تو آپؐ نے اُدھر سے فارغ ہو کر ان پر حملہ کیا، ان کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا، بچوں اور عورتوں کو غلام بنا لیا، اور ان کا مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ اس واقعہ کی بنا پر مخالفین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بدعہدی اور شقاوت و سنگدلی کے شدید الزامات لگائے ہیں۔ مگر جب تفصیلات پر نظر ڈالی ہے تو اس کی حقیقت بھی مخالفین کے زعم و بیان سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بنی قریظہ سے دو مرتبہ معاہدہ ہوا تھا۔ ایک عام معاہدہ جو دوسرے یہودی قبائل کی معیت میں ہوا، دوسرا خاص معاہدہ جو بنی نضیر سے لڑائی کے موقعہ پر ان سے کیا گیا۔ ان دو معاہدات کے بعد بنو قریظہ کا فرض تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کارروائی میں حصہ نہ لیتے۔ لیکن جنگِ احزاب میں جب بنو نَضیر کی تحریض پر عرب کے بڑے بڑے قبائل اسلام کو مٹانے کے لیے متفق ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے، تو بنو قریظہ نے حُیَیّ بن اَخْطب نَضَری کے بھڑکانے سے عَلانیہ معاہدہ توڑ دیا اور جنگ میں شامل ہو گئے[2]۔ آنحضرتؐ کو ان کے نقضِ عہد کی خبر ہوئی تو آپؐ نے سعدؓ بن مُعاذ اور سعدؓ بن عُبادَہ کو ان کے پاس بھیجا اور وفائے عہد کی نصیحت کی، مگر انھوں نے صاف کہہ دیا

---

[1] ابوداؤد کتاب الخراج والفیٔ والامارہ، باب فی خبر النضیر [2] ابن اثیر طبع مصر ج ۲ ص ۶۷، فتح الباری ج ۷، ص ۲۸۰

کہ ہمارا تمہارا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔

ان کے اس طرح عین وقت پر عہد توڑ دینے اور جنگ میں شریک ہو جانے سے مدینہ دو طرف سے محصور ہو گیا۔ ایک طرف قریش اور غطفان وغیرہ کی فوجیں تھیں، دوسری طرف بنو قریظہ کی۔ سب سے زیادہ خطرہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے جس قلعہ میں اپنی عورتوں کو حفاظت کے لیے بھیج دیا تھا وہ بنو قریظہ کی عین زد میں تھا اور یہ لوگ اس کا محاصرہ کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ اس صورتِ حال نے مسلمانوں کو دہشت اور پریشانی میں مبتلا کر دیا حتّٰی کہ آنحضرتؐ نے مجبور ہو کر یہ تہیہ کر لیا کہ مدینہ کی پیداوار کا تیسرا حصہ دے کر حملہ آوروں سے مصالحت کر لیں[1]۔

قرآن مجید میں اس پریشانی کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے۔

إِذْ جَآءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَ

بَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا (احزاب۔ آیت ۱۰)

ترجمہ: "جب کہ وہ تم پر بالائے شہر اور پائیں شہر کی جانب سے چڑھ آئے اور دل منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔"

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں۔

"اس رات ہماری پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک طرف ابوسفیان اور اس کے ساتھی زبردست فوجیں لیے ہوئے اوپر سے آئے، اور دوسری بنی قریظہ نیچے سے بڑھے اور ان کے حملہ سے ہمارے بال بچوں کی سلامتی بھی خطرہ میں پڑ گئی"[2]۔

اس شدید اور خطرناک بدعہدی کے بعد ان لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا خودکشی کرنا تھا۔ چنانچہ جب احزاب کے دل بادل چھٹ گئے اور بیرونی حملہ کا خوف جاتا رہا تو آنحضرتؐ نے فوراً بنی قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ ۱۵ دن یا ۲۵ دن تک اسلامی فوجیں ان کے قلعے کے گرد پڑی رہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ یہ قضا کا پیغام ٹل نہیں سکتا تو آنحضرتؐ کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ سعدؓ بن معاذ ہمارے حق میں جو فیصلہ

---

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۶۸، فتح الباری ج ۷، ص ۲۸۱۔

[2] فتح الباری ج ۷، ص ۲۸۱، ابن کثیر ج ۸ ص ۵۲۔ (از مؤلف)

کریں وہ ہمیں منظور ہے۔[1] بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ انھوں نے اپنی قسمت کا فیصلہ آپؐ پر چھوڑ دیا تھا۔ آپؐ نے اس خیال سے سعدؓ بن مُعاذ کو حَکَم بنایا کہ وہ بنو قریظہ کے حلیف تھے، ان پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے حق میں ناواجب فیصلہ کریں گے۔[2] بہرحال جو صورت بھی ہو سعدؓ بالاتفاق حَکَم بنائے گئے اور انھوں نے فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے بالغ مرد قتل کیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے، اور ان کا مال مسلمانوں میں بانٹ دیا جائے۔ چنانچہ یہی فیصلہ نافذ کیا گیا اور اس کے مطابق ان کے مرد قتل کر دیے گئے۔

اب جہاں تک بدعہدی کے الزام کا تعلق ہے وہ تو صاف ہو چکا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آنحضرتؐ نے ان پر حملہ کر کے عہد شکنی کی۔ مگر دوسرا الزام یہ باقی رہ جاتا ہے کہ ان کے ساتھ انتقام بہت سخت لیا گیا۔ مگر اس کو سختی اور سنگ دلی سے تعبیر کرنے سے پہلے چند امور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

۱۔ بنو قُریظہ اور ان کے ہم قوم بنو نَضیر کی بدعہدیوں کو دیکھ کر یہ ناممکن تھا کہ ان سے از سرِ نو کوئی معاہدہ کیا جاتا اور یہ توقع قائم کی جا سکتی کہ پھر کسی نازک موقع پر وہ اسے نہ توڑ دیں گے۔

۲۔ ان کے قلعے مدینہ سے بالکل متصل تھے اور اس صریح غدّاری کے بعد ان کے اتنے قریب رہنے سے ہر وقت خطرہ تھا کہ کب کسی دشمن کو عین مسلمانوں کے گھروں پر چڑھا لائیں۔

۳۔ ان کو جلا وطن بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ ان سے پہلے ان کے بھائی بنو نضیر کو جلا وطن کرنے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ انھوں نے مسلمانوں سے دور بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کیں اور فوجیں جمع کر کے مدینہ پر چڑھ آئے۔

۴۔ ان باتوں کے باوجود آنحضرتؐ نے خود ان کے لیے کوئی سزا تجویز نہیں کی بلکہ ان کی مرضی اور اتفاق سے ایک ایسے شخص کو حکم بنایا جو خود ان کا پشتینی حلیف تھا۔

۵۔ ثالثی اور پنچایت کے متعلق یہ تمام دنیا کا مسلّمہ قانون ہے کہ جب فریقین کے اتفاق سے کوئی

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب جوازِ قتال من نقض العہد۔ فتوح البلدان ص ۲۹۔

[2] زمانۂ جاہلیت میں حضرت سعدؓ کے قبیلے اور بنی قریظہ کے درمیان حلف کا تعلق تھا اور قدیم عرب میں حلف کا تعلق خونی رشتوں سے کچھ کم مضبوط نہ ہوتا تھا۔

شخص حَکَم، ثالث یا پنچ بنایا جائے تو جو فیصلہ وہ کر دے اس کی پابندی فریقین پر لازم ہوتی ہے۔

۶۔ سعدؓ بن معاذ نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ تورات کے احکام کے مطابق تھا[لہ]۔ اسی لیے کسی یہودی نے اس کے خلاف ایک لفظ نہ کہا۔

۷۔ ان میں سے صرف وہ مرد قتل کیے گئے جو ہتھیار اٹھانے کے قابل تھے۔ کیونکہ انھیں سے جنگ و غدر کا اندیشہ تھا۔ باقی رہیں عورتیں اور بچے تو ان کے سر دھروں کے قتل ہو جانے کے بعد ان کی پرورش کا بجز اس کے اور کیا وسیلہ ہو سکتا تھا کہ مسلمان خود ان کے کفیل بنتے۔

ان وجوہ کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی روک باقی نہیں رہتی کہ بنو قریظہ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ عین انصاف کے مطابق تھا، اور اس کے سوا ان سے کوئی سلوک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ (۱۸۳)

[لہ] "جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لیے پہنچے تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر۔ تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور، اور دروازے تیرے لیے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جاتی ہے تیری باجگزار ہوگی، اور تیری خدمت کرے گی۔ اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر۔ جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور بچوں اور جانوروں کو جو کچھ اس شہر میں ہو اپنے لیے غنیمت کے طور پر رکھ لے۔" (استثناء۔ باب ۲۰۔ آیت ۱۰-۱۴)

فصل ۵

عرب میں یہود کا زور ٹوٹ گیا

سورۂ جمعہ کا پہلا رکوع اس وقت نازل ہوا جب یہودیوں کی وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں جو اسلام کی دعوت کا راستہ روکنے کے لیے انھوں نے کیں۔ پہلے مدینہ میں ان کے تین طاقتور قبیلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی تک کا زور لگاتے رہے، اور نتیجہ یہ دیکھا کہ ایک قبیلہ پوری طرح تباہ ہو گیا اور دو قبیلوں کو جلاوطن ہونا پڑا۔ پھر وہ سازشیں کر کے عرب کے بہت سے قبائل کو مدینے پر چڑھا لائے، مگر غزوہ احزاب میں ان سب نے منہ کی کھائی۔ اس کے بعد ان کا سب سے بڑا گڑھ خیبر رہ گیا تھا جہاں مدینے سے نکلے ہوئے یہودیوں کی بھی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی۔ اس رکوع کے نزول کے وقت وہ بھی بغیر کسی غیر معمولی زحمت کے فتح ہو گیا اور یہودیوں نے خود درخواست کر کے وہاں مسلمانوں کے کاشتکاروں کی حیثیت سے رہنا قبول کر لیا۔ اس آخری شکست کے بعد عرب میں یہودی طاقت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ وادی القریٰ، فدک، تیما، تبوک، سب ایک ایک کر کے ہتھیار ڈالتے چلے گئے، یہاں تک کہ عرب کے تمام یہودی اُسی اسلام کی رعایا بن کر رہ گئے جس کے وجود کو برداشت کرنا تو در کنار، جس کا نام سننا تک انھیں گوارا نہ تھا۔ یہ موقع تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان کو سورۂ جمعہ میں ایک مرتبہ پھر خطاب فرمایا، اور یہ غالباً آخری خطاب تھا جو قرآن مجید میں ان سے کیا گیا۔ اس میں انھیں مخاطب کر کے تین باتیں فرمائی گئی ہیں۔

(۱) تم نے اس رسول کو اس لیے ماننے سے انکار کیا کہ یہ اس قوم میں مبعوث ہوا تھا جسے تم حقارت کے ساتھ "اُمّی" کہتے ہو۔ تمھارا زعمِ باطل یہ تھا کہ رسول لازماً تمھاری اپنی قوم ہی کا ہونا چاہیے۔ تم یہ فیصلہ کیے بیٹھے تھے کہ تمھاری قوم سے باہر کا جو شخص رسالت کا دعوے کرے وہ ضرور جھوٹا ہے کیونکہ یہ منصب تمھاری نسل کے لیے مختص ہو چکا ہے اور "اُمّیوں" میں کبھی کوئی رسول نہیں آ سکتا۔ لیکن اللہ نے

انہی اُمیوں میں سے ایک رسول اٹھایا ہے جو تمھاری آنکھوں کے سامنے اس کی کتاب سنا رہا ہے، نفوس کا تزکیہ کر رہا ہے اور ان لوگوں کو ہدایت دے رہا ہے جن کی گمراہی کا حال تم خود جانتے ہو۔ یہ اللہؐ کا فضل ہے جسے چاہے دے۔ اس کے فضل پر تمھارا اجارہ نہیں ہے کہ جسے تم دلوانا چاہو اسی کو وہ دے اور جسے تم محروم رکھنا چاہو اسے وہ محروم رکھے۔

(۲) تم کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا، مگر تم نے اس کی ذمہ داری نہ سمجھی نہ ادا کی۔ تمھارا حال اُس گدھے کا سا ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہوئی ہوں اور اُسے کچھ نہ معلوم ہو کہ وہ کس چیز کا بار اٹھائے ہوئے ہے۔ بلکہ تمھاری حالت گدھے سے بھی بدتر ہے۔ وہ تو سمجھ بوجھ نہیں رکھتا مگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو، اور پھر کتاب اللہ کے حامل ہونے کی ذمہ داری سے فرار ہی نہیں کرتے، ذانستہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے سے بھی باز نہیں رہتے اور اس پر تمھارا زُعم یہ ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو اور رسالت کی نعمت ہمیشہ کے لیے تمھارے نام لکھ دی گئی ہے۔ گویا تمھاری رائے یہ ہے کہ خواہ تم اللہ کے پیغام کا حق ادا کرو یا نہ کرو، بہرحال اللہ اس کا پابند ہے کہ وہ اپنے پیغام کا حامل تمھارے سوا کسی کو نہ بنائے۔

(۳) تم اگر واقعی اللہ کے چہیتے ہوتے اور تمھیں اگر یقین ہوتا کہ اس کے ہاں تمھارے لیے بڑی عزت اور قدر و منزلت کا مقام محفوظ ہے تو تمھیں موت کا ایسا خوف نہ ہوتا کہ ذلت کی زندگی قبول ہے مگر موت کسی طرح قبول نہیں۔ یہی موت کا خوف ہی تو ہے جس کی بدولت پچھلے چند سالوں میں تم شکست پر شکست کھاتے چلے گئے ہو۔ تمھاری یہ حالت آپ ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اپنے کرتوتوں سے تم خود واقف ہو اور تمھارا ضمیر خوب جانتا ہے کہ ان کرتوتوں کے ساتھ مرے تو اللہ کے ہاں اس سے زیادہ ذلیل و خوار ہو گے جتنے دنیا میں ہو رہے ہو۔ (۱۸۳)

فصل ٦

یہودِ خیبر کا اخراج

(خلافتِ راشدہ میں)

عہدِ رسالت علیٰ صاحبہا السلام کے بعد عہدِ خلافت میں یہودِ خیبر کے اخراج کو خاص طور پر ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے۔ مخالفین کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ خیبر سے پیداوار کے نصف حصّہ پر معاملہ کر لیا تھا اور وہ مستقل طور پر اسلام کی رعایا بن چکے تھے تو حضرت عمرؓ کو انھیں جلاوطن کرنے کا کیا حق تھا؟ کیا اس طرح انھوں نے عہد شکنی اور اہل الذمّہ کی حق تلفی نہیں کی؟ یہ اعتراض بظاہر بہت وزنی ہے۔ مگر تاریخ نے وہ تمام حقائق محفوظ رکھے ہیں جن سے اس اعتراض کا سارا تار و پود بکھر جاتا ہے۔

حضورؐ سے یہودِ خیبر کی شرائط

خیبر جب فتح ہوا تھا تو ابتداءً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہودیوں کی صلح اس شرط پر ہوئی تھی کہ آپؐ ان کی جان بخشی کر دیں گے اور وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے[1]۔ لیکن صلح ہونے کے بعد جب زمین کے باقاعدہ بندوبست کا موقع آیا تو اہلِ خیبر نے آپؐ سے درخواست کی کہ:

”آپ ہم کو یہیں رہنے دیں اور ہم سے معاملہ کر لیں، کیونکہ ہم زراعت اور نخلستان کے کام سے خوب واقف ہیں۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست قبول کر لی اور ان سے عارضی طور پر معاملہ کر لیا۔ لیکن معاملہ کی شرائط تحریر کرتے وقت صاف طور پر یہ تصریح کر دی کہ اقرکم ما اقرکم اللہ

---

[1] فتوح البلدان ص ۲۹ - ۳۰، ابن ہشام ص ۷۷۹، ابن سعد ج ۲ ص ۷۹ - ۸۰۔

میں تم کو برقرار رکھوں گا جب تک اللہ تم کو برقرار رکھے گا۔[1] اس کا مطلب یہ تھا کہ تم کو مستقل طور پر نہیں رکھا جائے گا، بلکہ جب تک احکامِ خداوندی کے مطابق ہمارے قومی مصالح تمہیں رکھنے کی اجازت دیں گے اس وقت تک تمہیں رہنے دیا جائے گا، اور جب تمہارا طرزِ عمل نامناسب ہوگا تو ہمیں آزادی ہوگی کہ اصل صلحنامہ کی شرائط کو نافذ کر کے تمہیں جلاوطن کر دیں۔ ابنِ حجرؒ نے اس جملہ کی یہ تشریح کی ہے۔

وان المراد بقوله ما اقركم الله ما قدر الله ان نترككم فيها

فاذا شئنا فاخرجناكم لتبين ان الله قدر اخراجكم[2]

ترجمہ: "یہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب تک اللہ تم کو رکھے گا" تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک اللہ تمہارا یہاں رہنا مقدر کر رکھا ہے ہم تم کو رہنے دیں گے، اور جب ہم تمہیں نکالنا چاہیں گے اور نکال دیں گے تو یہ فعل خود اس بات کی دلیل ہوگا کہ تمہارے اخراج کے لیے اللہ کی تقدیر پوری ہو چکی ہے۔"

ابوداؤدؒ نے ایک اور روایت میں اس سے بھی زیادہ تصریح کی ہے:

كان عامل خيبر على ان نخرجهم اذا شئنا۔[3]

ترجمہ: "آنحضرت صلعم نے ان سے اس شرط پر معاملہ کیا تھا کہ ہم جب چاہیں گے ان کو نکال دیں گے۔"

اس سے یہ بات تو بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ان سے کوئی ایسا معاہدہ نہ تھا جس کے لحاظ سے ان کے اخراج کو بدعہدی کہا جا سکتا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس اصل معاہدہ ان کے اخراج ہی کا مقتضی تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ نصف خراج پر جو عارضی معاملہ ان سے کیا گیا تھا اسے کن وجوہ کی بنا پر فسخ کیا گیا؟ تو اس کی تحقیق کے لیے ذیل کے واقعات پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

طے شدہ شرائط سے یہود کا انحراف

صلح کو چند ہی روز گزرے تھے کہ ان میں سے ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت

---

[1] بخاری کتاب الشروط، باب اذا اشترط فی المزارعۃ۔ فتوح البلدان ص ۲۹۔

[2] فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۷۔ [3] ابوداؤد باب ماجاء فی حکم ارض خیبر

کی اور اس میں آپ کو زہر کھلا دیا۔ بعد میں جب تحقیق کی گئی تو خود مجرم نے اعترافِ جرم کیا اور اس فعل میں دوسرے یہودیوں کی سازش بھی ثابت ہو گئی۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں انھوں نے عبداللہ بن سہل بن زید الانصاری کو قتل کر کے ایک نہر کے کنارے پر ڈال دیا۔[2]

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں وہ علانیہ برسرِ بغاوت ہو گئے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو سوتے میں پکڑ کر کوٹھے سے نیچے پھینک دیا جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔[3]

حضرت عمرؓ کے دور میں یہودِ خیبر کے اخراج کی کاروائی

ابتدائی واقعات تو خاص لوگوں کے ساتھ مخصوص تھے، اس لیے عامۃ الناس کو اس جرم کا ذمہ دار نہ سمجھا گیا۔ مگر یہ آخری جرم کھلے بندوں کیا گیا تھا اور تمام قوم کا معاندانہ رویہ ظاہر نظر آ رہا تھا اس لیے حضرت عمرؓ نے اس معاملہ کو صحابہؓ کی مجلس میں پیش کیا اور اس بات پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

ان رسول اللہ صلعم کان عامَلَ یہودَ خیبر علی اموالھم وقال نقرکم ما اقرکم اللہ وان عبد اللہ ابن عمر خرج الی مالہ ھناک فعدی علیہ من اللیل ففدعت یداہ ورجلاہ ولیس لنا ھناک عدو غیرھم، ھم عدونا وتُھَمَتُنَا، وقد رَأیتُ اجلاءھُم[4]

ترجمہ: ”رسول اللہ صلعم نے یہودِ خیبر سے ان کے اموال پر معاملہ کیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ ”ہم تمھیں برقرار رکھیں گے جب تک اللہ تم کو برقرار رکھے گا۔“ اب عبداللہ بن عمرؓ وہاں اپنی جائداد پر گئے تھے، رات کے وقت ان پر حملہ کیا گیا اور ان کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے گئے۔ اس وقت اس ملک میں اُن کے سوا ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے، وہی ہمارے دشمن رہ گئے ہیں اس لیے میری رائے میں ان کو جلاوطن کر دینا چاہیے۔“

---

[1] صحیح بخاری میں یہ واقعہ کئی جگہ مذکور ہے، غزوۂ خیبر کے بیان، اور کتاب الطب میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔

[2] اُسد الغابہ ج ۳ ص ۱۷۹

[3] فتوح البُلدان صفحہ ۳۱۔ ابن ہشام ص ۷۸۰،

[4] بخاری کتاب الشروط، باب اذا اشترط فی المزارعۃ

حضرت عمرؓ کی اس تجویز سے تمام مجلس نے اتفاق کیا اور یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ ہو گیا۔ لیکن ان مجرموں کو بھی اس طرح جلا وطن نہیں کیا گیا کہ ان کے اموال و اراضی پر قبضہ کر کے انھیں بیک بینی و دو گوش نکال دیا گیا ہو۔ جو کچھ وہ چھوڑ کر گئے اس کا پورا پورا معاوضہ ان کو بیت المال سے دیا گیا، سفر کی آسانی کے لیے اونٹ اور کجاوے دیے گئے، یہاں تک کہ کجاوے باندھنے کی رسیاں تک حکومت کی طرف سے مہیا کی گئیں۔[1]

اس معاملے کے متعلق ایک اہم حدیث

اس میں شک نہیں کہ بعض روایات میں ان کے اخراج کی یہ وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی کہ لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب، "جزیرۂ عرب میں دو دین جمع نہ ہونے پائیں" تو آپ نے اس کی تحقیق کی اور صحیح ثابت ہو جانے کے بعد یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ کر لیا۔ بلاذری نے اس روایت کو ابن شہاب زہری کے طریق سے نقل کیا ہے[2]، اور امام زہری نے عبداللہ بن عتبہ کے طریق سے[3]۔ لیکن اس حدیث کا منشا یہ ہرگز نہ تھا کہ غیر مسلم قوموں کو بلا قصور عرب سے نکال دیا جائے۔ امام زہری نے اپنی روایت میں خود یہ تصریح کی ہے کہ جب اس حدیث کی صحت ثابت ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے اعلان کرایا کہ:

من کان له من اهل الکتابین عهد فلیات به، انفذ لهٗ۔

ترجمہ: "دونوں کتابوں (انجیل و توراۃ) کے متبعین میں سے جس کسی کے پاس کوئی معاہدہ ہو وہ لے آئے تاکہ میں اسے نافذ کر دوں۔"

ظاہر ہے کہ اگر اس حدیث کا منشا یہ ہوتا کہ بلا امتیاز تمام غیر مسلم جزیرۃ العرب سے نکال دیے جائیں تو حضرت عمرؓ یہ اعلان ہرگز نہ کراتے، بلکہ تمام غیر مسلموں کو یک قلم خارج البلاد کر دیتے، خواہ ان سے معاہدہ ہوتا یا نہ ہوتا۔ مگر جب انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اہل معاہدہ سے ان کے عہد نامے طلب کیے اور وعدہ کیا کہ ان عہد ناموں کو نافذ کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اس سے مطلقاً اخراج مقصود نہ تھا، بلکہ

---

[1] بخاری کتاب الشروط

[2] فتوح البلدان ص ۳۴

[3] فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۷

[4] فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۷

ایک عام پالیسی کی تعیین مقصود تھی، جس پر دوسرے واجبات کا لحاظ رکھتے ہوئے عمل درآمد کیا جانا چاہیے تھا۔ پس یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک ذمّی قوم محض اس بنا پر ملک سے نکال دی گئی کہ عرب میں دو دینوں کا اجتماع مرغوب نہ تھا۔ بلکہ زیادہ قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہودِ خیبر کی مسلسل بدعنوانیوں سے تنگ آکر حضرت عمرؓ نے انھیں جلا وطن کرنے کا خیال کیا ہوگا تو لازمی طور پر انھیں ایک ذمی قوم کے ساتھ یہ معاملہ کرنے میں تامّل ہوا ہوگا اور وہ کسی شرعی حجّت کی تلاش میں ہوں گے، اسی دوران میں یہ حدیث ان کو پہنچی ہوگی اور اس کی اچھی طرح تحقیق کرنے کے بعد مطمئن ہو کر انھوں نے اپنی رائے کو عمل میں لانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ بعد میں راویوں نے اپنے اپنے رجحانِ طبع کے موافق اس ایک واقعہ کے دو الگ واقعے بنا لیے اور دو مختلف روایتوں کی صورت میں بیان کرنے لگے۔ (۱۸۵)

باب ۱۰

موجودہ دور میں یہودی ریاست کا قیام
اور اُس کی مُسلم دُشمن کاروائیاں

فصل ۱

یہودی ریاست کے قیام کا پس منظر

یہودی عزائم کی تاریخ

بیت المقدس اور فلسطین کے متعلق آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تقریباً تیرہ سو برس قبل مسیح میں بنی اسرائیل اس علاقے میں داخل ہوئے تھے اور دو صدیوں کی مسلسل کشمکش کے بعد بالآخر اس پر قابض ہو گئے تھے۔ وہ اس سرزمین کے اصل باشندے نہیں تھے۔ قدیم باشندے دوسرے لوگ تھے جن کے قبائل اور اقوام کے نام خود بائبل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور بائبل ہی کی تصریحات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان قوموں کا قتلِ عام کر کے اس سرزمین پر اسی طرح قبضہ کیا تھا جس طرح فرنگیوں نے سُرخ ہندیوں (RED INDIANS) کو فنا کر کے امریکہ پر قبضہ کیا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا نے یہ ملک ان کی میراث میں دے دیا ہے، اس لیے انھیں حق پہنچتا ہے کہ اس کے اصل باشندوں کو بے دخل کر کے بلکہ ان کی نسل کو مٹا کر اس پر قابض ہو جائیں۔

اس کے بعد آٹھویں صدی قبل مسیح میں اسیریا نے شمالی فلسطین پر قبضہ کر کے اسرائیلیوں کا بالکل قلع قمع کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو لا بسایا جو زیادہ تر عربی النسل تھیں۔ پھر چھٹی صدی قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصّر نے جنوبی فلسطین پر قبضہ کر کے تمام یہودیوں کو جلاوطن کر دیا۔ بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ہیکلِ سلیمانی (TEMPLE OF SOLOMON) کو جسے دسویں قبل مسیح میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کرایا تھا، اس طرح پیوندِ خاک کر دیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ قائم نہ رہی۔ ایک طویل مدت کی جلاوطنی کے بعد ایرانیوں کے دورِ حکومت میں یہودیوں کو پھر سے جنوبی فلسطین میں آ کر آباد ہونے کا موقع ملا اور انھوں نے بیت المقدس میں دوبارہ ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کی۔ لیکن یہ دوسرا وقفہ بھی تین چار سو برس سے دراز نہ ہوا۔ ۷۰ء میں یہودیوں نے رومی سلطنت کے خلاف بغاوت کی جس کی پاداش میں بیت المقدس

کے شہر اور ہیکل سلیمانی کو بالکل مسمار کر دیا گیا، اور پھر ایک دوسری بغاوت کو کچل کر ۱۳۵ء میں رُومیوں نے پورے فلسطین سے یہودیوں کو نکال باہر کیا۔ اس دوسرے اخراج کے بعد جنوبی فلسطین میں بھی اُسی طرح عربی النسل قبائل آباد ہو گئے جس طرح شمالی فلسطین میں وہ آٹھ سو برس پہلے آباد ہوئے تھے۔ اسلام کی آمد سے پہلے یہ پورا علاقہ عربی قوموں سے آباد تھا۔ بیت المُقدّس میں یہودیوں کا داخلہ تک رومیوں نے ممنوع کر رکھا تھا، اور فلسطین میں بھی یہودی آبادی قریب قریب بالکل ناپید تھی۔

اس تاریخ سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ (۱) یہودی ابتداءً نسل کُشی (GENOCIDE) کے مُرتکب ہو کر فلسطین پر زبردستی قابض ہوئے تھے۔ (۲) شمالی فلسطین میں صرف چار یا پانچ سو برس تک آباد رہے۔ (۳) جنوبی فلسطین میں ان کے قیام کی مدّت زیادہ سے زیادہ آٹھ نو سو برس رہی (۴) اور عرب شمالی فلسطین میں ڈھائی ہزار سال سے اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہودیوں کا آج بھی یہ دعویٰ ہے کہ فلسطین ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انھیں عطا فرمائی ہے اور انھیں حق پہنچتا ہے کہ اس میراث کو بزور حاصل کر کے اس علاقے کے قدیم باشندوں کو اسی طرح نکال باہر کریں اور خود ان کی جگہ بس جائیں جس طرح تیرہ سو برس قبل مسیح میں انھوں نے کیا تھا۔

دو ہزار برس سے دنیا بھر کے یہودی ہفتے میں چار مرتبہ یہ دعائیں مانگتے رہے ہیں کہ بیت المُقدّس پھر ہمارے ہاتھ آئے اور ہم ہیکل سلیمانی کو پھر تعمیر کریں۔ ہر یہودی گھر میں مذہبی تقریبات کے موقع پر اس تاریخ کا پورا ڈراما کھیلا جاتا رہا ہے کہ ہم مصر سے کس طرح نکلے اور فلسطین میں کس طرح سے آباد ہوئے اور کیسے بابل والے ہم کو لے گئے اور ہم کس طرح سے فلسطین سے نکالے گئے اور تِتّر بِتّر ہوئے۔ اس طرح یہودیوں کے بچّے بچّے کے دماغ میں یہ بات ۲۰ صدیوں سے بٹھائی جا رہی ہے کہ فلسطین تمہارا ہے اور تمھیں واپس ملنا ہے اور تمہارا مقصدِ زندگی یہ ہے کہ تم بیت المُقدّس میں ہیکل سلیمانی کو پھر تعمیر کرو۔ بارھویں صدی عیسوی کے مشہور یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون (MAIMONIDES) نے اپنی کتاب یہود (THE CODE OF JEWISH LAW) میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہر یہودی نسل کا یہ فرض ہے کہ وہ بیت المُقدّس میں ہیکل سلیمانی کو ازسرِ نو تعمیر کرے۔ مشہور فری میسن تحریک (FREE MASON MOVEMENT) بھی، جس کے متعلق ہمارے ملک کے اخبارات میں قریب قریب سارے ہی حقائق اب شائع ہو چکے ہیں، اصلاً ایک یہودی تحریک ہے، اور اس میں بھی ہیکل سلیمانی کی تعمیرِ نو کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ پوری فری میسن تحریک

کا مرکزی تصور یہی ہے۔ اور تمام فری میسن لاجوں میں اس کا باقاعدہ ڈراما ہوتا ہے کہ کس طرح سے ہیکل سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کرنا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ میں آگ لگنا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔ صدیوں سے یہودی قوم کی زندگی کا نصب العین یہی رہا ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکلِ سلیمانی کو تعمیر کرے، اور اب بیت المقدِس پر ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے اس نصب العین کو پورا کرنے سے باز رہ جائیں۔

یہودیوں کی احسان فراموشی

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک بات کی اور وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہیکل سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے ۷۰ء میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدِس فتح ہوا اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہ تھا بلکہ کھنڈر پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے مسجد اقصیٰ اور قبۂ صخرہ کی تعمیر کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ ان کے کسی معبد کو توڑ کر مسلمانوں نے یہ مساجد بنائی تھیں۔ یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ رومیوں کے زمانے میں فلسطین یہودیوں سے خالی کرا لیا گیا تھا اور بیت المقدِس میں تو ان کا داخلہ بھی ممنوع تھا۔ یہ مسلمانوں کی شرافت تھی کہ انھوں نے پھر انھیں وہاں رہنے اور بسنے کی اجازت دی۔ تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ پچھلی تیرہ چودہ صدیوں میں یہودیوں کو اگر کہیں امن نصیب ہوا ہے تو وہ صرف مسلمان ملک تھے، ورنہ دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی عیسائیوں کی حکومت رہی وہاں وہ ظلم و ستم کا نشانہ ہی بنتے رہے۔ یہودیوں کے اپنے مؤرخین اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ کا سب سے زیادہ شاندار دَور وہ تھا جب وہ آندلس میں مسلمانوں کی رعایا کی حیثیت سے آباد تھے۔ یہ دیوارِ گریہ جس کو آج یہودی اپنی سب سے بڑی مقدس یادگار سمجھتے ہیں۔ یہ بھی مسلمانوں ہی کی عنایت سے انھیں ملی تھی۔ بمبئی سے اسرائیلی حکومت کا ایک سرکاری بلیٹن NEWS FROM ISRAEL شائع ہوتا ہے۔ اس کی یکم جولائی ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دیوارِ گریہ پہلے ملبے اور کوڑے کرکٹ میں دبی ہوئی تھی اور اس کا کوئی نشان تک لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ سولھویں صدی عیسوی میں سلطان سلیم عثمانی کو اتفاقاً اس کے وجود کا علم ہوا اور اس نے اس جگہ کو صاف کرا کے یہودیوں کو اس کی زیارت کی اجازت عطا کی۔ لیکن یہودی ایک ایسی احسان فراموش قوم ہے کہ وہ مسلمانوں کی شرافت اور فیاضی اور حسنِ سلوک کا بدلہ آج اس شکل میں ان کو

دے رہی ہے۔

یہودیوں کی منصوبہ بندی

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ ان ظالموں نے کس طرح باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے کام کیا ہے۔ سب سے پہلے ان کے ہاں ایک تحریک شروع ہوئی کہ مختلف علاقوں سے یہودی ہجرت کر کر کے فلسطین میں جا کر آباد ہوں اور وہاں زمینیں خریدنی شروع کریں۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء سے اس مہاجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور زیادہ تر مشرقی یورپ سے یہودی خاندان وہاں منتقل ہونے لگے۔

اس کے بعد مشہور یہودی لیڈر تھیوڈور ہرتزل (HERZL) نے ۱۸۹۷ء میں صہیونی تحریک (ZIONIST MOVEMENT) کا باقاعدہ آغاز کیا اور اس میں اس بات کو مقصود قرار دیا گیا کہ فلسطین پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا جائے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی جائے۔ یہودی سرمایہ داروں نے اس غرض کے لیے بڑے پیمانے پر مالی امداد فراہم کی کہ فلسطین منتقل ہونے والے یہودی خاندان وہاں زمینیں خریدیں اور منظم طریقے سے اپنی بستیاں بسائیں۔ پھر ۱۹۰۱ء میں ہرتزل نے سلطان عبدالحمید خاں (سلطان ترکی کو باقاعدہ یہ پیغام بھجوایا کہ یہودی ترکی کے تمام قرضے ادا کرنے کو تیار ہیں، آپ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی اجازت دے دیں۔ مگر سلطان عبدالحمید خاں نے اس پیغام پر تھوک دیا اور صاف کہہ دیا کہ "جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک ترکی سلطنت موجود ہے اس وقت تک اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ فلسطین یہودیوں کے حوالے کیا جائے۔ تمھاری ساری دولت پر میں تھوکتا ہوں"۔ جس شخص کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا گیا تھا اس کا نام حاخام قُرہ صو آفندی۔ یہ سالونیکا کا یہودی باشندہ تھا اور ان یہودی خاندانوں میں سے تھا جو اسپین سے نکالے جانے کے بعد ترکی میں آباد ہوئے تھے۔ ترکی رعایا ہونے کے باوجود اس نے یہ جرأت کی کہ سلطان ترکی کے دربار میں پہنچ کر فلسطین کو یہودیوں کے حوالہ کرنے کا مطالبہ پیش کرے۔

اسی پر بس نہیں، بلکہ سلطان عبدالحمید خاں کا جواب سُن کر ہرتزل کی طرف سے ان کو صاف صاف یہ دھمکی دے دی گئی کہ تم اس کا برا نتیجہ دیکھو گے۔ چنانچہ اس کے بعد فوراً ہی سلطان عبدالحمید کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازشیں شروع ہو گئیں جن میں فری میسن، دونمہ؎، اور وہ مسلمان نوجوان شریک تھے

؎ یہ وہ یہودی تھے جنھوں نے ریا کارانہ اسلام قبول کر رکھا تھا۔ ترک ان کو دونمہ کہتے ہیں۔

جو مغربی تعلیم کے زیر اثر آ کر ترکی قوم پرستی کے علمبردار بن گئے تھے۔ ان لوگوں نے ترکی فوج میں اپنے اثرات پھیلائے اور سات سال کے اندر ان کی سازشیں پختہ ہو کر اس منزل پر پہنچ گئیں کہ سلطان عبد الحمید کو معزول کر دیں۔ اس موقع پر جو انتہائی عبرتناک واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ۱۹۰۹ء میں جو تین آدمی سلطان کی معزولی کا پروانہ لے کر اُن کے پاس گئے تھے ان میں دو تُرک تھے اور تیسرا وہی حاخام قرّہ صو آفندی تھا جس کے ہاتھ ہرتزل نے فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ سلطان کے پاس بھیجا تھا۔ مسلمانوں کی بے غیرتی کا اس سے اندازہ کیجیے کہ اپنے سلطان کی معزولی کا پروانہ بھیجتے بھی ہیں تو ایک ایسے یہودی کے ہاتھ جو سات ہی برس پہلے اسی سلطان کے پاس فلسطین کی حوالگی کا مطالبہ لے کر گیا تھا اور اس سے سخت جواب سن کر آیا تھا۔ ذرا تصور کیجیے کہ سلطان کے دل پر کیا گزری ہوگی جب وہی یہودی ان کی معزولی کا پروانہ لیے ہوئے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

فصل ۲

بین الاقوامی صورتِ حال

ترکی اور عربی قوم پرستی کا تصادم

اسی زمانے میں ایک دوسری سازش بھی زور شور سے چل رہی تھی جس کا مقصد ترکی سلطنت کے ٹکڑے اڑانا تھا اور اس سازش میں بھی مغربی سیاست کاروں کے ساتھ ساتھ یہودی دماغ ابتدا سے کارفرما رہا۔ ایک طرف ترکوں میں یہ تحریک اٹھائی گئی کہ وہ سلطنت کی بنا اسلامی اخوت کے بجائے ترکی قوم پرستی پر رکھیں، حالانکہ ترکی سلطنت میں صرف ترک ہی آباد نہیں تھے بلکہ عرب اور کُرد اور دوسری نسلوں کے مسلمان بھی تھے۔ ایسی سلطنت کو صرف ترکی قوم کی سلطنت قرار دینے کے صاف معنی یہ تھے کہ تمام غیر ترک مسلمانوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ختم ہو جائیں۔ دوسری طرف عربوں کو عربی قومیت کا سبق پڑھایا گیا اور ان کے دماغ میں یہ بات بٹھائی گئی کہ وہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کی جدوجہد کریں۔ عربوں میں اس عرب قوم پرستی کا فتنہ اٹھانے والے عیسائی عرب تھے، بیروت اس کا مرکز تھا، اور بیروت کی امریکن یونیورسٹی اس کو فروغ دینے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ اس طرح ترکوں اور عربوں میں بیک وقت دو متضاد قسم کی قوم پرستیاں ابھاری گئیں۔ اور ان کو یہاں تک بھڑکایا گیا کہ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم برپا ہوئی تو ترک اور عرب ایک دوسرے کے رفیق ہونے کے بجائے دشمن اور خون کے پیاسے بن کر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔

جنگِ عظیم اوّل اور اعلان بالفور

پہلی جنگِ عظیم میں ابتداءً یہودیوں نے حکومتِ جرمنی سے معاملہ کرنا چاہا تھا، کیونکہ جرمنی میں اس وقت یہودیوں کا اتنا ہی زور تھا جتنا آج امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے قیصر ولیم سے یہ وعدہ لینے کی کوشش کی کہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنوا دے گا۔ لیکن جس وجہ سے یہودی اس پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ایسا کرے گا وہ یہ تھی کہ ترکی حکومت اس وقت جنگ میں جرمنی کی حلیف تھی۔

یہودیوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ قیصر ولیم ہم سے یہ وعدہ پورا کر سکے گا۔ اس موقع پر ڈاکٹر وائزمین (DR. WEIZMAN) آگے بڑھا اور اس نے انگلستان کی حکومت کو یہ یقین دلایا کہ جنگ میں تمام دنیا کے یہودیوں کا سرمایہ اور تمام دنیا کے یہودیوں کا دماغ اور ان کی ساری قوت و قابلیت انگلستان اور فرانس کے ساتھ آسکتی ہے اگر آپ ہم کو یہ یقین دلادیں کہ آپ فتحیاب ہو کر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنا دیں گے۔ ڈاکٹر وائزمین ہی اس وقت یہودیوں کے قومی وطن کی تحریک کا علمبردار تھا۔ آخر کار اس نے ۱۹۱۷ء میں انگریزی حکومت سے وہ مشہور پروانہ حاصل کر لیا جو اعلان بالفور کے نام سے مشہور ہے۔ یہ انگریزوں کی بددیانتی کا شاہکار ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کو یقین دلا رہے تھے کہ ہم عربوں کی ایک خود مختار ریاست بنائیں گے اور اس غرض کے لیے انھوں نے شریف حسین کو تحریری وعدہ دے دیا تھا اور اسی وعدے کی بنیاد پر عربوں نے ترکوں سے بغاوت کر کے فلسطین اور عراق اور شام پر انگلستان کا قبضہ کرا دیا تھا۔ دوسری طرف وہی انگریز یہودیوں کو باقاعدہ یہ تحریر دے رہے تھے کہ ہم فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنائیں گے۔ یہ اتنی بڑی بے ایمانی تھی کہ جب تک انگریزی قوم دنیا میں موجود ہے وہ اپنی تاریخ پر سے اس کلنک کے ٹیکے کو نہ مٹا سکے گی۔ پھر ذرا غور کیجیے کہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کے آخر معنی کیا تھے؟ کیا فلسطین کوئی خالی پڑی ہوئی زمین تھی جس پر کسی قوم کو آباد کر دینے کا وعدہ کیا جا رہا تھا؟ وہاں دو ڈھائی ہزار برس سے ایک قوم آباد چلی آرہی تھی۔ اعلان بالفور کے وقت وہاں یہودیوں کی آبادی پوری ۵ فی صد بھی نہ تھی۔ ایسے ملک کے متعلق سلطنت برطانیہ کا وزیر خارجہ یہ تحریری وعدہ دے رہا تھا کہ ایک قوم کے وطن میں ایک دوسری قوم کا وطن بنایا جائے گا جو دنیا بھر میں ۱۹ سو برس سے بکھری ہوئی تھی۔ اس کا صاف مطلب گویا یہ وعدہ کرنا تھا کہ ہم تمھیں موقع دیں گے کہ عربوں کے جس وطن پر ہم نے خود عربوں کی مدد سے قبضہ کیا ہے اس سے تم انہی عربوں کو نکال باہر کرو اور ان کی جگہ دنیا کے گوشے گوشے سے اپنے افراد کو لا کر بسا دو۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس زخم پر نمک پاشی یہ ہے کہ لارڈ بالفور نے اپنے اس خط کے متعلق اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے تھے۔

> "ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے موجودہ باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صیہونیت ہمارے لیے اُن سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو اس قدیم سرزمین میں اس وقت آباد ہیں۔"

بالفور کی ڈائری کے یہ الفاظ آج بھی برطانوی پالیسی کی دستاویزات (DOCOMENTS OF BRITISH POLICY) کی جلد سوم میں ثبت ہیں۔

مجلسِ اقوام کی کارگزاری

فلسطین پر انگریزوں کے قبضے اور لارڈ بالفور کے اعلان سے یہودیوں کے طویل المیعاد منصوبے کا پہلا مرحلہ مکمل ہوگیا۔ ۱۸۹۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۷ء تک اس مرحلے کی تکمیل میں ۲۷ سال صرف ہوئے۔ اس کے بعد اس منصوبے کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں مجلس اقوام (LEAGUE OF NATIONS) اور اس کی اصل کارفرما دو بڑی طاقتوں، برطانیہ اور فرانس نے بالکل اس طرح کام کیا گویا وہ آزاد سلطنتیں نہیں ہیں بلکہ محض صہیونی تحریک کی ایجنٹ ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مجلس اقوام نے فیصلہ کیا کہ فلسطین کو انگریزوں کے انتداب[1] (MANDATE) میں دے دیا جائے۔ اس موقع پر فلسطین میں جو مردم شماری کرائی گئی تھی اس میں مسلمان عرب ۶۶۰۶۴۱، عیسائی عرب ۷۱۴۶۴، اور یہودی ۸۳۷۹۰ تھے، اور یہودیوں کی اتنی آبادی بھی اس وجہ سے تھی کہ وہ دھڑا دھڑ وہاں جا کر آباد ہو رہے تھے۔[2] اس پر بھی مجلسِ اقوام نے برطانیہ کو انتداب کا پروانہ دیتے ہوئے پوری بے شرمی کے ساتھ یہ ہدایت کی کہ اس کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرے، صہیونی تنظیم کو سرکاری طور پر باقاعدہ تسلیم کر کے اسے نظم و نسق میں شریک کرے اور اس کے مشورے اور تعاون سے یہودی قومی وطن کی تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اس کے ساتھ وہاں کے قدیم اور اصل باشندے کے لیے صرف اتنی ہدایت پر اکتفا کیا گیا کہ ان کے مذہبی اور مدنی (CIVIL) حقوق کا تحفظ کیا جائے، سیاسی حقوق کا اس میں سرے سے کوئی ذکر نہ تھا۔ یہ تھا اس مجلسِ اقوام کا انصاف جسے دنیا میں امن قائم کرنے کا نام لے کر وجود میں لایا گیا تھا۔ اس نے یہودیوں کو باہر سے لا کر بسانے والوں کو تو سیاسی اقتدار میں شریک کر دیا، اور ملک کے اصل باشندوں کو اس کا مستحق بھی نہ سمجھا کہ ان کے سیاسی حقوق کا برائے نام بھی تذکرہ کر

---

[1] انتداب کا مطلب یہ ہے کہ ایک حکومت بطورِ خود کسی ملک کی فرمانروائی نہیں کر رہی ہے بلکہ مجلسِ اقوام کی طرف سے اس کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ وہاں خاص شرائط کے تحت فرمانروائی کرے۔

[2] ۱۹۱۷ء میں یہودی آبادی صرف ۵۶ ہزار تھی۔ پانچ سال کے اندر وہ بڑھ کر ۸۳ ہزار کے قریب پہنچ گئی۔

دیا جاتا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں اور مجلسِ اقوام میں یہودیوں نے کتنے اثرات پیدا کر لیے تھے جن کی بدولت فلسطین کو انگریزوں کے انتداب میں دیتے ہوئے یہ ہدایات جاری کی گئی تھیں۔

انگریزی انتداب کا کارنامہ

یہ انتداب حاصل کرنے کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں لا کر بسانے کا باقاعدہ سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ فلسطین کا پہلا برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سیمویل خود ایک یہودی تھا۔ صہیونی تنظیم کو عملاً حکومت کے نظم و نسق میں شریک کیا گیا اور اس کے سپرد نہ صرف تعلیم اور زراعت کے محکمے کئے گئے بلکہ بیرونی ممالک سے لوگوں کے داخلے، سفر اور قومیت کے معاملات بھی اس کے حوالے کر دیے گئے۔ ایسے قوانین بنائے گئے جن کے ذریعہ سے باہر کے یہودیوں کو فلسطین میں آ کر زمینیں حاصل کرنے کی پوری سہولتیں دی گئیں۔ مزید برآں ان کو زمینیں کاشت کرنے کے لیے قرضوں اور تقاوی اور دوسری سہولتوں سے بھی نوازا گیا۔ عربوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے اور ٹیکسوں کے بقایا پر ہر بہانے عدالتوں نے زمینیں ضبط کرنے کی ڈگریاں دینی شروع کر دیں۔ ضبط شدہ زمینیں یہودیوں کے ہاتھ فروخت کی گئیں اور سرکاری زمینوں کے بھی بڑے بڑے رقبے یہودی نوآبادکاروں کو کہیں مفت اور کہیں برائے نام پٹے پر دے دیے گئے۔ بعض مقامات پر کسی نہ کسی بہانے پورے پورے گاؤں صاف کر دیے گئے اور وہاں یہودی بستیاں بسائی گئیں۔ ایک علاقے میں تو ۸ ہزار عرب کاشتکاروں اور زراعتی کارکنوں کو ۵۰ ہزار ایکڑ زمین سے حکماً بے دخل کر دیا گیا اور ان کو فی کس ۳ پونڈ دس شلنگ دے کر چلتا کر دیا گیا۔ ان تدبیروں سے ۱۷ سال کے اندر یہودی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ ۸۳ ہزار سے کچھ زائد تھے۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریز فلسطین میں صرف صہیونیت کی خدمت سر انجام دیتے رہے اور ان کے ضمیر نے ایک دن بھی ان کو یہ احساس نہ دلایا کہ کسی ملک کی حکومت پر اس کے اصل باشندوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں جن کی نگہداشت کرنا اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

جنگِ عظیم دوم کے زمانے میں معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ گیا۔ ہٹلر کے مظالم سے بھاگنے والے یہودی ہر قانونی اور غیر قانونی طریقے سے تحاشا فلسطین میں داخل ہونے لگے۔ صہیونی ایجنسی نے

ان کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ملک کے اندر گھسانا شروع کیا، اور مسلح تنظیمیں قائم کیں جنھوں نے ہر طرف مار دھاڑ کر کے عربوں کو بھگانے اور یہودیوں کو ان کی جگہ بسانے میں سفاکی کی حد کر دی۔ انگریزی انتداب کی ناک کے نیچے یہودیوں کو ہر طرح کے ہتھیار پہنچ رہے تھے اور وہ عربوں پر چھاپے مار رہے تھے مگر قانون صرف عربوں کے لیے تھا جو انھیں ہتھیار رکھنے اور ظلم کے جواب میں مدافعت کرنے سے روک رہا تھا۔ البتہ برطانوی حکومت جان بچا کر بھاگنے والے عربوں کو نقل مکانی کی سہولتیں فراہم کرنے میں بڑی فراخ دل تھی۔ اس طرح ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ۳۰ سال کے اندر یہودی منصوبے کا دوسرا مرحلہ مکمل ہوا جس میں وہ اس قابل ہو گئے کہ فلسطین کو یہودیوں کا "قومی وطن" بنانے کے بجائے ان کی "قومی ریاست" قائم کر دیں۔

فصل ۳

یہودیوں کا آئندہ لائحۂ عمل

”قومی وطن“ سے ”قومی ریاست“ تک

۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت نے فلسطین کا مسئلہ اقوامِ متحدہ میں پیش کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) نے صہیونیت کی جو خدمت ہمارے سپرد کی تھی وہ ہم انجام دے چکے ہیں۔ اب آگے کا کام اس آنجہانی مجلس کی نئی جانشین اقوام متحدہ انجام دے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ یہ دوسری مجلس جو دنیا میں امن وانصاف کے قیام کی علمبردار بن کر اٹھی تھی، اس نے فلسطین میں کیا انصاف قائم کیا۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ یہ فیصلہ ہوا کس طرح؟ اس کے حق میں ۳۳ ووٹ اور اس کے خلاف ۱۳ ووٹ تھے۔ دس ملکوں نے کوئی ووٹ نہیں دیا۔ یہ کم سے کم اکثریت تھی جس سے جنرل اسمبلی میں کوئی ریزولیوشن پاس ہو سکتا تھا۔ چند روز پہلے تک اس تجویز کے حق میں اتنی اکثریت بھی نہ تھی۔ صرف ۳۰ ملک اس کے حق میں تھے۔ آخر کار امریکہ نے غیر معمولی دباؤ ڈال کر ہائیٹی، فلپائن اور لائبیریا کو مجبور کر کے اس کی تائید کرائی۔ یہ بات خود امریکن کانگریس کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ یہ تین ووٹ زبردستی حاصل کیے گئے تھے، اور جیمز فوریسٹال (FORRE-STAL) اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ ”اس معاملہ میں دوسری قوموں پر دباؤ ڈالنے اور ان کو ووٹ دینے پر مجبور کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کیے گئے وہ شرمناک کارروائی (SCANDAL) کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔“

تقسیم کی جو تجویز ان ہتھکنڈوں سے پاس کرائی گئی اس کی رُو سے فلسطین کا ۵۵ فی صدی رقبہ ۳۳ فیصدی یہودی آبادی کو، اور ۴۵ فی صدی رقبہ، ۶۷ فی صدی عرب آبادی کو دیا گیا۔ حالانکہ اُس وقت تک فلسطین کی زمین کا صرف ۶ فی صدی حصہ یہودیوں کے قبضے میں آیا تھا۔ یہ تھا اقوامِ متحدہ کا انصاف!

لیکن یہودی اس بندر بانٹ سے بھی راضی نہ ہوئے اور انھوں نے مار دھاڑ کر کے عربوں کو نکالنا اور ملک کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں جو مظالم عربوں پر کیے گئے آرنلڈ ٹائن بی ان کے متعلق اپنی کتاب (A STUDY OF HISTORY) میں کہتا ہے کہ وہ کسی طرح بھی ان مظالم سے کم نہ تھے جو نازیوں نے خود یہودیوں پر کیے تھے۔ دیر یاسین میں ۹ اپریل ۱۹۴۸ء کے قتلِ عام کا خاص طور پر اس نے ذکر کیا ہے جس میں عرب عورتوں، بچوں اور مردوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا گیا، عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس سڑکوں پر نکالا گیا اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر جگہ جگہ یہ اعلان کرتے پھرے کہ "ہم نے دیر یاسین کی عرب آبادی کے ساتھ یہ اور یہ کیا ہے، اگر تم نہیں چاہتے کہ تمھارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو تو یہاں سے نکل جاؤ" ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ کیا یہ کسی ایسی قوم کا کارنامہ ہو سکتا ہے جس میں رتی برابر بھی شرافت و انسانیت موجود ہو؟

ان حالات کے دوران میں ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو عین اس وقت جبکہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی فلسطین کے مسئلے پر بحث کر رہی تھی، یہودی ایجنسی نے رات کے دس بجے اسرائیلی ریاست کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا، اور سب سے پہلے امریکہ اور روس نے آگے بڑھ کر اس کو تسلیم کیا، حالانکہ اس وقت تک اقوامِ متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی قومی ریاست قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔ اس اعلان کے وقت تک ۷ لاکھ سے زیادہ عرب گھر سے بے گھر کیے جا چکے تھے، اور اقوام متحدہ کی تجویز کے بالکل خلاف یروشلم (بیت المقدس) کے آدھے سے زیادہ حصے پر اسرائیل قبضہ کر چکا تھا۔

ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان ہونے کے بعد گرد و پیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو مار دھاڑ اور لوٹ مار سے بچانے کے لیے مداخلت کی اور ان کی فوجیں فلسطین میں داخل ہو گئیں۔ لیکن یہودی اس وقت تک اتنے طاقت ور ہو چکے تھے کہ یہ سب ریاستیں مل کر بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ بلکہ جب نومبر ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ نے جنگ بندی کا فیصلہ کیا اس وقت فلسطین کے رقبے کا ۷۷ فیصدی سے بھی کچھ زیادہ حصہ یہودیوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں کو اتنی جنگی طاقت کس نے فراہم کر کے دی تھی کہ پانچ عرب ریاستوں کی متحدہ طاقت بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکی؟ اس طاقت کے فراہم کرنے میں سرمایہ داری نظام اور اشتراکی نظام دونوں شریک تھے، اور سب سے زیادہ ہتھیار اس جنگ کے لیے چیکوسلوواکیہ سے آئے تھے جو آج خود ظلم و ستم کا شکار ہے۔ اقوامِ متحدہ میں بھی جو بحثیں اس زمانے میں

ہوئیں ان کا ریکارڈ شاہد ہے کہ یہودیوں کی حمایت اور عربوں کی مخالفت میں مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام، دونوں کے علمبردار ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے تھے، اور یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں کون یہودیوں کا زیادہ حامی ہے۔

یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ

اس کے بعد یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا جو ۱۹ سال کے اندر جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں بیت المقدس اور پورے باقی ماندہ فلسطین اور پورے جزیرہ نمائے سینا اور سرحدِ شام کی بالائی پہاڑیوں پر اسرائیل کے قبضے سے تکمیل کو پہنچا۔ نومبر ۱۹۴۹ء میں اسرائیلی ریاست کا رقبہ ۷۹۹۳، مربع میل تھا۔ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اس کے اندر ۲۷ ہزار مربع میل کا اضافہ ہوگیا اور ۱۴-۱۵ لاکھ عرب یہودیوں کے غلام بن گئے۔ اس مرحلے میں اسرائیل کے منصوبے کی کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر امریکہ اس کا حامی و مددگار اور پشت پناہ بنا رہا۔ برطانیہ اور فرانس اور دوسرے مغربی ممالک بھی اپنی اپنی حد تک اس کی تائید و حمایت کا پورا حق ادا کرتے رہے۔ روس اور اس کا مشرقی بلاک بھی کم از کم ۱۹۵۵ء تک علانیہ اس کا حامی رہا اور بعد میں اس نے اگر اس نے اپنی پالیسی بدلی بھی تو وہ عرب ملکوں کے لیے مفید ہونے کے بجائے اسرائیل ہی کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں جب عرب ممالک اس سے بالکل مایوس ہوگئے کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں سے ان کو اسرائیل کے مقابلے اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار مل سکیں گے تو انھیں مجبوراً اشتراکی بلاک کی طرف رجوع کرنا پڑا اور اس بلاک کے ملکوں نے اس لالچ میں ان کو ہتھیار دینے شروع کیے کہ اس طرح انھیں عرب ممالک میں اشتراکیت پھیلانے اور ان کو اپنے دائرہ اثر میں لانے کا موقع مل جائے گا۔

اس کے نتیجے میں یہ تو نہ ہو سکا کہ عرب ممالک اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتے، البتہ یہ ضرور ہوا کہ روس کو مصر و شام سے یمن تک اور عراق سے الجزائر تک اپنے اثرات پھیلانے کا موقع حاصل ہوگیا اور عرب ملکوں میں رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی کشمکش اتنی بڑھی کہ اسرائیل سے نمٹنے کے بجائے وہ آپس ہی میں ایک دوسرے سے الجھ کر رہ گئے۔

۱۹ برس کی اس مدت میں امریکہ نے اسرائیل کو ایک ارب ۶۰ کروڑ ڈالر کی مالی امداد دی۔ مغربی جرمنی سے اس کو ۸۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر کا تاوان دلوایا گیا۔ اور دنیا بھر کے یہودیوں نے دو ارب ڈالر سے زیادہ چندے دے کر اس کی مالی پوزیشن مضبوط کی۔ جنگی حیثیت سے اس کو زفرق تا بقدم اس قدر مسلح کر دیا گیا

کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے ہی امریکی ماہرین کا یہ اندازہ تھا کہ وہ صرف چار یا پانچ دن کے اندر اپنے گرد و پیش کی تمام عرب ریاستوں کو پیٹ لے گا۔ سیاسی حیثیت سے ہر موقع پر امریکہ اور اس کے ساتھی اس کی پشت پناہی کرتے رہے اور انہی کی حمایت کی وجہ سے اقوامِ متحدہ اس کی پے در پے زیادتیوں کا کوئی تدارک نہ کر سکی۔ نومبر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک اقوامِ متحدہ کے ۲۸ ریزولیوشن وہ اس کے منہ پر مار چکا تھا۔ ستمبر ۱۹۴۸ء سے نومبر ۱۹۶۶ء تک ۷ مرتبہ اقوامِ متحدہ نے اس کے خلاف مذمّت کی قراردادیں پاس کیں مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس کی بے باکی کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد جب جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا اس وقت اسرائیل کے وزیرِ اعظم لیوی اشکول نے علی الاعلان یہ کہا کہ "اگر اقوامِ متحدہ کے ۱۲۲ ممبروں میں سے ۱۲۱ بھی فیصلہ دے دیں اور تنہا اسرائیل کا اپنا ووٹ ہی ہمارے حق میں رہ جائے، تب بھی ہم اپنے مفتوحہ علاقوں سے نہ نکلیں گے۔" سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ امریکہ اور اس کے ساتھیوں کی حمایت کے بل پر اسرائیل تمام دنیا کی رائے کو ٹھوکر پر مارتا ہے اور اقوامِ متحدہ اس کے مقابلے میں قطعی بے بس ہے۔

امریکہ کی دلچسپی اسرائیل کے ساتھ کتنی بڑھی ہوئی ہے۔ اس کو جاننے کے لیے آپ ذرا اس رویے پر ایک نگاہ ڈال لیں جو جون ۱۹۶۷ء کے موقع پر اس نے اختیار کیا تھا۔ جنگ سے ایک ہفتہ پہلے امریکی فوج کے جائنٹ چیفس آف اسٹاف کے صدر جنرل وہیلر نے صدر جانسن کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر اسرائیل بڑھ کر پہلے ایک کامیاب ہوائی حملہ کر دے تو پھر زیادہ سے زیادہ تین چار دن کے اندر وہ عربوں کو مار لے گا لیکن اس رپورٹ پر بھی جانسن صاحب پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے اور انہوں نے سی آئی اے کے چیف رچرڈ ہیلمس (HELMS) سے رپورٹ طلب کی۔ جب اس نے بھی وہیلر کے اندازوں کی توثیق کر دی تو جانسن صاحب نے روس سے رجوع کر کے یہ اطمینان حاصل کیا کہ وہ عربوں کی مدد کے لیے عملاً کوئی مداخلت نہ کرے گا۔ اس کے بعد کہیں جا کر اسرائیل پر "وحی" نازل[1] ہوئی کہ اب عرب ملکوں پر حملہ کر دینے کا مناسب موقع آ گیا ہے۔ اس پر بھی امریکہ کا چھٹا بحری بیڑہ مصر و اسرائیل کے سواحل کے قریب اپنی پوری طاقت کے ساتھ مستعد کھڑا تھا تاکہ بوقتِ ضرورت کام آ سکے۔

---

[1] اس لفظ پر چونکیے نہیں۔ شیاطین بھی اپنے اولیاء پر "وحی" کیا کرتے ہیں۔

انگریزوں کی اسرائیل نوازی کا حال یہ تھا کہ ان کا ایک طیارہ بردار بحری جہاز مالٹا میں اور دوسرا عدن میں ایک منٹ کے نوٹس پر اسرائیل کی مدد پر حرکت کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ جنگ کے بعد لنڈن سنڈے ٹائمز نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا THE HOLY WAR, JUNE 67 - اس کا جو باب بیت المقدس پر یہودی قبضے کے بیان میں ہے اس کا عنوان رکھا گیا ہے BACK AFTER 896 YEARS یعنی "۸۹۶ برس کے بعد واپسی"۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ۸۹۶ سال پہلے بیت المقدس پر سے صلیبی عیسائیوں کا قبضہ اٹھا تھا نہ کہ یہودیوں کا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسرائیل کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردی میں صلیبی جذبہ کام کر رہا تھا اور اس لڑائی کو وہ صلیبی جنگوں ہی کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔

روس کی عرب دوستی کا حال بھی یہ تھا کہ جس صبح کو مصر کے ہوائی اڈوں پر اسرائیل کا حملہ ہونے والا تھا اسی کی رات کو روس نے صدر ناصر کو اطمینان دلایا تھا کہ کوئی حملہ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ ویسی ہی یقین دہانی تھی جیسی ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہم کو کرائی گئی تھی کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد پار نہ کرے گا! عربوں کے ساتھ روس کے رویے پر یوگوسلاویہ کے ایک ڈپلومیٹ کا یہ تبصرہ بڑا سبق آموز ہے کہ "ایک بڑی طاقت جب تمہارا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ تم کو پیراشوٹ کے بغیر ہوائی جہاز سے گرا دیتی ہے۔"

یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے یہودیوں کا تیسرا منصوبہ بھی کامیاب ہو گیا اور بیت المقدس سمیت پورا فلسطین جزیرہ نمائے سینا سمیت ان کے ہاتھ آ گیا۔

یہودیوں کا چوتھا منصوبہ

اب درحقیقت جس چیز سے دنیائے اسلام کو سابقہ درپیش ہے وہ یہودیوں کا چوتھا اور آخری منصوبہ ہے جس کے لیے وہ دو ہزار سال سے بے تاب تھے اور جس کی خاطر وہ ۹۰ سال سے باقاعدہ ایک اسکیم کے مطابق کام کرتے رہے ہیں۔

اس منصوبے کے اہم ترین اجزاء دو ہیں۔ ایک یہ کہ مسجدِ اقصیٰ اور قبۂ صخرہ کو ڈھا کر ہیکل سلیمانی پھر سے تعمیر کیا جائے، کیونکہ اس کی تعمیر ان دونوں مقاماتِ مقدسہ کو ڈھائے بغیر نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ اس پورے علاقے پر قبضہ کیا جائے جسے اسرائیل اپنی میراث سمجھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس منصوبے کے ان دونوں اجزاء کو ہر مسلمان اچھی طرح سمجھ لے۔

جہاں تک پہلے جزء کا تعلق ہے اسرائیل اسے عملی جامہ پہنانے پر اُسی وقت قادر ہو چکا تھا جب بیت المَقْدِس پر اس کا قبضہ ہوا تھا۔ لیکن دو وجوہ سے وہ اب تک اس کام میں تامّل کرتا رہا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اسے اور اس کے سرپرست امریکہ کو دنیائے اسلام کے شدید ردِّ عمل کا اندیشہ ہے۔ دوسرے یہ کہ خود یہودیوں کے اندر مذہبی بنیاد پر اس مسئلے میں اختلاف برپا ہے۔ ان کے ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہیکل کی تعمیرِ نو مسیح ہی آ کر کرے گا، جب تک وہ نہ آ جائے ہمیں انتظار کرنا چاہیے[1]۔ یہ ان کے قدامت پسند گروہ کا خیال ہے۔ دوسرا گروہ جو شدت پسند ہے، اور جس کے ہاتھ میں دراصل اس وقت اسرائیل کے اقتدار کی باگیں ہیں، کہتا ہے کہ قدیم بیت المقدس اور دیوارِ گریہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد ہم دورِ مسیحائی (MESSIANIC ERA) میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہی بات یہودی فوج کے چیف ربّی[2] نے تورات ہاتھ میں لے کر اس روز کہی تھی جب بیت المقدس کی فتح کے بعد وہ دیوارِ گریہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے کہ "آج ہم ملتِ یہود کے لیے دورِ مسیحائی میں داخل ہو رہے ہیں"۔ انہی دو وجوہ سے مسجدِ اقصیٰ کو یک لخت ڈھا دینے کے بجائے تمہید کے طور پر اس کو آگ لگائی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیائے اسلام کا ردِّ عمل دیکھ لیا جائے اور دوسری طرف یہودی قوم کو آخری کارروائی کے لیے بتدریج تیار کیا جائے۔

دوسرا جُز اس منصوبے کا یہ ہے کہ "میراث کے ملک" پر قبضہ کیا جائے۔ یہ میراث کا ملک کیا ہے؟ اسرائیل کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔

"اے اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں۔"

دنیا میں صرف ایک اسرائیل ہی ایسا ملک ہے جس کے کھلم کھلا دوسری قوموں کے ملک پر قبضہ کرنے

---

[1] واضح رہے کہ مسلمان اور عیسائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح مانتے ہیں، مگر یہودی ان کا انکار کرتے ہیں اور وہ ابھی تک مسیح موعود (DROMISED MESSIAH) کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا یہ مسیح موعود وہی ہے جسے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیح دجّال قرار دیا ہے۔

[2] جس طرح ہماری فوج کے ساتھ پیش امام ہوتے ہیں اسی طرح یہودی فوج کے ساتھ ربّی ہوتے ہیں، اور ان کے چیف ربّی کو اسرائیلی فوج میں بریگیڈیر جنرل کا رینک حاصل ہے۔

کا ارادہ عین اپنی پارلیمنٹ کی عمارت پر ثبت کر رکھا ہے۔ کسی دوسرے ملک نے اس طرح علانیہ اپنی جارحیت کے ارادوں کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس منصوبے کی جو تفصیل صیہونی تحریک کے شائع کردہ نقشے میں دی گئی ہے۔ اس کی رُو سے اسرائیل جن علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ان میں دریائے نیل تک مصر، پورا اُردن، پورا شام، پورا لبنان، عراق کا بڑا حصہ، ٹرکی کا جنوبی علاقہ، اور جگر تھام کر سنیے کہ مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔ اگر دنیائے عرب اسی طرح کمزور رہی جیسی آج ہے، اور خدانخواستہ دنیائے اسلام کا ردِّ عمل بھی مسجدِ اقصٰی کی آتش زدگی پر کچھ زیادہ مُؤثر ثابت نہ ہو سکا، تو پھر خاکم بدہن ہمیں وہ بھی دیکھنا پڑے گا جب یہ دشمنانِ اسلام اپنے ان ناپاک ارادوں کو پورا کرنے کے لیے پیش قدمی کر بیٹھیں۔

پس چہ باید کرد؟

اتنی تفصیل میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ پیش نظر مسئلے کی پوری نوعیت، نزاکت اور اہمیت اچھی طرح سمجھ لی جائے، جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس سے چند باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں۔

اول یہ کہ یہودی آج تک اپنے منصوبوں میں اس بنا پر کامیاب ہوتے رہے ہیں کہ دنیا کی بڑی طاقتیں ان کی حامی و مددگار بنی رہی ہیں اور ان کی اس روش میں آئندہ بھی کسی تغیر کے امکانات نظر نہیں آتے۔ خصوصاً امریکہ کی پشت پناہی جب تک اسے حاصل ہے وہ کسی بڑے سے بڑے جرم کے ارتکاب سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔

دوم یہ کہ اشتراکی بلاک سے کوئی امید وابستہ کرنا بالکل غلط ہے۔ وہ اسرائیل کا ہاتھ پکڑنے کے لیے قطعاً کوئی خطرہ مول نہ لے گا۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس سے ہتھیار لے سکتے ہیں، اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اشتراکیت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالیں اور اسلام کو دیس نکالا دے دیں۔

سوم یہ کہ اقوامِ متحدہ ریزولیوشن پاس کرنے سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتی۔ اس میں یہ دم خم نہیں ہے کہ اسرائیل کو کسی مجرمانہ اقدام سے روک سکے۔

چہارم یہ کہ عرب ممالک کی طاقت اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی ہے۔ پچھلے ۲۲ سال کے تجربات نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی ہے۔

ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد نہ صرف مسجدِ اقصٰی، بلکہ مدینہ منورہ کو بھی آنے والے خطرات سے بچانے کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی طاقت اس

یہودی خطرے کا مقابلہ کرنے اور اسلام کے مقاماتِ مقدسہ کو مستقل طور پر محفوظ کر دینے کے لیے مجتمع کی جائے۔ اب تک یہ غلطی کی گئی ہے کہ فلسطین کے مسئلے کو ایک عرب مسئلہ بنائے رکھا گیا۔ دنیا کے مسلمان ایک مدت سے کہتے رہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کا مسئلہ ہے مگر بعض عرب لیڈروں کو اس پر اصرار رہا کہ نہیں، یہ محض ایک عرب مسئلہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب مسجدِ اقصیٰ کے سانحہ سے ان کی آنکھیں بھی کھل گئی ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ صہیونیت کی عظیم الاقوامی سازش کا مقابلہ، جبکہ دنیا کی بڑی طاقتوں کی پوری تائید و حمایت بھی اس کو حاصل ہے، تنہا عربوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔ دنیا میں اگر ایک کروڑ ۲۰ لاکھ یہودی ایک طاقت ہیں تو ۵۰ - ۶۰ کروڑ مسلمان بھی ایک طاقت ہیں، اور ان کی ۳۰ - ۳۲ حکومتیں اس وقت انڈونیشیا سے مراکو اور مغربی افریقہ تک موجود ہیں۔ ان سب کے سربراہ اگر سر جوڑ کر بیٹھیں، اور روئے زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے مسلمان ان کی پشت پر جان و مال کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو اس مسئلے کو حل کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں جو عالمی کانفرنس بھی ہو اس کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اصل مسئلہ محض مسجدِ اقصیٰ کی حفاظت کا نہیں ہے۔ مسجدِ اقصیٰ محفوظ نہیں ہو سکتی جب تک بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ اور خود بیت المقدس بھی محفوظ نہیں ہو سکتا جب تک فلسطین پر یہودی قابض ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کرانے کا ہے۔ اور اس کا سیدھا اور صاف حل یہ ہے کہ اعلان بالفور سے پہلے جو یہودی فلسطین میں آباد تھے صرف وہی وہاں رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ باقی جتنے یہودی ۱۹۱۷ء کے بعد سے اب تک وہاں باہر سے آئے اور لائے گئے ہیں انھیں واپس جانا چاہیے۔ ان لوگوں نے سازش اور جبر و ظلم کے ذریعہ سے ایک دوسری قوم کے وطن کو زبردستی اپنا قومی وطن بنایا، پھر اسے قومی ریاست میں تبدیل کیا، اور اس کے بعد توسیع کے جارحانہ منصوبے بنا کر آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا نہ صرف عملاً ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، بلکہ اپنی پارلیمنٹ کی پیشانی پر علانیہ یہ لکھ دیا کہ کس کس ملک کو وہ اپنی اس جارحیت کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایک ایسی کھلی کھلی جارح ریاست کا وجود بجائے خود ایک جرم اور بین الاقوامی امن کے لیے خطرہ ہے اور عالمِ اسلامی کے لیے اس سے بھی بڑھ کر وہ اس بنا پر خطرہ ہے کہ اس کے ان جارحانہ ارادوں کا ہدف مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ ہیں۔ اب اس ریاست کا وجود برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو ختم ہونا چاہیے۔

فلسطین کے اصل باشندوں کی ایک جمہوری ریاست بننی چاہیے۔ جس میں ملک کے پرانے یہودی باشندوں کو بھی عرب مسلمانوں اور عیسائیوں کی طرح شہری حقوق حاصل ہوں۔ اور باہر سے آئے ہوئے ان غاصبوں کو نکل جانا چاہیے جو زبردستی اس ملک کو قومی وطن اور قومی ریاست بنانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔

اس کے سوا فلسطین کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ رہا امریکہ، جو اپنا ضمیر یہودیوں کے ہاتھ رہن رکھ کر، اور تمام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر ان غاصبوں کی حمایت کر رہا ہے، تو اب وقت آگیا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اس کو صاف صاف خبردار کردیں کہ اس کی یہ روش اگر اسی طرح جاری رہی تو روئے زمین پر ایک مسلمان بھی وہ ایسا نہ پائے گا جس کے دل میں اس کے لیے کوئی ادنیٰ درجہ کا بھی جذبۂ خیرسگالی باقی رہ جائے۔ اب وہ خود فیصلہ کر لے کہ اسے یہودیوں کی حمایت میں کہاں تک جانا ہے۔ (۱۸۶)

یہودیوں کا مسلمان کے ساتھ رویہ

مسلمانوں نے اپنے اخلاق کی جس بلندی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی گرد کو بھی وہ لوگ کبھی نہ پہنچ سکے جو تہذیب و شائستگی کے علمبردار بنے پھرتے ہیں۔ یورپ کی قوموں نے افریقہ، امریکہ، ایشیا اور خود یورپ میں مغلوب قوموں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا ہے مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دور میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ قرآن ہی کی برکت ہے، جس نے مسلمانوں میں اتنی انسانیت پیدا کر دی ہے کہ وہ کبھی غلبہ پا کر اتنے ظالم نہ بن سکے جتنے غیر مسلم تاریخ کے ہر دور میں ظالم پائے گئے اور آج تک پائے جا رہے ہیں۔ کوئی آنکھیں رکھتا ہو تو خود دیکھ لے کہ اسپین میں جب مسلمان صدیوں حکمران رہے اس وقت عیسائیوں کے ساتھ ان کا کیا سلوک تھا اور جب عیسائی وہاں غالب آئے تو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہندوستان میں آٹھ سو برس کے طویل زمانۂ حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور اب ہندو غالب آ جانے کے بعد ان سے کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔ یہودیوں کے ساتھ پچھلے تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا رویہ کیا رہا اور اب فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ ان کا کیا رویّہ ہے۔ (۱۸۷)

فصل ۴

خاتمۂ بحث

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ
اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

(النساء - آیات ۱۶۰ - ۱۶۱)

ترجمہ: غرض ان یہودی بن جانے والوں کے اسی ظالمانہ رویہ کی بنا پر، اور اس بنا پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور سود لیتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا تھا، اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں، ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں، اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

یعنی وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں، بلکہ اس قدر بیباک مجرم بن چکے ہیں کہ:

دنیا میں خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو تحریک بھی اٹھتی ہے، اکثر اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ ہی کام کرتا نظر آتا ہے۔ اور راہِ حق کی طرف بلانے کے لیے جو تحریک بھی شروع ہوتی ہے اکثر اس کے مقابلے میں یہودی ہی سب سے بڑھ کر مزاحم بنتے ہیں، درآنحالیکہ یہ کمبخت کتاب اللہ کے حامل اور انبیاء کے وارث ہیں۔ ان کا تازہ ترین جرم یہ اشتراکی تحریک ہے جسے یہودی دماغ نے اختراع کیا اور یہودی رہنمائی ہی نے اسے پروان چڑھایا۔ ان نام نہاد اہلِ کتاب کے نصیب میں یہ جرم بھی مقدر تھا کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظامِ زندگی اور نظامِ حکومت خدا کے صریح انکار پر، خدا سے کھلم کھلا دشمنی پر، خدا پرستی کو مٹا دینے کے علی الاعلان عزم و ارادہ پر تعمیر کیا گیا اس کے موجد و مخترع اور بانی و سربراہ کار موسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا ہوں۔

اشتراکیت کے بعد زمانۂ جدید میں گمراہی کا دوسرا بڑا ستون فرائڈ کا فلسفہ ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ بھی بنی اسرائیل ہی کا ایک فرد ہے۔ (۱۰۳)

باب ۱

ظہورِ مسیح علیہ السّلام

فصل ۱

حضرت مریم اور ولادتِ عیسیٰؑ

اُمِّ مریم کی نذر

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۚ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (آلِ عمرٰن۔ آیت ۳۵)

ترجمہ: "(وہ اُس وقت سُن رہا تھا) جب عمران کی عورت کہہ رہی تھی کہ "میرے پروردگار، میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں، وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہوگا۔ میری اس پیشکش کو قبول فرما۔ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

اگر عمران کی عورت سے مراد "عمران کی بیوی" لی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ وہ عمران نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، بلکہ یہ حضرت مریمؑ کے والد تھے، جن کا نام شاید عمران ہوگا (مسیحی روایات میں حضرت مریمؑ کے والد کا نام یوآخیم (IOACHIM) لکھا ہے)، اور اگر عمران کی عورت سے مراد آلِ عمران کی عورت لی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ اس قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ معلومات نہیں ہے جس سے ہم قطعی طور پر ان دونوں معنوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دے سکیں، کیونکہ تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضرت مریمؑ کے والد کون تھے اور ان کی والدہ کس قبیلے کی تھیں۔ البتہ اگر یہ روایت صحیح مانی جائے کہ حضرت یحییٰؑ کی والدہ اور حضرت مریمؑ کی والدہ آپس میں رشتہ کی بہنیں تھیں تو پھر "عمران کی عورت" کے معنی قبیلۂ عمران کی عورت ہی درست ہوں گے، کیونکہ انجیل لوقا میں ہم کو یہ تصریح ملتی ہے کہ حضرت یحییٰؑ کی والدہ حضرت ہارونؑ کی اولاد سے تھیں۔ (لوقا ۱: ۵) ①

حضرت مریمؑ کی پیدائش

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ ط وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ط

وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی ۚ (آل عمران ۔ آیت ۳۶)

ترجمہ: ”پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا۔ ”مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے ــــ حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا، اللہ کو اس کی خبر تھی ــــ اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔“

یعنی لڑکا ان بہت سی کمزوریوں اور تمدنی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے، جو لڑکی کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں، لہٰذا اگر لڑکا ہوتا تو مقصد زیادہ اچھی طرح حاصل ہو سکتا تھا جس کے لیے میں اپنے بچے کو تیری راہ میں نذر کرنا چاہتی تھی۔ ②

دُعا اور قبولیتِ دُعا

وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (آل عمران ۔ ۳۶-۳۷)

ترجمہ: ”خیر، میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے اور میں اُسے اور اُس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔“ آخرکار اُس کے رب نے اُس لڑکی کو بخوشی قبول فرما لیا اور اُسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اُٹھایا۔“

حضرت مریمؑ حضرت زکریاؑ کی کفالت میں

وَّكَفَّلَهَا زَكَرِیَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَكَرِیَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ (آل عمران ۔ آیت ۳۷)

ترجمہ: ”اور زکریا کو اس کا سرپرست بنا دیا۔ زکریا جب کبھی اس کے پاس محراب[1] میں جاتا تو اُس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔“

اب اس وقت کا ذکر شروع ہوتا ہے جب حضرت مریمؑ سنِ رشد کو پہنچ گئیں اور بیت المقدس کی عبادت گاہ (ہیکل) میں داخل کر دی گئیں اور ذکرِ الٰہی میں شب و روز مشغول رہنے لگیں۔ حضرت زکریاؑ جن

---

[1] محراب سے لوگوں کا ذہن بالعموم اُس محراب کی طرف چلا جاتا ہے جو ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑے ہونے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ لیکن یہاں محراب سے یہ چیز مراد نہیں ہے۔ صوامع اور کنیسوں میں اصل عبادت گاہ کی عمارت سے متصل

(باقی برصفحہ

کی تربیت میں دے دی گئی تھیں، غالباً رشتے میں ان کے خالو تھے اور ہیکل کے مجاوروں میں سے تھے۔ یہ وہ زکریاہ نبی نہیں ہیں جن کے قتل کا ذکر بائیبل کے پرانے عہد نامے میں آیا ہے۔ ④

قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (آل عمران۔ آیت ۳۷)

ترجمہ: "پوچھا مریم، یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ جواب دیتی اللہ کے پاس سے آیا ہے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔"

حضرت مریم کے پاس ملائکہ کی آمد

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (آل عمران۔ آیات ۴۲-۴۳)

ترجمہ: "پھر وہ وقت آیا جب مریمؑ سے فرشتوں نے آکر کہا: "اے مریم، اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ اے مریمؑ، اپنے رب کی تابع فرمان بن کر رہ، اس کے آگے سربسجود ہو، اور جو بندے اس کے حضور میں جھکنے والے ہیں ان کے ساتھ تو بھی جھک جا۔"

حضرت عیسیٰؑ کی بشارت

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران۔ آیات ۴۵-۴۶-۴۷)

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

سطح زمین سے کافی بلندی پر جو کمرے بنائے جاتے ہیں، جن میں عبادت گاہ کے مجاور، خدام اور معتکف لوگ رہا کرتے ہیں، انھیں محراب کہا جاتا ہے۔ اسی قسم کے کمروں میں سے ایک میں حضرت مریم معتکف رہتی تھیں۔ ④

ترجمہ: "اور جب فرشتوں نے کہا: "اے مریمؑ، اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے، اُس کا نام مسیح عیسیٰؑ ابنِ مریمؑ ہوگا، دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا، اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ ایک مرد صالح ہوگا۔" یہ سن کر مریمؑ بولی "پروردگار، میرے ہاں بچہ کہاں سے ہوگا، مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔" جواب ملا "ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرماتا ہے تو بس کہتا ہے کہ ہوجا اور وہ ہوجاتا ہے۔""

یعنی باوجود اس کے کہ کسی مرد نے تجھے ہاتھ نہیں لگایا، تیرے ہاں بچہ پیدا ہوگا۔ یہی لفظ کَذٰلِکَ (ایسا ہی ہوگا) حضرت زکریاؑ کے جواب میں بھی کہا گیا تھا۔ اس کا جو مفہوم وہاں ہے وہی یہاں بھی ہونا چاہیے۔ نیز بعد کا فقرہ بلکہ پچھلا اور اگلا سارا بیان اسی معنی کی تائید کرتا ہے کہ حضرت مریمؑ کو صنفی مواصلت کے بغیر بچہ پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی، اور فی الواقع اسی صورت سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی۔ ورنہ اگر بات یہی تھی کہ حضرت مریمؑ کے ہاں اسی معروف فطری طریقہ سے بچہ پیدا ہونے والا تھا جس طرح دنیا میں عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے، اور اگر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش فی الواقع اسی طرح ہوئی ہوتی تو یہ سارا بیان قطعی مہمل ٹھہرتا ہے جو چوتھے رکوع سے چھٹے رکوع تک چلا جا رہا ہے، اور وہ تمام بیانات بھی بے معنی قرار پاتے ہیں جو ولادتِ مسیح کے باب میں قرآن کے دوسرے مقامات پر ہمیں ملتے ہیں۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو الٰہ اور ابن اللہ اسی وجہ سے سمجھا تھا کہ ان کی پیدائش غیر فطری طور پر بغیر باپ کے ہوئی تھی، اور یہودیوں نے حضرت مریمؑ پر الزام بھی اسی وجہ سے لگایا کہ سب کے سامنے یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ لڑکی غیر شادی شدہ تھی اور اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ اگر یہ سرے سے واقعہ ہی نہ تھا تب ان دونوں گروہوں کے خیالات کی تردید میں بس اتنا کہہ دینا بالکل کافی تھا کہ تم لوگ غلط کہتے ہو، وہ لڑکی شادی شدہ تھی، فلاں شخص اس کا شوہر تھا، اور اسی کے نُطفے سے حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تھے۔ یہ مختصر سی دو ٹوک بات کہنے کے بجائے آخر اتنی لمبی تمہیدیں اٹھانے اور پیچ در پیچ باتیں کرنے اور صاف صاف مسیح بن فلاں کہنے کے بجائے مسیح بن مریم کہنے کی آخر کیا ضرورت تھی جس سے بات سلجھنے کے بجائے اور اُلجھ جائے۔ پس جو لوگ قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں اور پھر مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ولادت حسبِ معمول باپ اور ماں کے اتصال سے ہوئی تھی وہ دراصل ثابت یہ کرتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ اظہارِ ما فی الضمیر اور بیانِ مُدّعا کی اتنی قدرت بھی نہیں رکھتا جتنی خود یہ حضرات رکھتے ہیں (معاذ اللہ) ⑤

مشرقی جانب گوشہ نشینی

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ہ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم-۱۶-۱۷)

ترجمہ: "اور (اے محمدؐ) اس کتاب میں مریمؑ کا حال بیان کرو، جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہوکر شرقی جانب گوشہ نشین ہوگئی تھی اور پردہ ڈال کر ان سے چھپ بیٹھی تھی۔ اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہوگیا۔"

سورۂ آلِ عمران میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ نے اپنی مانی ہوئی نذر کے مطابق ان کو بیت المَقدِس میں عبادت کے لیے بٹھا دیا تھا اور حضرت زکریاؑ نے ان کی حفاظت و کفالت اپنے ذمّے میں لے لی تھی۔ وہاں یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت مریمؑ بیت المَقدِس کی ایک محراب میں مُعتکف تھیں۔ اب یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ محراب جس میں حضرت مریمؑ مُعتکف تھیں بیت المَقدِس کے شرقی حصے میں واقع تھی اور انھوں نے مُعتکفین کے عام طریقے کے مطابق ایک پردہ لٹکا کر اپنے آپ کو دیکھنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے محض بائیبل کی موافقت کی خاطر مکاناً شرقیاً سے مراد ناصرہ لیا ہے انھوں نے غلطی کی ہے، کیونکہ ناصرہ یروشلم کے شمال میں ہے نہ کہ مشرق میں۔ ⑥

فرشتے کی آمد پر ان کا استعجاب

قَالَتْ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ہ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ہ قَالَتْ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ہ .... (مریم-۱۸ تا ۲۱)

ترجمہ: "مریمؑ یکایک بول اٹھی کہ "اگر تو خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔" اس نے کہا "میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں ...."

حضرت مریمؑ کے استعجاب پر فرشتے کا یہ کہنا کہ "ایسا ہی ہوگا" ہرگز اس معنی میں نہیں ہو سکتا کہ بشر تجھ کو چھوئے گا اور اس سے تیرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا، بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تیرے ہاں لڑکا ہوگا باوجود اس کے کہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا ہے۔ اوپر انہی الفاظ میں حضرت زکریاؑ کا استعجاب نقل ہو چکا ہے اور وہاں بھی فرشتے نے یہی جواب دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مطلب اس جواب کا وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے۔ اسی طرح سورۂ ذاریات، آیات ۲۸۔۳۰ میں جب فرشتہ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتا ہے اور حضرت سارہ کہتی ہیں کہ مجھ بوڑھی بانجھ کے ہاں بیٹا کیسے ہوگا تو فرشتہ ان کو جواب دیتا ہے کہ کَذٰلِکِ "ایسا ہی ہوگا"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد بڑھاپے اور بانجھ پن کے باوجود ان کے ہاں اولاد ہونا ہے۔ علاوہ بریں اگر کَذٰلِکِ کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ بشر تجھے چھوئے گا اور تیرے ہاں اسی طرح لڑکا ہوگا جیسے دنیا بھر کی عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے، تو پھر بعد کے دونوں فقرے بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ تیرا رب کہتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے، اور یہ کہ ہم اس لڑکے کو ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ نشانی کا لفظ یہاں صریحاً معجزے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور اسی معنی پر یہ فقرہ بھی دلالت کرتا ہے کہ "ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے"۔ لہٰذا اس ارشاد کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ ہم اس لڑکے کی ذات ہی کو ایک معجزے کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ (۷)

جائے اعتکاف سے دور چلی جاتی ہیں

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ (مریم۔ ۲۲)

ترجمہ: "مریم کو اس بچے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دور کے مقام پر چلی گئی"۔

دُور کے مقام سے مراد بیت لحم ہے۔ حضرت مریمؑ کا اپنے اعتکاف سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو بیت المقدس میں خدا کی عبادت کے لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اس حالت میں اگر وہ اپنی جائے اعتکاف پر بیٹھی رہتیں۔ اور ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان والے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ اس لیے بیچاری اس شدید آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر

نکل کھڑی ہوئیں تاکہ جب تک اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بدنامی سے تو بچی رہیں۔

یہ واقعہ بجائے خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوتے تھے۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور سسرال، سب کو چھوڑ چھاڑ کر وہ زچگی کے لیے تن تنہا ایک دور دراز مقام پر چلی جاتیں۔ ⑧

حالتِ زچگی کے وقت ان کی پریشانی

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا
وَكُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا ○ (مریم-۲۳)

ترجمہ: ”پھر زچگی کی تکلیف نے اسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی

”کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام و نشان نہ رہتا۔“

ان الفاظ سے اس پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں حضرت مریم اس وقت مبتلا تھیں۔ موقع کی نزاکت ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ دردِ زہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، بلکہ یہ فکر ان کو کھائے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزمائش میں انھیں ڈالا ہے اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چھپا لیا۔ اب اس بچے کو کہاں لے جائیں۔ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے ان سے کہا ”غم نہ کر“ اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ حضرت مریم نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے۔ شادی شدہ لڑکی کے ہاں جب پہلا بچہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے، اسے رنج و غم کبھی لاحق نہیں ہوا کرتا۔ ⑨

فرشتے کی ندا

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا ○ وَهُزِّیْۤ
اِلَیْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَیْكِ رُطَبًا جَنِیًّا ○ فَكُلِیْ وَاشْرَبِیْ وَقَرِّیْ
عَیْنًا ج فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوْلِیْۤ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ
صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا ○ (مریم- ۲۵-۲۶)

ترجمہ: ”فرشتے نے پائنتی سے اس کو پکار کر کہا: ”غم نہ کر۔ تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے اور تو اس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اوپر تر و تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔

بس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہہ دے
کہ میں نے رحمان کے لیے روزے کی نذر مانی ہے، اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی۔"

مطلب یہ ہے کہ بچے کے معاملے میں تجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی پیدائش پر جو کوئی بھی معترض ہو اس کا جواب اب ہمارے ذمے ہے (واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں چُپ کا روزہ رکھنے کا طریقہ رائج تھا) یہ الفاظ بھی صاف بتا رہے ہیں کہ حضرت مریمؑ کو اصل پریشانی کیا تھی۔ نیز یہ بھی امر قابلِ غور ہے کہ شادی شدہ لڑکی کے ہاں پہلوٹی کا بچہ اگر دنیا کے معروف طریقہ پر پیدا ہو تو آخر اُسے چُپ کا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے ؟ ⑩

حضرت مریمؑ قوم کے سامنے

فَأَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۚ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ۝
يٰاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا (مریم ۲۷-۲۸)

ترجمہ: "پھر وہ اس بچے کو لیے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی۔ لوگ کہنے لگے "اے مریم! یہ تو تو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن، نہ تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی۔"

ان الفاظ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انھیں ظاہری معنی میں لیا جائے اور سمجھا جائے کہ حضرت مریمؑ کا کوئی بھائی ہارون نامی ہو۔ دوسرے یہ کہ عربی محاورے کے مطابق اُخْتِ ہارون کے معنی "ہارون کے خاندان کی لڑکی" لیے جائیں، کیونکہ عربی میں یہ ایک معروف طرزِ بیان ہے۔ مثلاً قبیلہ مُضر کے آدمی کو یا اخا مُضر (اے مُضر کے بھائی) اور قبیلہ ہمدان کے آدمی کو یا اخا ھمدان (اے ہمدان کے بھائی) کہہ کر پکارتے ہیں۔ پہلے معنی کے حق میں دلیلِ ترجیح یہ ہے کہ بعض روایات میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنی منقول ہوئے ہیں۔ اور دوسرے معنی کی تائید میں دلیل یہ ہے کہ موقع و محل اس معنی کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ اس واقعہ سے قوم میں جو ہیجان برپا ہوا تھا اس کی وجہ بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہارون نامی ایک گمنام شخص کی کنواری بہن گود میں بچہ لیے ہوئے آئی تھی، بلکہ جس چیز نے لوگوں کا ایک ہجوم حضرت مریمؑ کے گرد جمع کر دیا تھا وہ یہی ہو سکتی تھی کہ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے، خانوادۂ ہارون کی ایک لڑکی اس حالت میں پائی گئی۔ اگرچہ ایک حدیث مرفوع کی موجودگی میں کوئی دوسری تاویل اصولاً قابلِ لحاظ نہیں ہو

سکتی، لیکن مسلم، نسائی اور ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ان الفاظ کے معنی لازماً "ہارون کی بہن" ہی ہیں۔ مغیرہ بن شعبہ کی روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا کہ قرآن میں حضرت مریمؑ کو ہارون کی بہن کہا گیا ہے، حالانکہ حضرت ہارونؑ ان سے سینکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے، حضرت مغیرہؓ ان کے اس اعتراض کا جواب نہ دے سکے اور انھوں نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ ماجرا عرض کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ "تم نے یہ جواب کیوں نہ دے دیا کہ بنی اسرائیل اپنے نام انبیاء وصلحاء کے نام پر رکھتے تھے"، حضورؐ کے اس ارشاد سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ لاجواب ہونے کے بجائے یہ جواب دے کر اعتراض رفع کیا جا سکتا تھا۔ (۱۱ا)

جو لوگ حضرت عیسیٰؑ[1] کی معجزانہ پیدائش کے منکر ہیں وہ آخر اس بات کی کیا معقول توجیہ کر سکتے ہیں کہ حضرت مریمؑ کے بچہ لیے ہوئے آنے پر قوم کیوں چڑھ کر آئی اور اس پر طعن اور ملامت کی بوچھاڑ اس نے کیوں کی؟ (۱۱ب)

گہوارے میں حضرت عیسیٰؑ کا کلام کرنا

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ اِنِّىْ
عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِىْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ
وَاَوْصٰنِىْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ (مریم - ۲۹-۳۱)

ترجمہ: "مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ لوگوں نے کہا "ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے؟" بچہ بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی، اور نبی بنایا، اور بابرکت کیا اور جہاں بھی رہوں، اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک زندہ رہوں"۔

حضرت عیسیٰؑ کی ابتدائی پرورش کہاں ہوئی؟

مختلف لوگوں نے اس سے مختلف مقامات مراد لیے ہیں۔ کوئی دمشق کہتا ہے، کوئی الرَّملہ، کوئی بیتُ المقدس،

---

[1] حضرت عیسیٰؑ کے تفصیلی حالات مؤلف موصوف کی کتاب قصص القرآن میں ملاحظہ ہوں۔

اور کوئی معر، مسیحی روایات کے مطابق حضرت مریمؑ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد ان کی حفاظت کے لیے دو مرتبہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئیں۔ پہلے ہیرودیس بادشاہ کے عہد میں وہ انھیں مصر لے گئیں اور اس کی موت تک وہیں رہیں۔ پھر اَرخِلاؤس کے عہدِ حکومت میں ان کو گلیل کے شہر ناصرہ میں پناہ لینی پڑی (متی ۲ - ۱۳ تا ۲۳)۔ اب یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ قرآن کا اشارہ کس مقام کی طرف ہے۔ لغت میں رَبوَہ اس بلند زمین کو کہتے ہیں جو ہموار ہو اور اپنے گرد و پیش کے علاقے سے اونچی ہو۔ ذاتِ قرار سے مراد یہ ہے کہ اس جگہ ضرورت کی سب چیزیں پائی جاتی ہوں اور رہنے والا وہاں بفراغت زندگی بسر کر سکتا ہو اور مَعین سے مراد بہتا ہوا پانی یا چشمۂ جاری۔ ⑫

اس واقعہ کی ایک مہمل تاویل

قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ "ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے" یعنی ان کے نزدیک یہ گفتگو حضرت عیسیٰؑ کی جوانی کے زمانے میں ہوئی اور بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں نے کہا کہ بھلا اس لڑکے سے کیا بات کریں جو کل ہمارے سامنے گہوارے میں پڑا ہوا تھا۔ مگر جو شخص موقع و محل اور سیاق و سباق پر کچھ بھی غور کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ یہ محض ایک مہمل تاویل ہے جو معجزے سے بچنے کے لیے کی گئی ہے۔ اور کچھ نہیں تو ظالموں نے یہی سوچا ہوتا کہ جس بات پر اعتراض کرنے کے لیے وہ لوگ آئے تھے وہ تو بچے کی پیدائش کے وقت پیش آئی تھی نہ کہ اس کے جوان ہونے کے وقت۔

علاوہ بریں سورۂ آلِ عمران کی آیت ۴۶، اور سورۂ مائدہ کی آیت ۱۰ دونوں اس بات کی قطعی صراحت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ کلام جوانی میں نہیں بلکہ گہوارے میں ایک نوزائیدہ بچے کی حیثیت ہی سے کیا تھا۔ پہلی آیت میں فرشتہ حضرت مریمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرے گا اور جوان ہو کر بھی۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ خود حضرت عیسیٰؑ سے فرماتا ہے کہ تو لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرتا تھا اور جوانی میں بھی۔ ⑬

بے باپ پیدائش کی دلیل

وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا (مریم-۳۲)

ترجمہ: "اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا۔"

یہ نہیں فرمایا کہ والدین کا حق ادا کرنے والا۔ صرف والدہ کا حق ادا کرنے والا فرمایا ہے۔ یہ بھی اس

بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا باپ کوئی نہ تھا۔ اور اسی کی ایک صریح دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہر جگہ ان کو عیسیٰؑ ابنِ مریمؑ کہا گیا ہے۔ ⑭

وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ أَمُوْتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ۝ (مریم ۔ ۳۳)

ترجمہ: "سلام ہے مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جبکہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں۔"

یہ ہے وہ "نشانی" جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کی مسلسل بدکرداریوں پر عبرتناک سزا دینے سے پہلے ان پر حجت تمام کرنا چاہتا تھا۔ اسی کے لیے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک ایسی زاہدہ و عابدہ لڑکی کو جو بیت المقدس میں معتکف اور حضرت زکریاؑ کے زیرِ تربیت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا تاکہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے اور لوگوں کی توجہات یکلخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک ہجوم حضرت مریم پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا تاکہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نبوت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود رہیں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوت کا انکار کرے اور اس کی پیروی قبول کرنے کے بجائے اسے مجرم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے تو پھر اس کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے جو دنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔ ⑮

فصل ۲

حضرت مسیحؑ کی معجزانہ پیدائش کے متعلّق چند نکات

حضرت مسیحؑ کی پیدائش اور سنّت اللہ

یہ کہنا کہ اللہ اپنی سنّت نہیں بدلتا، اپنی جگہ صحیح ہے۔ مگر اللہ کی سنّت کیا ہے اور کیا نہیں ہے، اس کا فیصلہ کرنے والے ہم نہیں بلکہ اللہ خود ہی ہے۔ جس چیز کو خدا نے خود اپنی سنّت کہا ہو اس کے خلاف تو کچھ نہیں ہوسکتا مگر جسے ہم اس کی سنت قرار دے لیں اس کے خلاف بہت کچھ ہوسکتا ہے، کیونکہ اللہ نے اس کی پابندی کا کوئی ذمہ نہیں لیا ہے۔ آخر اللہ نے یہ کب کہا ہے کہ مرد کے بغیر عورت کے ہاں بچہ پیدا ہونا میری سنّت کے خلاف ہے، یا میری سنّت یہ ہے کہ عورت کے ہاں صرف مرد کے ملاپ ہی سے بچہ پیدا ہوسکتا ہے۔ بنی نوعِ انسان کے اوّلین فرد اور اس کے جوڑے کی پیدائش آخر کس مرد اور عورت کے ملاپ کا نتیجہ تھی؟ اللہ نے خود فرمایا ہے کہ ہم نے حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا اور ان کے جوڑے کو ان سے پیدا کیا۔ اگر اس جوڑے کی پیدائش سنت اللہ کے خلاف نہیں تو حضرت مسیح علیہ السلام کی بغیر والد کے پیدائش کیوں سنت اللہ کے خلاف ہے؟ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے خود بھی مسیح علیہ السلام کی پیدائش کو آدم علیہ السلام کی پیدائش سے تشبیہ دی ہے۔ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران - آیت ۵۹) "درحقیقت عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے جسے اللہ نے مٹی سے بنایا، پھر فرمایا کہ ہوجا اور بس وہ ہوگیا۔" ⑯

معجزانہ پیدائش کی وجہ سے حضرت عیسیٰؑ ابن اللہ نہیں ہیں

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ج قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ مَا كَانَ
لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ لا سُبْحٰنَهٗ ط اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ
لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (مریم - ۳۴-۳۵)

ترجمہ: "یہ ہے عیسیٰؑ ابن مریم اور یہ ہے اس کے بارے میں وہ سچی بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔ اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ وہ پاک ذات ہے۔ وہ جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا، اور بس وہ ہو جاتی ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ ہونے کا جو عقیدہ عیسائیوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ باطل ہے۔ جس طرح ایک معجزے سے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش نے ان کو خدا کا بیٹا نہیں بنا دیا اسی طرح ایک دوسرے معجزے سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر انھیں خدا کا بیٹا قرار دے دیا جائے۔ عیسائیوں کی اپنی روایات میں بھی یہ بات موجود ہے کہ حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ، دونوں ایک ہی طرح کے معجزے سے پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ لوقا کی انجیل میں قرآن کی طرح ان دونوں معجزوں کا ذکر ایک سلسلۂ بیان میں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ عیسائیوں کا غلو ہے کہ وہ ایک معجزے سے پیدا ہونے والے کو اللہ کا بندہ کہتے ہیں اور دوسرے معجزے سے پیدا ہونے والے کو اللہ کا بیٹا بنا بیٹھے ہیں۔ ⑰

پیدائش میں حضرت عیسیٰؑ کی حضرت آدمؑ سے مماثلت

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء ۔ ۹۱)

ترجمہ: "اور وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ ہم نے اس کے اندر اپنی روح سے پھونکا اور اسے اور اس کے بیٹے کو دنیا بھر کے لیے نشانی بنا دیا۔"

مراد ہیں حضرت مریم علیہا السلام (تفہیم القرآن ج ۳۔ الانبیاء، حاشیہ ۸۸)

حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ (ص ۔ آیات ۷۱ ۔ ۷۲) "میں مٹی سے ایک بشر بنا رہا ہوں، پس (اے فرشتو) جب میں اسے پورا بنا لوں اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔" اور یہی بات حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مختلف مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (آیت ۱۷۱) "اللہ کا رسول اور اس کا فرمان جو مریم کی طرف القا کیا گیا اور اس کی طرف سے ایک روح" اور سورۂ تحریم میں ارشاد ہوا وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا

(آیت ۱۲) ”اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی پس پھونک دیا ہم نے اس میں اپنی روح سے“۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور حضرت آدمؑ کی پیدائش کو ایک دوسرے کے مشابہ قرار دیتا ہے، چنانچہ سورۂ آل عمران میں فرمایا۔ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (آیت ۵۹) ”عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے جس کو اللہ نے مٹی سے بنایا پھر فرمایا ”ہو جا“ اور وہ ہو جاتا ہے“۔ ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ معمولی طریقۂ تخلیق کے بجائے جب اللہ تعالیٰ کسی کو براہِ راست اپنے حکم سے وجود میں لاکر زندگی بخشتا ہے تو اس کو ”اپنی روح سے پھونکنے“ کے الفاظ سے تعبیر فرماتا ہے۔ اس روح کی نسبت اللہ کی طرف غالباً اس وجہ سے کی گئی ہے کہ اس کا پھونکا جانا معجزے کی غیر معمولی شان رکھتا ہے۔ (۱۸)

اعجازی پیدائش عجائباتِ تخلیق کا ایک نمونہ ہے

قُلْ فَمَنْ یَّمْلِکُ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّھْلِکَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّہٗ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا ط یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ط وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (المائدہ۔ آیت ۱۷)

ترجمہ: ”اے محمدؐ! ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابن مریمؑ اور اُس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکے؟ اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور ان سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے“۔

اس فقرے میں ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ محض مسیحؑ کی اعجازی پیدائش اور ان کے اخلاقی کمالات اور محسوس معجزات کو دیکھ کر جو لوگ اس دھوکہ میں پڑ گئے کہ مسیحؑ ہی خدا ہیں وہ درحقیقت نہایت نادان ہیں۔ مسیحؑ تو اللہ کے بے شمار عجائبِ تخلیق میں سے محض ایک نمونہ ہے جسے دیکھ کر ان ضعیف البصر لوگوں کی نگاہیں چوندھیا گئیں۔ اگر ان لوگوں کی نگاہ کچھ وسیع ہوتی تو انھیں نظر آتا کہ اللہ نے اپنی مخلوق کے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز نمونے پیش کیے ہیں اور اس کی قدرت کسی حد کے اندر محدود نہیں ہے پس یہ بڑی بے دانشی ہے کہ مخلوق کے کمالات کو دیکھ کر اسی پر خالق ہونے کا گمان کر لیا جائے۔ دانشمند وہ ہیں جو مخلوق کے کمالات میں خالق کی عظیم الشان قدرت کے نشانات دیکھتے ہیں اور ان سے ایمان کا نور

حاصل کرتے ہیں۔ ⑲

"کلمہ" اور "روح من اللہ" کی بحث

اصل میں لفظ "کلمہ" استعمال ہوا ہے۔ مریم کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضرت مریم علیہا السلام کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد کے نطفہ سے سیراب ہوئے بغیر حمل کا استقرار قبول کرلے۔ عیسائیوں کو ابتداءً مسیح علیہ السلام کی پیدائش بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا۔ مگر انھوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہوکر پہلے لفظ "کلمہ" کو "کلام" کہا کہ اللہ تعالیٰ کی اس ذاتی صفت نے مریم علیہا السلام کے بطن میں داخل ہوکر جسمانی صورت اختیار کی جو مسیح کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصور نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی ازلی صفات میں سے نطق و کلام کی صفت کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

مسیح کو رُوْحٌ مِّنْهُ (خدا کی طرف سے ایک روح) کہا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (ہم نے پاک رُوح سے مسیح کی مدد کی) دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ روح عطا کی تھی جو بدی سے ناآشنا تھی۔ سراسر حقانیت اور راست بازی تھی، اور از سرتا پا فضیلتِ اخلاق تھی۔ یہی تعریف آنجناب کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی۔ مگر انھوں نے اس میں بھی غلو کیا، رُوْحٌ مِّنَ اللّٰهِ کو عین رُوح اللہ قرار دے لیا، اور روح القدس (HOLI GHOST) کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی روحِ مقدس تھی جو مسیح کے اندر حلول کر گئی تھی۔ اس طرح اللہ اور مسیح کے ساتھ ایک تیسرا خدا رُوح القدس بنا ڈالا گیا۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست غلو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ لطف یہ ہے کہ آج بھی انجیل متی میں یہ فقرہ موجود ہے کہ "فرشتے نے اسے (یعنی یوسف نجار کو) خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اے یوسف ابن داؤد! اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر، کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے۔" (باب ۱۔ آیت ۲۰) ⑳

عیسیٰ اور مریم علیہما السلام دونوں مل کر "ایک نشانی" ہیں

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ۝

(المومنون۔ آیت ۵۰)

ترجمہ: "اور ابنِ مریمؑ اور اس کی ماں کو ہم نے ایک نشانی بنایا اور ان کو ایک سطحِ مُرتفع پر رکھا جو اطمینان کی جگہ تھی اور چشمے اس میں جاری تھے۔"

یہ نہیں فرمایا کہ ایک نشانی ابنِ مریم تھے اور ایک نشانی خود مریم۔ اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ ابنِ مریم اور اس کی ماں کو دو نشانیاں بنایا۔ بلکہ فرمایا یہ ہے کہ دونوں مل کر ایک نشانی بنائے گئے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ باپ کے بغیر ابنِ مریمؑ کا پیدا ہونا، اور مرد کی صحبت کے بغیر مریمؑ کا حاملہ ہونا ہی وہ چیز ہے جو ان دونوں کو ایک نشانی بناتی ہے۔ جو لوگ حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش بے پدر کے منکر ہیں وہ ماں اور بیٹے کے ایک آیت ہونے کی کیا توجیہ کریں گے؟ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول آلِ عمران، حواشی ۴۴-۵۳۔ النساء حواشی ۱۹۰-۲۱۲-۲۱۳- جلد سوم مریم، حواشی ۱۵ تا ۲۲- الانبیاء، حواشی ۸۹-۹۰) یہاں دو باتیں اور بھی قابلِ توجہ ہیں۔ اوّل یہ کہ حضرت عیسٰیؑ اور ان کی والدۂ ماجدہ کا معاملہ جاہل انسانوں کی ایک دوسری کمزوری کی نشان دہی کرتا ہے۔ انبیاء پر تو ایمان لانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا گیا کہ تم بشر ہو، بھلا بشر بھی کہیں نبی ہو سکتا ہے۔ مگر حضرت عیسٰیؑ اور ان کی والدہ کے جب لوگ معتقد ہوئے تو پھر ایسے ہوئے کہ انھیں بشریت کے مقام سے اٹھا کر خدائی کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ دوم یہ کہ جن لوگوں نے حضرت عیسٰیؑ کی معجزانہ پیدائش، اور ان کی گہوارے والی تقریر سے اس کے معجزہ ہونے کا کھلا ثبوت دیکھ لینے کے باوجود ایمان لانے سے انکار کیا اور حضرت مریم پر تہمت لگائی ان کو پھر سزا بھی ایسی دی گئی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا کے سامنے ایک نمونۂ عبرت بن گئی۔ (۲۱)

باب ۲

حضرت عیسیٰؑ کی دعوت اور تعلیمات

فصل ۱

حضرت عیسیٰؑ کی اساسی تعلیم

میں بیّنات لے کر آیا ہوں

وَلَمَّا جَآءَ عِیْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُکُمْ بِالْحِکْمَۃِ وَلِاُبَیِّنَ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْہِ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ؕ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۔ الزخرف۔ ۶۳-۶۴)

ترجمہ: "اور جب عیسیٰؑ صریح نشانیاں لیے ہوئے آیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، اور اس لیے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔"

یعنی عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ میں خدا ہوں یا خدا کا بیٹا ہوں اور تم میری عبادت کرو، بلکہ ان کی دعوت وہی تھی جو دوسرے تمام انبیاء کی دعوت تھی۔ ㉒

اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ؕ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (مریم۔ ۳۶)

ترجمہ: (اور عیسیٰؑ نے کہا تھا) "اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، پس تم اس کی بندگی کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت بھی وہی تھی جو تمام دوسرے انبیاء علیہم السلام لے کر آئے تھے۔ انھوں نے اس کے سوا کچھ نہیں سکھایا تھا کہ صرف خدائے واحد کی بندگی کی جائے۔ اب یہ جو تم نے ان کو بندے کے بجائے خدا بنا لیا ہے اور انھیں عبادت میں اللہ کے ساتھ شریک کر رہے ہو، یہ تمہاری اپنی ایجاد ہے، تمہارے پیشوا کی یہ تعلیم ہرگز نہیں تھی۔ ㉓

نبوتِ عیسیٰؑ کے بیّنات

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ إِذْ أَيَّدْتُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۖ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيلَ ۖ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي ۖ وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَآءِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ (المائدہ - آیت ۱۱۰)

ترجمہ: "پھر تصور کرو اس موقع کا جب اللہ فرمائے گا کہ اے مریمؑ کے بیٹے عیسیٰ، یاد کر میری اس نعمت کو جو میں نے تجھے اور تیری ماں کو عطا کی تھی، میں نے رُوحِ پاک سے تیری مدد کی، تو گہوارے میں بھی لوگوں سے بات کرتا تھا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی، تو میرے حکم سے مٹی کا پتلا پرندے کی شکل کا بناتا اور اس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا، تو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتا تھا، تو مُردوں کو میرے حکم سے نکالتا تھا، پھر جب تو بنی اسرائیل کے پاس صریح نشانیاں لے کر پہنچا اور جو لوگ ان میں سے منکرِ حق تھے انھوں نے کہا کہ یہ نشانیاں جادوگری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں تو میں نے ہی تجھے ان سے بچایا۔"

دینِ موسوی کی تجدید

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ (آلِ عمران - آیت ۵۰-۵۱)

ترجمہ: "اور میں اس تعلیم و ہدایت کا تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے۔"

یعنی یہ میرے فرستادۂ خدا ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ اگر میں اس کی طرف سے بھیجا ہوا نہ ہوتا بلکہ جھوٹا مدعی ہوتا تو خود ایک مستقل مذہب کی بنا ڈالتا اور اپنے ان کمالات کے زور پر تمھیں سابق دین سے ہٹا کر اپنے ایجاد کردہ دین کی طرف لانے کی کوشش کرتا۔ لیکن میں تو اسی اصل دین کو مانتا ہوں اور

اسی تعلیم کو صحیح قرار دے رہا ہوں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر مجھ سے پہلے لائے تھے۔

یہ بات کہ مسیح علیہ السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء نے پیش کیا تھا، رائج الوقت اناجیل میں بھی واضح طور پر ہمیں ملتی ہے۔ مثلاً متی کی روایت کے مطابق پہاڑی کے وعظ میں مسیح علیہ السلام صاف فرماتے ہیں۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔"

ایک یہودی عالم نے حضرت مسیحؑ سے پوچھا کہ اصل دین میں اولین حکم کونسا ہے۔ جواب میں آپ نے فرمایا: "خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اس کے مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے۔" (متی ۲۲ : ۳۴ - ۴۰)

پھر حضرت مسیحؑ اپنے شاگردوں سے فرماتے ہیں،

"فقیہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو مگر ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔" (متی ۲۳ : ۲ - ۳) ㉔

حضرت عیسیٰ کی دعوت کے تین نکات

تمام انبیاءؑ کی طرح حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کے بنیادی نکات تین تھے:

ایک یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ، جس کے مقابلہ میں بندگی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کی اطاعت پر اخلاق و تمدن کا پورا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اس مقتدرِ اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلت و حرمت، اور جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو، دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیے جائیں۔

پس درحقیقت حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کے مشن میں یک سرِ مُو فرق نہیں ہے۔ؔ

ؔ جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیے ہیں اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اعتبار سے فرق

انجیل اور دعوت کے تین نکات

افسوس ہے کہ موجودہ اناجیل میں مسیح علیہ السلام کے مشن کو اس وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا جس طرح قرآن (آلِ عمران ۵۰-۵۱) میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم منتشر طور پر اشارات کی شکل میں وہ تینوں بنیادی نکات ہمیں ان کے اندر ملتے ہیں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ مسیح صرف اللہ کی بندگی کے قائل تھے ان کے اس اشارے صاف ظاہر ہوتی ہے۔

”تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر“ (متی ۴ : ۱۰)

اور صرف یہی نہیں کہ وہ اس کے قائل تھے بلکہ ان کی ساری کوششوں کا مقصود یہ تھا کہ زمین پر خدا کے امرِ شرعی کی اسی طرح اطاعت ہو جس طرح آسمان پر اس کے امرِ تکوینی کی اطاعت ہو رہی ہے۔

”تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔“

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام اپنے آپ کو نبی اور آسمانی بادشاہت کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرتے تھے اور اسی حیثیت سے لوگوں کو اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیتے تھے، ان کے متعدد اقوال سے معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے جب اپنے وطن ناصرہ سے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کے اپنے ہی بھائی بند اور اہلِ شہر ان کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس پر متی، مرقس اور لوقا تینوں کی متفقہ روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا ”نبی اپنے وطن میں مقبول نہیں ہوتا“ اور جب یروشلم میں ان کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں اور لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ کہیں اور چلے جائیں تو انھوں نے جواب دیا ”ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو“ (لوقا ۱۳ ، ۲۳) آخری مرتبہ جب وہ یروشلم میں داخل ہو رہے تھے تو ان کے شاگردوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا ”مبارک ہے وہ بادشاہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے“ اس پر یہودی علماء ناراض

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کیا ہے انھوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اس کی رعیت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود مختاری سے روکے اور شرک سے (یعنی اس بات سے کہ وہ اقتدارِ اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کریں) منع کرے اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔

ہوئے اور انھوں نے حضرت مسیحؑ سے کہا کہ آپ اپنے شاگردوں کو چپ کریں اس پر آپ نے فرمایا" اگر یہ چپ رہیں گے تو پتھر پکار اٹھیں گے۔" (لوقا ۱۹: ۳۸-۴۰) ایک اور موقع پر آپ کے فرمایا:

"اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو، سب میرے پاس آؤ، میں تم کو آرام دوں گا،

میرا جوا اپنے اوپر اٹھالو .... میرا جوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا ہے"۔ (متی ۱۱: ۲۸-۳۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام انسانی ساخت کے قوانین کے بجائے خدائی قانون کی اطاعت کرانا چاہتے تھے۔ متی اور مرقس کی اُس روایت سے خاص طور پر مترشح ہوتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودی علماء نے اعتراض کیا کہ آپ کے شاگرد بزرگوں کی روایات کے خلاف ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کیوں کھا لیتے ہیں۔ اس پر حضرت مسیحؑ نے فرمایا تم ریاکاروں کی حالت وہی ہے جس پر یَسعیاہ نبی کی زبان سے یہ طعنہ دیا گیا ہے کہ" یہ امت زبان سے تو میری تعظیم کرتی ہے مگر ان کے دِل مجھ سے دُور ہیں، کیونکہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں" تم لوگ خدا کے حکم کو تو باطل کرتے ہو اور اپنے گھڑے ہوئے قوانین کو برقرار رکھتے ہو۔ خدا نے توراۃ میں حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی عزّت کرو اور جو کوئی ماں باپ کو بُرا کہے وہ جان سے مارا جائے۔ مگر تم کہتے ہو کہ جو شخص اپنی ماں یا باپ سے یہ کہہ دے کہ میری جو خدمات تمہارے کام آسکتی تھیں انھیں میں خدا کی نذر کر چکا ہوں، اس لیے بالکل جائز ہے کہ پھر ماں یا باپ کی کوئی خدمت نہ کرے۔ (متی ۱۵: ۲-۹، مرقس ۷: ۵-۱۳) (۲۵)

فصل ۲

مروّجہ چار انجیلوں میں تعلیماتِ عیسوی

چونکہ ہمارے زمانے کے موجودہ حالات ان حالات سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ جن میں سیدنا مسیحؑ نے اہلِ فلسطین کو حکومتِ الٰہیہ کی دعوت دی تھی، اس لیے ان کے طریقِ عمل میں ہم کو مفید ہدایات مل سکتی ہیں۔ ذیل میں ہم ان کے بعض اشارات نقل کرتے ہیں:

دعوتِ توحید

"فقیہوں میں سے ایک .... اس سے پوچھا کہ سب حکموں میں سے اول حکم کون سا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ اوّل یہ ہے: "اے اسرائیل سن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ"....... فقیہ نے اس سے کہا: "اے استاد، کیا خوب تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں۔" (مرقس ۔ ۱۲ : ۲۸ - ۳۲)

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔" (لوقا ۴ : ۸)

حکومتِ الٰہی

"پس تم اس طرح دعا مانگو۔ کہ اے ہمارے باپ، تو جو آسمان پر ہے۔ تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔" (متی ۶ : ۹ - ۱۰)

آخری آیت میں حضرت مسیح نے اپنے نصب العین کو واضح کر دیا ہے۔ یہ جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے ان کی مراد روحانی بادشاہت تھی۔ یہ آیت اس کی تردید کرتی ہے۔ ان کا صاف مقصد یہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اس کا حکمِ شرعی اسی طرح جاری ہو، جس طرح تمام کائنات میں اس کا قانونِ طبعی نافذ ہے۔ اسی انقلاب کے لیے وہ لوگوں کو تیار کر رہے تھے۔

حق و باطل کی کشمکش کا پیغام

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں، میں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور اس کی بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔ اور آدمی کے دشمن اُس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔"

راہِ حق میں آزمائش ضروری ہے

"اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے[1] اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا۔ اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا۔"

(متی ۱۰۱، ۳۴-۳۹)

"جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی خودی[2] سے انکار کر دے اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہولے۔" (متی ۱۶: ۲۴)

"بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالے کرے گا اور بیٹے کو باپ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر انھیں مروا ڈالیں گے۔ اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا۔" (متی ۱۰: ۲۱-۲۲)

"دیکھو میں تمھیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کے بیچ میں .... آدمیوں سے خبردار رہو۔ کیونکہ وہ تمھیں عدالتوں کے حوالے کردیں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمھارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے۔"، ۱۰: ۱۶-۱۸)

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں، بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے[3] تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اُٹھائے

---

[1] اپنی صلیب اٹھانے سے مراد سزائے موت کے لیے تیار رہنا ہے۔ جس طرح اردو محاورہ میں ہے۔ سر ہتھیلی پر رکھنا۔ (مؤلف)

[2] اس سے مراد ہے خود پرستی اور اغراض ذاتی سے دست بردار ہو جانا۔ (مؤلف)

[3] دشمنی کرنے سے مراد اُن کی محبت اور اُن کے مفاد کو اسلامی تحریک پہ قربان کرنا ہے (مؤلف)

اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ برج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کرے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر ہنسنا شروع کر دیں کہ اس شخص نے عمارت تو شروع کی مگر تیار نہ کر سکا ...... تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کر دے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔" (لوقا ۱۴: ۲۶-۳۳)

انقلابی تحریک

یہ تمام آیات صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام محض ایک دھرم کا پرچار کرنے نہیں اٹھے تھے بلکہ پورے نظامِ تمدن و سیاست کو بدل دینا ان کے پیشِ نظر تھا جس میں رومی سلطنت، یہودی ریاست، فقیہوں اور فریسیوں کے اقتدار اور فی الجملہ تمام بندگانِ نفس و ہوائے نفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ لوگوں کو کھلے الفاظ میں بتا دیتے تھے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے۔ اور میرے ساتھ اسی کو آنا چاہیے جو ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

مسلکِ صبر کی تلقین

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔" (متی ۱۵: ۳۹-۴۱)

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کرتے ان سے نہ ڈرو۔ بلکہ اس سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔" (متی - ۱۰ - ۲۸)

حُبِّ دُنیا سے اجتناب اور فکرِ آخرت کی دعوت

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو۔ جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے۔ اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو۔" (متی ۶: ۱۹-۲۰)

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے۔ اور نہ بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں۔ پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو

کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کرکے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی شان و شوکت کے ان میں سے کسی مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا پس جب خدا میدان کی گھاس کو، جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی، ایسی پوشاک پہناتا ہے۔ تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ تم پہلے اس کی بادشاہت اور اس کی راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمھیں مل جائیں گی"۔ (متی ۶ : ۲۴-۳۳)

"مانگو تو تمھیں دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو تم پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ، تو تمھارے واسطے کھولا جائے گا۔" (متی ۔ ۷ : ۷)

تحمّلِ شدائد کی تعلیم کا مقصد

عام غلط فہمی ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے رہبانیت اور ترک و تجرید کی تعلیم دی ہے حالانکہ اس انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحمُّلِ شدائد اور توکل علی اللہ کی تعلیم و تربیت دیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں جہاں ایک نظامِ تمدن و سیاست پوری طاقت کے ساتھ زمین پر چھایا ہوا ہو اور تمام وسائل و ذرائع زندگی اس کے قبضۂ اختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی جماعت انقلاب کے لیے اٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان و مال کی محبت دل سے نکال نہ دے، سختیاں اٹھانے کو تیار نہ ہو جائے، اپنے بہت سے فوائد کو قربان کرنے اور بہت سے نقصانات کو گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حاضر الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام آفات و مصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہوتا ہے۔ یہ کام جنھیں کرنا ہو انھیں ایک تھپیڑ کھا کر دوسرے تھپیڑ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ کرتا ہاتھ سے جاتا ہو تو چوغہ بھی چھوڑنے کے لیے آمادہ ہونا چاہیے۔ اور روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہونا چاہیے۔ خزائنِ رزق فی الوقت جن کے ہاتھ میں ہیں، ظاہر ہے کہ ان سے لڑ کر رزق پانے کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا جو اس بات سے قطع نظر کر کے صرف خدا کے بھروسہ پر اس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو، وہی ان سے لڑ سکتا ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کا جامع مینی فسٹو

"اے محنت اٹھانے والو، بوجھ سے دبے ہوئے لوگو سب میرے پاس آؤ میں تمھیں آرام

دوں گا۔ کیونکہ میرا جُوا ملائم ہے۔ اور میرا بوجھ ہلکا۔" (متی ۱۱: ۲۸-۳۰)

شاید حکومتِ الٰہیہ کا مینی فسٹو اس سے زیادہ مختصر اور پراثر الفاظ میں مرتب نہیں کیا جا سکتا انسان پر انسانی حکومت کا جُوا بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے۔ اس بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کو الٰہی حکومت کا نقیب جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس حکومت کا جُوا میں تمہارے اوپر رکھنا چاہتا ہوں، وہ نرم بھی ہے اور خفیف بھی۔

حکومت خدمت ہے

"غیر قوموں کے بادشاہ ان پر حکومت چلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا، بلکہ جو تم میں بڑا ہے وہ چھوٹے کے مانند اور جو سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کی مانند ہے۔"

(لوقا ۲۲: ۲۵-۲۶)

حضرت مسیحؑ یہ ہدایت اپنے حواریوں یعنی صحابیوں کو فرماتے تھے۔ اس مضمون کے متعدد اقوال انجیلوں میں موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کہیں فرعونوں اور نمرودوں کو ہٹا کر تم خود فرعون و نمرود نہ بن جانا۔

یہودی علماء و مشائخ پر تنقید

"فقیہہ اور فریسی[1] موسیٰؑ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں، وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انھیں اپنی انگلی سے ہلانا بھی نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربّی کہلانا پسند کرتے ہیں۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے

---

[1] فریسی سے مراد حاملانِ شریعت ہیں۔ (مؤلف)

> ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔"
>
> "اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اُسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔"
>
> "اے اندھے راہ بتانے والو! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔"
>
> "اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس ہے تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوب صورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔" (متی ۲۳: ۲-۲۸)

یہ اس وقت کے حاملانِ شریعت کا حال تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود بندگیٔ نفس کی وجہ سے آپ بھی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے اور اس انقلاب کے راستہ میں رومی قیاصرہ سے بڑھ کر وہی حائل تھے۔

حضرت عیسیٰؑ کے خلاف مذہبی اکابر کی سازش

> "اس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔ پس انھوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں کے ساتھ اس کے پاس بھیجا اور انھوں نے (یعنی شاگردوں نے) کہا کہ اے استاد ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پرواہ نہیں کرتا ہمیں بتا کہ تو کیا سمجھتا ہے، قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا، اے ریاکارو! مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکہ مجھے دکھاؤ۔ وہ دینار اس کے پاس لے آئے اُس نے اُن سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انھوں نے کہا، قیصر کا۔ اس پر اس نے کہا جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو ادا کرو۔" (متی ۲۲: ۱۵-۲۱)

؎ مسیح علیہ السلام کے زمانے میں فلسطین کے ایک حصہ میں ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی طرح ایک یہودی ریاست قائم تھی، جو سلطنتِ روم کی تابع فرمان تھی۔ اس کے بانی ہیرود کے نام سے اس کو عموماً ہیرودی ریاست کہتے تھے۔ ہیرودیوں سے مراد اس ریاست کی پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی ہیں (مؤلف)

اس قصّہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک چال تھی۔ فریسی اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے یہ چاہتے تھے کہ حضرت مسیحؑ کا قبل از وقت حکومت سے تصادم کرا دیا جائے اور تحریک کو جڑ پکڑنے سے پہلے حکومت کے زور سے اسے کچلوا ڈالا جائے۔ اسی لیے ہیرودی ریاست کی سی آئی ڈی کے سامنے یہ سوال اٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جائے یا نہیں؟ جواب میں حضرت مسیحؑ نے جو ذو معنی بات کہی اس کو دو ہزار برس سے مسیحی اور غیر مسیحی سب اسی معنی میں لے رہے ہیں کہ عبادت خدا کی کرو اور اطاعت ہر اس حکومت کی کرتے رہو جو تمھارے زمانہ میں موجود ہو۔ لیکن دراصل مسیحؑ نے نہ تو یہ فرمایا کہ قیصر کو ٹیکس دینا روا ہے، کیونکہ ایسا کہنا ان کی دعوت کے خلاف تھا۔ اور نہ یہ فرمایا کہ اسے ٹیکس نہ دیا جائے، کیونکہ اس وقت تک ان کی تحریک اس مرحلے پر نہیں پہنچی تھی کہ ٹیکس روکنے کا حکم دیا جاتا۔ اس لیے انھوں نے یہ لطیف بات کہہ دی کہ قیصر کا نام اور اس کی صورت تو قیصر ہی کو واپس کر دو اور سونا جو خدا نے پیدا کیا ہے وہ خدا کی راہ میں صرف کرو۔ اس سازش میں ناکام ہونے کے بعد فریسیوں نے خود مسیحؑ کے حواریوں میں سے ایک کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی ایسے موقع پر مسیحؑ کو گرفتار کرائے جب کہ عام بلوے کا خطرہ نہ ہو چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور یہوداہ اسکریوتی نے مسیحؑ کو پکڑوا دیا۔

حضرت عیسیٰؑ کے خلاف اکابر یہود کا مقدمہ

> "پھر ان کی ساری جماعت اُٹھ کر اسے پیلاطُس (رومی حاکم) کے پاس لے گئی اور انھوں نے الزام لگانا شروع کیا۔ کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیحؑ بادشاہ کہتے پایا ہے .... پیلاطُس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا۔ کہ میں اس شخص میں کوئی قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر اُبھارتا ہے......
>
> وہ چلّا چلّا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے اور ان کا چلانا کارگر ہوا۔" (لوقا ۲۳ : ۱-۲۳)

حضورؐ کے مکّی دَورِ دعوت سے مماثلت

اس طرح دنیا میں مسیحؑ کا مشن ان لوگوں کی بدولت ختم ہوا جو اپنے آپ کو حضرت موسیٰؑ کا وارث کہتے تھے۔ تاریخی شواہد کی رُو سے حضرت مسیحؑ کی نبوّت کا کل زمانہ ڈیڑھ سال اور تین سال کے درمیان رہا ہے۔ اس مختصر مدّت میں انھوں نے اُتنا ہی کام کیا جتنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مکّی زندگی کے ابتدائی تین سال میں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص انجیل کی مذکورہ بالا آیات کا مقابلہ قرآن مجید کی مکّی سورتوں اور زمانۂ قیامِ مکّہ کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائے گا۔ (۲۶)

فصل ۳

دعوتِ عیسیٰؑ مسیحیّت کی تعبیر کے مطابق

اس فصل میں جناب مؤلف نے تعلیماتِ مسیحؑ کی اس غلط تعبیر سے تعرض کیا ہے جس پر موجودہ مسیحیت قائم ہے۔ چنانچہ اس بحث میں انجیل کی بعض ایسی عبارات بھی زیرِ گفتگو آئی ہیں جن کے متعلق فاضل مؤلف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی حقیقی تعلیمات کی آئینہ دار ہیں اور ان عبارات کو اس سے پہلی فصل میں صحیح تعبیر کے ساتھ لیا جا چکا ہے۔

مسیحیت کی غلط تعبیرات کے ساتھ جو تعلیمات بحث میں مذکور ہیں، انھیں مسیحؑ سے باقاعدہ منسوب کر کے جہاں کہیں مؤلف نے اعتراض اٹھایا ہے وہاں ان کی مراد مسیحؑ کی شخصیت اور تعلیم کا وہ تصور ہے جو تحریف شدہ دینِ مسیحیت کے علمبرداروں نے پیدا کر لیا ہے ایسے موقعوں پر مراد جناب عیسیٰؑ ابن مریمؑ نہیں ہیں جو خدا کے سچے رسول تھے۔ (مرتبین)

تعلیمِ محبت کا مسیحی تصوّر

مسیحؑ کے نزدیک مذہب کا سب سے بڑا حکم یہ ہے کہ "خدا سے محبت رکھنے کے بعد اپنے پڑوسی سے محبت رکھو۔" (متی ۔ ۲۲ : ۳۹) لیکن وہ صرف محبت کرنے اور غُصّہ نہ کرنے ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ صاف الفاظ میں ایک سچے مسیحی کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ ظلم اور شرارت کے مقابلہ میں سر جھکا دے، اور دوسروں کی حفاظت کرنا تو درکنار، خود اپنے حق کی حفاظت بھی نہ کرے۔ ان کی تعلیم کا گُلِ سرسبد پہاڑی کا وعظ ہے جس پر مسیحی اخلاق کی بنیاد قائم ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں ؎

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ تم شریر کا مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کی

طرف پھیر دے، اور کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لینے دے، اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے تو اس کے ساتھ دو کوس چلا جا ...... تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھو، جو تم پر لعنت کریں، ان کے لیے برکت چاہو، جو تم سے نفرت کریں، ان سے اچھا سلوک کرو، جو تمھیں ذلیل کریں اور تمھیں ستائیں، ان کے لیے دعا مانگو" (متی، ۵ : ۳۸-۴۴)

"میں تم سننے والوں سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمن سے محبّت رکھو، جو تم سے عداوت رکھیں، ان کا بھلا کرو، جو تم پر لعنت کریں ان کے لیے برکت چاہو، جو تمھاری بے عزّتی کریں ان کے لیے دعا مانگو، جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا بھی پھیر دے، جو تیرا چوغہ لے اس کو کُرتہ لینے سے بھی منع نہ کر۔ جیسا تم اوروں سے برتاؤ چاہتے ہو تم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی کرو۔ اگر تم محبّت رکھنے والوں ہی سے محبّت رکھو۔ تو تمھارا کیا احسان ہے؟ کیونکہ گنہگار بھی اپنے محبت رکھنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔" (لوقا ۶ : ۲۷-۳۲)

یہ تعلیم مسیحیت کی اصل الاصول ہے اور اس کا منشا خود اس کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک سچّے مسیحی کو جو "آسمانی باپ کی طرح کامل" (متی ۵ : ۴۸) بننا چاہتا ہو اور جس کا نصب العین "خدائے برتر کا بیٹا" (لوقا ۶ ، ۳۵) بننا ہو، کسی حال میں ظلم و تعدّی کا مقابلہ قوت سے نہ کرنا چاہیے، بلکہ شریروں اور مفسدوں کے سامنے اپنے حقوق سے خود بخود دست بردار ہو جانا چاہیے۔

مسیحیت کی رُہبانی رُوح

اس تعلیم کے حُسن و قبح کا پورا پورا اندازہ اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک مسیحیت کی رُوح کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے۔

مسیحی مذہب جس شکل میں ہم تک پہنچا ہے، اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دراصل سنیاس، رہبانیت، اور تیاگ کا مذہب ہے۔ اس میں انسان کی تمدّنی زندگی کے لیے کوئی دستور العمل، کوئی شریعت، کوئی ضابطۂ قوانین وضع نہیں کیا گیا ہے۔ وہ انسان کو کچھ نہیں بتاتا کہ اس پر اس کی ذات، اس کے خاندان، اس کی قوم اور اس کے ابنائے نوع، اور اس کے خدا کے کیا حقوق ہیں۔ اور ان کو ادا کرنے کی صحیح صورت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو مادی وسائل اور ذہنی و جسمانی قویٰ عطا کیے ہیں، ان کا مصرف کیا

ہے۔ اور اسے ان چیزوں کو کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔ عملی زندگی کے ان مسائل سے وہ کوئی بحث نہیں کرتا۔ اس کی ساری توجہات کا مرکز صرف ایک سوال ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کس طرح "آسمانی بادشاہت" میں داخل ہو؟ یہی ایک سوال پورے مسیحی اخلاقیات کا محور ہے اور "مسیحؑ" نے جو کچھ تعلیم دی ہے اس کا اصلی مقصد اسی نصب العین تک لے جانے کے لیے انسانی جماعت کو تیار کرنا ہے۔

آسمانی بادشاہت اور دنیوی بادشاہت میں منافات

لیکن "آسمانی بادشاہت" مسیحیت کی نگاہ میں زمین کی بادشاہت کی ارتقائی صورت کا نام نہیں ہے۔ وہ ان دونوں کے درمیان بیج اور پھل کا تعلق تسلیم نہیں کرتی۔ بلکہ ان دونوں میں تضاد اور کُلّی اختلاف کی قائل ہے۔ اس کے نزدیک دنیوی بادشاہت اور آسمانی بادشاہت دو الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں بالکل اسی طرح باہم نہیں ہو سکتیں۔ جس طرح آگ اور پانی باہم نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں چیزوں کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ آسمانی بادشاہت حاصل کرنے کا راستہ بھی زمین کی بادشاہت کے راستہ سے بالکل الگ اختیار کرتی ہے۔ ہر وہ چیز جو زمین کی بادشاہت کے ساز و سامان میں داخل ہے، آسمانی بادشاہت کے ساز و سامان سے خارج ہے۔ اور صرف خارج ہی نہیں۔ بلکہ اس کا وجود انسان کو آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے روکنے والا ہے۔ اسی لیے مسیحیت قدم قدم پر انسان کو تاکید کرتی ہے کہ اگر وہ آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتا ہے تو زمین کی بادشاہت کے سر و سامان سے کُلّی اجتناب کرے اور اگر اس سے اجتناب نہیں کر سکتا تو آسمانی بادشاہت کی اُمید نہ رکھے۔ اسی اصل پر وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں رُہبانیت کی تعلیم دیتی ہے اور تمدن و تہذیب سے الگ کر کے انسان کو کُلّیۃً تارک الدُّنیا بنا دینا چاہتی ہے۔

دُنیوی سر و سامان سے کُلّی اجتناب کے چند احکام

اس کی توضیح میں مسیحؑ کے چند احکام نقل کر دینا کافی ہے:

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور اولاد اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی نفرت نہ رکھے تو وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔" (لوقا ۱۴: ۲۶)

"کیا تم گمان کرتے ہو کہ میں زمین پر صُلح کرانے آیا ہوں؟ میں تم سے کہتا ہوں کہ نہیں، بلکہ تفریق کرانے، کیونکہ اب سے ایک گھر کے پانچ آدمی آپس میں مخالفت رکھیں گے، تین دو کے خلاف

اور دو تین کے خلاف، باپ بیٹے سے مخالفت رکھے گا، اور بیٹا باپ سے، ماں بیٹی سے اور بیٹی ماں سے، ساس بہو سے اور بہو ساس سے۔" (لوقا ۱۲ : ۵۱-۵۳)

"تم نے مفت پایا مفت دے دو، نہ سونا اپنے کیسہ میں رکھو نہ چاندی نہ پیتل۔ اپنے سفر کے لیے نہ جھولی لو نہ دو دو کرتے، نہ جوتیاں اور نہ لاٹھی۔" (متی، ۱۰ : ۸-۱۰)

"اے چھوٹے گلّے نہ ڈر، کیونکہ تمھارے باپ کو پسند آیا کہ تمھیں بادشاہت دے اپنا مال اسباب بیچ کر خیرات کر دو۔ اور اپنے لیے ایسے بٹوے بناؤ جو پُرانے نہیں ہوتے یعنی آسمان پر ایسا خزانہ جو خالی نہیں ہوتا۔" (لوقا، ۱۲ : ۳۲ تا ۳۳)

"اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال اسباب بیچ کر غریبوں کو دے دے اور میرے پیچھے ہو لے تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا۔[1]" (متی : ۱۹، ۲۱)

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے، اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔" (متی، ۱۹ : ۲۳-۲۴)

"اپنے لیے زمین میں مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے .... بلکہ آسمان پر جمع کرو۔" (متی، ۱۲ : ۱۹)

"اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کرو گے تو تمھارا آسمانی باپ بھی تمھیں معاف کرے گا اور اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کرو گے تو تمھارا باپ بھی تمھیں معاف نہ کرے گا۔" (لوقا، ۶ : ۱۴-۱۵)

"میں تم سے کہتا ہوں کہ نہ اپنی جان کی فکر کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پہنیں گے۔ نہ اپنے بدن کے لیے کہ کیا پہنیں گے۔ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بہتر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں۔ نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں، پھر بھی تمھارا آسمانی

---

[1] مسیح نے یہ حکم اس شخص کو دیا تھا جو متی، مرقس اور لوقا کے متفقہ بیان کے مطابق قتل، زنا، چوری اور جھوٹ سے پرہیز کرتا تھا، اپنے ماں باپ کی خدمت کرتا تھا، اور اپنے پڑوسی سے اپنے مانند محبت رکھتا تھا۔ مسیحؑ نے اس سے کہا تو کامل اس وقت ہو گا جب اپنا سارا مال اسباب بیچ کر خیرات کر دے گا

> باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور تم لباس کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو، کہ وہ کیسے بڑھتے ہیں۔ نہ محنت کرتے ہیں، نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمانؑ بھی اپنی ساری شان وشوکت کے باوجود ان میں سے کسی کی مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو، جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی، ایسی پوشاک پہناتا ہے۔ تو اے کم اعتقادو! تم کو ضرور بھی پہنا دے گا۔ اس لیے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے؟ کیا پئیں گے؟ (متی، ۶: ۲۵-۳۱)

تمدن اور تہذیب سے کامل انقطاع

ان اقوال سے صاف ظاہر ہے کہ آسمانی بادشاہت کی طرف لے جانے کے لیے مسیحیت جس ڈھنگ پر انسانی جماعت کی تربیت کرنا چاہتی ہے وہ تمدن اور تہذیب کے کامل انقطاع پر مبنی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ خاندانی تعلقات تمدنی زندگی کی بنیاد ہیں۔ جماعت سے انسان کا ابتدائی تعلق اپنے رشتہ داروں ہی کے واسطہ سے ہوتا ہے، انھیں کے باہمی روابط سے ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوتی ہے اور درحقیقت انسان کے لیے اخلاق کی بہترین درسگاہ بھی یہی ہے۔ مگر مسیحؑ کے تیشہ کا سب سے پہلا وار اسی اصل الاصول پر پڑتا ہے اور وہ سب سے پہلے اس رشتہ کو کاٹ دیتا ہے جو آدمی کو سوسائٹی سے منسلک کیے ہوئے ہے۔ دنیا کے برتنے اور اس کے معاملات میں حصہ لینے کے لیے سب سے پہلے جو شے انسان کو عمل پر مجبور کرتی ہے؛ وہ پیٹ بھرنے اور تن ڈھانپنے کی فکر ہے۔ لیکن مسیحؑ اس ابتدائی محرک ہی کو قتل کر دینا چاہتے ہیں تاکہ آدمی دنیا میں ویسی ہی زندگی بسر کرے جیسی ہوا کے پرندوں جنگلی سوسن کے درختوں کی ہے۔ انسان کی راحت و آسائش اور انفرادی و اجتماعی فلاح کے لیے مال و دولت حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ مگر مسیحؑ کے نزدیک روحانی ترقی اور آسمانی بادشاہت کے لیے اس کو چھوڑ دینا ضروری ہے۔ دنیا میں نظامِ امن و عدل کا قیام سیاست و تعزیر اور قصاص و انتقام کے قانون پر منحصر ہے۔ مگر مسیحؑ کہتے ہیں کہ آسمانی باپ اس وقت تک تمھارے قصور معاف نہ کرے گا جب تک مکافاتِ عمل کے اس پورے قانون کو لپیٹ کر نہ رکھ دیا جائے۔ غرض یہ کہ مسیحؑ کے نزدیک دینداری دراصل ترکِ دنیا کا نام ہے۔ جو شخص دنیا اور اس کے اسباب کو نہیں چھوڑتا، اجتماعی تعلقات کو قطع نہیں کرتا، دنیوی کاروبار کو ترک نہیں کرتا، اور کامل ترک و تجرید کی زندگی بسر نہیں

کرتا، اس کے لیے آسمان کی بادشاہت میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ انسان بیک وقت ان دونوں بادشاہوں میں داخل نہیں ہو سکتا۔ دین اور دُنیا دونوں کو پا لینا اس کے لیے ناممکن ہے۔ "مسیح" کے ارشاد کے مطابق "تم بیک وقت خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔" یہ دو متضاد چیزیں ہیں، اس لیے جو ایک کا طالب ہو اسے دوسرے کی طلب چھوڑنی پڑے گی۔

ایک مفسّرِ انجیل کا نقطۂ نظر

"مسیح" کی اس تعلیم کو خود مسیحی علما جس رنگ میں پیش کرتے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے ریورینڈ ڈملو کی تفسیرِ انجیل کے چند فقرات یہاں نقل کر دینا کافی ہے۔ یہ تفسیر ۴۰ سے زیادہ مسیحی علماء کی مدد سے تیار کی گئی ہے اور انجیل کی بہترین تفاسیر میں سے ہے۔ اس کے مقدّمے میں ایک مستقل مقالہ "تعلیماتِ مسیح" کے عنوان پر ہے۔ جس میں لکھا ہے:

> "مسیح نے انسانی سیرت کے لیے وہ طرز پسند کیا ہے جو بڑی حد تک دنیا کے پسند لیے ہوئے طرز سے مختلف ہے۔ خودداری کی بجائے فروتنی، اپنے حقوق پر جمے رہنے کے بجائے بدی کے آگے سر جھکا دینا اور وسعت طلبی کی جگہ قناعت، شرافت، عجز، صبر، ہمدردی، مصیبت میں خوش ہونا، درد سے راحت حاصل کرنا، یہ دنیا کو مسیحیت کے عطایا ہیں …… مگر ایک مسیحی کے کیریکٹر کی سب سے زیادہ جامع تعریف غالباً یہ ہے کہ وہ ایک یکسُو آدمی ہوتا ہے وہ ایک پاؤں دنیا میں اور دوسرا دین (چرچ) میں نہیں رکھ سکتا۔ وہ ایک ہی وقت میں خدا اور متاعِ دنیا دونوں کی خدمت نہیں کر سکتا …… مسیح کے نزدیک دنیا کے پاس انسان کو اپنی خدمت پر مجبور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ دولت ہے، لہٰذا ایک مسیحی بننے کے لیے پہلی اور ضروری شرط یہ ہے کہ انسان دولت سے بے تعلق ہو جائے۔"[1]

ذریعۂ استیصالِ شر سے مسیحیت کا احتراز

اب یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مسیحیت میں محبت، عفو و درگزر اور تذلّل و انفعال کی جو تعلیم دی گئی ہے وہ ایک ایسے اخلاقی نظام کے اجزا میں سے ہے جو رہبانیت کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس

---

[1] COMMENTRY ON THE HOLY BIBLE, DUMELLEW, P. LXXX

نے اخروی نجات کا راستہ دنیوی فلاح کے راستے سے الگ اختیار کیا ہے۔ اس لیے وہ دنیا کے معاملات کو دنیاداروں پر چھوڑ دیتی ہے اور خود اپنے دینداروں کو لے کر الگ ہو جاتی ہے تاکہ گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر "آسمانی بادشاہت" حاصل کرنے کی تیاری کرے۔ ایسے مذہب میں جنگ نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ دنیا اور اس کے معاملات کی ذمہ داریاں قبول کرتا ہے اور اس کے باوجود ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قوت کے استعمال کی ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اس کو دین کے معاملات ہی سے کچھ تعلق نہیں ہے تو قدرتی طور پر جنگ و خونریزی سے بھی انکار ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ فساد فرو کرنے کے لیے تلوار کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ خود فساد ہی کو فرو کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ نہیں کہتا کہ شرارت کا استیصال جنگ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ سرے سے اس کے استیصال ہی کی فکر فضول ہے، اس سے لڑنے کے بجائے تم اس کے آگے سر جھکا دو۔ وہ نہیں کہتا کہ ظلم و تعدی کے مقابلے میں حق کی حفاظت خونریزی کے بغیر بھی ممکن ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ حق کی حفاظت ہی نہ کرو، اگر ظالم تمھارا حق چھینتا ہے تو چھین لینے دو۔ وہ نہیں کہتا کہ مجرموں کو تشدد کے بغیر بھی سزا دی جا سکتی ہے اور مظلوموں کا قصاص قوت کے بغیر بھی لیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ تم سرے سے سزا اور قصاص ہی کو چھوڑ دو۔ اور کوئی "سات دفعہ نہیں سات کے ستر گُنے تک قصور کیے جائے تو اسے معاف کرتے رہو" غرض یہ کہ دنیا میں امن قائم کرنا، اس کو بدی و شرارت سے پاک کرنا، اس میں عدل و انصاف کی حکومت قائم کرنا، اور انسانیت ظلم و فساد کے تسلط سے نجات دلانا سب کچھ مسیحیت کے دائرۂ عمل سے خارج ہے۔ اس نے اپنے لیے محکومی و مغلوبی اور مظلومی و منکوبی کی زندگی پسند کر لی ہے۔ اس لیے اگر وہ جنگ کی مخالف ہے اور بلاتمیز حق و غیر حق نفسِ جنگ ہی کو بُرا سمجھتی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایسی زندگی کے لیے یہی رویّہ زیادہ موزوں ہے۔

تذلّل و انفعال کی تعلیم کے مضمرات

لیکن سوال یہ ہے کہ تذلّل و انفعال کی یہ تعلیم کیا انسان کے لیے ایک دائمی اور عالمگیر قانون بن سکتی ہے؟ اس کا جواب مسیحیت خود اپنے منہ سے دے رہی ہے۔ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جنگ سے احتراز کا حکم خود کوئی مستقل قانون نہیں ہے بلکہ رہبانیت و ترکِ دُنیا کے ایک وسیع قانون کی دفعات میں سے ایک دفعہ ہے تو اس سے یہ بات خود بخود لازم آتی ہے کہ ترکِ جنگ کا قاعدہ اسی صورت میں نافذ ہو سکتا

ہے جبکہ ترکِ دنیا کا پورا قانون نافذ ہو۔ مسیحیت خود بھی یہ نہیں کہتی کہ تم دنیا کا انتظام تو ضرور ہاتھ میں لو، مگر جنگ ہرگز نہ کرو۔ اس کی اپنی تعلیم کی رُو سے بھی انسان یہ عاجزانہ انفعالی زندگی اسی وقت اختیار کر سکتا ہے جبکہ وہ دنیا کو چھوڑ دے اور اس کی مختلف تمدنی ذمہ داریوں سے دستبردار ہو جائے۔ ان سب ذمہ داریوں کو قبول کرنے اور پورا کرنے کے ساتھ اس طریقہ کو اختیار کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ خود مسیح کا یہ منشا ہے۔ اب اگر اس کو ایک عالمگیر قانون قرار دیا جائے تو لامحالہ ساری نوعِ انسانی کو تمدن و تہذیب سے کنارہ کش ہو جانا پڑے گا۔ اگر انسان کی منزلِ مقصود "آسمانی بادشاہت" ہو اور یہ بھی مان لیا جائے کہ دنیوی زندگی کے تمام معاملات اس بادشاہت میں داخل ہونے سے روکتے ہیں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ نوعِ بشر پوری کی پوری اس منزل تک پہنچنے کے لیے اس روکنے والی چیز سے اجتناب کرے اور راہبانہ زندگی اختیار کر کے نفس کُشی و ریاضت میں لگ جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا ہونا غیر ممکن ہے۔ تمام دنیا بیک وقت اپنے کاروبار بند نہیں کر سکتی۔ معاش کی فکر چھوڑ کر "ہوا کے پرندوں" اور "جنگلی سوسن کے درختوں" کی سی زندگی اختیار نہیں کر سکتی۔ تجارت، صنعت، زراعت اور تمام دوسرے مشاغل کو ترک کر کے تعطل و بیکاری کی حالت قبول نہیں کر سکتی۔ حکومت اور اس کے انتظام کو چھوڑ کر خانقاہوں میں نہیں بیٹھ سکتی۔ اور اگر بفرضِ محال وہ ایسا کر بھی لے۔ تو ہرگز اس شرف و عزت کی مالک نہیں رہ سکتی۔ جو اس کو اللہ تعالیٰ نے دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں عطا فرمایا ہے۔ بلکہ سچ یوں ہے کہ زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ انسانی سوسائٹی کی یہ ایک ایسی حالت ہے جس کا متحقق ہونا ایک شاداب تخیل کے سوا کسی خارجی عالم میں ممکن نہیں ہے اور جو خدانخواستہ ممکن ہو بھی جائے تو کم از کم وہ کسی ذی عقل انسان کو مطلوب و مرغوب نہیں ہو سکتی۔ پس یہ کہنا بالکل بعید از عقل ہے کہ مسیحیت کا قانونِ اخلاق تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک دائمی اور عالمگیر قانون ہے، کیونکہ عالمگیر اور دائمی قانون صرف وہی ہو سکتا ہے، جس پر تمام دُنیا کے باشندے ہر حالت میں عمل کر سکتے ہوں۔

مسیحیت اجتماعی نظام کی نقیض ہے

پھر یہ قانون کسی ایک پوری قوم کے لیے بھی قابلِ عمل نہیں ہے۔ اگر کوئی قوم من حیث المجموع اس کی پابندی قبول کرے اور "آسمانی بادشاہت" میں داخل ہونے کے لیے اس کی تمام ہدایات پر عمل پیرا ہونے لگے تو اس کو سب سے پہلے اپنی حکومت کا سارا نظام معطل کرنا پڑے گا۔ اپنی فوج اور پولیس منتشر کرنی ہوگی،

اور اپنی سرحدوں کی حفاظت اور قلعوں کی نگہبانی چھوڑنی پڑے گی۔ پھر جب اس کی کوئی ہمسایہ قوم میدان خالی دیکھ کر حملہ کردے گی۔ تو مسیحی تعلیم کے مطابق یہ نیک نہاد قوم شریر کا مقابلہ نہ کرے گی۔ بلکہ ایک گال کے ساتھ دوسرا گال بھی اور کُرتے کے ساتھ چوغہ بھی پیش کردے گی، پھر وہ اپنی ساری دولت، اپنی تجارتی کوٹھیاں، اپنی دُکانیں، حتّٰی کہ اپنے گھروں کا مال و اسباب بھی چھوڑ دے گی، کیونکہ "دولت مند آسمانی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا" اور حکم ہے کہ "تو اپنا سارا مال بیچ کر خیرات کردے"۔ اس کے بعد وہ کسبِ معاش کے لیے محنت مزدوری کرنا بھی چھوڑ دے گی، اپنے کارخانے بند کردے گی، صنعت، حرفت، خدمت سب کچھ ترک کردے گی۔ اور اس کے تمام کاروباری آدمی اپنے اپنے کام چھوڑ کر صومعوں میں جا بیٹھیں گے، کیونکہ "تم خدا اور دولت دونوں کی ایک ساتھ خدمت نہیں کرسکتے اور مسیح کا حکم ہے کہ "تم اپنی جان کی فکر نہ کرو" آخر میں اس کے لیے صرف ایک ذریعۂ معاش رہ جائے گا۔ کہ زمین کی کاشت کرے اور اپنی خوراک کے لیے غلّہ حاصل کرے۔ لیکن آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کے لیے اسے یہ بھی چھوڑنا پڑے گا۔ کیونکہ مسیح کا ارشاد ہے کہ "ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں، نہ کاٹتے ہیں، پھر بھی تمھارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے"۔ اس طرح وہ قوم اپنی حکومت، اپنی زمین، اپنی دولت، اپنی صنعت و تجارت، غرض اپنا سب کچھ ان بیرونی حملہ آوروں کے سُپرد کردے گی پھر وہ "ایک کوس بیگار میں لے جائیں گے" تو یہ "دو کوس" جائے گی، وہ ظلم کریں گے اور یہ ان کے لیے دعا مانگے گی، وہ اس پر "لعنت کریں گے" اور یہ اُن کے لیے "برکت" چاہے گی، وہ اس کی عزت و حرمت پر حملے کریں گے اور یہ انھیں خاموشی کے ساتھ برداشت کرتی رہے گی۔ مسیحی نقطۂ نظر سے یہ اس کے اخلاق کا منتہائے کمال ہے جس کے بعد کوئی چیز اس کو آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتی، مگر عقل و دانش کے نقطۂ نظر سے یہ ایک قوم کی پستی و تنزل کا انتہائی درجہ ہے جس کے حصول کی کوشش کو ایک عقلمند آدمی خودکُشی کے سوا کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کرسکتا۔ اور میں نہیں سمجھا کہ آخر وہ آسمانی بادشاہت ہے کس قسم کی جس میں ایسے ناکارہ لوگوں کی مانگ اور کھپت ہے ——

بہرحال جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ اس معنی میں دنیا کی کوئی قوم بھی مسیحیت کے قانونِ اخلاق کو اپنا قانونِ حیات نہیں بنا سکتی، کیونکہ اس کی فطرت اسے اپنے وجود کی حفاظت اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے اس قانون کی ایک ایک دفعہ کو توڑنے پر مجبور کردے گی اور عملاً اس کی خلاف ورزی کے بعد اعتقاداً اس پر ایمان رکھنا بے معنی ہوگا۔

راہبوں اور سنیاسیوں کی ایک مختصر جماعت مسیحیت پر چل سکتی ہے

تیسری صورت یہ ہے کہ اس کو ایک پوری قوم کے لیے بھی ہمہ گیر قانون نہ مانا جائے بلکہ ایک خاص گروہ کے لیے مخصوص سمجھ لیا جائے، جیسا کہ ”خود مسیح“ کی تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ صورت یقیناً ممکن العمل ہے۔ اگر انسانی جماعت کے مختلف گروہ اس کی مختلف ضروریات کو انجام دیتے رہیں، کوئی تجارت میں مشغول رہے، کوئی صنعت و حرفت کا کام کرے، کوئی زراعت کرتا رہے۔ تو یہ ممکن ہے کہ سوسائٹی اپنے ایک قلیل حصّہ کو ”ہوا کے پرندوں“ اور ”جنگلی سوسن کے درختوں“ کی طرح بے عمل اور بیکار زندگی بسر کرنے کے لیے چھوڑ دے۔ اور اس کے چند افراد مسیحی اخلاق کے اس منتہائے کمال تک پہنچنے کی کوشش میں مشغول ہو جائیں، جو ترکِ اسباب، قطعِ علائق، تذلّل و انفعال اور نفس کشی و خود انکاری سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر ایک مخصوص گروہ کے لیے اس قانون کو محدود مان لینے اور دوسری طرف اسی کو برحق اور واحد ذریعۂ نجات تسلیم کرنے کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم نجات یا ”آسمانی بادشاہت“ پر راہبوں اور سنیاسیوں کی ایک مختصر جماعت کا اجارہ تسلیم کریں۔ اور یہ مان لیں کہ اس ”چھوٹی سی بادشاہت“ کے تنگ دائرے میں عالمِ انسانیت کے سوادِ اعظم کو جگہ نہیں مل سکتی۔ جو لوگ نظامِ تمدّن کو چلاتے ہیں، حکومت و سیاست کی تدبیر کرتے ہیں، قوم و ملک کی حفاظت میں جان لڑاتے ہیں اور مختلف انسانی ضروریات مہیا کرنے کے لیے مختلف قسم کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں، ان کے لیے اس ”بادشاہت“ کے دروازے بند ہیں، کیونکہ مسیحیت کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان بیک وقت دنیا اور دین دونوں میں پاؤں نہیں رکھ سکتا اور ”آسمانی بادشاہت“ کا دروازہ اسی وقت کھل سکتا ہے، جب کہ وہ دنیا کو چھوڑ کر مسیح کی بتائی ہوئی دینی زندگی اختیار کرے۔ اس طرح صرف ایک مختصر سے گروہ کو ”آسمانی باپ کی بادشاہت“ میں داخل ہونے کا موقع ملتا ہے اور باقی اللہ کی ساری مخلوق اس سے محروم کر دی جاتی ہے۔ حتّٰی کہ ان لوگوں کو بھی وہاں بار نہیں مل سکتا۔ جو دنیا میں نیکی اور پاکیزگی کے ساتھ رہتے ہیں، قتل نہیں کرتے، زنا نہیں کرتے، چوری اور جھوٹ وغیرہ منہیات سے پرہیز کرتے ہیں، ماں باپ کی عزت کرتے ہیں، اپنے پڑوسی سے اپنے مانند محبت رکھتے ہیں۔ مگر اپنا سارا مال بیچ کر خیرات نہیں کر دیتے۔

مسیحیت پوری انسانیت کے لیے ذریعۂ نجات نہیں ہے

اس نظریہ کو صحیح مان لینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم پھر پہلی صورت کی طرف رجوع کر رہے ہیں، اگر یہ مان لیا

جائے کہ "آسمانی بادشاہت" یعنی نجات کی منزل تک پہنچنے کا ذریعہ صرف مسیحیت کا قانونِ اخلاق ہی ہے، اور جو کوئی اس پر عمل نہیں کرتا تو پھر لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ نوعِ انسانی کے لیے ایک عالمگیر قانون ہے۔ کیونکہ نجات ہر انسان کی منزلِ مقصود ہے، اور کسی راستہ کو اس تک پہنچنے کا واحد راستہ قرار دینا یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لیے بنایا گیا ہے اور سب کو اس کی طرف دعوت دینا مطلوب ہے۔ لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس راستہ پر تمام نوعِ انسانی کا جمع ہو جانا اور بالاتفاق گامزن ہونا عقلاً ناممکن ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ مسیحیت کا بنایا قانون جس طرح دائمی اور عالمگیر نہیں ہے۔ اسی طرح برحق اور واحد ذریعۂ نجات بھی نہیں ہے؎۔ عالمگیر، دائمی اور واحد ذریعۂ نجات تو صرف وہی قانون ہو سکتا ہے جس پر حاکم حاکم رہتے ہوئے، تاجر تاجر رہتے ہوئے، کسان کسان رہتے ہوئے اور ہر شخص اپنے اجتماعی وانفرادی فرائض ادا کرتے ہوئے عمل پیرا ہو سکتا ہو اور جس کی تعمیل میں کسی انسان کے لیے ناقابلِ عبور مشکلات، ناقابلِ برداشت خطرات ومصائب اور مالایطاق تکالیف نہ ہوں۔ جو قانون ایسا نہیں ہے وہ نہ حق کا سیدھا راستہ ہے، نہ نجات کا واحد ذریعہ ہے نہ فطرت کا سچا قانون ہے۔

فطرت کے بالکل خلاف

لیکن ہم اس نقطہ پر بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ ہم کو ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہنا چاہیے کہ مسیحیت کا قانونِ اخلاق

؎ اس اشکال کو خود مسیحیوں نے بھی محسوس کیا ہے اور اسی لیے یہ مسئلہ پیدا کیا گیا ہے کہ نجات کے لیے مسیحیت کے قانون پر پوری طرح عملدرآمد کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مسیح نے خود صلیب پر چڑھ کر تمام اہلِ ایمان کا کفارہ ادا کر دیا۔ اور مسیح ان تمام لوگوں کے نجات دہندہ ہیں، جو ان پر ایمان رکھتے ہیں، مگر اس مسئلہ کی کمزوری ظاہر ہے۔ اس کو تسلیم کر لینے کے بعد تو مسیحیت کے قانونِ اخلاق کی کوئی ضرورت باقی ہی نہیں رہتی۔ اگر یہ کفارہ کا عقیدہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی قتل کر کے، چوری اور زنا کر کے، ہمسائے کو ستا کر، اور حرام کی کمائی کے ذخیرے جمع کر کے بھی "آسمانی بادشاہت" میں داخل ہو سکتا ہے بشرطیکہ مسیح پر ایمان لے آئے۔ اس صورت میں وہ ساری اخلاقی تعلیم مہمل ہو جاتی ہے جو مسیح نے اپنے مواعظ میں دی ہے، بلکہ خود مسیح کا اپنا قول بھی غلط ہو جاتا ہے کہ ان اعمال کے ساتھ کوئی شخص آسمانی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر مسیح کی یہ بات سچی ہے تو یقیناً کفارے کا یہ عقیدہ باطل ہے۔ بہرحال یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ اور عقل ومنطق کی رُو سے یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ صریح تناقض کے بغیر یہ دونوں ایک ہی نظام کا جز بن سکیں۔

اپنی موجودہ شکل میں فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ وہ دراصل اخلاقی فضیلت کے ایک غلط تصور کا نتیجہ ہے جس میں بے اعتدالی کے ساتھ بعض فضائل پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور بعض کو بلا ضرورت معطل کر کے انسانیت کو مفلوج کر دیا گیا ہے۔ اس نے انسانی اخلاق کی جن خوبیوں پر زور دیا ہے ان کی فضیلت یقیناً مسلّم ہے، فروتنی، عجز و انکسار، عفو و درگزر، حلم و بردباری، صبر و تحمّل کی فضیلت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ مگر تنہا انہی صفات پر انسانی زندگی کی تعمیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر دنیا سے بدی و شرارت بالکل لے کر کسی اور کرّہ میں چلا جائے تب تو یہ ممکن ہے کہ انسان اپنی جسمانی قوّت و شدّت کا استعمال کیے بغیر اپنے حقوق، اپنی عزّت اور خود اپنے وجود کی حفاظت کر سکے، لیکن جب دنیا میں نیکی کے ساتھ بدی بھی موجود ہے اور انسانی فطرت سے وہ شیطانی ملکات مٹ نہیں گئے ہیں جو ملکوتی فضائل کو مغلوب کرنے کے لیے ہر وقت مستعد رہتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں نیکی کو نہتّا چھوڑ دینا اور اللہ کی دی ہوئی قوّتوں کو اس کی حفاظت کے لیے استعمال نہ کرنا صرف خودکشی ہی نہیں ہے بلکہ بدی و شرارت کی بالواسطہ امداد بھی۔ حقیقتاً یہ کوئی نیکی ہی نہیں ہے کہ ظالموں کو عمداً ظلم کا موقع دیا جائے اور مفسدین کو جان بوجھ کر فساد پھیلانے کی آزادی دے دی جائے۔ اس کو ہم کمزوری کہہ سکتے ہیں، بزدلی و کم حوصلگی سے موسوم کر سکتے ہیں، مگر خیر و صلاح اور نیکی و احسان سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ نیکی دراصل اصلاح کا دوسرا نام ہے، اور وہ محبّت و غضب دونوں کے معتدل امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر بدی کی اصلاح عفو و درگزر، صبر و تحمّل اور لطف و رحم سے ہو سکے تو اسی سے کرنی چاہیے، اور اگر یہ محبّت کی قوّتیں اس میں کامیاب نہ ہو سکیں تو پھر سیاست و تعزیر اور قصاص و انتقام کی قوّتوں سے کام لینا ضروری ہے، کیونکہ اصل مقصود اصلاح ہے، اور انسان کا فرض ہے کہ ضرورت کی حد تک ہر اس طریقے کو استعمال کرے جو اس کے مقصد کے حصول کے لیے مفید اور ناگزیر ہو۔ اس میں طریقوں کا امتیاز کرنا اور ایک ہی طریقہ پر اس حد تک اصرار کرنا کہ وہ اصلاح کے بجائے مزید فساد کا موجب ہو جائے۔ نہ تو عقلمندی ہے اور نہ نیکی۔

مسیحی نظریۂ محبّت اور دوسرے انسانی فطری جذبات

مسیحیت کا یہ نظریہ کہ دین کا اصل الاصول "محبّت" ہے اور اس کے سوا انسان کے تمام جذبات اور اخلاقی خصائص باطل ہیں جن کو مٹا دینے ہی سے دینداری کو نشوونما حاصل ہو سکتی ہے، دراصل ایک غلط تخیل پر قائم ہے۔ اس نظریہ کے موجدوں کی نظر اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکی، کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کوئی چیز

عبث نہیں پیدا کی ہے۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ انسان کے اندر غضب، شہوت اور حُبِّ نفس وغیرہ جذبات خواہ مخواہ بلا ضرورت پیدا ہو گئے ہیں اور انسانی زندگی میں شجاعت و خودداری، جرأت و شہامت، تدبر و سیاست، عدل و انصاف وغیرہ کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ انسان کے اندر جتنے ملکات و قویٰ اور عواطف و جذبات ودیعت کیے گئے ہیں۔ سب کے سب اپنا ایک مصرف اور مدعا رکھتے ہیں۔ جس طرح انسان کا کوئی عضو حتیٰ کہ کوئی رونگٹا بھی بے کار نہیں ہے، اسی طرح انسان کی کوئی ذہنی و جسمانی قوّت، اس کا کوئی ظاہری ملکہ اور کوئی نفسانی جذبہ و داعیہ بھی بے کار نہیں ہے۔ فاطرِ کائنات نے اس کو بغیر کسی مصلحت کے نہیں بنایا ہے۔ اگر یہ قوتیں غلط صُورتوں میں ظاہر ہوں اور غلط راستے اختیار کرلیں تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ فی نفسہٖ غلط اور مذموم ہیں، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان نے اس کا صحیح مصرف نہیں سمجھا اور اس کے شعور نے اتنی ترقی نہیں کی کہ وہ ان کے صحیح استعمال کی طرف اس کی رہنمائی کرے۔ مثال کے طور پر شہوت ایک جذبہ ہے جس کی بدولت انسان نے اتنے گناہ کیے ہیں کہ شاید کسی اور جذبہ کے اثر سے نہ کیے ہوں گے مگر اس کی بنا پر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو بالکل مٹا دیا جانا چاہیے کیونکہ اسی پر بقائے نوع کی بنیاد قائم ہے۔ حرص ایک جذبہ ہے جو انسان کو بندۂ غرض بنا کر بدترین گناہوں پر آمادہ کرتا ہے مگر اس کو بالکل فنا کر دینے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہی چیز عمل کی اصل محرک ہے۔ غضب ایک جذبہ ہے جس نے دنیا میں بے شمار جھگڑے اور ظلم و ستم کرائے ہیں۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ سراسر بدی ہی بدی ہے اور اس میں کوئی فائدہ متصوّر نہیں ہے کیونکہ یہی چیز دنیا میں امن و امان کی ضامن ہے۔ ورنہ بدی و شرارت کی قوتیں اس کو تباہ کر ڈالیں۔ بالکل یہی حال ان جذبات و ملکات کا ہے جو لطیف اور افضل سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں بھی جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں بہت سی خرابیاں بھی ہیں۔ شجاعت اگر حد سے بڑھ جائے تو تہوّر اور حماقت کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ دُور اندیشی اگر افراط کا پہلو اختیار کرلے تو بزدلی اور نامردی بن جاتی ہے۔ رحم اگر اپنی قدرتی حدود میں نہ رہے تو جرائم و معاصی کا مددگار بن جاتا ہے۔ فیاضی اگر حد سے گُزر جائے تو اسراف و تبذیر کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ کفایت شعاری اگر زیادہ ہو جائے تو بُخل اور کنجوسی سے بدل جاتی ہے۔ محبت اگر اپنی حدود میں نہ رہے تو انسان کی عقل کو اندھا کر دیتی ہے۔ مروّت اگر بے موقع استعمال کی جائے تو بدکاریوں میں جسارت اور بے باکی پیدا کر دیتی ہے۔ حِلم و بُردباری اگر بے محل ہو تو گُستاخی اور ظلم کی محرک بن جاتی ہے۔ فروتنی اور انکساری اگر بے محل

ہو تو خودداری و عزتِ نفس خاک میں مل جاتی ہے۔ غرض یہ کہ نفسِ انسانی کو جتنی قوتیں عطا کی گئی ہیں، سب اپنے اچھے اور بُرے دونوں پہلو رکھتی ہیں اور ان کے ایک ہی پہلو کو دیکھ کر نہ تو ان کی اچھائی یا بُرائی کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی کے ترک اور کسی کے اختیار کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ جس طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان کے لیے صرف ہاتھ پاؤں اور قلب و دماغ ہی مفید ہیں، آنکھ، ناک، معدہ و جگر وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ محض قوتِ سامعہ اور لامسہ کافی ہے، باصرہ اور شامہ کی ضرورت نہیں۔ محض شعور و ادراک کفایت کرتا ہے، حافظہ اور تمیز کی ضرورت نہیں۔ بالکل اسی طرح ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انسان میں صرف محبت و رحم، عفو و درگزر، عجز و فروتنی ہی کی ضرورت ہے، نفرت و غضب، شجاعت و شہامت، خودداری و عزتِ نفس، غیرت و حمیت وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر معدہ کی کمی کو جگر پورا نہیں کر سکتا، اگر دل کی جگہ دماغ کام نہیں دے سکتا۔ تو یقیناً غضب و انتقام کی جگہ محبت و رحم اور سیاست و تعزیر کی جگہ عفو و درگزر بھی مفید نہیں ہے۔ جس طرح بدن کی صحت کا انحصار تمام جسمانی قوتوں کے اعتدال پر ہے اور جس طرح صحتِ عقل اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب تمام قوائے ذہنی تناسب کے ساتھ اپنا اپنا کام کرتے رہیں۔ ٹھیک اسی طرح کمالِ اخلاق بھی اسی وقت متحقق ہوتا ہے جب جذبات و خواہشات میں اعتدال ہو۔ نفس کی تمام قوتیں اپنے اپنے موقع و محل پر توازن کے ساتھ استعمال کی جائیں اور قدرت کے دیے ہوئے تمام ملکات کو اپنی حدود میں کام کرنے کا پوری طرح موقع دیا جائے۔ ایک فطری مذہب کا کام اسی اعتدال کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ نہ کہ بے اعتدالی کے جواب میں دوسری بے اعتدالی اور افراط کے مقابلہ میں تفریط پیدا کر دینا۔

ظلمِ عظیم

مسیحیت اس حقیقتِ کبریٰ کے فہم سے قاصر رہی ہے۔ اسی لیے اس نے انسان کو ترکِ دنیا اور رہبانیت کی تعلیم دی اور فیصلہ کر دیا کہ انسان محض تذلل و انفعال ہی کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنا لے۔ مگر یہ نہ تو کمالِ اخلاق کا کوئی درجہ ہے اور نہ انسانیت کی کوئی خدمت۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ انسانیت پر ایک ظلمِ عظیم ہے۔ اسی طریقِ زندگی کو اختیار کرنے والے ایک طرف اپنی ذات کو ان جائز لذتوں اور آسائشوں سے محروم کر دیتے ہیں۔ جو اللہ نے ان کے لیے پیدا کی ہیں، اور دوسری طرف اپنے وجود کو بے کار و معطل کر کے انسانی جماعت کو اپنی خدمات سے محروم کر دیتے ہیں۔ مسیحیت نے دنیوی بادشاہت کو آسمانی بادشاہت

سے الگ کر دیا ہے۔ خدا اور دولت دو متضاد قوتیں قرار دی ہیں اور سچے دینداروں کو حکم دیا ہے کہ وہ دولت کو چھوڑ کر خدا کے ہو جائیں اور دنیوی بادشاہت سے دست کش ہو کر صرف آسمانی بادشاہت کے ہو رہیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ نیک نہاد، شریف الطبع، دیندار، خدا ترس، ایماندار اور سچے لوگ تو دنیا کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں اور دنیا کا تمام کاروبار سوسائٹی کے ان بدترین طبقوں کے ہاتھ میں چلا جائے جو خدا ترسی و ایمانداری کے جوہر سے خالی ہوں۔ حکومت پر جبّاروں اور ظالموں کا قبضہ ہو۔ تجارت طمّاع اور بددیانت لوگوں کے حصہ میں آئے۔ صنعت و حرفت پر دھوکہ باز اور حیلہ ساز قابض ہو جائیں۔ اور شرّ و فساد کی قوتیں سوسائٹی کے سارے نظام کو خراب کر کے رکھ دیں۔ جب وہ نیکوکار لوگ جو سوسائٹی کو صحیح راستہ پر چلا سکتے ہیں، ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں گے تو یقیناً بدکردار لوگ برسرِکار آئیں گے۔ اور ان کی بدکاریوں کی کم از کم آدھی ذمّہ داری ان نیکوکاروں پر بھی عائد ہو گی جنھوں نے ذمّہ داریوں سے جی چرا کر میدانِ عمل کو بدمعاشوں کے لیے خالی چھوڑ دیا۔ (۲۷)

فصل ۴

مسیحؑ کی حقیقی تعلیمات کا تجزیہ

موجودہ مسیحیت کے نقائص اور کوتاہیاں

اس بحث سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مسیحیت میں جنگ اور سیاست و تعزیر کا نہ ہونا اس کے کمال کی دلیل نہیں بلکہ نقص کی دلیل ہے۔

مسیحیت جس شکل میں ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے وہ اتنے نقائص سے بھری ہوئی ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقے کی پیروی دنیا کی کوئی قوم نہیں کر سکتی۔ لیکن مسیحیت اور اس کی تاریخ کے گہرے مطالعے سے ایک اور حقیقت منکشف ہوتی ہے، جب ہم مسیحؑ کی تعلیمات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عقائد و اخلاق کی موٹی موٹی باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے، نہ ان کی کوئی شریعت ہے نہ کوئی مستقل ضابطۂ قوانین و اخلاق ہے۔ نہ حقوق و فرائض اور معاملات کے متعلق کسی قسم کی ہدایات ہیں، حتیٰ کہ عبادت کا بھی کوئی طریقہ متعین نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا مذہب کوئی مستقل مذہب نہیں ہو سکتا۔ عقائد اور چند اخلاقی ہدایات کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہت سی ایسی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں جن کے لیے ایک مذہب کے پیرؤوں کو اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہدایات کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جس مذہب میں یہ ہدایات موجود نہ ہوں اس میں ایک جداگانہ دینی نظام بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

یہ ایک مستقل جداگانہ مذہب نہ تھا

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسیحؑ نے ایسے ہی غیر مستقل مذہب کو ایک مستقل مذہب بنایا تھا؛ اور کیا مسیحؑ اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ ایسا مذہب تمام نوعِ بشری بلکہ کسی ایک قوم کے لیے بھی ہر حالت میں، ہر زمانہ میں قابلِ عمل نہیں ہو سکتا؛ مسیحیت کے متبعین اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں، مگر ہم جب مسیحیت کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان حالات پر نظر ڈالتے ہیں جن میں وہ پیدا ہوئی تھی، اور ان

اغراض کی تحقیق کرتے ہیں، جن کے لیے وہ وجود میں آئی تھی تو ہمیں اس کا جواب کچھ اور ملتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسیحی مذہب خود کوئی مستقل مذہب نہ تھا، مگر موسوی شریعت کی تکمیل اور بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے پیدا ہوا تھا۔ موسوی شریعت جس زمانہ میں بھیجی گئی تھی وہ بنی اسرائیل کی ذہنی طفولیت کا زمانہ تھا۔ ان میں کسی گہری اخلاقی تعلیم کو قبول کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس لیے حضرت موسیٰ نے ان کو ایک سادہ عقیدہ اور سیدھے سے ضابطۂ اخلاق کی تعلیم دے کر چھوڑ دیا تھا، جس میں اخلاقی فضائل روحانی پاکیزگی اور ایمانی روح کی بہت کمی تھی۔ (۲۸)

عیسائیت دینِ یہود کا تتمہ ہے

پس دینِ مسیحی ایک الگ دین نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت دینِ یہود کا ایک جزء اور زیادہ صحیح الفاظ میں اس کا تتمہ ہے۔ بالکل یہی بات خود انجیل میں حضرت مسیحؑ کی زبان سے منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں توراۃ یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں، بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں توراۃ کا ایک نقطہ یا ایک شوشہ بھی پورا ہوئے بغیر نہ ٹلے گا۔ پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا، اور آدمیوں کو ایسا کرنے کی ہدایت کرے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا۔ لیکن جو ان پر عمل کرے گا اور ان کی تعلیم دے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے بڑا کہلائے گا۔ پس میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو سکو گے۔"

(متی، ۵: ۱۷-۲۰۔ لوقا، ۱۶: ۱۷)

ایک دوسری جگہ اپنے پیرؤوں کو حکم دیتے ہیں:۔

"فقیہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں، پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں سب عمل میں لاؤ اور مانتے رہو، لیکن ان کے سے کام نہ کرو، کیونکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا بھی مشکل ہے، دوسروں کے کندھوں پر رکھ دیتے ہیں مگر آپ انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔" (متی، ۲۳: ۱-۴)

یوحنا نے اپنی انجیل میں تصریح کی ہے کہ:۔

"شریعت موسیٰؑ کی معرفت دی گئی اور فضیلت و صداقت یسوع مسیح کی معرفت پہنچی۔" (۱: ۱۷)

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحیت میں موسوی شریعت کے تمام احکام باقی رکھے گئے ہیں اور ان پر صرف فضیلت و صداقت کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

دعوت ناتمام رہی

مسیحؑ کی بعثت کے وقت ان کی قوم سات، آٹھ سو برس سے غیر قوموں کی غلامی میں مبتلا تھی۔ ان کی ولادت سے ۶۰ برس پہلے ہی روم کی فوج نے فلسطین پر حملہ کیا تھا۔ اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک پامال کرتی چلی گئی تھی۔ جس وقت مسیحؑ نے آنکھ کھولی تو ان کی پوری قوم رومیوں کی قیدِ غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔ ان کا خاص وطن یہودیہ ۶؁ میں براہِ راست رومی صوبہ داروں کے زیرِ انتظام آگیا تھا جو پروکیوریٹر (PROCURATOR) کہلاتے تھے۔ جب ان کی پیغمبرانہ دعوت کا آغاز ہوا تو یروشلم کا پروکیوریٹر پونتوس پیلاطس (PONTIUS PILATE) جیسا بے انصاف اور بے ضمیر شخص تھا۔ ان بے دین آقاؤں کی غلامی میں بنی اسرائیل کی ذہنی و اخلاقی حالت اس حد تک خراب ہو چکی تھی کہ وہ کلمۂ حق سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ مسیحؑ کی آنکھوں کے سامنے گلیل کا رئیس ہیرودیس محض ایک رقاصہ کو خوش کرنے کے لیے حضرت یحییٰؑ (JOHN THE BAPTIST) کو قتل کرا چکا تھا، اور خود مسیحؑ کی قدر و قیمت بھی ان کی قوم کی نگاہ میں جیسی کچھ تھی، اس کا حال اس سے ظاہر ہے کہ آخر میں بنی اسرائیل نے برابا نامی ڈاکو کی جان کو مسیحؑ کی جان سے زیادہ قیمتی سمجھا۔ ایسی حالت میں مسیحؑ کے لیے کیونکر ممکن تھا کہ اپنی دعوت کے آغاز ہی میں جنگ کا جھنڈا لے کر اٹھ کھڑے ہوتے اور لڑ کر ایک آزاد دینی حکومت قائم کر دیتے۔

یہود کو اخلاقی پستی سے نکالنے کی کوشش

وہ دیکھ رہے تھے کہ یہودیوں کی رُوح نکل چکی ہے، ان کی سیرت میں کوئی مضبوطی اور ان کی قومیت میں کوئی زندگی باقی نہیں ہے۔ اس لیے ان کا سب سے پہلا کام یہی تھا کہ اپنی قوم کو اس اخلاقی پستی کے گڑھے سے نکالتے جس میں وہ گری ہوئی تھی اور اس میں فضیلتِ اخلاق کی وہ رُوح پھونکتے جس کے بغیر کوئی قوم غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور دنیا میں اپنے آزاد وجود کو برقرار رکھنے پر قادر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اوّل اوّل انھوں نے قومی سیرت کی تعمیر ہی کی طرف توجہ کی اور اپنے اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے وہ برابر کوشش کرتے رہے کہ اس تعمیری کام کے دوران میں کہیں حکومتِ وقت سے تصادم کا موقع نہ آجائے۔ کیونکہ اگر ابتداء ہی میں حکومت سے مقابلہ شروع ہو جاتا تو اصل اصلاحی کام بھی نہ ہوتا اور اس کے انجام پانے

بغیر حکومت کے مقابلے میں بھی ناکامی ہوتی۔ اسی لیے انھوں نے حکومت کے ساتھ تصادم کرنے سے انتہائی پہلو تہی کی، اور جب یہودی علماء کے شاگردوں نے ان کو پکڑوانے کے لیے مسئلہ پوچھا کہ قیصر کو ہم ٹیکس دیں یا نہیں تو انھوں نے ذو معنی جواب دے کر ٹال دیا کہ:

"جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو" (لوقا، ۲۰ : ۲۲)

انھوں نے حکم دیا کہ شریر کا مقابلہ نہ کرو، جو تم پر ظلم کرے اسے دعا دو اور اس کے لیے برکت چاہو، جو تمھیں بیگار میں پکڑے اس کے ساتھ ایک کوس کے بجائے دو کوس جاؤ، جو تمھارا کرتہ چھینے اس کو چوغہ بھی اتار دو، جو تمھارے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ ابتداً ان سب احکام کا مُدّعا یہ تھا کہ حکومت سے تصادم نہ ہو اور قوم میں مصیبت جھیلنے کی قوّت پیدا ہو جائے۔

تعلیم صبر و استقامت

اس کے بعد انھوں نے آہستہ آہستہ اپنی قوم کو استقامت، صبر، تحمل، بے خوفی کی تعلیم دینی شروع کی، ان کو مصائب و شدائد کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا اور ان کے دل سے موت کا خوف اور حاکمانہ قہر و طاقت کا ڈر نکالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ:

"جب تم حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے پیش کیے جاؤ اور تمھیں اذیتیں دی جائیں تو اس وقت ثابت قدم رہنا" (مرقس، ۱۳)

انھوں نے جان کی محبت دلوں سے نکالنے اور مرنے کی آمادگی پیدا کرنے کے لیے کہا:

"جو کوئی اپنی جان بچانا چاہے وہ اسے کھوئے گا اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوئے گا وہی اسے بچائے گا" (لوقا، ۹ : ۲۴)

انھوں نے حکومت اور اس کی عنایت پر بھروسہ رکھنے کے بجائے خدا اور اس کی رزاقی پر بھروسہ رکھنے کی تعلیم دی تاکہ غلامی کی وہ سب سے بڑی کمزوری دور ہو جو ایک غلام قوم کو حکمران قوم کے طلسم میں گرفتار رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ:

"جب تم بڑے ہو کر اپنی اولاد کو اچھی چیزیں دیتے ہو تو تمھارا آسمانی باپ اپنے مانگنے والوں کو ضرور دے گا" (لوقا، ۱۱ : ۱۳)

انھوں نے حکومت کا رُعب دلوں سے دُور کرنے کی کوشش کی اور ان کو بتایا کہ جو لوگ محض جسم کو قتل

کر سکتے ہیں مُروح کو قتل نہیں کر سکتے، ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اصل میں ڈرنے کے قابل وہ ہے جو رُوح اور جسم دونوں پر ہلاکت طاری کر سکتا ہے۔ (لوقا، ۱۲: ۴ - ۵)

یہ سب باتیں ایک صدیوں کی غلام قوم میں آزادی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ضروری تھیں، اور ابتداً مسیح نے انھیں تک اپنی تعلیم کو محدود رکھا۔

آخری دور میں جہاد کی ناتمام تعلیم

اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد آخری زمانہ میں وہ جہاد و قتال کے مضمون کی طرف بڑھ رہے تھے اور کبھی کبھی اپنے دشمنوں کو قتل کرنے کی خواہش بھی ظاہر کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ:

> "میرے ان دشمنوں کو جنھوں نے نہ چاہا کہ میں اُن پر بادشاہی کروں یہاں لاکر میرے سامنے قتل کرو۔"

اس طرح انھوں نے اپنے متبعین کو تلوار رکھنے کا حکم بھی دے دیا تھا جیسا کہ لوقا نے لکھا ہے:

> "اس نے اُن سے کہا کہ اب جس کے پاس بٹوا ہو وہ اسے لے، اور اسی طرح جھولی بھی، اور جس کے پاس نہ ہو وہ اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدے ...... انھوں نے کہا کہ اے خداوندا! دیکھ یہاں دو تلواریں ہیں، اس نے کہا بہت ہیں۔" (۲۲: ۳۶ - ۳۸)

لیکن مسیح کو اپنی قوم کی ہدایت و راہنمائی کے لیے صرف ڈھائی تین سال کی مدت نصیب ہوئی اور یہ مختصر مدت ایک پوری قوم کو جہاد فی سبیل اللہ کے قابل بنانے کے لیے کافی نہیں تھی۔ اس عرصہ میں نہ تو ان کے پیروؤں کی تعداد اس حد تک پہنچی تھی کہ وہ رومیوں کے مقابلہ پر ان سے کام لے سکتے اور نہ خود ان لوگوں کی جو ان کے پیرو ہو چکے تھے، اخلاقی تربیت اس قدر مکمل ہوئی تھی کہ وہ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوںؓ کی طرح جرأت و عزیمت کے ساتھ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرتے، گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر جاتے اور بڑی سے بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں بھی بے خوف ہو کر جانیں لڑا دیتے۔ ان لوگوں کے ایمان ابھی اتنے قوی نہ ہوئے تھے کہ وہ عَلانیہ اظہارِ حق کی جرأت کرتے۔ مسیح کے سب سے زیادہ محبوب اور معتمد علیہ حواری پطرس کا یہ حال تھا کہ اُن کی گرفتاری کے وقت جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا تم بھی مسیح کے پیرو ہو تو اس نے "مرغ کے دو دفعہ بانگ دینے سے پہلے تین دفعہ مسیح کا انکار کر دیا (مرقس، ۱۴: ۳۰)۔ ان کے ایک اور حواری یہوداہ اسکریوتی نے چاندی کے ۳۰ سکوں کی خاطر ان کو گرفتار

کرادیا (متی، ۲۶ : ۱۴-۱۶) اور جب ان کو گرفتار کر لیا گیا تو ان کے سارے شاگرد انھیں چھوڑ کر بھاگ گئے (متی، ۲۶ : ۵۶)۔ ظاہر ہے کہ جب ان کے خاص حواریوں اور پھر دوسرے شاگردوں کا یہ حال تھا تو وہ ایسی ناقابلِ اعتماد فوج کو لے کر جہاد کی جُرأت کیونکر کر سکتے تھے۔ اگر رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ان کو بھی تعلیم و تربیت کا کافی موقع ملتا تو ممکن تھا کہ وہ بھی اپنے حواریوں میں وہی مجاہدانہ رُوح پیدا کر دیتے، جو صحابہؓ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا کی تھی۔ لیکن ان کی سرکش قوم نے ان کی نبوّت کو پورے تین سال بھی برداشت نہ کیا اور انھیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ اس کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی بڑا کام کر سکتے۔ اس قلیل مُدت میں زیادہ سے زیادہ اُتنا ہی کام ہو سکتا تھا۔ جتنا مسیحؑ نے کیا۔ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے ابتدائی تین سال پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس میں بھی کہیں جہاد و قتال کا نشان نہ ملے گا۔ وہی صبر و تحمل، ثبات و استقامت، تقویٰ و خشیت، توکل علی اللہ اور تزکیۂ نفس و تنزیہہ اخلاق کی تعلیمات وہاں بھی پائی جائیں گی۔ جو مسیحؑ کی حیاتِ نبویہ میں پائی جاتی ہیں۔

مسیحیت اور موسوی شریعت کا تعلق

اس علم و بصیرت کی روشنی میں اگر مسیحؑ کی تعلیمات کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو بڑی اقسام پر منقسم ہو جائیں گی۔

ایک قسم وہ ہے جس میں مسیحؑ نے شریعتِ موسویہ کی تکمیل کی ہے اور اس میں ضروری اضافے کیے ہیں۔ موسوی شریعت میں رافت و رحمت اور شفقت و لینت کی کمی تھی۔ مسیحؑ نے اس کا اضافہ کیا۔ اس کے قوانین میں لچک بالکل نہ تھی اور اس کی تعلیمات میں انسانی برادری کا وسیع تخیل بہت دُھندلا تھا۔ مسیحؑ نے اس کمی کو پورا کیا اور بنی اسرائیل کو تمام بنی نوعِ انسان کے ساتھ یکساں محبت کرنے کی تلقین کی۔ اس میں انسان کے محض فرائض پر زور دیا گیا تھا اور احسان یا فضیلتِ اخلاق کے حصہ کو اچھوتا چھوڑ دیا گیا تھا، مسیحؑ نے سب سے زیادہ اسی پہلو پر زور دیا اور خیرات، فیاضی، ہمدردی، ایثار اور لطف و رحم وغیرہ فضائل کی خصوصیت کے ساتھ تلقین کی۔ مسیحؑ کی تعلیم کا یہ حِصّہ خود کوئی مستقل قانون تھا بلکہ موسوی شریعت کا تتمہ اور ایک ضروری ضمیمہ تھا۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں مسیحؑ نے اپنے زمانہ کے بنی اسرائیل کی مخصوص اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی حالت کو پیشِ نظر رکھ کر اصلاح کی کوشش کی تھی۔ مثلاً یہودیوں میں مال و دولت کی حرص اور دنیا کی محبت بڑھی ہوئی تھی۔ مسیحؑ نے اس کے مقابلہ میں قناعت و توکل اور متاعِ دُنیا کی تحقیر پر زور دیا۔ یہودیوں میں بے رحمی، سنگدلی اور شقاوت کی زیادتی تھی۔ مسیحؑ نے اس کے جواب میں عفو و درگزر اور رحم کی تلقین کی۔ یہودیوں میں

کنجوسی اور تنگ دلی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ مسیح نے اس کی اصلاح کے لیے سخاوت و فراخ حوصلگی کا درس دیا۔ یہودی امراء و فقہاء خود پسند، نفس پرست، متکبر اور مغرور تھے۔ مسیح نے ان کو اعتدال پر لانے کے لیے فروتنی، انکسار، زہد و تقویٰ اور خدا پرستی پر زور دیا۔ یہودی قوم رومی حکومت میں غلام، بے بس اور کمزور تھی۔ مسیح نے ان کی سلامتی اور نجات کے لیے انھیں ایک طرف حکومت کے مقابلہ سے روکا، ظلم و تعدی کو برداشت کرنے کی تلقین کی، حقوق کی حفاظت میں قوت استعمال کرنے سے منع کیا اور دوسری طرف ان میں جنگ کی معنوی قوت پیدا کرنے کے لیے صبر و استقامت، بے خوفی اور پختگیٔ عزم و ارادہ کی قوت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسیح کی تعلیم کا یہ دوسرا حصہ بنی اسرائیل کی خاص اسی حالت کے لیے مخصوص تھا جس میں بعثتِ مسیح کے وقت وہ مبتلا تھے اس کو کوئی دائمی اور عالمگیر قانون بنانا ہرگز مقصود نہ تھا۔ خصوصیت کے ساتھ تذلل و انفعال کی یہ تعلیم کہ شریر کا مقابلہ نہ کر، جو کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے آگے دوسرا گال بھی پیش کر دے، جو کوئی تیرا کُرتہ چھینے، اسے چوغہ بھی اتار دے، یہ دراصل غلامی و بے بسی کی ایک مخصوص حالت کے لیے تھی، اس کو کسی آزاد قوم کی سیاسی پالیسی بنانا نہ تو مطلوب تھا اور نہ یہ کسی طرح درُست اور معقول ہو سکتا تھا۔ (۲۹)

باب ۳

حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں تحریف

فصل ۱

مسیحیت کا ظہور

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ (المائدہ۔ آیت ۱۴)

ترجمہ: "اسی طرح ہم نے ان لوگوں سے بھی پختہ عہد لیا تھا۔ جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں"۔

لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ "نصاریٰ" کا لفظ ناصرہ سے ماخوذ ہے جو مسیح علیہ السلام کا وطن تھا۔ دراصل اس کا ماخذ "نصرت" ہے اور اس کی بنا پر وہ قول ہے جو مسیح علیہ السلام کے سوال مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ (خدا کی راہ میں کون لوگ میرے مددگار ہیں؟) کے جواب میں حواریوں نے کہا تھا کہ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ (ہم اللہ کے کام میں مددگار ہیں) عیسائی مصنفین کو بالعموم محض ظاہری مشابہت دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ میں ناصریہ (NAZARENES) کے نام سے جو ایک فرقہ پایا جاتا تھا، اور جنھیں حقارت کے ساتھ ناصری اور ایبونی کہا جاتا تھا، انہی کے نام کو قرآن نے تمام عیسائیوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ انھوں نے خود کہا تھا کہ "ہم نصاریٰ" ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ عیسائیوں نے اپنا نام کبھی ناصری نہیں رکھا۔

موسوی شریعت سے جدائی

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروؤں کا نام کبھی "عیسائی" یا "مسیحی" نہیں رکھا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے نام سے کسی نئے مذہب کی بنا ڈالنے نہیں آئے تھے۔ ان کی دعوت اسی دین کو تازہ کرنے کی طرف تھی، جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن سے پہلے اور بعد کے انبیاء علیہم السلام لے کر آئے تھے۔ اس لیے انھوں نے عام بنی اسرائیل اور پیروانِ شریعتِ موسوی سے الگ نہ کوئی جماعت بنائی اور نہ اس کا کوئی مستقل نام رکھا۔ ان کے ابتدائی پیرو خود بھی نہ اپنے آپ کو اسرائیلی ملت سے الگ سمجھتے تھے، نہ ایک مستقل گروہ بن کر رہے، اور نہ انھوں نے اپنے لیے کوئی امتیازی نام اور نشان قرار پایا۔ وہ

عام یہودیوں کے ساتھ بیت المقدس ہی کے ہیکل میں عبادت کرنے کے لیے جاتے تھے۔ اور اپنے آپ کو موسوی شریعت پر عمل کرنے کا پابند سمجھتے تھے (ملاحظہ ہو کتاب اعمال ۳ : ۱ - ۱۰ : ۱۴ - ۱۵ : ۱ ، ۵ - ۲۱ : ۲۱)

جُدائی کا دو طرفہ عمل

آگے چل کر جدائی کا عمل دو جانب سے شروع ہوا۔ ایک طرف حضرت عیسیٰؑ کے پیروان میں سے پولوس (سینٹ پال) نے شریعت کی پابندی ختم کرکے یہ اعلان کر دیا کہ مسیحؑ پر ایمان لے آنا نجات کے لیے کافی ہے اور دوسری طرف یہودی علمانے پیروانِ مسیحؑ کو ایک گمراہ فرقہ قرار دے کر عام بنی اسرائیل سے کاٹ دیا۔ لیکن اس جدائی کے باوجود ابتداءً اس نئے فرقے کا کوئی خاص نام نہ تھا۔ خود پیروان مسیحؑ اپنے لیے کبھی "شاگرد" کا لفظ استعمال کرتے تھے اور کبھی اپنے رفقاء کا ذکر "بھائیوں" (اخوان)، "ایمان داروں" (مومنین)، "جو ایمان لائے" (اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا) اور "مقدسوں" کے الفاظ سے کرتے تھے۔ (کتاب اعمال ۲ : ۴۴ - ۴ : ۳۲ - ۹ : ۲۶ - ۱۱ : ۲۹ - ۱۳ : ۵۲ - ۱۵ : ۱ ، ۲۳ - رومیوں ۱۵ : ۲۵ - گلتیوں ۱ : ۲) بخلاف اس کے یہودی ان لوگوں کو کبھی "گلیلی" کہتے تھے اور کبھی "ناصریوں کا بدعتی فرقہ" کہہ کر پکارتے تھے (اعمال ۲۴ : ۵ - لوقا ۱۳ : ۲) یہ نام دھرنے کی کوشش انھوں نے از راہ طنز و تشنیع اس بنا پر کی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وطن ناصرہ تھا اور وہ فلسطین کے ضلع گلیل میں واقع تھا۔ لیکن یہ طنزیہ الفاظ اس حد تک رائج نہ ہو سکے کہ پیروانِ مسیحؑ کے لیے نام کی حیثیت اختیار کر جاتے۔

لفظ "مسیحی" کا اوّلین استعمال

اس گروہ کا موجودہ نام مسیحی (   ) پہلی مرتبہ ۴۳ء یا ۴۴ء میں انطاکیہ کے مشرک باشندوں نے رکھا تھا، جب کہ سینٹ پال اور بَرنَباس نے وہاں پہنچ کر اپنے مذہب کی تبلیغِ عام شروع کی (اعمال ۱۱ : ۲۶) یہ نام بھی دراصل طنز و تمسخر کے طور پر مخالفین کی طرف سے رکھا گیا تھا، اور پیروانِ مسیحؑ اسے خود اپنے نام کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن جب ان کے دشمنوں نے ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا کہ ان کے لیڈروں نے کہا کہ اگر تمھیں مسیح کی طرف نسبت دے کر "مسیحی" کہا جاتا ہے تو تمھیں اس پر شرمانے کی کیا ضرورت ہے (۱ - پطرس ۴ : ۱۶) اس طرح رفتہ رفتہ یہ لوگ خود بھی اپنے آپ کو اسی نام سے موسوم کرنے لگے جس سے ان کے دشمنوں نے طنزاً انھیں موسوم کیا تھا، یہاں تک کہ آخر کار ان کے اندر سے یہ احساس ہی ختم ہو گیا کہ یہ دراصل ایک بُرا لقب تھا جو انھیں دیا گیا تھا۔

عیسائیوں پر قرآن کا ایک احسان

قرآن مجید نے اسی لیے مسیح کے ماننے والوں کو مسیحی یا عیسائی کے نام سے یاد نہیں کیا۔ بلکہ انھیں یاد دلایا ہے کہ تم دراصل ان لوگوں کے نام لیوا ہو جنھیں عیسیٰؑ ابن مریم نے پکارا تھا کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللہِ ؕ کون ہے جو اللہ کی راہ میں میری مدد کرے"، اور انھوں نے جواب دیا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللہِ "ہم اللہ کی راہ میں مددگار رہیں گے"۔ اس لیے تم اپنی ابتدائی اور بنیادی حقیقت کے اعتبار سے نصاریٰ یا انصار رہو۔ لیکن آج عیسائی مشنری اس یاددہانی پر قرآن کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اُلٹی شکایت کر رہے ہیں کہ قرآن نے ان کو مسیحی کہنے کے بجائے نصاریٰ کے نام سے کیوں موسوم کیا۔ (۳۰)

سینٹ پال نے ایک نیا دین بنا ڈالا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیرو آپ کو صرف نبی مانتے تھے، موسوی شریعت کا اتباع کرتے تھے عقائد اور احکام اور عبادات کے معاملہ میں اپنے آپ کو دوسرے بنی اسرائیل سے قطعاً الگ نہ سمجھتے تھے، اور یہودیوں سے ان کا اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کو مسیح تسلیم کر کے ان پر ایمان لائے تھے اور وہ اُن کو مسیح ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بعد میں جب سینٹ پال اس جماعت میں داخل ہوا تو اُس نے رومیوں، یونانیوں، اور دوسرے غیر یہودی اور غیر اسرائیلی لوگوں میں بھی اس دین کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی، اور اس غرض کے لیے ایک نیا دین بنا ڈالا جس کے عقائد و اصول اور احکام اُس دین سے بالکل مختلف تھے جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ اس شخص نے حضرت عیسیٰؑ کی کوئی صحبت نہیں پائی تھی، بلکہ اُن کے زمانے میں وہ اُن کا سخت مخالف تھا اور ان کے بعد بھی کئی سال تک اُن کے پیرؤوں کا دشمن بنا رہا۔ پھر جب اس جماعت میں داخل ہو کر اس نے ایک نیا دین بنانا شروع کیا اس وقت بھی اُس نے حضرت عیسیٰؑ کے کسی قول کی سند پیش نہیں بلکہ اپنے کشف و الہام کو بنیاد بنایا۔

نئے دین سے سینٹ پال کا مقصد

اس نئے دین کی تشکیل میں اس کے پیشِ نظر بس یہ مقصد تھا کہ دین ایسا ہو جسے عام غیر یہودی (GENTILE) دنیا قبول کر لے۔ اس نے اعلان کر دیا کہ ایک عیسائی، شریعتِ یہود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس نے کھانے پینے میں حرام و حلال کی ساری قیود ختم کر دیں۔ اس نے ختنہ کے حکم کو بھی منسوخ کر دیا جو غیر یہودی دنیا کو خاص طور پر ناگوار تھا حتیٰ کہ اس نے مسیح کی اُلوہیت اور ان کے ابنِ خدا ہونے اور صلیب پر جان دے کر

اولادِ آدم کے پیدائشی گناہ کا کفارہ بن جانے کا عقیدہ بھی تصنیف کر ڈالا کیونکہ عام مشرکین کے مزاج سے یہ بہت مناسبت رکھتا تھا۔

اِس فتنہ کی روک تھام میں پیروانِ مسیح کی ناکامی

مسیح کے ابتدائی پیروؤں نے ان بدعات کی مزاحمت کی، مگر سینٹ پال نے جو دروازہ کھولا تھا، اس سے غیر یہودی عیسائیوں کا ایک ایسا زبردست سیلاب اس مذہب میں داخل ہوگیا جس کے مقابلے میں وہ مُٹھی بھر لوگ کسی طرح نہ ٹھہر سکے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بکثرت لوگ ایسے موجود تھے جو مسیحیت کی اُلوہیت کے عقیدے سے انکار کرتے تھے۔ مگر چوتھی صدی کے آغاز ۳۲۵ء میں نیقیہ (NICAEA) کی کونسل نے پولوسی عقائد کو قطعی طور پر مسیحیت کا مسلّم مذہب قرار دے دیا۔ پھر رومی سلطنت خود عیسائی ہوگئی اور قیصر تھیوڈوسیس کے زمانے میں یہی مذہب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ تمام کتابیں جو اس عقیدے کے خلاف ہوں، مردُود قرار دے دی جائیں اور صرف وہی کتابیں معتبر ٹھہرائی جائیں جو اس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ۳۶۷ء میں پہلی مرتبہ اتھاناسیوس (ATHANASIUS) کے ایک خط کے ذریعے معتبر و مسلّم کتابوں کے ایک مجموعہ کا اعلان کیا گیا، پھر اس کی توثیق ۳۸۲ء میں پوپ ڈیمیسس (DAMASIUS) کے زیرِ صدارت ایک مجلس نے کی، اور پانچویں صدی کے آخر میں پوپ گلاسیس (GELASIUS) نے اس مجموعہ کو مسلّم قرار دینے کے ساتھ ساتھ اُن کتابوں کی ایک فہرست مرتب کردی جو ان کے متعلق کبھی کوئی عیسائی عالم یہ دعویٰ نہیں کرسکا ہے کہ ان میں سے کسی عقیدے کی تعلیم خود حضرت عیسٰی علیہ السلام نے دی تھی۔ بلکہ معتبر کتابوں کے مجموعہ میں جو انجیلیں شامل ہیں، خود ان میں بھی حضرت عیسٰیؑ کے اپنے کسی قول سے ان عقائد کا ثبوت نہیں ملتا۔ (۳۱)

تعلیماتِ عیسیٰؑ کو بالکل ملیامیٹ کردیا گیا

لیکن مسیح کے اس دنیا سے اُٹھ جانے کے چند ہی برس بعد ان تمام اصول و قواعد کو یکلخت منہدم کردیا گیا جن پر انھوں نے اپنی دینی تجدید و اصلاح کی بنیاد رکھی تھی۔ اور مسیح کی اصل تعلیم کو ایسا بدل دیا گیا کہ دنیا میں اس کے وجود کا نام و نشان تک نہ رہا۔ اس عمل تحریف و تمسیخ کا محرک سینٹ پال (پولوس) تھا۔ ہم اس کی نیت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ممکن ہے کہ مسیح کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی ۶ برس تک ان کی دعوت کا شدید دشمن رہنے کے بعد آخر کار وہ سچے دل سے مسیح کا پیرو اور وکیل بن گیا ہو، لیکن اس سے

انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ مسیح کا صحبت یافتہ نہ تھا، ان کی تربیت میں رہ کر اسے تعلیماتِ مسیح کی اصل رُوح کو سمجھنے کا موقع نہیں ملا تھا، اور وہ ان حواریوں کے مقابلہ میں جو مسیح کے زیرِ تربیت رہ چکے تھے، مسیحی تعلیمات کو زیادہ سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس لیے جب اس نے پطرس جیسے حواریوں کی رائے کے خلاف مسیح کے دین کی تعبیر و تاویل کی اور اسے اپنی نو ایجاد بنیادوں پر قائم کیا، تو یہ بدنیتی نہ سہی، جہل و ناواقفیت کی بنا پر یقیناً ایک کھلی ہوئی تحریف تھی۔[1]

اصولِ دین میں پہلی تحریف

اس سلسلہ میں پولوس نے دین کے اصول میں جو تحریفات کیں ان میں سب سے پہلی تحریف یہ تھی کہ مسیح کی تعلیم کو تمام عالمِ انسانی کے لیے ایک عام پیغام قرار دیا۔ حالانکہ دراصل وہ محض بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ مسیح نے اپنی زندگی میں جب حواریوں کو تبلیغ و دعوت کے لیے بھیجا تھا تو صاف طور پر حکم دیا تھا کہ:

> "غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ اسرائیل کی بھٹکی ہوئی بھیڑوں ہی کے پاس جانا" (متی، ۱۰: ۵-۶)

خود مسیح نے اپنے پورے عہدِ نبوت میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی غیر اسرائیلی قوموں کو اپنی طرف دعوت نہیں دی۔ اور نہ کسی غیر اسرائیلی کو داخلِ جماعت کیا۔ سینٹ پال کے ظہور سے پہلے مسیح کے حواری بھی اسرائیلیوں ہی کو دعوت دیتے رہے۔ مبلّغ بھی اسرائیلی تھے اور اس کے مخاطب بھی اسرائیلی۔ اس وقت تک مسیحی دعوت یہودی مذہب میں ایک اصلاحی دعوت شمار ہوتی تھی۔[2] حواریوں میں یہ ایک مسلّم مسئلہ تھا کہ انجیل کی منادی صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو شریعتِ موسویہ کے پیرو ہیں۔[3] پیروانِ مسیح کی جو مؤتمرِ عام ۴۹ء میں بمقام یروشلم منعقد

---

[1] خود سینٹ پال کے شاگرد لوقا کی کتابِ اعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح کی زندگی میں اس کو ان کی صحبت اور تربیت سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ نیز یہ کہ جب اس نے دینِ مسیح میں تحریف شروع کی تو مسیح کے خاص تربیت یافتہ حواریوں نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ پس خود انجیل کی سند پر کہا جا سکتا ہے کہ سینٹ پال کے ایجاد کردہ اصول نہ صرف دینِ مسیح کی اسپرٹ کے خلاف تھے بلکہ خود مسیح کی صریح ہدایات کے بھی خلاف تھے۔

[2] (MILLMAN, HISTORY OF CHRISTIANTY, VOL. I, P, 377)

[3] (DUMELLOW, COMMENTARY ON THE HOLY BIBLE, P. LXXXIX)

ہوتی تھی۔ اس میں ایک بڑی جماعت، اسی رائے کی مؤید تھی[1]۔ لیکن پولوس نے دعوتِ مسیح کی حقیقت، مسیح کی تصریحات اور حواریوں کے علم و یقین، سب کو نظر انداز کر کے یہ فیصلہ کیا کہ مسیح کی دعوت، تمام دنیا کی قوموں کے لیے ہے، اور اس فیصلہ کو حق بجانب قرار دینے کے لیے یہ دعویٰ کیا کہ مسیح نے صلیب پر چڑھنے اور وفات پا جانے کے بعد اپنے شاگردوں کے پاس آ کر یہ حکم دیا تھا کہ "تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ[2]" (متی، ۲۸:۱۹)

اصولِ دین میں دوسری تحریف

لیکن غیر اسرائیلی قوموں کو موسوی قوانین کا پابند بنانا مشکل تھا۔ بہت سے رسوم و شعائر ایسے تھے۔ جن سے ان قوموں کو نفرت تھی۔ اس لیے فوراً ہی یہ سوال پیدا ہو گیا کہ جب ان قوموں کو مسیحیت کی طرف دعوت دی جائے تو موسوی شریعت کی پابندی پر زور دیا جائے یا نہیں؟ اس بارے میں مسیح کی تصریحات بالکل واضح تھیں۔ وہ فرما چکے تھے کہ "زمین و آسمان ٹل سکتے ہیں مگر تورات کا ایک شوشہ اور ایک نقطہ بھی نہیں ٹل سکتا" اور یہ کہ "میں تورات کو منسوخ کرنے کے لیے نہیں بلکہ مکمّل کرنے آیا ہوں" اور "آسمان کی بادشاہت میں وہی داخل ہو سکتا ہے جو تورات کے حکموں پر عمل کرے"۔ ان تصریحات کے بعد کسی سچے مسیحی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ مسیحیت کو موسوی شریعت سے الگ کرتا۔ مگر پولوس نے ان کے علی الرغم یہ فیصلہ کیا کہ ہر غیر اسرائیلی مسیحی بن سکتا ہے خواہ شریعت پر عمل کرے یا نہ کرے[3]۔ چنانچہ وہ تمام غیر اسرائیلی مشرکین جو شریعتِ موسویہ کے کلی و جزوی طور پر منکر تھے، مسیحیت میں داخل کر لیے گئے۔

شریعتِ موسوی کی مخالفت

اس ترمیم و تنسیخ پر عام ناراضی کا اظہار کیا گیا (اعمال باب ۲۱) اور خود مسیحی جماعت کے اعیان نے بھی اس کی سخت مخالفت کی، مگر پولوس نے سینٹ پیٹرس اور سینٹ برنا باس جیسے جلیل القدر حواریوں کو ریاکار اور گمراہ قرار دیا (گلیتون ۲ : ۱۳) اور علی الاعلان شریعتِ موسویہ کی مخالفت شروع کر دی۔ وہ گلیتون کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے:

---

[1] (MILLMAN, HISTORY OF CHRISTIANITY, VOL. I, P. 393)

[2] (DUMELLOW, COMMENTARY ON THE HOLY BIBLE, P. LXXXIX)

[3] (MILLMAN HISTORY OF CHRISTIANITY VOL. I, P. 392)

> "ہم یہ جان کر یسوع مسیح پر ایمان لائے کہ آدمی شریعت کے اعمال سے نہیں بلکہ صرف یسوع مسیح پر ایمان لانے سے برحق ٹھہرتا ہے .... شریعت کے اعمال سے کوئی بشر برحق نہ ٹھہرے گا .... حقانیت اگر شریعت ہی کے وسیلہ سے ملتی تو مسیح کا مرنا عبث ہوتا۔" (۲ : ۱۶-۲۱)

> "جو لوگ شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں سب لعنت کے ماتحت ہیں ...... شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیتا رہے گا۔ اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں ...... مسیح نے ہمارے لیے لعنتی بن کر اور ہمیں خرید کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا۔" (۳ : ۱۰-۱۳)

> "شریعت، ایمان (یعنی مسیح کی تعلیم) تک پہنچانے کے لیے ہماری اُستاد بنی تاکہ ہم ایمان کے سبب راستباز ٹھہریں۔ مگر جب ایمان آ چکا تو ہم اُستاد کے ماتحت نہ رہے۔" (۳ : ۲۴-۲۵)

> "مسیح نے ہمیں آزاد رہنے کے لیے آزاد کیا ہے۔ پس قائم رہو اور دوبارہ غلامی یعنی شریعت کی پابندی کے جُوئے میں نہ جُتو .... تم جو شریعت کے وسیلہ سے راستباز بننا چاہتے ہو تو گویا تم مسیح سے الگ ہو گئے اور فضل سے محروم، کیونکہ ہم رُوح اور ایمان کے توسّل سے راستبازی کی اُمید پر آنے کے منتظر ہیں۔" (۵ : ۱-۵)

اس طرح مسیحیت شریعت سے الگ ہو گئی۔ تمدّن، معاشرت، سیاست اور اجتماعی و انفرادی زندگی کے متعلق تمام قوانین منسوخ ہو گئے۔ اور صرف چند اخلاقی و روحانی تعلیمات کے ایک نامکمل مجموعہ کو، جو دراصل شریعت کے ضمیمہ کے طور پر ایک خاص قوم کی خاص حالت کو درست کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا، ایک مستقل، دائمی اور عالمگیر مذہب بنا دیا گیا۔

پولوسی مسیحیت کے مضر اخلاقی اثرات

سینٹ پال کے مقلّدوں نے اس غیر مکمل مذہب کو جو دراصل مسیحی نہیں، بلکہ پولوسی مذہب تھا، بنی اسرائیل کو چھوڑ کر روم و یونان کی آزاد قوموں میں پھیلانا شروع کیا۔ لیکن کسی شریعت اور کسی ضابطۂ قانون کے بغیر محض ایک اخلاقی تعلیم اور ایسی تعلیم جو دراصل ایک غلام اور پسماندہ قوم کے لیے وضع کی گئی تھی، آزاد اور صاحبِ حکومت و سیاست قوموں کے لیے بیکار اور بے معنی چیز تھی۔ اس میں کوئی ایسی مکمل ہدایت تو تھی ہی نہیں کہ عام انسانی جماعت کے مختلف حالات میں مفید و مناسب ہو سکتی۔ وہ تو صرف

چند اخلاقی نصائح کا مجموعہ تھی جو زیادہ انتہاپسندانہ تھیں اور ظاہر ہے کہ تنہا ان پر عمل کر کے کسی قوم کا زندہ رہنا محال تھا، لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی ڈھائی تین سو برس تک تو عیسائی ہر قسم کے مظالم و شدائد کے تختۂ مشق بنتے رہے۔ کیونکہ یہی اخلاق ان کو سکھایا گیا تھا اور اس منزل سے آگے چلنے کے لیے ان کے پاس کوئی ہدایت نہ تھی۔ پھر جب ان کی اپنی تدبیر سے نہیں بلکہ محض اتفاقاً ان کو حکومت حاصل ہو گئی تو پولوسی مسیحیت کے ناممکن العمل دائرہ میں زندگی بسر کرنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اس لیے انھوں نے مسیحیت کی ساری حدیں توڑ ڈالیں۔ اور ظلم و ستم، اور قتل و غارتگری کی انتہا کر دی۔

ظلم کا مقابلہ کرنے کی روح کا فقدان

ابتدا میں تو مسیحیوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ "ایک گال کے ساتھ دوسرا گال بھی پیش کر دینا" اور "شریر کا مقابلہ کبھی نہ کرنا" مسیح کی دائمی تعلیم ہے۔ اس لیے جب ان کی تعداد خوب بڑھ گئی۔ اور ان کے اثرات وسیع ہو گئے، اس وقت بھی ان میں ظلم کا مقابلہ کرنے اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کی روح پیدا نہ ہو سکی۔ سنہ ۶۴ عیسوی میں جبکہ یونان اور روم، شام اور فلسطین میں مسیحیوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو چکی تھی۔ نیرو نے ان پر حریق روم کا جھوٹا الزام لگایا اور اس کے حکم سے ہر وہ شخص جس نے مسیحی ہونے کا اقرار کیا، گرفتار کر لیا۔ کسی کو صلیب پر چڑھایا گیا، کسی کو زندہ جلا دیا گیا، کسی کو کتوں سے پھڑوایا گیا اور سینکڑوں عیسائی عورتوں اور مردوں اور بچوں کو روم کے اکھاڑوں میں وحشیانہ کھیلوں کا تختۂ مشق بنایا جانے لگا۔ سنہ ۷۰ء میں تیتوس (TITUS) کے زیر قیادت بیت المقدس پر چڑھائی کی گئی، ۹۷ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بنا لیے گئے۔ گیارہ ہزار آدمیوں کو بھوکا مار دیا گیا۔ ہزاروں آدمی پکڑ کر روم کے اکھاڑوں اور امفی تھیٹروں میں جنگلی جانوروں کا لقمہ بننے یا سیافوں کی شمشیر زنی کا تختۂ مشق بننے کے لیے بھیج دیے گئے؎

نیرو کے بعد مارکس آریلیوس، سپٹیموس، سیویروس، ڈیسیوس اور والیریان نے مسیحیت اور اس کے پیروؤں کو کچلنے کی کوششیں کیں۔ آخر میں ڈایو کلیٹیان نے تو ظلم و ستم کی حد کر دی۔ اس نے عام حکم جاری کر دیا کہ کلیسا مسمار کر دیے جائیں، انجیلیں جلا دی جائیں، اور کلیساؤں کے اوقاف ضبط کر لیے جائیں۔

؎ (GIBBON, VOL. II, CHAP. 16. EARLY DAYS OF CHRISTIANITY, PP. 488-89)

۳۰۳ء میں خود شہنشاہ نے نیکومیڈیا کے مرکزی کلیسا کو پیوندِ خاک کر دیا۔ اور مقدس کتابیں جلوا دیں۔ ۳۰۴ء میں اس نے عام حکم دے دیا کہ جو شخص مسیحی مذہب پر اصرار کرے وہ قتل کر دیا جائے۔ اس کے بعد سختیاں اور بڑھیں، یہاں تک کہ جو لوگ مسیحی مذہب چھوڑنے سے انکار کرتے ان کے بدن زخمی کر کے ان پر سرکہ اور نمک ڈالا جاتا اور بعد میں ان کی بوٹی بوٹی کاٹی جاتی تھی۔ بعض اوقات ان کو کنیسوں میں بند کر کے آگ لگا دی جاتی۔ اور زیادہ لطف اٹھانے کے لیے ایک ایک عیسائی کو پکڑ کر دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جاتا تھا یا لوہے کے کانٹے اس کے بدن میں جھونکے جاتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ تمام سلطنت میں عیسائی پھیلے ہوئے تھے، سلطنت کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے عہدے بکثرت ان کے ہاتھ میں تھے۔ اور خود شہنشاہ کے قصر میں عیسائیوں کی ایک کثیر جماعت موجود تھی[1] لیکن مسیحیوں کو یقین دلا دیا گیا تھا کہ اس کثرت و قوت کے زمانے میں بھی وہی شریر کا مقابلہ نہ کرنے اور ایک گال کے ساتھ دوسرا گال بھی پیش کر دینے کی تعلیم ہی واجب العمل ہے جو اسرائیلیوں کو انتہائی کمزوری و بے بسی کی حالت میں دی گئی تھی۔ اس لیے شام، فلسطین، عراق، مصر، افریقہ، اسپین، گال، اسسلی، اٹلی، البیریا، ایشیائے کوچک، غرض کہیں بھی کسی عیسائی نے ان مظالم پر دم نہ مارا اور ساری قوم ان تجاوزات کو خودکشانہ بے عملی کے ساتھ برداشت کرتی رہی۔

مسیحی خود ظالم بن گئے

یہ تو تھی مسیحیت کی تفریط۔ اس کے بعد جب قسطنطینِ اعظم نے اس کو قبول کر لیا۔ اور وہ عملاً سلطنت کا مذہب بن گئی۔ تو وہ تفریط کے انتہائی نقطہ سے جست لگا کر دفعتہً افراط کے انتہائی نقطہ پر جا پہنچی۔ پہلی خرابی تو اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ پولوسی مسیحیت کو سیاست و تمدن سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کے پیرؤوں نے اپنے مذہب کی پابندی کرتے ہوئے ایک خالص انفعالی زندگی اختیار کر رکھی تھی۔ مگر جب اتفاقِ وقت سے ان پر سلطنت کی ذمہ داریاں آ پڑیں تو دوسری اور پہلے سے زیادہ شدید خرابی پیدا ہو گئی اور وہ یہ تھی کہ جہانبانی و حکمرانی کے لیے چونکہ مسیحیت نے ان کی کوئی رہنمائی نہ کی تھی، اس لیے یہ سارا کاروبار شریعتِ خدا کے بجائے شریعتِ نفس کے مطابق سرانجام دینا شروع کر دیا۔ معاملاتِ سلطنت میں تو جنگ بھی ہے اور صلح بھی، سیاست بھی ہے اور تعزیر بھی، انتقام بھی ہے اور عفو بھی۔ مگر موسوی شریعت سے جدا کی ہوئی مسیحیت

---

[1] REV CUTTS, CONSTANIINE THE GREAT, PP. 55.60

کے پاس ان میں سے کسی کام کے لیے بھی کوئی ضابطہ و قانون اور دستورِ عمل موجود نہ تھا۔ اس نے زندگی کے معاملات کے لیے بجز اس ایک قانون کے کہ شریر کا مقابلہ نہ کرو اور کُرتہ چھیننے والے کو چوغہ بھی اُتار دے اور کوئی قانون نہ بنایا تھا۔ مگر اس انفعال و تذلل کی تعلیم کے تنگ دائرے میں رہ کر مسیحیوں کے لیے ناممکن تھا کہ سلطنت کے اہم معاملات کو انجام دے سکتے۔ اس لیے وہ اس دائرے کو توڑ کر باہر نکلنے پر مجبور ہوئے۔ اور جب وہ اسے توڑ کر باہر نکل آئے، تو اپنے نفس کے فتوے پر عمل کرنے کے لیے بالکل آزاد تھے۔ اس عملی دنیا میں ان کے لیے کوئی ایسی دینی ہدایت اور الٰہی روشنی موجود ہی نہ تھی جو انھیں صحیح راستہ دکھا سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں نے خدا کی زمین میں فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کر دیا اور طغیان و سرکشی کا وہ ہنگامہ برپا کیا کہ آج تک سرد نہ ہو سکا۔

قسطنطین کے عہد میں تو سلطنت کے تقریباً نصف باشندے صنم پرست تھے، اس لیے اس نے ان لوگوں پر زیادہ ظلم کرنے کی جرأت نہ کی۔ بس اتنے ہی پر اکتفا کیا کہ مندروں کے دروازے اور ان کی چھتیں منہدم کرا دیں۔ بتوں کے کپڑے اور زیور اتروا دیے اور ان کو معبدوں سے باہر نکلوا دیا۔[1] مگر چند سال بعد جب کلیسا کو ملک پر پورا تسلط حاصل ہو گیا تو مسیحیت کے مقتداؤں نے وثنیت کو کچلنے کا عزم کر لیا اور مذہبی قوانین کے حسب ذیل دو اصول مقرر کیے جن سے غیر مذاہب کو جبراً مٹانے کے بے شمار احکام مستنبط ہوتے تھے:-

۱۔ جن گناہوں سے مجسٹریٹ منع نہ کرے یا ان پر سزا نہ دے ان کی ذمہ داری میں وہ خود بھی ایک حد تک شریک ہوتا ہے۔

۲۔ مصنوعی دیوتاؤں اور حقیقی ارواحِ خبیثہ کی بُت پرستانہ عبادت، خالقِ برتر کی بزرگی کے خلاف سخت قابلِ نفرت جُرم ہے۔

سینٹ کی قرارداد اور تھیوڈوسیوس کے فرامین

ان اصولِ موضوعہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سب سے پہلے رومن سینٹ نے باضابطہ یہ قرارداد منظور کی کہ "رومیوں کا مذہب جوپیٹر (JUPITER) کی عبادت نہیں بلکہ مسیح کی عبادت ہے" اس کے بعد بتوں کی پرستش اور ان پر نذر و نیاز چڑھانا اور قربانیاں کرنا سب کچھ قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا اور ان افعال کے مرتکبوں کے لیے شدید سزائیں مقرر کی گئیں۔ شاہ تھیوڈوسیوس نے اپنے فرامین میں ہر قسم کی غیر مسیحی عبادتوں کو

(REV CUTTS, CONSTANTINE THE GREAT, P. 278)

خواہ وہ علانیہ کی جائیں یا گھروں میں چھپ کر حکومت وقت کے خلاف بغاوت اور جرم مستلزم سزائے موت قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مندروں کو توڑنے، ان کی جائدادیں ضبط کرنے، اور عبادت کے سامانوں کو مٹا دینے کا بھی عام حکم دے دیا۔ اس حکم کے مطابق سب سے پہلے مرکز حکومت میں وثنیت کا جبراً خاتمہ کیا گیا۔ پھر صوبوں میں یہی مشق کرائی گئی۔ گال کے صوبہ میں تورس کے بشپ نے دیندار پادریوں کی ایک پوری فوج لے کر مندروں، معبدوں اور بتوں کو حتیٰ کہ ان درختوں کو بھی جو مقدس سمجھے جاتے تھے، پیوند خاک کر دیا۔ شام میں مسیحیت کے مقدس پیشوا مارسیلوس (MARCELLUS) نے جو حلقۂ فامیا (DIOCESS OF APAMEA) کا بشپ تھا، جوپیٹر کے عظیم الشان مندر کو تباہ کر دیا اور ایک پوری فوج فراہم کی جسے ساتھ لے کر وہ اپنے حلقہ کے غیر مسیحی معابد کو توڑتا پھرتا تھا۔ اسکندریہ میں مصر کے آرچ بشپ تھیوفیلس (THEOPHILUS) نے سیراپیس کے مندر کو جو یونانی فن تعمیر کا بے نظیر نمونہ تھا، مسمار کر دیا۔ اس کے کتب خانہ کو جس میں خاندان بطالسہ نے علوم و فنون کا بہترین ذخیرہ جمع کیا تھا، نذر آتش کر دیا[1]۔ سیراپیس کے بت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، اس کے بازوؤں کو اسکندریہ کے بازاروں میں گھسٹوایا تاکہ اس کے معتقدین دیکھ کر جلیں اور آخر میں اس کے ٹکڑوں کو ہزارہا آدمیوں کے سامنے جلوا دیا۔ اسی طرح دوسرے صوبوں میں بھی "مذہبی دیوانوں" کی ایک پوری فوج کسی باضابطہ اختیار اور کسی نظم و تربیت کے بغیر پُرامن باشندوں پر حملے کرتی اور قدیم فن تعمیر کے بہترین نمونوں کو برباد کرتی پھرتی تھی[2]۔

ان مظالم کا نتیجہ یہ ہوا کہ بت پرست رعایا نے تلوار کے خوف سے اس مذہب کو قبول کر لیا جس کو وہ دل سے پسند نہ کرتی تھی۔ بددل اور بے اعتقاد پیرؤوں سے مسیحی کلیسا بھر گئے۔ ۲۸ برس کے اندر روم کی عظیم الشان سلطنت سے وثنیت کا نام و نشان مٹ گیا اور یورپ، افریقہ اور شرق اردن میں "تلوار کے زور سے" مسیحیت پھیل گئی۔

عیسائیوں کی آپس میں اخلاق سوز لڑائیاں

اس کے بعد سے مسیحیوں اور غیر مسیحیوں کے درمیان اور خود مسیحیوں میں باہم جس قدر لڑائیاں ہوئیں ان میں

---

[1] اس کتب خانہ کو تنہا مارک انتونی نے دو لاکھ کتابیں دی تھیں۔ اوروسیوس لکھتا ہے کہ ۲۰ برس بعد اس کتب خانہ کی خالی الماریوں کو دیکھ کر ہر وہ دل رنج و الم اور نفرت و غضب سے بھر جاتا تھا جو مذہبی تعصب سے بالکل سیاہ نہ ہو گیا ہو۔ یہی کتب خانہ ہے جس کے جلانے کا الزام بعض عیسائی مؤرخوں نے مسلمانوں پر لگایا ہے۔

[2] یہ تمام تفصیلات گبن کی تاریخ زوال و سقوط سلطنت روم کے باب ۲۸ سے لی گئی ہیں۔

اخلاق و انسانیت کے مبادی و اصول کو بالائے طاق رکھ کر جنگ کے ایسے ایسے وحشیانہ طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ جن کے ہولناک ذکر سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ غیر مسیحی عقائد کو مٹانے کے لیے قوّت کے استعمال کے جن طریقوں کو مسیحیت کے پیروؤں نے جائز کر رکھا تھا ان کا ایک نمونہ وہ مذہبی عدالتیں ہیں جو انکوئزیشن (INQUISITION) کے نام سے خود پاپانِ روم کے ماتحت قائم تھیں۔ ان میں کفر و الحاد، یہودیت، اسلام اور تعدّدِ ازدواج جیسے "جرائم" کی سزا دینے کے لیے جو قانونِ تعزیرات رائج تھا اس میں منجملہ بہت سی سزاؤں کے، انسانوں کو زندہ جلا دینا، زبان کاٹ ڈالنا اور مرے ہوئے شخص کی قبر کھود کر ہڈیاں نکال پھینکنا بھی شامل تھا۔ تنہا اسپین میں اس مذہبی عدالت کے حکم سے تین لاکھ چالیس ہزار آدمی مختلف طریقوں سے قتل کیے گئے ہیں جن میں ۳۲ ہزار وہ ہیں جنھیں زندہ جلایا گیا۔ اس کے علاوہ میکسیکو، قرطاجنہ، سسلی، سارڈینیا، مالٹا، نیپلز، میلان، فلانڈرس وغیرہ علاقوں کی مذہبی عدالتوں نے اپنی مدّتِ حیات میں جتنے آدمیوں کو غیر مسیحی عقائد رکھنے کی پاداش میں ہلاک کرایا ان کی تعداد کا کم سے کم اندازہ ڈیڑھ لاکھ کیا گیا ہے۔[1]

یہ پولوسی مسیحیت کی ناقص تعلیم کا دوسرا نتیجہ ہے۔ پہلا نتیجہ تو یہ تھا کہ جب مسیحیوں نے اس مذہب کے احکام کی پابندی کی تو حد سے زیادہ نرم بن گئے، اور مقاومت کی استطاعت کے باوجود ظلم و ستم کو برداشت کر کے تین سو برس تک اپنے آپ کو تباہ کراتے رہے اور دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ جب زمانہ نے ان کو قوّت بخشی اور سلطنت کی ذمہ داریاں ان پر آ پڑیں تو انھیں مسیحیت کے تنگ دائرے سے نکلنا پڑا اور یہاں مذہب کی ہدایت و رہنمائی نہ پا کر انھوں نے اپنے ابنائے نوع پر ہر قسم کے ظلم و ستم کرنے شروع کیے اور نفس کی پیروی میں آزادی کے ساتھ جو چاہا کیا۔[2]

متذکرہ حالات کی ذمہ داری موجودہ مسیحیت پر ہے

پیروانِ مسیحیت نے جتنے اخلاقی گناہ کیے ہیں ان کی ذمہ داری میں خود مسیحیت بھی شامل ہے، کیونکہ

---

[1] (ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA ART "INQUISITION.")

[2] تیسرا اور آخری نتیجہ یہ ہے کہ مذہب کے نام سے جبر و ظلم اور جاہلانہ تعصب کا طوفان جب حد سے گزر گیا تو انھیں خود مذہب سے نفرت ہو گئی اور وہ دنیا بھر میں لامذہبی پھیلانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس نے انھیں سیدھی راہ نہیں بتائی۔ اسلام کی طرح مسیحیت اپنے پیرؤوں کے گناہوں سے اس بنا پر تبرّی نہیں کر سکتی کہ انھوں نے اس کے بتائے ہوئے اصول و قواعد کی پیروی نہیں کی۔ وہ ان دو صورتوں میں سے ایک کو اختیار کرنے پر مجبور ہے کہ یا تو اُن سب عیسائیوں کو گناہگار قرار دے جنھوں نے سیاست و حکمرانی کی ذمّہ داری قبول کی ہے، خواہ حق کے ساتھ اسے انجام دیا ہو یا غیر حق کے ساتھ۔ یا پھر اسے ان تمام عیسائیوں کو بھی بے گناہ قرار دینا پڑے گا۔ جنھوں نے جہانبانی و فرمانروائی کے بار کو اُٹھایا اور اس کے امور کو انجام دیا، خواہ حق کے ساتھ یا غیر حق کے ساتھ۔ وہ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری صورت اختیار نہیں کر سکتی، اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں غیر معقول ہیں۔ (۳۲)

پاپائی نظام

عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیحؑ کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں، لہٰذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور انھیں یہ کہہ کر نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔

کوئی شخص جو مسیحی مذہب اور پاپائیت کی تاریخ سے واقف ہے، میرے اس اشارہ کو جو میں نے ان چند فقروں میں کیا ہے، سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا۔ یورپ کا پاپائی نظام سینٹ پال کا پیرو تھا جس نے موسوی شریعت کو لعنت قرار دے کر مسیحیت کی بنیاد صرف اُن اخلاقی تعلیمات پر رکھی تھی جو نئے عہدنامہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان اخلاقی تعلیمات میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں ہے جس پر ایک تمدن اور ایک سیاست کا نظام چلایا جا سکے۔ مگر جب پاپاؤں نے یورپ میں بلاواسطہ یا بالواسطہ تھیاکریسی قائم کی تو اس کے لیے ایک قانونِ شریعت بھی وضع کیا، جو ظاہر ہے کہ کسی وحی و الہام سے ماخوذ نہ تھا، بلکہ خود ان کا گھڑا ہوا تھا)۔ اس میں انھوں نے جو نظامِ عقائد، جو مذہبی اعمال و رسوم، جو نذریں اور نیازیں، جو معاشرتی ضوابط وغیرہ تجویز کیے تھے ان میں سے کسی کی سند بھی ان کے پاس کتاب اللہ سے نہ تھی۔ اسی طرح انھوں نے خدا اور بندے کے درمیان مذہبی منصب داروں کو جو ایک مستقل واسطہ قرار دے دیا تھا یہ بھی ان کا خود ساختہ تھا۔ نیز انھوں نے کلیسا کے کارپردازوں کے لیے جو حقوق اور اختیارات تجویز کیے تھے اور جو مذہبی ٹیکس لوگوں پر لگائے تھے ان کے لیے بھی کوئی ماخذ ان کی اپنی ہوائے نفس کے سوا نہ تھا۔ ایسے نظام کا نام چاہے اُنھوں نے تھیاکریسی رکھ دیا ہو، لیکن وہ فی الحقیقت تھیاکریسی نہیں تھا۔ (۳۳)

یورپ اس تھیاکریسی سے واقف ہے، جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے اور عملاً اپنی خدائی تمام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو الٰہی حکومت کہنے کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ (۳۲)

عیسائیوں کے بنیادی عقائد میں فساد

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ
قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (المائدہ ۷۷)

ترجمہ: "کہو، اے اہلِ کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور "سَوَاءَ السَّبِیْل" سے بھٹک گئے۔"

تقلیدِ اغیار کا مرض

یہ اشارہ ہے ان گمراہ قوموں کی طرف جن سے عیسائیوں نے غلط عقیدے اور باطل طریقے اخذ کیے۔ خصوصاً فلاسفۂ یونان کی طرف جن کے تخیلات سے متاثر ہو کر عیسائی اس صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے جس کی طرف ابتداءً ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیح کے ابتدائی پیرو جو عقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انھوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی و رہنما نے ان کو دی تھی۔ مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیح کی عقیدت اور تعظیم میں غلو کر کے اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اوہام اور فلسفوں سے متاثر ہو کر اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیریں شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا، جس کو مسیح کی اصل تعلیمات سے دور کا واسطہ بھی نہ رہا۔

اس باب میں خود ایک مسیحی عالمِ دینیات ریورینڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ) کا بیان قابلِ ملاحظہ ہے۔

اناجیل کے رو سے حضرت عیسیٰ انسان تھے

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن میں "یسوع مسیح" (JESUS CHRIST) کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے:

"پہلی تین انجیلوں (متی، مرقس، لوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ

ان انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے ۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیضیاب ہوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے ۔ خود متی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو "مسیح" تسلیم کرنے کے بعد "الگ ایک طرف لے جا کر اسے ملامت کی" متی (۱۶-۲۲) لوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد اماؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ وہ "خدا اور ساری اُمت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا ۔ (لوقا ۲۴، ۱۹) یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ "مرقس" کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لیے لفظ "خداوند" (LORD) کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا ۔ لیکن نہ مرقس کی انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیلوں میں بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لیے بکثرت استعمال کیا گیا ہے ۔ یسوع کے ابتلاء کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں جیسا کہ اس واقعہ کے شایانِ شان ہے، مگر مرقس کی "فدیہ" والی عبارت (مرقس ۱۰، ۴۵) اور آخری فسح کے موقع پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنی نہیں پہنائے گئے ہیں جو بعد میں پہنائے گئے ۔ حتّٰی کہ اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے کہ یسوع کی موت کا انسان کے گناہ اور اس کے کفارہ سے کوئی تعلق تھا ۔"

آگے چل کر وہ پھر لکھتا ہے :

"یہ بات کہ یسوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا اناجیل کی متعدد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے ۔ مثلاً یہ کہ "مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو" (لوقا ۱۳، ۳۳) اور اکثر اپنا ذکر "ابن آدم" کے نام سے کرتا ہے ...... یسوع کہیں اپنے آپ کو "ابن اللہ" نہیں کہتا اس کے دوسرے ہم عصر جب اس کے متعلق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو غالباً ان کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو خدا کا ممسوح سمجھتے ہیں ۔ البتہ وہ اپنے آپ کو مطلقاً "بیٹے" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے ...... مزید برآں وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بیان کرنے کے لیے بھی "باپ" کا لفظ

اسی اطلاق شان میں استعمال کرتا ہے ...... اس تعلق کے بارے میں وہ اپنے آپ کو منفرد نہیں سمجھتا تھا، بلکہ ابتدائی دور میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا کے ساتھ اس خاص گہرے تعلق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا۔ البتہ بعد کے تجربے اور انسانی طبائع کے عمیق مطالعہ نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اس معاملہ میں وہ اکیلا ہے۔"

پھر یہی مصنف لکھتا ہے:

" عیدِ پنتکُست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ " ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا " یسوع کو اس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہمعصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے ...... انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نشوونما کے مدارج سے گزرا۔ اس کو پیاس لگتی تھی، وہ تھکتا تھا اور سوتا تھا، وہ حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافتِ احوال کا محتاج تھا، اس نے دکھ اٹھایا اور مرا۔ اس نے صرف یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے ...... درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اس پورے تصور کے بالکل خلاف ہوگا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے جبکہ اس دعویٰ کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو اور گتسمنی اور کھوپڑی کے مقام پر جو واردات گزریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جا سکتی۔ تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار نہ دے دیا جائے، یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان سارے حالات سے گزرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیت اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا اور اس محدودیت میں اگر کوئی استثناء تھا تو وہ صرف اسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ پھر مسیح کو قادرِ مطلق سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختارانہ کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اس قسم کے الفاظ سے کہ " یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعہ سے مل نہیں سکتی " اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات بالکل خدا پر منحصر ہے۔ فی الواقع یہ بات ان انجیلوں کے تاریخی حیثیت سے معتبر ہونے کی ایک اہم شہادت ہے کہ اگرچہ ان کی تصنیف و ترتیب اس زمانہ سے پہلے مکمل نہ ہوئی تھی جبکہ مسیحی کلیسا نے مسیح کو الٰہ سمجھنا شروع کر دیا تھا، پھر بھی

ان دستاویزوں میں ایک طرف مسیح کے فی الحقیقت انسان ہونے کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر کوئی شہادت اس امر کی موجود نہیں کہ مسیح اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔"

حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ بنا دیا گیا

اس کے بعد یہ مصنف پھر لکھتا ہے:

"وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعۂ رفع کے وقت اسی فعلِ رفع کے ذریعہ سے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ "ابن اللہ" کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا، ...... "یہ ابن اللہ" کا لفظ یقینی طور پر ذاتی ابنیّت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسوع کو "خدا کا اپنا بیٹا" کہہ کر صاف کر دیا ہے۔ اس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جا سکتا کہ آیا وہ ابتدائی عیسائیوں کا گروہ تھا یا پال جس نے مسیح کے لفظ "خداوند" کا خطاب اصل مذہبی معنی میں استعمال کیا۔ شاید یہ فعل مقدّم الذکر گروہ ہی کا ہو۔ لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پورے معنی میں بولنا شروع کیا۔ پھر اپنے مُدّعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ "خداوند یسوع مسیح" کی طرف سمت سے وہ تصوّرات اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیے جو قدیم کتب مُقدّسہ میں خداوند یہُوَہ (اللہ تعالیٰ) کے لیے مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مسیح کو خدا کی دانش اور خدا کی عظمت کے مساوی قرار دیا اور اسے مطلق معنی میں خدا کا بیٹا ٹھہرایا۔ تاہم متعدد حیثیّات اور پہلوؤں سے مسیح کو خدا کے برابر کر دینے کے باوجود پال اس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا"

عقیدۂ تثلیث یونانی فکر پر مبنی ہے

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون مسیحیت (CHRISTIANITY) میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"عقیدۂ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکّب ہے، مذہبی خیالات بائبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفے کی صورتوں میں۔

باپ، بیٹا اور رُوح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری اصطلاح اگرچہ خود یسوع نے شاذونادر ہی کبھی استعمال کی تھی اور پال نے بھی جو اس کو استعمال

کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا، تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ تشخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پس اس عقیدہ کا مواد یہودی ہے (اگرچہ اس مرکّب میں شامل ہونے سے پہلے وہ بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا) اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا، وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی، بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا یعنی یہ کہ ان تینوں اقانیم (باپ، بیٹے اور روح) کے درمیان تعلق کی حقیقت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا وہ اس عقیدے میں درج ہے جو نیقیا کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا، اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے“۔

اُلوہیت مسیح کو باقاعدہ مسیحی عقیدہ قرار دیا گیا

اسی سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون تاریخ کلیسا (CHURCH HISTORY) کی یہ عبارت بھی قابلِ ملاحظہ ہے:

”تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر ”کلام“ کا جسدی ظہور تو مان لیا گیا تھا تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی اُلوہیت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی عیسوی میں اس مسئلہ پر سخت بحثیں چھڑی ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیا کی کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدّت تک جھگڑا چلتا رہا۔ لیکن آخری فتح نیقیا ہی کے فیصلے کی ہوئی جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے۔ بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح کی الوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیا میں مسیح کا جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزو لاینفک قرار پا گیا۔

تشخصیتِ مسیح میں اُلوہیت اور انسانیت کا اجتماع

”پھر اس دعوے پر کہ ”بیٹے کی الوہیت مسیح کی ذات میں مجسم ہوئی تھی“ —— ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدّتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔

مسئلہ یہ تھا کہ مسیح کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے۔ ۴۵۱ء میں کالیڈن کی کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں مجتمع ہیں، ایک الٰہی طبیعت، دوسری انسانی طبیعت اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیر و تبدل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل میں جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئی۔ اس پر اتنا اضافہ اور کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مشیتیں بھی رکھتی ہیں۔ یعنی مسیح بیک وقت دو مختلف مشیتوں کا حامل ہے۔"

گناہ سے نجات اور فضلِ خداوندی

"اسی دوران میں مغربی کلیسا نے گناہ اور فضل کے مسئلہ پر بھی خاص توجہ کی اور یہ سوال مدتوں زیرِ بحث رہا کہ نجات کے معاملہ میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا۔ آخر کار ۵۲۹ء میں اورینج کی دوسری کونسل میں .... یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ ہبوطِ آدم کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا جب تک وہ اس فضلِ خداوندی سے، جو اصطباغ میں عطا کیا گیا ہے، نئی زندگی حاصل نہ کر لے۔ اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالتِ خیر میں استمرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فضلِ خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ رہے اور فضلِ خداوندی کی یہ دائمی اعانت اسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسط سے حاصل رہ سکتی ہے۔"

انسان کے پیدائشی گناہ گار ہونے کا عقیدہ

کتب آسمانی نے کبھی انسان کے پیدائشی گناہگار ہونے کا وہ تصور پیش نہیں کیا جسے ڈیڑھ ہزار سال سے عیسائیت نے اپنا بنیادی عقیدہ قرار دے رکھا ہے۔ آج خود کیتھولک علماء یہ کہنے لگے ہیں کہ بائبل میں اس عقیدے کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ چنانچہ بائبل کا ایک مشہور جرمن عالم ریورینڈ ہربرٹ ہاگ (HAAG) اپنی تازہ کتاب (IS ORIGINAL SIN IN SCRIPTURE) میں لکھتا ہے کہ ابتدائی دور کے عیسائیوں میں کم از کم تیسری صدی تک یہ عقیدہ سرے سے موجود ہی نہ تھا کہ انسان پیدائشی گنہگار ہے۔ اور جب یہ خیال لوگوں میں پھیلنے لگا تو دو صدیوں تک عیسائی اہلِ علم اس کی تردید کرتے رہے۔ مگر آخر کار پانچویں صدی میں سینٹ آگسٹائن نے اپنی منطق کے زور سے اس بات کو مسیحیت کے بنیادی عقائد میں

شامل کر دیا کہ "نوعِ انسانی نے آدم کے گناہ کا وبال وراثت میں پایا ہے اور مسیح کے کفارے کی بدولت نجات پانے کے سوا انسان کے لیے کوئی راہِ نجات نہیں ہے۔" ㉕

اصل بیماری غلو تھی

مسیحی علما کے ان بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداءً جس چیز نے مسیحیوں کو گمراہ کیا وہ عقیدت اور محبت کا غلو تھا۔ اسی غلو کی بنا پر مسیح علیہ السلام کے لیے خداوند اور ابن اللہ کے الفاظ استعمال کیے گئے، خدائی صفات ان کی طرف منسوب کی گئیں، اور کفارہ کا عقیدہ ایجاد کیا گیا، حالانکہ حضرت مسیح کی تعلیمات میں ان باتوں کے لیے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ پھر جب فلسفہ کی ہوا مسیحیوں کو لگی تو بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس ابتدائی گمراہی کو سمجھ کر اس سے بچنے کی سعی کرتے، انھوں نے اپنے گزشتہ پیشواؤں کی غلطیوں کو نباہنے کے لیے ان کی توجیہات شروع کر دیں اور مسیح کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کیے بغیر محض منطق اور فلسفہ کی مدد سے عقیدے پر عقیدہ ایجاد کرتے چلے گئے۔ یہی وہ ضلالت ہے جس پر قرآن نے ان آیات میں مسیحیوں کو متنبہ فرمایا ہے۔ ㉖

حضرت مریم کو مادرِ خدا قرار دینا

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ
اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ
لِيْ ۤ بِحَقٍّ ۭ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ
مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ
بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ
فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۔

(المائدہ ۔ آیت ۱۱۶ ۔ ۱۱۷)

ترجمہ: "غرض جب (یہ احسانات یاد دلا کر) اللہ فرمائے گا کہ "اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنا لو؟" تو وہ جواب میں عرض کرے گا کہ "سبحان اللہ" میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا

> جو کچھ آپ کے دل میں ہے، آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔ میں نے اُن سے اُس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ میں اُسی وقت تک ان کا نگران تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بُلا لیا تو آپ ان پر نگران تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگران ہیں۔"

عیسائیوں نے اللہ کے ساتھ صرف مسیح اور رُوح القُدس ہی کو خدا بنانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسیح کی والدۂ ماجدہ حضرت مریم کو بھی ایک مستقل معبود بنا ڈالا۔ حضرت مریم علیہا السلام کی الوہیت یا قُدوسیّت کے متعلق کوئی اشارہ تک بائبل میں موجود نہیں ہے۔ مسیح کے بعد ابتدائی تین سو برس تک عیسائی دنیا اس تخیّل سے بالکل ناآشنا تھی۔ تیسری صدی عیسوی کے آخری دَور میں اسکندریہ کے بعض علماءِ دینیات نے پہلی مرتبہ حضرت مریم کے لیے "اُمّ اللہ" یا "مادرِ خُدا" کے الفاظ استعمال کیے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اُلوہیتِ مریم کا عقیدہ اور مریم پرستی کا طریقہ عیسائیوں میں پھیلنا شروع ہوا۔ لیکن اوّل اوّل چرچ اسے باقاعدہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ مریم پرستوں کو فاسد العقیدہ قرار دیتا تھا۔ پھر جب نسطوریُس کے اس عقیدے پر کہ مسیح کی واحد ذات میں دو مستقل جُداگانہ شخصیّتیں جمع تھیں، مسیحی دُنیا میں بحث و جدال کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تو اس کا تصفیہ کرنے کے لیے ۴۳۱ء میں شہر افسوس میں ایک کونسل منعقد ہوئی اور اس کونسل میں پہلی مرتبہ کلیسا کی سرکاری زبان میں حضرت مریم کے لیے "مادرِ خدا" کا لقب استعمال کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریم پرستی کا جو مرض اب تک کلیسا کے باہر پھیل رہا تھا وہ اس کے بعد کلیسا کے اندر بھی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا، حتّٰی کہ نزولِ قرآن کے زمانہ تک پہنچتے پہنچتے حضرت مریم اتنی بڑی دیوی بن گئیں کہ باپ، بیٹا اور روحُ القُدس تینوں ان کے سامنے ہیچ ہو گئے۔ ان کے مجسّمے جگہ جگہ کلیساؤں میں رکھے ہوئے تھے، ان کے آگے عبادت کے جملہ مراسم ادا کیے جاتے تھے، انہی سے دعائیں مانگی جاتی تھیں، وہی فریاد رس، حاجت روا، مشکل کشا اور بیکسوں کی پشتیبان تھیں، اور ایک مسیحی بندے کے لیے سب سے بڑا ذریعۂ اعتماد اگر کوئی تھا تو وہ یہ تھا کہ "مادرِ خدا" کی حمایت و سرپرستی اسے حاصل ہو۔ قیصر جَسٹینین اپنے ایک قانون کی تمہید میں حضرت مریم کو اپنی سلطنت کا حامی و ناصر قرار دیتا ہے۔ اس کا مشہور جنرل نرسیس میدانِ جنگ میں حضرت مریم سے ہدایت و رہنمائی طلب کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر قیصر ہرقل نے اپنے جھنڈے پر "مادرِ خدا" کی تصویر بنا رکھی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس تصویر کی برکت سے یہ جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ اگرچہ بعد کی صدیوں میں تحریکِ اصلاح کے اثر سے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے مریم پرستی کے خلاف شدت سے آواز اُٹھائی لیکن رومن کیتھولک کلیسا آج تک اس مسلک پر قائم ہے۔ (۴۷)

فصل ۳

صُحفِ اناجیل کی تاریخی حیثیّت

انجیل دراصل نام ہے ان الہامی خطبات اور اقوال کا، جو مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ڈھائی تین برس میں بحیثیتِ نبی ارشاد فرمائے۔ وہ کلماتِ طیّبات آپ کی زندگی میں لکھے اور مرتب کیے گئے تھے یا نہیں، اس کے متعلق اب ہمارے پاس کوئی ذریعۂ معلومات نہیں ہے ممکن ہے، بعض لوگوں نے انھیں نوٹ کر لیا ہو، اور ممکن ہے کہ سننے والے معتقدین نے ان کو زبانی یاد کر رکھا ہو، بہرحال ایک مُدّت کے بعد جب آنجناب کی سیرتِ پاک پر مختلف رسالے لکھے گئے، تو ان میں تاریخی بیان کے ساتھ ساتھ وہ خطبات اور ارشادات بھی جگہ جگہ حسبِ موقع درج کر دیے گئے، جو ان رسالوں کے مصنّفین تک زبانی روایات اور تحریری یادداشتوں کے ذریعے سے پہنچے تھے۔ آج متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی جن کتابوں کو اناجیل کہا جاتا ہے، دراصل انجیل وہ نہیں ہیں، بلکہ انجیل حضرت مسیحؑ کے وہ ارشادات ہیں جو ان کے اندر درج ہیں۔ ہمارے پاس ان کو پہچاننے اور مصنّفینِ سیرت کے اپنے کلام سے ان کو غیر کرنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جہاں سیرت کا مصنّف کہتا ہے کہ مسیح نے یہ فرمایا یا لوگوں کو یہ تعلیم دی، صرف وہی مقامات اصل انجیل کے اجزا ہیں۔

قرآن انھیں اجزا کے مجموعے کو انجیل کہتا ہے اور انھیں کی وہ تصدیق کرتا ہے۔ آج کوئی شخص ان بکھرے ہوئے اجزا کو مرتب کر کے قرآن سے ان کا مقابلہ کر کے دیکھے تو وہ دونوں میں بہت ہی کم فرق پائے گا۔ اور جو تھوڑا بہت فرق محسوس ہو گا، وہ بھی غیر متعصبانہ غور و تامّل کے بعد بآسانی حل کیا جا سکے گا۔ (۳۸)

کیا موجودہ اناجیل قابلِ اعتماد ہیں

یہودی مذہب کی طرح مسیحیت[1] کے متعلق بھی ہماری معلومات کا واحد ذریعہ ایک ہی کتاب ہے جس

---

[1] مسیحی مذہب سے مراد فی الحقیقت وہ مذہب نہیں ہے جس کی تعلیم حضرت عیسٰی علیہ السلام نے دی تھی (باقی برصفحہ)

کو تمام مسیحی دنیا اپنے مذہب کی بنیادی کتاب تسلیم کرتی ہے۔ اور وہ انجیل ہے۔ انجیل کے متعلق یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ آج وہ جس صورت میں موجود ہے اس سے صرف موجودہ مسیحیت کے معتقدات ہی ہم کو معلوم ہو سکتے ہیں ورنہ سوال کہ فی الاصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کیا تھی، اس سے حل نہیں ہوتا۔ اس لیے انجیلی صحائف کی تاریخی حیثیت پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

آج ہم جس مجموعہ کو انجیل کہتے ہیں وہ دراصل چار بڑے صحیفوں پر مشتمل ہے، متی، مرقس، لوقا، یوحنا۔ لیکن ان میں کوئی صحیفہ بھی حضرت عیسیٰؑ کا نہیں ہے۔ جس طرح قرآن مجید میں وہ تمام منزل من اللہ آیات اور سورتیں جمع ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں، اس طرح کسی کتاب میں وہ وحیاں ہم کو یکجا نہیں ملتیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھیں۔ پھر وہ مواعظ و نصائح بھی ہم کو خود عیسیٰ علیہ السلام کے اپنے الفاظ میں نہیں ملتے جو انھوں نے اپنی پیغمبرانہ زندگی کے زمانے میں مختلف مواقع پر ارشاد فرمائے تھے۔ یہ صحیفے جو ہم تک پہنچے ہیں، نہ خدا کا کلام ہیں، نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بلکہ دراصل حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے بھی شاگردوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ جن میں ان لوگوں نے اپنے علم و فہم کے مطابق حضرتؑ کے حالات اور ان کی تعلیمات کو جمع کیا ہے۔

صحفِ انجیل اور ان کے مرتّبین

لیکن یہ کتابیں خود اس قدر مجہول الاصل ہیں کہ ان پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی کتاب مسیح کے حواری متی کی طرف منسوب ہے۔ اور یہ تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ متی کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ متی کی اصل کتاب جس کا نام لوجیا (LOGIA) تھا مفقود ہے۔ جو کتاب متی کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس کا مصنف کوئی گمنام شخص ہے، جس نے دوسری کتابوں کے ساتھ لوجیا سے بھی استفادہ کیا تھا۔ خود متی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بلکہ وہ مذہب ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ہمارے پاس اس بات کے لیے قوی دلائل ہیں کہ اس مسیحیت کی تعلیم حضرت عیسیٰؑ نے نہیں دی تھی بلکہ وہ تو وہی اسلام لے کر آئے تھے۔ جو ان سے سارے پیغمبر لاتے تھے۔ اور ان کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے۔ آگے چل کر ہم ان دلائل میں سے بعض کو بیان کریں گے۔ یہاں ہم صرف اس بات پر تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم مسیحیت پر یہاں پر جو بحث کر رہے ہیں وہ دراصل دینِ مسیح سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس دین سے متعلق ہے جو مسیح علیہ السلام کے نام پر بنایا گیا ہے۔

کا ذکر اس میں اس طرح کیا گیا ہے جیسے کسی غیر آدمی کا کیا جاتا ہے[1]۔ پھر اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر مرقس کی انجیل سے ماخوذ ہے کیونکہ اس کی ۱۰۶۸ آیات میں سے ۴۷۰ بعینہٖ وہی ہیں جو مرقس کی انجیل میں آئی ہیں، حالانکہ اگر اس کا مصنف متی حواری ہوتا تو اس کو ایک ایسے شخص کی کتاب سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہ تھی جو نہ حواری اور نہ حضرت عیسیٰؑ سے کبھی ملا تھا۔ مسیحی علماء کا خیال ہے کہ یہ کتاب سنہ ۷۰ء میں یعنی مسیح سے ۴۱ برس بعد لکھی گئی ہے اور بعض کا خیال ہے کہ سنہ ۹۰ء کی تصنیف ہے۔

دوسری کتاب مرقس کی طرف منسوب ہے اور عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ مرقس خود ہی اس کا مصنف ہے لیکن یہ بات ثابت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ سے کبھی نہیں ملا اور نہ ان کا مرید ہوا[2] وہ دراصل پطرس (ST-PETERS) حواری کا مرید تھا اور جو کچھ ان سے سنتا تھا اسے یونانی زبان میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے عیسائی مصنفین اس کو عموماً "پطرس کا ترجمان" کہا کرتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب سنہ ۶۳ء اور سنہ ۷۰ء کے درمیان کسی زمانہ میں لکھی گئی ہے۔

تیسری کتاب لوقا کی طرف منسوب ہے اور یہ بالکل مُسَلَّم ہے کہ لوقا نے کبھی مسیح کو نہیں دیکھا اور نہ اس سے استفادہ کیا۔ وہ پولوس (ST-PAUL) کا مرید تھا، ہمیشہ اسی کی صحبت میں رہا۔ اور اس نے اپنی انجیل میں اسی کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ خود پولوس اس کی انجیل کو اپنی انجیل کہتا ہے۔ لیکن یہ ثابت ہے کہ سینٹ پال خود بھی مسیح کی صحبت سے محروم تھا، اور مسیحی روایات کے مطابق واقعہ صلیب کے چھ برس بعد وہ اس مذہب میں داخل ہوا اس لیے لوقا اور مسیح کے درمیان سلسلۂ روایت کی ایک کڑی بالکل غائب ہے۔ انجیل لوقا کی تاریخ بھی متعین نہیں ہے۔ بعض اس کو سنہ ۸۵ء کی تصنیف بتاتے ہیں اور بعض سنہ ۶۳ء کی۔ مگر ہارنک، میگگفرٹ اور پلومر جیسے محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ سنہ ۸۰ء سے پہلے لکھی گئی۔

---

[1] متی باب ۹، آیت ۹ میں لکھا ہے:

> "یسوع نے وہاں سے آگے بڑھ کر متی نام ایک شخص کو محصول کی چوکی پر دیکھا۔"

ظاہر ہے کہ مصنف خود اپنا تذکرہ اس طرح نہیں کر سکتا۔

[2] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دیے جانے کے وقت وہ تماشائی کی حیثیت سے موجود تھا، مگر اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔

چوتھی کتاب یوحنا کی انجیل کہلاتی ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق مشہور یوحنا حواری کی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ کسی اور مجہول الاحوال شخص کی ہے جس کا نام یوحنا تھا۔ یہ کتاب مسیح سے بہت بعد سنہ ۹۰ء میں یا اس کے بھی بعد لکھی گئی ہے۔ ہارنک اس مدت کو سنہ ۱۱۰ء تک بڑھا دیتا ہے۔

اناجیل کی دستاویزی حیثیت کا جائزہ

ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں سے کسی ایک کا سلسلہ بھی مسیح تک نہیں پہنچتا۔ اور ان کی سند پر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ مسیح نے کیا کہا تھا اور کیا نہیں کہا تھا[1]۔ لیکن زیادہ عمیق تحقیقات سے ان کتابوں کی دستاویزی حیثیت اور بھی زیادہ مشکوک ہو جاتی ہے۔

اولاً چاروں انجیلوں کے بیانات میں بھی اختلاف ہے حتیٰ کہ پہاڑی کے وعظ کو بھی جو مسیحی تعلیم کا اصل الاصول ہے متی، مرقس اور لوقا تینوں نے مختلف اور متضاد طریقوں سے بیان کیا ہے۔

ثانیاً چاروں انجیلوں میں ان کے مصنفین کے خیالات، و تاثرات صاف طور پر نمایاں ہیں۔ متی کے مخالف، یہودی معلوم ہوتے ہیں اور وہ ان پر اتمام حجت کرتا نظر آتا ہے۔ مرقس کے مخاطب رومی ہیں اور وہ ان کو اسرائیلیات سے روشناس کرانا چاہتا ہے۔ لوقا سینٹ پال کا وکیل ہے اور دوسرے حواریوں کے خلاف اس کے دعاوی کی تائید کرنا چاہتا ہے۔ یوحنا ان فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات سے متاثر نظر آتا ہے جو پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں مسیحیوں کے درمیان پھیل گئے تھے۔ اس طرح ان چاروں انجیلوں کے درمیان معنوی اختلاف، لفظی اختلاف سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔

ثالثاً اناجیل سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی ہیں، حالانکہ حضرت عیسیٰ اور ان کے تمام حواریوں کی زبان سُریانی تھی۔ زبان کے اختلاف سے خیالات کی تعبیر میں اختلاف ہو جانا قدرتی بات ہے

رابعاً، اناجیل کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش دوسری صدی عیسوی سے پہلے نہیں کی گئی۔ سنہ ۱۵۰ء تک عام خیال یہ تھا کہ زبانی روایت تحریر سے زیادہ مفید ہے۔ دوسری صدی کے آخر میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن اس زمانہ کی تحریروں کو مستند نہیں سمجھا جاتا۔ "عہدِ جدید" (NEW TESTAMENT) کا پہلا مستند

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ یہ کتابیں وثوق و استناد کے اعتبار سے قرآن تو درکنار حدیث کے کسی ضعیف ترین مجموعہ کے برابر بھی نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کا وہ مرتبہ ہے جو ہمارے ہاں مولود شریف کی کتابوں کا ہے

متن قرطاجنہ کی کونسل میں منظور کیا گیا جو ۲۹۷ء میں منعقد ہوئی تھی۔

خامساً، اناجیل کا قدیم ترین نسخہ جو اس وقت دنیا میں موجود ہے چوتھی صدی عیسوی کے وسط کا ہے۔ دوسرا نسخہ پانچویں صدی کا اور تیسرا ناقص نسخہ بھی جو پاپائے روم کے کتب خانہ میں ہے چوتھی صدی سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔ پس یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلی تین صدیوں میں جو انجیلیں رائج تھیں ان سے موجودہ اناجیل کس حد تک مطابقت رکھتی ہیں۔

سادساً، اناجیل کو قرآن کی طرح حفظ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ ان کی اشاعت کا انحصار ابتداءً روایت بالمعنی پر رہا جس میں حافظہ کے اختلال اور راویوں کے ذاتی خیالات کا اثر آنا قدرتی امر ہے۔ بعد میں جب کتابت کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ نقل نویسوں کے رحم پر تھیں۔ نقل کرتے وقت ہر شخص کے لیے آسان تھا کہ جس چیز کو اپنے عقائد کے خلاف دیکھے حذف کر دے اور جس کی کمی پائے بڑھا دے۔[1]

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اناجیل اربعہ میں ہم کو مسیح کی اصل تعلیم ملتی ہے۔ پس آئندہ صفحات میں مسیحیت کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا وہ اس دین کے متعلق نہ ہوگا جس کی تعلیم مسیح علیہ السلام نے دی تھی بلکہ اس مسیحیت کے متعلق ہوگا جس پر آج کل مسیحی دنیا اعتقاد رکھتی ہے۔ (۲۹)

قرآن کس انجیل کی تصدیق کرتا ہے

"نئے عہد نامے" (NEW TESTAMENT) کی کتاب اعمال (ACTS) تو درکنار، چاروں انجیلیں (GOSPELS) بھی الہامی کتابیں نہیں ہیں، نہ قرآن ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ البتہ قرآن اس انجیل کی تصدیق کرتا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اب آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ وہ انجیل کہاں ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اس انجیل کے منتشر اجزاء زبانی روایات کے ذریعہ سے نئے عہد نامے کی چاروں انجیلوں کے مصنفین کو پہنچے تھے اور انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات بیان کرتے ہوئے اپنی کتابوں میں مختلف مقامات پر انھیں درج کیا ہے۔ ان کتابوں میں حضرت عیسیٰؑ کی جو تقریریں اور

---

[1] یہ پوری بحث ذیل کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔

DUMELLOW, COMMENTARY ON THE HOLY BIBLE. YK.

CHEYNE ENCYCLOPAEDIA BIBLICA MILLMAN HISTORY OF CHRISTIANITY.

امثال ملتی ہیں وہ اسی انجیل کے متفرق اجزاء ہیں اور ان میں آپ مشکل ہی سے کوئی بات ایسی پائیں گے جسے قرآن کے خلاف کہا جا سکے۔ ㊵

انجیل اور دیگر کتبِ آسمانی کے متعلق ایک جامع جائزہ

قرآن مجید جن کتابوں کی تصدیق کرتا ہے وہ "پرانا عہد نامہ" اور "نیا عہد نامہ" نہیں ہیں بلکہ تورات، زبور اور انجیل ہیں۔ تورات کو یہودیوں نے ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے نہیں رکھا بلکہ اُس کے مختلف اجزاء پرانے عہد نامہ کی پہلی پانچ کتابوں میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے اندر شامل (INCORPORATE) کر دیے۔ آپ ان کتابوں میں سے اس تورات کے اجزاء کو اس علامت کی مدد سے چھانٹ سکتے ہیں کہ جہاں جہاں کوئی عبارت اس طرح شروع ہوتی ہے کہ خداوند نے موسیٰؑ سے یہ کہا، یا خدا نے یہ حکم دیا، یا موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے یہ تقریر کی، وہاں غالباً اس تورات کا کوئی جُز نقل کیا گیا ہے۔ یہی صُورت زبور کی بھی ہے کہ پرانے عہد نامے کی پوری کتاب "زبور" (PSALMS) نہیں بلکہ صرف زبورِ داؤد (PSALMS OF DAVID) کی قرآن نے تصدیق کی ہے، اور اس کے اجزاء کتاب زبور میں شامل پائے جاتے ہیں۔ موجودہ بائیبل میں زبور کے نام سے جو کتاب پائی جاتی ہے وہ ساری کی ساری زبورِ داؤد نہیں ہے۔ اس میں بکثرت مزامیر دوسرے لوگوں کے بھی بھر دیے گئے ہیں اور وہ اپنے اپنے مصنّفین کی طرف منسوب ہیں۔ البتہ جن مزامیر پر تصریح ہے کہ وہ حضرت داؤدؑ کے ہیں ان کے اندر فی الواقع کلامِ حق کی روشنی محسوس ہوتی ہے۔

اسی طرح بائبل میں امثالِ سلیمان کے نام سے جو کتاب موجود ہے اس میں بھی اچھی خاصی آمیزش پائی جاتی ہے اور اس کے آخری دو باب تو صریحاً الحاقی ہیں، مگر اس کے باوجود ان امثال کا بڑا حصّہ صحیح و برحق معلوم ہوتا ہے۔ ان دو کتابوں کے ساتھ ایک اور کتاب حضرت ایوبؑ کے نام سے بھی بائبل میں درج ہے۔ لیکن حکمت کے بہت سے جواہر اپنے اندر رکھنے کے باوجود اسے پڑھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا کہ واقعی حضرت ایوبؑ کی طرف اس کتاب کی نسبت صحیح ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں اور خود اس کتاب کی ابتداء میں حضرت ایوبؑ کے جس صبرِ عظیم کی تعریف کی گئی ہے اس کے بالکل برعکس وہ ساری کتاب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضرت ایوبؑ اپنی مصیبت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کے خلاف سراپا شکایت بنے ہوئے تھے، حتّٰی کہ ان کے ہمنشین انھیں اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ خدا ظالم نہیں ہے، مگر وہ کسی طرح

مان کر نہ دیتے تھے

ان صحیفوں کے علاوہ بائبل میں انبیاء بنی اسرائیل کے، صحائف اور بھی درج ہیں جن کا بیشتر حصہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً یسعیاہ، یرمیاہ، حزقی ایل، عاموس اور بعض دوسرے صحیفوں میں تو بکثرت مقامات ایسے آتے ہیں جنھیں پڑھ کر آدمی کی رُوح وجد کرنے لگتی ہے۔ ان میں الہامی کلام کی شان صریح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کی اخلاقی تعلیم، ان کا شرک کے خلاف جہاد، ان کا توحید کے حق میں پُرزور استدلال اور ان کی بنی اسرائیل کے اخلاقی زوال پر سخت تنقیدیں پڑھتے وقت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اناجیل میں حضرت مسیح کی تقریریں اور قرآن مجید اور یہ صحیفے ایک ہی سرچشمے سے نکلی ہوئی سوتیں ہیں۔ (۳۱)

ایسا ہی معاملہ انجیل کا بھی ہے کہ اس کے پیروان مسیح علیہ السلام نے ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے محفوظ نہ رکھا بلکہ مسیح علیہ السلام کے سوانح نگاروں (متی، مرقس، لوقا، یوحنا وغیرہم) نے اپنی اپنی کتابوں میں اس کے وہ حصے درج کر دیے ہیں جو ان کو زبانی روایات کے ذریعے سے پہنچے تھے، اور انھیں اس علامت کی مدد سے چھانٹا جا سکتا ہے کہ مسیح نے یوں کہا، یا مسیح نے یہ تمثیل دی، یا لوگوں کو خطاب کر کے یہ وعظ کیا آپ میری اس نشان دہی پر پرانے اور نئے عہد نامے میں تورات، زبور اور انجیل کے ان اجزاء کو چھانٹ لیں اور پھر قرآن کا ان سے مقابلہ کر کے دیکھیں۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ ان کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں بہت کم اختلاف پایا جاتا ہے، اور جو تھوڑا سا اختلاف ہے اس کی بھی یہ معقول توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ قرآن اپنے اصل الفاظ میں ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے موجود، اور وہ تینوں کتابیں نہ اصل الفاظ میں محفوظ رکھی گئی ہیں[1] اور نہ انھیں ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے باقی رہنے دیا گیا ہے۔ میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ تینوں کتابیں مستقل کتابوں کی حیثیت سے موجود تھیں یا نہیں، لیکن کم از کم تورات کے متعلق یہ بات خود پرانے عہد نامے کے بیانات[2] سے بھی اور

---

[1] اگر اس امر میں کسی کو شک ہو کہ یہ کتابیں اپنے اصل الفاظ میں محفوظ ہیں یا نہیں، تو وہ مثال کے طور پر صاف پہاڑی کے وعظ کی عبارات متی اور لوقا کی انجیلوں میں نکال کر دیکھ لے۔ دونوں روایتوں میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس کی موجودگی میں مشکل ہی سے وعظ کے اصل الفاظ محفوظ ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔

[2] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: ۲ سلاطین باب ۲۲-۲۳۔

ہمارے ہاں کی احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہودیوں کے ہاں یہ ایک مُدت تک ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے پائی جاتی تھی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس کا ایک نسخہ مدینے کے یہودیوں کے پاس موجود تھا۔ (۴۲)

باب ۴

رہبانیت کا ظہور اور نشو و ارتقاء

فصل ۱

ظہور رہبانیّت کے اسباب

رہبانیت کے ابتدائی جراثیم

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد دو سو سال تک عیسائی کلیسا رہبانیت[؎] سے نا آشنا تھا۔ مگر ابتدا ہی سے مسیحیت میں اس کے جراثیم پائے جاتے تھے اور وہ تخیلات اس کے اندر موجود تھے جو اس چیز کو جنم دیتے ہیں۔ ترک و تجرید کو اخلاقی آئیڈیل قرار دینا اور درویشانہ زندگی کو شادی بیاہ اور دنیوی کاروبار کی زندگی کے مقابلے میں اعلیٰ و افضل سمجھنا ہی رہبانیت کی بنیاد ہے اور یہ دونوں چیزیں مسیحیت میں ابتدا سے موجود تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ تجرّد کو تقدّس کا ہم معنی سمجھنے کی وجہ سے کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے لیے یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی تھی کہ وہ شادی کریں، بال بچوں والے ہوں اور خاندان کے بکھیڑوں میں پڑیں۔ اسی چیز نے تیسری صدی تک پہنچتے پہنچتے ایک فتنے کی شکل اختیار کر لی۔ اور رہبانیت ایک وبا کی طرح مسیحیت میں پھیلنی شروع ہوئی۔

تاریخی طور پر اس کے تین بڑے اسباب تھے:

پہلا سبب

ایک یہ کہ قدیم مشرک سوسائٹی میں شہوانیت، بدکرداری اور دنیا پرستی جس شدت کے ساتھ پھیلی ہوئی

[؎] اس کا تلفظ رَہبانیت بھی کیا جاتا ہے اور رُہبانیت بھی۔ اس کا مادہ رَہب ہے جس کے معنی خوف کے ہیں۔ رَہبانیت کا مطلب ہے مسلکِ خوف زدگی اور رُہبانیت کے معنی ہیں مسلکِ خوف زدگان۔ اصطلاحًا اس سے مراد ہے کسی شخص کا خوف کی بنا پر (قطع نظر اس سے کہ وہ کسی کے ظلم کا خوف ہو، یا دنیا کے فتنوں کا خوف، یا اپنے نفس کی کمزوریوں کا خوف) تارک الدنیا بن جانا اور دنیوی زندگی سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینا یا گوشہ ہائے عزلت میں جا بیٹھنا۔ (از مؤلف)

تھی اس کا توڑ کرنے کے لیے عیسائی علماء نے اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی بجائے انتہا پسندی کی راہ اختیار کی، انھوں نے عفت پر اتنا زور دیا کہ عورت اور مرد کا تعلق بجائے خود نجس قرار پا گیا، خواہ نکاح ہی کی صورت میں ہو۔ انھوں نے دنیا پرستی کے خلاف اتنی شدت برتی کہ آخر کار ایک دین دار آدمی کے لیے سرے سے کسی قسم کی املاک رکھنا ہی گناہ بن گیا۔ اور اخلاق کا معیار یہ ہو گیا کہ آدمی بالکل مفلس اور ہر لحاظ سے تارک الدنیا ہو۔ اسی طرح مشرک سوسائٹی کی لذت پرستی کے جواب میں وہ اس انتہا پر جا پہنچے کہ ترکِ لذات، نفس کو مارنا اور خواہشات کا قلع قمع کر دینا اخلاق کا مقصود بن گیا، اور طرح طرح کی ریاضتوں سے جسم کو اذیتیں دینا آدمی کی روحانیت کا کمال اور اس کا ثبوت سمجھا جانے لگا۔

دوسرا سبب

دوسرے یہ کہ مسیحیت جب کامیابی کے دور میں داخل ہو کر عوام میں پھیلنی شروع ہوئی تو اپنے مذہب کی توسیع و اشاعت کے شوق میں کلیسا ہر اس برائی کو اپنے دائرے میں داخل کرتا چلا گیا جو عام لوگوں میں مقبول تھی۔ اولیاء پرستی نے قدیم معبودوں کی جگہ لے لی۔ ہورس (HORUS) اور آئسس (ISIS) کے مجسموں کی جگہ مسیح اور مریم کے بت پوجے جانے لگے۔ سیٹرنیلیا (SATURNALIA) کی جگہ کرسمس کا تہوار منایا جانے لگا۔ قدیم زمانے کے تعویذ گنڈے، عملیات، فال گیری و غیب گوئی، جن بھوت بھگانے کا عمل، سب عیسائی درویشوں نے شروع کر دیے۔ اسی طرح چونکہ عوام اس شخص کو خدا رسیدہ سمجھتے تھے جو گندہ اور ننگا ہو اور کسی بھٹ یا کھوہ میں رہے، اس لیے عیسائی کلیسا میں ولایت کا یہی تصور مقبول ہو گیا، اور ایسے ہی لوگوں کی کرامتوں کے قصوں سے عیسائیوں کے ہاں تذکرۃ الاولیاء قسم کی کتابیں لبریز ہو گئیں۔

تیسرا سبب

تیسرے یہ کہ عیسائیوں کے پاس دین کی سرحدیں متعین کرنے کے لیے کوئی مفصل شریعت اور کوئی واضح سنت موجود نہ تھی۔ شریعت موسوی کو وہ چھوڑ چکے تھے، اور تنہا انجیل کے اندر کوئی مکمل ہدایت نامہ نہ پایا جاتا تھا۔ اس لیے مسیحی علماء کچھ باہر کے فلسفوں اور طور طریقوں سے متاثر ہو کر اور کچھ خود اپنے رجحانات کی بنا پر طرح طرح کی بدعتیں دین میں داخل کرتے چلے گئے۔ رہبانیت بھی انہی بدعتوں میں سے ایک تھی۔

فصل ۲

مسیحی فلسفۂ رہبانیت

اِس فلسفہ کے ماخذ

مسیحی مذہب کے علماء اور ائمہ نے اُس کا فلسفہ اور اُس کا طریق کار بدھ مذہب کے بھکشوؤں سے، ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں سے، قدیم مصری نقراء (ANCHORITES) سے، ایران کے مانویوں سے، اور افلاطون اور فلاطینوس کے پیرو اشراقیوں سے اخذ کیا اور اسی کو تزکیۂ نفس، روحانی ترقی کا ذریعہ اور تقرب اِلی اللہ کا وسیلہ قرار دے لیا۔ اس غلطی کے مرتکب کوئی معمولی درجہ کے لوگ نہ تھے۔ تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی (یعنی نزولِ قرآن کے زمانے) تک جو لوگ مشرق اور مغرب میں مسیحیت کے اکابر علماء، بزرگ ترین پیشوا اور امام مانے جاتے ہیں، سینٹ اتھاناسیوس، سینٹ باسِل، سینٹ گریگوری، نازیانزین، سینٹ کرائی سوسٹم، سینٹ ایمبروز، سینٹ جیروم، سینٹ آگسٹین، سینٹ بینیڈکٹ، گریگوری اعظم، سب کے سب خود راہب اور رہبانیت کے زبردست علمبردار تھے۔ انہی کی کوششوں سے کلیسا میں رہبانیت نے رواج پایا۔

اِس فلسفہ کا عملی ظہور

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں میں رہبانیت کا آغاز مصر سے ہوا۔ اس کا بانی سینٹ انیتھونی (ST. ANTHONY) تھا جو سنہ ۲۵۰ء میں پیدا ہوا۔ اور سنہ ۳۵۰ء میں دنیا سے رخصت ہوا۔ اسے پہلا مسیحی راہب قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے فیوم کے علاقے میں پَسپیر کے مقام پر (جو اب دیر المیمون کے نام سے معروف ہے) پہلی خانقاہ قائم کی۔ اس کے بعد دوسری خانقاہ اس نے بحرِ احمر کے ساحل پر قائم کی، جسے اب دَیر مارانطونیوس کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں میں رہبانیت کے بنیادی قواعد اس کی تحریروں اور ہدایات سے ماخوذ ہیں۔

اس آغاز کے بعد یہ سلسلہ مصر میں سیلاب کی طرح پھیل گیا اور جگہ جگہ راہبوں اور راہبات کے لیے

خانقاہیں قائم ہوگئیں، جن میں سے بعض میں تین تین ہزار راہب بیک وقت رہتے تھے۔ ۳۲۵ء میں مصر ہی کے اندر ایک اور مسیحی ولی پاخومیُوس نمودار ہوا۔ جس نے دس بڑی خانقاہیں راہبین اور راہبات کے لیے بنائیں۔ اس کے بعد یہ سلسلہ شام و فلسطین اور افریقہ و یورپ کے مختلف ملکوں میں پھیلتا چلا گیا۔ کلیسائی نظام کو اوّل اوّل اس رہبانیت کے معاملہ میں سخت اُلجھن سے سابقہ پیش آیا، کیونکہ وہ ترکِ دُنیا اور تجرّد اور غریبی و مفلسی کو روحانی زندگی کا آئیڈیل تو سمجھتا تھا، مگر راہبوں کی طرح شادی بیاہ اور اولاد پیدا کرنے اور ملکیت رکھنے کو گناہ بھی نہ ٹھہرا سکتا تھا۔ بالآخر سینٹ اتھانا سیُوس (متوفّی ۳۷۳ء)، سینٹ باسل (متوفّی ۳۷۹ء) سینٹ آگسٹائن (متوفی ۴۳۰ء) اور گریگوری اعظم (متوفی ۶۰۹ء) جیسے لوگوں کے اثر سے رہبانیت کے بہت سے قواعد چرچ کے نظام میں باقاعدہ داخل ہو گئے۔

فصل ۳

عیسائی رہبانیّت کی چند خصوصیّات

اس راہبانہ بدعت کی چند خصوصیات ہم اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

۱۔ جسمانی اذیت پسندی

سخت ریاضتوں اور نت نئے طریقوں سے اپنے جسم کو اذیتیں دینا۔ اس معاملہ میں ہر راہب دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ عیسائی اولیاء کے تذکروں میں ان لوگوں کے جو کمالات بیان کیے گئے ہیں۔ وہ کچھ اس قسم کے ہیں:

اسکندریہ کا سینٹ مکاریوس ہر وقت اپنے جسم پر ہر وقت ۸۰ پونڈ کا بوجھ اٹھائے رکھتا تھا۔ ۶ مہینے تک وہ ایک دلدل میں سوتا رہا اور زہریلی مکھیاں اس کے برہنہ جسم کو کاٹتی رہیں۔ اس کے مرید سینٹ یوسیبیوس نے پیر سے بھی بڑھ کر ریاضت کی۔ وہ ۱۵۰ پونڈ کا بوجھ اٹھائے پھرتا تھا اور ۳ سال تک ایک خشک کنوئیں میں پڑا رہا۔ سینٹ سابیوس صرف وہ مکئی کھاتا تھا جو مہینہ بھر پانی میں بھیگ کر بدبودار ہو جاتی تھی۔ سینٹ بیساریون ۴۰ دن تک خاردار جھاڑیوں میں پڑا رہا۔ اور ۴۰ دن تک اس نے زمین کو پیٹھ نہیں لگائی۔ سینٹ پاخومیوس نے ۱۵ سال، اور ایک روایت کے مطابق پچاس سال زمین کو پیٹھ لگائے بغیر گزار دیے۔ ایک ولی سینٹ جان تین سال تک عبادت میں کھڑا رہا۔ اس پوری مدت میں وہ نہ کبھی بیٹھا نہ لیٹا۔ آرام کے لیے بس ایک چٹان کا سہارا لے لیتا تھا اور اس کی غذا صرف وہ تبرک تھا۔ جو ہر اتوار کو اس کے لیے لایا جاتا تھا۔ سینٹ سیمیون اسٹائلائٹ (۳۹۰ء تا ۴۴۹ء) جو عیسائیوں کے اولیائے کبار میں شمار ہوتا ہے، ہر ایسٹر سے پہلے پورے چالیس دن فاقہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ پورے ایک سال تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہا۔ بسا اوقات وہ اپنی خانقاہ سے نکل کر ایک کنوئیں میں جا رہتا تھا۔ آخر کار اس نے شمالی شام کے قلعہ سیمان کے قریب ۶۰ فیٹ بلند ایک ستون بنوایا جس کا بالائی حصہ صرف تین فیٹ کے گھیر میں تھا اور اوپر کٹہرا بنا دیا گیا تھا۔ اس ستون

پر اس نے پورے تیس سال گزار دیے۔ دھوپ، بارش، سردی، گرمی سب اس پر سے گزرتی رہتی تھیں۔ اور وہ کبھی ستون سے نہ اُترتا تھا۔ اس کے مرید سیڑھی لگا کر اس کو کھانا پہنچاتے اور اس کی گندگی صاف کرتے تھے۔ پھر اس نے ایک رسّی لے کر اپنے آپ کو اس ستون سے باندھ لیا یہاں تک کہ رسی سے اس کا گوشت سڑ گیا اور اس میں کیڑے پڑ گئے۔ جب کوئی کیڑا اس کے پھوڑوں سے گر جاتا تو وہ اسے اٹھا کر پھر پھوڑے ہی میں رکھ لیتا اور کہتا "کھا جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے" مسیحی عوام دُور دُور سے اس کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ جب وہ مرا تو مسیحی عوام کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ عیسائی ولی کی بہترین مثال تھا۔

اس دور کے عیسائی اولیاء کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ وہ ایسی ہی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ کسی ولی کی تعریف یہ تھی کہ ۲۰ سال تک وہ بالکل خاموش رہا اور کبھی اسے بولتے نہ دیکھا گیا۔ کسی نے اپنے آپ کو ایک چٹان سے باندھ رکھا تھا۔ کوئی جنگلوں میں مارا مارا پھرتا اور گھاس پھونس کھا کر گزارا کرتا۔ کوئی بھاری بوجھ ہر وقت اٹھائے پھرتا۔ کوئی طوق و سلاسل سے اپنے اعضا جکڑے رکھتا۔ کچھ حضرات جانوروں کے بھٹوں، یا خشک کنوؤں، یا پرانی قبروں میں رہتے تھے۔ اور کچھ دوسرے بزرگ ہر وقت ننگے رہتے اور اپنا ستر اپنے لمبے لمبے بالوں سے چھپاتے اور زمین پر رینگ کر چلتے تھے۔ ایسے ہی ولیوں کی کرامات کے چرچے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اور ان کے مرنے کے بعد اُن کی ہڈیاں خانقاہوں میں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ میں نے خود کوہِ سینا کے نیچے سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ میں ایسی ہی ہڈیوں کی ایک پوری لائبریری سجی ہوئی دیکھی ہے۔ جس میں کہیں اولیاء کی کھوپریاں قرینے سے رکھی ہوتی تھیں، کہیں پاؤں کی ہڈیاں، اور کہیں ہاتھوں کی ہڈیاں اور ایک ولی کا تو پورا ڈھانچہ ہی شیشے کی ایک الماری میں رکھا ہوا تھا۔

۲۔ ترکِ طہارت و نظافت

ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر وقت گندے رہتے اور صفائی سے سخت پرہیز کرتے۔ نہانا یا جسم کو پانی لگانا ان کے نزدیک خدا پرستی کے خلاف تھا۔ جسم کی صفائی کو وہ روح کی نجاست سمجھتے تھے۔ سینٹ اتھاناسیوس بڑی عقیدت کے ساتھ سینٹ اینتھنی کی یہ خوبی بیان کرتا ہے کہ اس نے مرتے دم تک کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے۔ سینٹ ابراہام جب سے داخلِ مسیحیت ہوا، پورے پچاس سال اس نے نہ مُنہ دھویا نہ پاؤں۔ ایک مشہور راہبہ کنواری سلویا نے عمر بھر اپنی انگلیوں کے سوا

جسم کے کسی حصّے کو پانی نہیں لگنے دیا۔ ایک کانوینٹ کی ۱۳۰ راہبات کی تعریف میں لکھا ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے اور غُسل کا تو نام سُن کر ہی ان کے بدن پر لرزہ چڑھ جاتا تھا۔

۳- ازدواجی زندگی سے احتراز

اس رہبانیت نے ازدواجی زندگی کو عملاً بالکل حرام کر دیا اور نکاح کے رشتے کو کاٹ پھینکنے میں سخت بیدردی سے کام لیا۔ چوتھی اور پانچویں صدی کی تمام تحریریں اس خیال سے بھری ہوئی ہیں کہ تجرّد سب سے بڑی اخلاقی قدر ہے، اور عِفّت کے معنی یہ ہیں کہ آدمی جنسی تعلق سے قطعی احتراز کرے، خواہ وہ میاں اور بیوی کا تعلق ہی کیوں نہ ہو۔ پاکیزہ رُوحانی زندگی کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ آدمی اپنے نفس کو بالکل مار دے۔ اور اس میں جسمانی لذّت کی کوئی خواہش تک باقی نہ چھوڑے۔ ان لوگوں کے نزدیک خواہش کو مار دینا اس لیے ضروری تھا کہ اس سے حیوانیت کو تقویت پہنچتی ہے۔ ان کے نزدیک لذّت اور گناہ ہم معنی تھے، حتیٰ کہ مسرّت بھی ان کی نگاہ میں خدا فراموشی کی مترادف تھی۔ سینٹ باسل ہنسنے اور مسکرانے تک کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ انہی تصورات کی بنا پر عورت اور مرد کے درمیان شادی کا تعلق ان کے ہاں قطعی نجس قرار پا گیا تھا۔ راہب کے لیے ضروری تھا کہ وہ شادی کرنا تو درکنار، عورت کی شکل تک نہ دیکھے، اور اگر شادی شدہ ہو تو بیوی کو چھوڑ کر نکل جائے۔ مردوں کی طرح عورتوں کے دل میں بھی یہ بات بٹھائی گئی تھی کہ وہ اگر آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتی ہیں تو ہمیشہ کنواری رہیں، اور شادی شدہ ہوں تو اپنے شوہروں سے الگ ہو جائیں۔ سینٹ جیرُوم جیسا ممتاز مسیحی عالم کہتا ہے کہ جو عورت مسیح کی خاطر راہبہ بن کر ساری عمر کنواری رہے وہ مسیح کی دُلہن ہے اور اس عورت کی ماں کو خدا (یعنی مسیح) کی ساس (MOTHER IN LAW OF GOD) ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایک اور مقام پر سینٹ جیرُوم کہتا ہے کہ عفت کی کلہاڑی سے ازدواجی تعلق کی لکڑی کو کاٹ پھینکنا سالک کا اوّلین کام ہے۔" ان تعلیمات کی وجہ سے مذہبی جذبہ طاری ہونے کے بعد ایک مسیحی مرد یا ایک مسیحی عورت پر اس کا پہلا اثر یہ ہوتا تھا کہ اس کی خوشگوار ازدواجی زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی تھی۔ اور چونکہ مسیحیت میں طلاق و تفریق کا راستہ بند تھا، اس لیے نکاح کے رشتے میں رہتے ہوئے میاں اور بیوی ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے۔ سینٹ نائلس (ST. NILUS) دو بچوں کا باپ تھا۔ اس پر رہبانیّت کا دورہ پڑا تو اس کی بیوی روتی رہ گئی اور وہ اس سے الگ ہو گیا۔ سینٹ اَمُّون (ST. AMMON) نے شادی کی پہلی رات ہی اپنی دُلہن کو ازدواجی تعلّق کی نجاست

پروعظ فرمایا اور دونوں نے بالاتفاق یہ طے کر لیا کہ جیتے جی ایک دوسرے سے الگ رہیں گے۔ سینٹ ابراہام شادی کی پہلی رات ہی اپنی بیوی کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ یہی حرکت سینٹ ایلیکس (ST. ALEXIS) نے کی۔ اس طرح کے واقعات سے عیسائی اولیاء کے تذکرے بھرے پڑے ہیں۔

کلیسا کا نظام تین صدیوں تک اپنے حدود میں ان انتہا پسندانہ تصورات کی کسی نہ کسی طرح مزاحمت کرتا رہا۔ اس زمانے میں ایک پادری کے لیے مجرد ہونا لازم نہ تھا۔ اگر اس نے پادری کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے شادی کر رکھی ہو تو وہ بیوی کے ساتھ رہ سکتا تھا، البتہ تقرر کے بعد شادی کرنا اس کے لیے ممنوع تھا۔ نیز کسی ایسے شخص کو پادری مقرر نہیں کیا جاتا تھا جس نے کسی بیوہ یا مطلقہ سے شادی کی ہو، یا جس کی دو بیویاں ہوں، یا جس کے گھر میں لونڈی ہو۔ رفتہ رفتہ چوتھی صدی میں یہ خیال پوری طرح زور پکڑ گیا کہ جو شخص کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دیتا ہو اس کے لیے شادی شدہ ہونا بڑی گھناؤنی بات ہے۔ سنہ ۳۶۲ء کی گنگرا کونسل (COUNCIL OF GENGRA) آخری مجلس تھی جس میں اس طرح کے خیالات کو خلافِ مذہب ٹھہرایا گیا۔ مگر اس کے تھوڑی ہی مدت بعد سنہ ۳۸۲ء کی رومن سیناڈ (SYNOD) نے تمام پادریوں کو مشورہ دیا کہ وہ ازدواجی تعلقات سے کنارہ کش رہیں۔ اور دوسرے سال پوپ سائریکیس (SIRICIUS) نے حکم دیا کہ جو پادری شادی کرے، یا شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنی بیوی سے تعلق رکھے، اس کو منصب سے معزول کر دیا جائے۔ سینٹ جیروم، سینٹ ایمبروز، اور سینٹ آگسٹائن جیسے اکابر علماء نے بڑے زور و شور سے اس فیصلے کی حمایت کی۔ اور تھوڑی سی مزاحمت کے بعد مغربی کلیسا میں یہ پوری شدت کے ساتھ نافذ ہو گیا۔ اس دور میں متعدد کونسلیں ان شکایات پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوئیں کہ جو لوگ پہلے سے شادی شدہ تھے وہ مذہبی خدمات پر مقرر ہونے کے بعد بھی اپنی بیویوں کے ساتھ "ناجائز" تعلقات رکھتے ہیں۔ آخر کار ان کی اصلاح کے لیے یہ قواعد بنائے گئے کہ وہ کھلے مقامات پر سوئیں، اپنی بیویوں سے کبھی علیحدگی میں نہ ملیں، اور ان کی ملاقات کے وقت کم از کم دو آدمی موجود رہیں۔ سینٹ گریگوری ایک پادری کی تعریف میں لکھتا ہے کہ ۴۰ سال تک وہ اپنی بیوی سے الگ رہا۔ حتیٰ کہ مرتے وقت جب اس کی بیوی اس کے قریب گئی تو اس نے کہا، عورت، دور ہٹ جا!

۴۔ قطع رحمی اور قرابتوں کا خاتمہ

سب سے زیادہ دردناک باب اس رہبانیت کا یہ ہے کہ اس نے ماں باپ، بھائی بہنوں اور

اولاد تک سے آدمی کا رشتہ کاٹ دیا۔ مسیحی ولیوں کی نگاہ میں بیٹے کے لیے ماں کی محبت، بھائی کے لیے بھائی بہنوں کی محبت اور باپ کے لیے اولاد کی محبت بھی ایک گناہ تھی۔ ان کے نزدیک روحانی ترقی کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ آدمی ان سارے تعلقات کو توڑ دے۔ مسیحی اولیاء کے تذکروں میں ایسے ایسے دلدوز واقعات ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر انسان کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک راہب ایواگریوس (EVAGRIUS) سالہا سال سے صحرا میں ریاضتیں کر رہا تھا۔ ایک روز یکایک اس کے پاس اس کی ماں اور اس کے باپ کے خطوط پہنچے، جو برسوں سے اس کی جدائی میں تڑپ رہے تھے۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے خطوط کو پڑھ کر اس کے دل میں انسانی محبت کے جذبات نہ جاگ اٹھیں۔ اس نے ان کو کھولے بغیر فوراً آگ میں جھونک دیا۔ سینٹ تھیوڈورس کی ماں اور بہن بہت سے پادریوں کے سفارشی خطوط لے کر اس خانقاہ میں پہنچیں جہاں وہ مقیم تھا۔ اور خواہش کی کہ وہ صرف ایک نظر بیٹے اور بھائی کو دیکھ لیں مگر اس نے ان کے سامنے آنے تک سے انکار کر دیا۔ سینٹ مارکس (ST. MARCUS) کی ماں اس سے ملنے کے لیے اس کی خانقاہ میں گئی۔ خانقاہ کے شیخ (ABBOT) کی خوشامدیں کر کے اس کو راضی کیا کہ وہ بیٹے کو ماں کے سامنے آنے کا حکم دے۔ مگر بیٹا کسی طرح ماں سے نہ ملنا چاہتا تھا۔ آخر کار اس نے شیخ کے حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ بھیس بدل کر ماں کے سامنے آگیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس طرح نہ ماں نے بیٹے کو پہچانا نہ بیٹے نے ماں کی شکل دیکھی۔ ایک اور ولی سینٹ پوئمن (ST. POEMEN) اور اس کے چھ بھائی مصر کی ایک صحرائی خانقاہ میں رہتے تھے۔ برسوں بعد ان کی بوڑھی ماں کو ان کا پتہ معلوم ہوا۔ اور وہ ان سے ملنے کے لیے وہاں پہنچی۔ بیٹے ماں کو دور سے دیکھتے ہی بھاگ کر اپنے حجرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ ماں باہر بیٹھ کر رونے لگی اور اس نے چیخ چیخ کر کہا کہ میں اس بڑھاپے میں اتنی دور چل کر صرف تمھیں دیکھنے آئی ہوں، تمھارا کیا نقصان ہو گا اگر میں تمھاری شکلیں دیکھ لوں۔ کیا میں تمھاری ماں نہیں ہوں؟ مگر ان ولیوں نے دروازہ نہ کھولا اور ماں سے کہہ دیا کہ ہم تجھ سے خدا کے ہاں ملیں گے۔ اس سے بھی زیادہ دردناک قصہ سینٹ سیمیون اسٹلائٹس (ST. SIMEON STYLITES) کا ہے جو ماں باپ کو چھوڑ کر ۲۷ سال غائب رہا۔ باپ اس کے غم میں مر گیا۔ ماں زندہ تھی۔ بیٹے کی ولایت کے چرچے جب دور و نزدیک پھیل گئے۔ تو اس کو پتہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ بے چاری اس سے ملنے کے لیے اس کی خانقاہ پر پہنچی مگر وہاں کسی عورت کو داخلے کی اجازت نہ تھی۔ اس نے لاکھ منت سماجت کی کہ بیٹا یا تو اسے اندر بلا لے یا باہر نکل کر اسے اپنی صورت دکھا دے مگر اس ولی اللہ نے صاف انکار کر دیا۔ تین دن اور تین رات وہ خانقاہ

کے دروازے پر پڑی رہی اور آخر کار وہیں لیٹ کر اس نے جان دے دی۔ تب ولی صاحب نکل کر آئے۔ ماں کی لاش پر آنسو بہائے اور اس کی مغفرت کے لیے دعا کی۔

ایسی ہی بے دردی ان ولیوں نے بہنوں کے ساتھ اور اپنی اولاد کے ساتھ برتی۔ ایک شخص میوٹیس (MUTIUS) کا قِصّہ لکھا ہے کہ وہ خوشحال آدمی تھا۔ یکایک اس پر مذہبی جذبہ طاری ہوا اور وہ اپنے ۸ سال کے اکلوتے بیٹے کو لے کر ایک خانقاہ میں جا پہنچا۔ وہاں اس کی روحانی ترقی کے لیے ضروری تھا کہ وہ بیٹے کی محبت دِل سے نکال دے۔ اس لیے پہلے تو بیٹے کو اس سے جُدا کر دیا گیا پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک مُدّت تک طرح طرح کی سختیاں اس معصوم بچے پر کی جاتی رہیں اور وہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر خانقاہ کے شیخ نے اسے حکم دیا کہ اسے لے جا کر اپنے ہاتھ سے دریا میں پھینک دے۔ جب وہ اس حکم کی تعمیل کے لیے بھی تیار ہو گیا تو عین اس وقت راہبوں نے بچے کی جان بچائی جب وہ اسے دریا میں پھینکنے لگا تھا۔ اس کے بعد تسلیم کر لیا گیا کہ وہ واقعی مرتبۂ ولایت کو پہنچ گیا ہے۔

مسیحی رہبانیت کا نقطۂ نظر ان معاملات میں یہ تھا کہ جو شخص خدا کی محبت چاہتا ہو اسے انسانی محبت کی وہ ساری زنجیریں کاٹ دینی چاہئیں جو دنیا میں اس کو اپنے والدین، بھائی بہنوں اور بال بچوں کے ساتھ باندھتی ہیں۔ سینٹ جیروم کہتا ہے کہ ”اگرچہ تیرا بھتیجا تیرے گلے میں بانہیں ڈال کر تجھ سے لپٹے، اگرچہ تیری ماں اپنے دُودھ کا واسطہ دے کر تجھے روکے اگرچہ تیرا باپ تجھے روکنے کے لیے تیرے آگے لیٹ جائے، پھر بھی تو سب کو چھوڑ کر اور باپ کے جسم کو روند کر ایک آنسو بہائے بغیر صلیب کے جھنڈے کی طرف دوڑ جا۔ اس معاملے میں بے رحمی ہی تقویٰ ہے“۔

سینٹ گریگوری لکھتا ہے کہ ”ایک نوجوان راہب ماں باپ کی محبت دل سے نہ نکال سکا اور ایک رات چپکے سے بھاگ کر ان سے مِل آیا۔ خدا نے اس قصور کی سزا اسے یہ دی کہ خانقاہ واپس پہنچتے ہی وہ مر گیا۔ اس کی لاش زمین میں دفن کی گئی تو زمین نے اسے قبول نہ کیا۔ بار بار قبر میں ڈالا جاتا اور زمین اسے نکال کر پھینک دیتی۔ آخر کار سینٹ بینیڈکٹ نے اس کے سینے پر تبرک رکھا تب قبر نے اسے قبول کیا“۔

ایک راہبہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مرنے کے بعد تین دن عذاب میں اس لیے مبتلا رہی کہ وہ اپنی ماں کی محبت دل سے نہ نکال سکی تھی۔ ایک ولی کی تعریف میں لکھا ہے کہ اس نے کبھی اپنے رشتہ داروں کے سوا کسی کے ساتھ بے دردی نہیں برتی۔

۵۔ فرقہ دارانہ بنیادوں پر ظلم و تعدی

اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ بے رحمی، سنگ دلی اور قساوت برتنے کی جو مشق یہ لوگ کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کے انسانی جذبات مر جاتے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں سے انھیں مذہبی اختلاف ہوتا تھا ان کے مقابلے میں یہ ظلم و ستم کی انتہا کر دیتے تھے۔ چوتھی صدی تک پہنچتے پہنچتے مسیحیت میں ۸۰۔۹۰ فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ سینٹ آگسٹائن نے اپنے زمانے میں ۸۸ فرقے گنائے ہیں۔ یہ فرقے ایک دوسرے کے خلاف سخت نفرت رکھتے تھے۔ اس نفرت کی آگ کو بھڑکانے والے بھی راہب ہی تھے اور اس آگ میں مخالف گروہوں کو جلا کر خاک کر دینے کی کوششوں میں بھی راہب پیش پیش ہوتے تھے۔ اسکندریہ اس فرقہ دارانہ کشمکش کا ایک بڑا اکھاڑا تھا۔ وہاں پہلے ایرین (ARIAN) فرقے کے بشپ نے اتھاناسیوس کی پارٹی پر حملہ کیا۔ اس کی خانقاہوں سے کنواری راہبات پکڑ پکڑ کر نکالی گئیں، اُن کو ننگا کر کے خار دار شاخوں سے پیٹا گیا اور ان کے جسم پر داغ لگائے گئے تاکہ وہ اپنے عقیدے سے توبہ کریں۔ پھر جب مصر میں کیتھولک گروہ کو غلبہ حاصل ہوا تو اس نے ایرین فرقے کے خلاف یہی سب کچھ کیا، حتیٰ کہ غالب خیال یہ ہے کہ خود ایریس (ARIUS) کو بھی زہر دے کر مار دیا گیا۔ اسی اسکندریہ میں ایک مرتبہ سینٹ سائرل (ST. SYRIL) کے مرید راہبوں نے ہنگامۂ عظیم برپا کیا۔ یہاں تک کہ مخالف فرقے کی ایک راہبہ کو پکڑ کر اپنے کلیسا میں لے گئے، اسے قتل کیا، اس کی لاش کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالی اور پھر اُسے آگ میں جھونک دیا۔ رُوم کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا۔ ۳۶۶ء میں پوپ لبریس (LIBERIUS) کی وفات پر دو گروہوں نے اپنے اپنے امیدوار کھڑے کیے۔ دونوں کے درمیان سخت خونریزی ہوئی حتیٰ کہ ایک دن میں صرف ایک چرچ سے ۱۳۷ لاشیں نکالی گئیں۔

۶۔ ترک و تجرد کے ساتھ دنیا پرستی

اس ترکِ تجرد اور فقر و درویشی کے ساتھ دولتِ دنیا سمیٹنے میں بھی کمی نہ کی گئی۔ پانچویں صدی کے آغاز ہی میں یہ حالت ہو چکی تھی کہ روم کا بشپ بادشاہوں کی طرح اپنے محل میں رہتا تھا اور اس کی سواری جب شہر میں نکلتی تھی تو اس کے ٹھاٹھ باٹھ قیصر کی سواری سے کم نہ ہوتے تھے۔ سینٹ جیروم اپنے زمانے (چوتھی صدی کے آخری دور) میں شکایت کرتا ہے کہ بہت سے بشپوں کی دعوتیں اپنی شان میں گورنروں کی دعوتوں کو شرماتی ہیں۔ خانقاہوں اور کنیسوں کی طرف دولت کا یہ بہاؤ ساتویں صدی (نزولِ قرآن کے زمانے) تک پہنچتے پہنچتے

سیلاب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یہ بات عوام کے ذہن نشین کرا دی گئی تھی کہ جب کسی سے کوئی گناہِ عظیم سرزد ہو جائے اس کی بخشش کسی نہ کسی ولی کی درگاہ پر نذرانہ چڑھانے، یا کسی خانقاہ یا چرچ کو بھینٹ دینے ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد وہی دنیا راہبوں کے قدموں میں آ رہی جس سے فرار ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ خاص طور پر جو چیز اس تنزل کی موجب ہوئی، وہ یہ تھی کہ راہبوں کی غیر معمولی ریاضتوں اور ان کی نفس کشی کے کمالات دیکھ کر جب عوام میں ان کے لیے بے پناہ عقیدت ہو گئی تو بہت سے دنیا پرست لوگ لباسِ درویشی پہن کر راہبوں کے گروہ میں داخل ہو گئے اور انھوں نے ترکِ دنیا کے بھیس میں جلبِ دنیا کا کاروبار ایسا چمکایا کہ بڑے بڑے طالبینِ دنیا اُن سے مات کھا گئے۔

۷۔ خانقاہوں میں فحاشی کے اڈے

عفّت کے معاملہ میں بھی فطرت سے لڑ کر رہبانیت نے بارہا شکست کھائی اور جب شکست کھائی تو بُری طرح کھائی۔ خانقاہوں میں نفس کشی کی کچھ مشقیں ایسی بھی تھیں جن میں راہب اور راہبات مل کر ایک ہی جگہ رہتے تھے اور بسا اوقات ذرا زیادہ مشق کرنے کے لیے ایک ہی بستر پر رات گزارتے تھے۔ مشہور راہب سینٹ ایواگریس (ST-EVAGRIUS) بڑی تعریف کے ساتھ فلسطین کے ان راہبوں کے ضبطِ نفس کا ذکر کرتا ہے جو اپنے جذبات پر اتنا قابو پا گئے تھے کہ عورتوں کے ساتھ یک جا غسل کرتے تھے اور اُن کی دید سے، اُن کے لمس سے، حتّٰی کہ ان کے ساتھ ہم آغوشی سے بھی اُن کے اوپر فطرت غلبہ نہ پاتی تھی۔ غسل اگرچہ رہبانیت میں سخت ناپسندیدہ تھا مگر نفس کشی کی مشق کے لیے اس طرح کے غسل بھی کر لیے جاتے تھے۔ آخر کار اسی فلسطین کے متعلق نیسا (NYSSA) کا سینٹ گریگوری متوفی ۳۹۶ء لکھتا ہے کہ وہ بدکرداری کا اڈا بن گیا ہے۔ انسانی فطرت کبھی ان لوگوں سے انتقام لیے بغیر نہیں رہتی جو اس سے جنگ کریں۔ رہبانیت اس سے لڑ کر بالآخر بداخلاقی کے جس گڑھے میں جا گری اس کی داستان آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی عیسوی تک کی مذہبی تاریخ کا بدنما داغ ہے۔ دسویں صدی کا ایک اطالوی بشپ لکھتا ہے کہ "اگر چرچ میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے خلاف بدچلنی کی سزائیں نافذ کرنے کا قانون عملاً جاری کر دیا جائے تو لڑکوں کے سوا کوئی سزا سے نہ بچ سکے گا، اور اگر حرامی بچوں کو بھی مذہبی خدمات سے الگ کر دینے کا قاعدہ نافذ کیا جائے، تو شاید چرچ کے خادموں میں کوئی لڑکا تک باقی نہ رہے۔" قرونِ متوسطہ کے مصنفین کی کتابیں ان شکایتوں سے بھری پڑی ہیں کہ راہبات کی خانقاہیں بداخلاقی کے چکلے

بن گئی ہیں، ان کی چار دیواریوں میں نوزائیدہ بچوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔ پادریوں اور چرچ کے مذہبی کارکنوں میں محرمات تک سے ناجائز تعلقات اور خانقاہوں میں خلافِ وضع فطری جرائم تک پھیل گئے ہیں، اور کلیساؤں میں اعترافِ گناہ (CONFESSION) کی رسم بدکرداری کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔

ان تفصیلات سے صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید یہاں رہبانیت کی بدعت ایجاد کرنے اور پھر اس کا حق ادا نہ کرنے کا ذکر کر کے مسیحیت کے کس بگاڑ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ (۴۳)

ملاحظہ ہو سورۃ الحدید۔ آیت ۲۷ :

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ
وَجَعَلْنَا فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا
مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ج

ترجمہ: "ان کے بعد ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے، اور ان سب کے بعد عیسیٰ بن مریم کو مبعوث کیا اور اس کو انجیل عطا کی، اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔ اور رہبانیت انھوں نے خود ایجاد کر لی، ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے ان کا اجر ہم نے عطا کیا، مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔"

باب ۵

عیسائیوں کی تاریخ کے چند اہم اجزا

فصل ۱

اصحابِ اُخدود

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ (بروج - آیت ۴)

ترجمہ: مارے گئے گڑھے والے۔

گڑھوں میں آگ جلا کر ایمان والوں کو ان میں پھینکنے کے متعدد واقعات روایات میں بیان ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کئی مرتبہ اس طرح کے مظالم کیے گئے ہیں۔

حضرت صہیب رومیؓ کی روایت

ان میں سے ایک واقعہ حضرت صہیب رومیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ ایک بادشاہ کے پاس ایک ساحر تھا۔ اس نے اپنے بڑھاپے میں بادشاہ سے کہا کہ کوئی لڑکا ایسا مامور کر دے جو مجھ سے یہ سحر سیکھ لے۔ بادشاہ نے ایک لڑکے کو مامور کر دیا۔ مگر وہ لڑکا ساحر کے پاس آتے جاتے ایک راہب سے بھی (جو غالباً پیروانِ مسیح علیہ السلام میں سے تھا) ملنے لگا۔ اور اس کی باتوں سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا۔ حتیٰ کہ اس کی تربیت سے صاحب کرامت ہو گیا اور اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے لگا۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا توحید پر ایمان لے آیا ہے تو اس نے پہلے تو راہب کو قتل کیا، پھر اس لڑکے کو قتل کرنا چاہا۔ مگر کوئی ہتھیار اور کوئی حربہ اس پر کارگر نہ ہوا۔ آخر کار لڑکے نے کہا اگر تو مجھے قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو مجمعِ عام میں باسم ربّ الغلام (اس لڑکے کے رب کے نام پر) کہہ کر مجھے تیر مار میں مر جاؤں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا مر گیا۔ اس پر لوگ پکار اُٹھے کہ ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ کے مصاحبوں نے اس سے کہا کہ یہ تو وہی کچھ ہو گیا جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ لوگ آپ کے دین کو چھوڑ کر اس لڑکے کے دین کو مان گئے۔ بادشاہ یہ دیکھ کر غصے میں بھر گیا۔ اس نے سڑکوں کے کنارے گڑھے کھدوائے، ان میں آگ بھروائی، اور جس جس نے ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا اس کو آگ میں پھکوا دیا (احمد، مسلم، نسائی

(ترمذی۔ ابن جریر۔ عبدالرزاق۔ ابن ابی شیبہ۔ طبرانی۔ عبد بن حمید)

حضرت علیؓ کی بیان کردہ روایت

دوسرا واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایران کے ایک بادشاہ نے شراب پی کر اپنی بہن سے زنا کا ارتکاب کیا اور دونوں کے درمیان ناجائز تعلقات استوار ہو گئے۔ بات کھلی تو بادشاہ نے لوگوں میں اعلان کرایا کہ خدا نے بہن سے نکاح حلال کر دیا ہے۔ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا تو اس نے طرح طرح کے عذاب دے کر عوام کو یہ بات ماننے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ہر اس شخص کو پھکواتا چلا گیا جس نے اسے ماننے سے انکار کیا۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ اسی وقت سے مجوسیوں میں محرمات سے نکاح کا طریقہ رائج ہوا ہے۔ (ابن جریر)

حضرت ابن عباسؓ کی روایت

تیسرا واقعہ ابن عباسؓ نے غالباً اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ بابل والوں نے بنی اسرائیل کو دینِ موسیٰ علیہ السلام سے پھر جانے پر مجبور کیا تھا، یہاں تک کہ انھوں نے آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ان لوگوں کو پھینک دیا جو اس سے انکار کرتے تھے (ابنِ جریر۔ عبد بن حمید)

اسلامی مؤرخین کا بیان

سب سے مشہور واقعہ نجران کا ہے جسے ابنِ ہشام، طبری، ابنِ خلدون اور صاحب معجم البلدان وغیرہ اسلامی مؤرخین نے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حمیر (یمن کا بادشاہ) تبان اسعد، ابوکرب ایک مرتبہ یثرب گیا، جہاں یہودیوں سے متاثر ہو کر اس نے دینِ یہود قبول کر لیا۔ اور بنی قریظہ کے دو یہودی عالموں کو اپنے ساتھ یمن لے گیا۔ وہاں اس نے بڑے پیمانے پر یہودیت کی اشاعت کی۔ اس کا بیٹا ذونواس اس کا جانشین ہوا اور اس نے نجران پر (جو جنوبی عرب میں عیسائیوں کا گڑھ تھا) حملہ کیا تاکہ وہاں سے عیسائیت کا خاتمہ کر دے اور اس کے باشندوں کو یہودیت اختیار کرنے پر مجبور کر دے (ابنِ ہشام کہتا ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کے اصل دین پر قائم تھے) نجران پہنچ کر اس نے لوگوں کو دینِ یہود قبول کرنے کی دعوت دی مگر انھوں نے انکار کیا۔ اس پر اس نے بکثرت لوگوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلوا دیا اور بہت سوں کو قتل کر دیا، یہاں تک کہ مجموعی طور پر ۲۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ اہلِ نجران میں سے ایک شخص دوس ذو ثعلبان بھاگ نکلا اور ایک روایت کی رو سے اس نے قیصرِ روم کے پاس جا کر، اور دوسری روایت کی رو سے حبش

کے بادشاہ نجاشی کے ہاں جا کر اس ظلم کی شکایت کی۔ پہلی روایت کی رُو سے قیصر نے حبش کے بادشاہ کو لکھا اور دوسری روایت کی رُو سے نجاشی نے قیصر سے بحری بیڑہ فراہم کرنے کی درخواست کی۔ بہرحال آخر کار حبش کی ۷۰ ہزار فوج اریاط نامی ایک جنرل کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہوئی، ذو نواس مارا گیا یہودی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور یمن حبش کی عیسائی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔

اسلامی مؤرخین کے بیانات کی نہ صرف تصدیق دوسرے تاریخی ذرائع سے ہوتی ہے بلکہ ان سے بہت سی مزید تفصیلات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یمن پر سب سے پہلے عیسائی حبشیوں کا قبضہ ۳۴۰ء میں ہوا تھا اور ۳۷۸ء تک جاری رہا۔ اس زمانے میں عیسائی مشنری یمن میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ اسی کے قریب دور میں ایک زاہد و مجاہد اور صاحبِ کشف و کرامت عیسائی سیّاح فیمیون (FAMIYUN) نامی نجران پہنچا اور اس نے وہاں کے لوگوں کو بُت پرستی کی برائی سمجھائی اور اس کی تبلیغ سے اہلِ نجران عیسائی ہو گئے۔ ان لوگوں کا نظام تین سردار چلاتے تھے۔ ایک سیّد، جو قبائلی شیوخ کی طرح بڑا سردار اور خارجی معاملات، معاہدات اور فوجوں کی قیادت کا ذمّہ دار تھا۔ دوسرا عاقب، جو داخلی معاملات کا نگران تھا۔ اور تیسرا اسقف (بشپ) جو مذہبی پیشوا ہوتا تھا۔ جنوبی عرب میں نجران کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ایک بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز تھا۔ ٹسر، چمڑے اور اسلحہ کی صنعتیں یہاں چل رہی تھیں۔ مشہور حُلّہ یمانی بھی یہیں تیار ہوتا تھا۔ اسی بنا پر محض مذہبی وجوہ ہی سے نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی وجوہ سے بھی ذُونواس نے اس اہم مقام پر حملہ کیا۔ نجران کے سیّد حارثہ کو جسے سُریانی مؤرخین (ARETHAS) لکھتے ہیں، قتل کیا۔ اس کی بیوی رومہ کے سامنے اس کی دو بیٹیوں کو مار ڈالا اور اسے ان کا خُون پینے پر مجبور کیا، پھر اسے قتل بھی کر دیا۔ اُسقف پال (PAUL) کی ہڈیاں قبر سے نکال کر جلا دیں۔ اور آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں عورت، مرد، بچے، بوڑھے، پادری راہب سب کو پھینکوا دیا۔ مجموعی طور پر ۲۰ سے چالیس ہزار تک مقتولین کی تعداد بیان کی جاتی ہے۔ یہ واقعہ اکتوبر ۵۲۳ء میں پیش آیا تھا۔ آخر کار ۵۲۵ء میں حبشیوں نے یمن پر حملہ کر کے ذُونواس اور اس کی حمیری سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی تصدیق حصنِ غراب کے کتبے سے ہوتی ہے۔ جو یمن میں موجودہ زمانے کے محققینِ آثارِ قدیمہ کو ملا ہے۔

واقعۂ اصحاب الاخدود کے عینی شاہد

چھٹی صدی عیسوی کی متعدد عیسائی تحریرات میں اصحاب الاخدود کے اس واقعہ کی تفصیلات بیان

ہوئی ہیں جن میں سے بعض عین زمانۂ حادثہ کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور عینی شاہدوں سے سُن کر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے تین کتابوں کے مصنّف اس واقعہ کے ہمعصر۔ ایک پرولیبیوس، دوسرا کوسماس انڈیکوپلیوسٹس (COS- MAS INDICOPLEUSTIS) جو نجاشی ایلیسبوعان (ELASBOAN) کے حکم سے اس زمانے میں بطلیموس کی یونانی کتابوں کا ترجمہ کر رہا تھا۔ اور حبش کے ساحلی شہر اُدولیس (ADOLIS) میں مقیم تھا تیسرا یوحنّس ملالا (JOHANNES MALALA) جس سے بعد کے متعدّد مؤرّخین نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ اس کے بعد یوحنّس افسوسی (JOHANNES OF EPHESUS) متوفی ۵۸۵ء نے اپنی تاریخ کنیسہ میں نصاریٰ نجران کی تعذیب کا قصہ اس واقعہ کے معاصر راوی اُسقُف مار شمعون (SIMEON) کے ایک خط سے نقل کیا ہے جو اس نے دیرِ جبُلہ کے رئیس (ABBOT VON GABULA) کے نام لکھا تھا، اور مار شمعون نے اپنے خط میں یہ واقعہ اُن اہلِ یمن کے آنکھوں دیکھے بیان سے روایت کیا ہے جو اس موقع پر موجود تھے۔ یہ خط ۱۸۸۱ء میں روم سے اور ۱۸۹۰ء میں شہدائے مسیحیت کے حالات کے سلسلے میں شائع ہوا ہے۔ یعقوبی بطریق ڈایونیسیوس (PATRIARCH DIONYSIUS) اور زکریا مدتلی (ZACHARIA OF MITYLENE) نے اپنی سُریانی تاریخوں میں بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے یعقوب سروجی کی کتاب درباب نصاریٰ نجران میں بھی یہ ذکر موجود ہے۔ الرّہا (EDESSA) کے اُسقُف پولس (PULUS) نے نجران کے ہلاک شدگان کا مرثیہ لکھا جو اب بھی دستیاب ہے۔ سُریانی زبان کی تصنیف کتاب "الحمیریین" کا انگریزی ترجمہ (BOOK OF THE HIMYARITES) ۱۹۲۴ء میں لندن سے شائع ہوا ہے اور وہ مسلمان مؤرخین کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ برٹش میوزیم میں اس عہد اور اس سے قریب عہد کے کچھ حبشی مخطوطات بھی موجود ہیں۔ جو اس قصّے کی تائید کرتے ہیں۔ فلبی نے اپنے سفرنامے (ARABIAN HIGHLANDS) میں لکھا ہے کہ نجران کے لوگوں میں اب تک وہ جگہ معروف ہے جہاں اصحاب الاخدود کا واقعہ پیش آیا۔ اُمّ خرق کے پاس ایک جگہ چٹانوں میں کھدی ہوئی کچھ تصویریں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور کعبۂ نجران جس جگہ واقعہ تھا اس کو بھی آج کل کے اہلِ نجران جانتے ہیں۔

کعبۂ نجران کی تعمیر

حبشی عیسائیوں نے نجران پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں کعبہ کی شکل کی ایک عمارت بنائی جسے وہ مکّہ کے کعبہ کی جگہ مرکزی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ اس کے اساقفہ عمامے باندھتے تھے۔ اور اس کو

حرم قرار دیا گیا تھا۔ رومی سلطنت بھی اس کعبے کے لیے مالی اعانت بھیجتی تھی۔ اسی کعبۂ نجران کے پادری اپنے سید اور عاقب اور اسقف کی قیادت میں مناظرے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور مُباہلہ کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا جس کا ذکر سورۂ آلِ عمران آیت ۶۱ میں کیا گیا ہے۔ (۴۴)

فصل ۲

واقعۂ اصحابِ کہف

مشرکینِ مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے اہلِ کتاب کے مشورے سے آپؐ کے سامنے تین سوالات پیش کیے تھے، اصحابِ کہف کون تھے؟ قصۂ خضر کی حقیقت کیا ہے؟ اور ذوالقرنین کا کیا قصہ ہے؟ یہ تینوں قصے عیسائیوں اور یہودیوں کی تاریخ سے متعلق تھے۔ حجاز میں ان کا کوئی چرچا نہ تھا۔ اسی لیے اہلِ کتاب نے امتحان کی غرض سے ان کا انتخاب کیا تھا تاکہ یہ بات کھل جائے کہ واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی غیبی ذریعۂ علم ہے یا نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کہ اپنے نبی کی زبان سے ان کے سوالات کا پورا جواب دیا، بلکہ ان کے اپنے پوچھے ہوئے تینوں قصوں کو پوری طرح اس صورتِ حال پر چسپاں بھی کر دیا جو اس وقت مکہ میں کفر و اسلام کے درمیان درپیش تھی۔ (از مؤلف)

کہف و رقیم کی بحث

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ اِذْ اَوَى
الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا
مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ (الکہف - آیت ۹-۱۰)

ترجمہ: ”کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور کتبے والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے تھے؟ جب وہ چند نوجوان غار میں پناہ گزیں ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ”اے پروردگار“ ہم کو اپنی رحمتِ خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے۔“

عربی زبان میں ”کہف“ وسیع غار کو کہتے ہیں اور ”غار“ کا لفظ تنگ کھوہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

مگر اُردو میں غار کہف کا ہم معنی ہے۔

الرقیم کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض صحابہ و تابعین سے منقول ہے کہ یہ اُس بستی کا نام ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا، اور وہ ایلہ (یعنی عَقَبہ) اور فلسطین کے درمیان واقع تھی اور بعض قدیم مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ کتبہ ہے جو اس غار پر اصحاب کہف کی یادگار میں لگایا گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر "ترجمان" میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مقام وہی ہے جسے بائیبل کی کتاب یشوع (باب ۱۸۔ آیت ۲۷) میں رقم یا راقم کہا گیا ہے۔ پھر وہ اسے نبطیوں کے مشہور تاریخی مرکز پیٹرا کا قدیم نام قرار دیتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ کتاب یشوع میں رقم یا راقم کا ذکر بنی بن یمین کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے اور خود اسی کتاب کے بیان کی رُو سے اس قبیلے کی میراث کا علاقہ دریائے اُردن اور بحیرہ لوط کے مغرب میں واقع تھا جس میں پیٹرا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ پیٹرا کے کھنڈر جس علاقے میں پائے جاتے ہیں اس کے اور بنی بن یمین کی میراث کے درمیان یہودا اور اَدُومیہ کا پورا علاقہ حائل تھا۔ اسی بنا پر جدید زمانے کے محققین آثار قدیمہ نے یہ بات ماننے میں سخت تامّل کیا ہے کہ پیٹرا اور راقم ایک چیز ہیں (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع ۱۹۴۶ء جلد ۱۷، ص ۶۵۸) ہمارے نزدیک صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ رقیم سے مراد کتبہ ہے۔ (۴۵)

فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ
الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ
اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًی (الکهف آیت ۱۱ تا ۱۳)

ترجمہ: "تو ہم نے انھیں اسی غار میں ٹھیک کر سالہا سال کے لیے گہری نیند سلا دیا، پھر ہم نے انھیں اٹھایا تاکہ دیکھیں ان کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مُدّتِ قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے — ہم ان کا قصّہ تمھیں سناتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔"

قِصّے کی قدیم ترین شہادت

اس قِصّے کی قدیم ترین شہادت شام کے ایک عیسائی پادری جیمس سروجی کے مواعظ میں پائی گئی ہے جو سُریانی زبان میں لکھے گئے تھے۔ یہ شخص اصحاب کہف کی وفات کے چند سال بعد ۴۵۲ء میں پیدا ہوا

تھا اور اس نے سنہ ۴۷۴ء کے لگ بھگ زمانے میں اپنے یہ مواعظ مرتب کیے تھے۔ ان مواعظ میں وہ اس پورے واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہی سُریانی روایت ایک طرف ہمارے ابتدائی دَور کے مفسّرین کو پہنچی جسے ابنِ جریر طبری نے مختلف سندوں کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے اور دوسری طرف یورپ کو پہنچی جہاں یونانی اور لاطینی زبانوں میں اس کے ترجمے اور خلاصے شائع ہوئے۔ گبن نے اپنی کتاب "تاریخ زوال و سقوطِ دولتِ رُوم" کے باب ۳۳ میں "سات سونے والوں" (SEVEN SLEEPERS) کے عنوان کے تحت ان مآخذ سے اس قصے کا جو خلاصہ دیا ہے وہ ہمارے مفسّرین کی روایات سے اس قدر مِلتا جُلتا ہے کہ دونوں قِصّے قریب قریب ایک ہی مآخذ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جس بادشاہ کے ظلم سے بھاگ کر اصحابِ کہف غار میں پناہ گزیں ہوئے تھے، ہمارے مفسّرین اس کا نام دَقیُنُوس یا دقیانوس یا دَقیوُس بتاتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ وہ قیصر ڈِیسیئس (DECIUS) تھا جس نے سنہ ۲۴۹ء سے سنہ ۲۵۱ء تک سلطنتِ روم پر فرمانروائی کی ہے اور مسیح علیہ السّلام کے پیرؤوں پر ظلم کرنے کے معاملہ میں جس کا عہد بہت بدنام ہے۔ جس شہر میں یہ واقعہ پیش آیا اس کا نام ہمارے مفسّرین اُفسُس یا افسوس لکھتے ہیں اور گبن اس کا نام اِفِسُس (EPHESUS) بتاتا ہے جو ایشائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ تھا، جس کے کھنڈر آج موجودہ ٹرکی کے شہر ازمیر (سمرنا) سے ۲۰-۲۵ میل بجانبِ جنوب پائے جاتے ہیں۔ پھر جس بادشاہ کے عہد میں اصحابِ کہف جاگے اس کا نام ہمارے مفسّرین تیذوسیس لکھتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ ان کے بعث کا واقعہ قیصر تھیوڈوسیس ثانی (THEODASIUS) کے زمانے میں پیش آیا جو رومی سلطنت کے عیسائیت قبول کر لینے کے بعد سنہ ۴۰۸ء سے سنہ ۴۵۰ء تک روم کا قیصر رہا۔ دونوں بیانات کی مماثلت کی حد یہ ہے کہ اصحابِ کہف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے جس رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا تھا اس کا نام ہمارے مفسّرین یملیخا بتاتے ہیں اور گبن اسے یَملیخُس (JAMBLICHUS) لکھتا ہے۔ قِصّے کی تفصیلات دونوں روایتوں میں یکساں ہیں۔ اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قیصر ڈیسیئس کے زمانے میں جب مسیح علیہ السلام کے پیرؤوں پر سخت ظلم و ستم ہو رہے تھے، یہ سات نوجوان ایک غار میں جا بیٹھے تھے۔ پھر قیصر تھیوڈوسیس کی سلطنت کے اڑتیسویں سال یعنی تقریباً سنہ ۴۴۵ء یا سنہ ۴۴۶ء میں) یہ لوگ بیدار ہوئے جب کہ پوری رومی سلطنت مسیح علیہ السلام کی پیرو بن چکی تھی۔ اس حساب سے غار میں ان کے رہنے کی مدت تقریباً ۱۹۶ سال بنتی ہے۔

بعض مستشرقین کی اختلافی بحث

بعض مستشرقین نے اس قصّے کو اصحابِ کہف کا مترادف ماننے سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ آگے قرآن ان کے قیامِ غار کی مُدّت ۳۰۹ سال بیان کر رہا ہے۔

اس سُریانی روایت اور قرآن کے بیان میں کچھ جزوی اختلافات بھی ہیں جن کو بنیاد بنا کر گبن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر "جہالت" کا الزام لگایا ہے، حالانکہ جس روایت کے اعتماد پر وہ اسی بڑی جسارت کر رہا ہے۔ اس کے متعلق وہ خود مانتا ہے کہ اس واقعے کے تیس چالیس سال بعد شام کے ایک شخص نے لکھی ہے، اور اتنی مُدّت کے اندر زبانی روایت کے ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جایا کرتا ہے۔ اس طرح کی ایک روایت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہے اور اس سے کسی جزو میں اختلاف ہونا لازماً قرآن ہی کی غلطی ہے صرف ان ہٹ دھرم لوگوں کو زیب دیتا ہے جو مذہبی تعصب میں عقل کے معمولی تقاضوں تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ (۴۲)

محلِ واقعہ اور اس کی تفصیلات

شہر افسوس (EPHESUS) جس میں اصحابِ کہف کا واقعہ پیش آیا، تقریباً گیارھویں صدی قبل مسیح میں تعمیر ہوا تھا اور بعد میں یہ بُت پرستی کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں چاند دیوی کی پوجا ہوتی تھی، جسے ڈائنا (DIANA) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اسی کا عظیم الشان مندر عہدِ قدیم کے عجائباتِ عالم میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایشیائے کوچک کے لوگ اس کی پرستش کرتے تھے، اور رومی سلطنت نے بھی اس کو اپنے معبودوں میں شامل کر لیا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب مسیحی دعوت رومی سلطنت کے مختلف علاقوں میں پہنچنی شروع ہوئی تو اس شہر کے چند نوجوان بھی شرک سے تائب ہو کر خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔ ان کے قصّے کی جو تفصیلات مسیحی روایات کو جمع کر کے گریگوری آف ٹورس (GREGORY OF TOURS) نے اپنی کتاب (MERACULORUM LIBER) میں بیان کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

یہ سات نوجوان تھے۔ ان کی تبدیلئ مذہب کا حال سن کر قیصر ڈیسیئس نے ان کو اپنے سامنے طلب کیا اور ان سے پوچھا کہ تمھارا مذہب کیا ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ قیصر پیروانِ مسیح کے خون کا پیاسا ہے۔ مگر انھوں نے کسی خوف کے بغیر صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا رب وہ ہے جو زمین اور آسمان کا رب ہے۔ اس کے سوا ہم کسی اور معبود کو نہیں پکارتے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بہت بڑا گناہ کریں گے۔ قیصر نے پہلے تو سخت مشتعل ہو کر کہا کہ اپنی زبان بند کرو، ورنہ میں تمھیں ابھی قتل کرا دوں گا۔ پھر کچھ ٹھنڈا ہوا اور بولا تم ابھی بچے ہو۔ میں تمھیں تین دن دیتا ہوں۔ اس مدت میں اگر تم نے اپنا رویہ بدل لیا اور اپنی قوم کے مذہب کی طرف پلٹ آئے تو خیر، ورنہ تمھاری گردن ماردی جائے گی۔

اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر یہ ساتوں نوجوان شہر سے بھاگ نکلے اور انھوں نے پہاڑوں کی راہ لی تاکہ کسی غار میں جا چھپیں۔ راستے میں ایک کُتا ان کے ساتھ لگ گیا۔ انھوں نے بہتیری کوشش کی کہ وہ ان کا پیچھا چھوڑ دے، مگر وہ کسی طرح ان سے الگ نہ ہوا۔ آخر کار ایک بڑے گہرے غار کو اچھی جائے پناہ دیکھ کر وہ اس میں چھپ گئے اور کُتا اس کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ تھکے ماندے تھے اس لیے فوراً ہی سو گئے۔ یہ ۲۵۰ عیسوی کا واقعہ ہے۔ ۱۹۷ برس بعد ۴۴۷ عیسوی میں وہ یکایک بیدار ہوئے۔ جب قیصر تھیوڈوسیس دوم کا عہدِ حکومت، رومی سلطنت مسیحیت اختیار کر چکی تھی، اور شہر افسوس کے باشندے بھی بت پرستی ترک کر چکے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب رومی باشندوں کے درمیان زندگی بعد موت اور حشر و نشر کے معاملے میں سخت اختلاف برپا تھا اور قیصر اس بات پر بہت فکر مند تھا کہ لوگوں کے دلوں سے انکارِ آخرت کا خیال کیسے نکالا جائے۔ ایک روز اس نے خدا سے دعا کی کہ وہ کوئی ایسی نشانی دکھا دے جس سے لوگ آخرت پر ایمان لے آئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ٹھیک اسی زمانے میں یہ نوجوان جاگ اُٹھے۔

بیدار ہو کر انھوں نے آپس میں پُوچھا کتنی دیر ہم سوئے ہوں گے؟ کسی نے کہا دن بھر۔ کسی نے کہا دن کا کچھ حصہ۔ پھر یہ کہہ کر سب خاموش ہو گئے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک ساتھی جین (JEAN) کو چاندی کے چند سکے دے کر کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا اور اس سے کہا ذرا احتیاط سے کام لینا، کہیں لوگ تمھیں پہچان نہ جائیں۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر لوگوں کو ہمارا پتہ چل گیا تو وہ ہمیں پکڑ لے جائیں گے اور ڈائنا کی پرستش پر مجبور کریں گے۔ مگر جین جب شہر میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دنیا بدلی ہوئی ہے۔ سب لوگ مسیحی ہو گئے ہیں اور ڈائنا کو پوجنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ ایک دکان پر پہنچ کر اس نے روٹیاں خریدیں اور دکاندار کو چاندی کا ایک سکہ دیا جس پر قیصر ڈیسیئس کی تصویر تھی۔ دکاندار یہ سکہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے پُوچھا یہ تمھیں کہاں سے ملا جین

نے کہا یہ میرا اپنا مال ہے، کہیں سے لایا نہیں ہوں۔ اس پر دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ لوگ جمع ہوگئے حتی کہ کوتوال شہر تک معاملہ پہنچا۔ کوتوال نے کہا مجھے وہ دفینہ بتاؤ جہاں سے تم یہ سکہ لائے ہو۔ جیمن نے جواب دیا دفینہ کیسا؟ یہ میرا اپنا مال ہے میں کسی دفینے کو نہیں جانتا۔ کوتوال نے کہا تمھاری یہ بات ماننے کے قابل نہیں ہے۔ یہ تو صدیوں پرانا سکہ ہے۔ تم تو ابھی جوان لڑکے ہو، ہمارے بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی یہ سکہ نہیں دیکھا۔ یہ ضرور کوئی راز ہے۔ جیمن نے جب یہ سنا کہ قیصر ڈیسیس کو مرے زمانہ دراز گزر چکا ہے تو وہ دنگ رہ گیا اور کچھ دیر تک بالکل دم بخود رہا۔ پھر آہستہ سے بولا کل ہی تو میں اور میرے چھ ساتھی اس شہر سے بھاگ کر گئے تھے اور ایک غار میں ہم نے پناہ لی تھی تاکہ ڈیسیس کے ظلم سے بچ رہیں۔ جیمن کی یہ بات سن کر کوتوال بھی حیران رہ گیا اور وہ اس کو لے کر اس غار کی طرف چلا جہاں اس کے بیان کے مطابق یہ لوگ چھپے ہوئے تھے۔ لوگوں کا ایک انبوہِ کثیر ان کے ساتھ تھا۔ وہاں پہنچ کر یہ امر پوری طرح تحقیق ہوگیا کہ یہ واقعی قیصر ڈیسیس کے زمانے کے لوگ ہیں۔ تھیوڈوسیس کو اس کی اطلاع دی گئی۔ وہ خود آکر ان سے ملا اور ان سے برکت لی۔ اس کے بعد یکایک یہ ساتوں آدمی غار میں جاکر لیٹے اور وفات پاگئے۔ اس صریح نشانی کو دیکھ کر لوگ مان گئے کہ واقعی موت کے بعد زندگی برحق ہے۔ پھر قیصر کے حکم سے اس غار پر ایک زیارت گاہ تعمیر کر دی گئی۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

غار والوں کی یہ داستان جو مسیحی روایات میں بیان ہوئی ہے، قرآن کے بیان کردہ قصے سے اتنی مطابقت رکھتی ہے کہ انہی کو اصحابِ کہف قرار دینا بہت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ قصہ ایشائے کوچک کے ایک شہر کا ہے، اور قرآن ان واقعات سے بحث نہیں کرتا جو سرزمینِ عرب کے باہر پیش آئے ہیں، اس لیے اس مسیحی قصے کو اصحابِ کہف پر چسپاں کرنا قرآن کے اسلوب سے انحراف ہوگا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ قرآن مجید میں دراصل جس بات کا التزام کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ عرب کو عبرت دلانے کے لیے ان قوموں اور طاقتوں کے حالات پر کلام کیا جائے جن سے وہ واقف تھے، قطع نظر اس سے کہ سرزمینِ عرب کے حدود میں ہوں یا اس سے باہر۔ اسی بنا پر مصر کی قدیم تاریخ قرآن میں زیرِ بحث آئی ہے، حالانکہ وہ عرب سے باہر واقع ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب مصر کے حالات قرآن میں زیرِ بحث آسکتے ہیں تو روم کے کیوں نہ آسکتے تھے؟ اہلِ عرب جس طرح مصر سے واقف تھے اسی طرح روم سے بھی تو واقف تھے۔ رومی سلطنت کی سرحدیں عین حجاز کی شمالی سرحدوں سے ملی ہوئی تھیں۔ عربوں کے تجارتی

قافلے شب و روز رومی علاقوں میں جاتے تھے۔ بہت سے عرب قبائل رومیوں کے زیرِ اثر تھے۔ روم عربوں کے لیے ہرگز اجنبی ملک نہ تھا۔ سورۂ روم اس پر شاہد ہے۔ علاوہ بریں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ قصّہ قرآن مجید میں ازخود بیان نہیں فرمایا ہے بلکہ کفّارِ مکّہ کے پوچھنے پر اس کا ذکر کیا ہے، اور کفّارِ مکّہ کو اہلِ کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے ایسے واقعات دریافت کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جن سے اہلِ عرب قطعی ناواقف تھے۔ (۲۷)

قرآن کا بیان

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا • إِذْ أَوَى
الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا
مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ہ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ہ ثُمَّ
بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا أَمَدًا ہ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ
نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى (الكهف اٰيات ۹تا۱۳)

ترجمہ: ”کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور کتبے والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے تھے؟ جب وہ چند نوجوان غار میں پناہ گزیں ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ”اے پروردگار، ہم کو اپنی رحمتِ خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے۔ تو ہم نے انھیں اسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لیے گہری نیند سُلا دیا، پھر ہم نے انھیں اٹھایا تاکہ دیکھیں ان کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدّتِ قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے — ہم ان کا قصّہ تمھیں سُناتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔“

وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ إِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَنْ
نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ إِذًا شَطَطًا ہ (الكهف اٰيت ۱۴)

ترجمہ: ”ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیے جب وہ اٹھے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو بالکل بے جا بات کریں گے۔“

یعنی جب وہ سچے دل سے ایمان لے آئے تو اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا اور ان کو یہ توفیق

بخشی کہ حق اور صداقت پر ثابت قدم رہیں، اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈال لینا گوارا کر لیں، مگر باطل کے آگے سر نہ جھکائیں۔ (۲۸)

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ
بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ
وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ
لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝ (الکہف - آیات ۱۵-۱۶)

ترجمہ: "(پھر انھوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا) یہ ہماری قوم تو رب کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے۔ یہ لوگ ان کے معبود ہونے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ اب جب تم ان سے اور ان کے معبودانِ غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔ تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سر و سامان مہیا کر دے گا۔"

جس زمانے میں ان خدا پرست نوجوانوں کو آبادیوں سے بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی تھی، اس وقت شہر افسس ایشیائے کوچک میں بت پرستی اور جادوگری کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں ڈائنا دیوی کا ایک عظیم الشان مندر تھا جس کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور دُور دُور سے لوگ اس کی پوجا کے لیے آتے تھے۔ وہاں کے جادوگر، عامل، فال گیر اور تعویذ نویس دنیا بھر میں مشہور تھے۔ شام و فلسطین اور مصر تک ان کا کاروبار چلتا تھا اور اس کاروبار میں یہودیوں کا بھی اچھا خاصا حصہ تھا جو اپنے فن کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے (ملاحظہ ہو سائیکلو پیڈیا آف ببلیکل لٹریچر عنوان EPHESUS) شرک اور اوہام پرستی کے اس ماحول میں خدا پرستوں کا جو حال ہو رہا تھا اس کا اندازہ اصحاب کہف کے اس فقرے سے کیا جا سکتا ہے، کہ "اگر ان کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس ہمیں سنگسار ہی کر ڈالیں گے یا پھر زبردستی اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے"۔ (۲۹)

اس قرارداد باہمی کے مطابق یہ لوگ شہر سے نکل کر پہاڑوں کے درمیان ایک غار میں جا چھپے تاکہ سنگسار ہونے یا مجبوراً مرتد ہونے سے بچ سکیں۔ (تفہیم القرآن جلد سوم الکہف حاشیہ ۱۲)

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ

تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِىْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۝ (الکہف۔ آیت ۱۷)

ترجمہ: "تم انھیں غار میں دیکھتے تو تمھیں یوں نظر آتا کہ سورج جب نکلتا ہے تو ان کے غار کو چھوڑ کر دائیں جانب چڑھ جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بچ کر بائیں جانب اُتر جاتا ہے اور وہ ہیں کہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ میں پڑے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ بھٹکا دے اس کے لیے تم کوئی ولی مرشد نہیں پا سکتے۔"

ان کے غار کا دہانہ شمال کے رُخ تھا جس کی وجہ سے سورج کی روشنی کسی موسم میں بھی اندر نہ پہنچتی تھی اور باہر سے گزرنے والا یہ نہ دیکھ سکتا تھا کہ اندر کون ہے۔ ㊿

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ڰ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ڰ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۭ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا۔ (الکہف۔ آیت ۱۸)

ترجمہ: "تم انھیں دیکھ کر یہ سمجھتے کہ وہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سو رہے تھے۔ ہم انھیں دائیں بائیں کروٹ دلواتے رہتے تھے۔ اور ان کا کُتا غار کے دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اگر تم کہیں جھانک کر انھیں دیکھتے تو اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تم پر اُن کے نظارے سے دہشت بیٹھ جاتی۔"

یعنی اگر باہر سے کوئی جھانک کر دیکھتا بھی تو ان سات آدمیوں کے وقتاً فوقتاً کروٹیں لیتے رہنے کی وجہ سے وہ یہی گمان کرتا کہ یہ بس یونہی لیٹے ہوئے ہیں، سوئے ہوئے نہیں ہیں۔ (51)

یعنی پہاڑوں کے اندر ایک اندھیرے غار میں چند آدمیوں کا اس طرح موجود ہونا اور آگے کُتے کا بیٹھے ہونا ایک ایسا دہشت ناک منظر پیش کرتا کہ جھانکنے والے ان کو ڈاکو سمجھ کر بھاگ جاتے تھے، اور یہ ایک بڑا سبب تھا جس کی وجہ سے ان لوگوں کے حال پر اتنی مدت تک پردہ پڑا رہا۔ کسی کو یہ جرأت ہی نہ ہوئی کہ اندر جا کر کبھی اصل معاملے سے باخبر ہوتا۔ (52)

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ (الكهف ۔ ۱۹)

ترجمہ: "اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انھیں اٹھا بٹھایا تاکہ آپس میں پوچھ کچھ کریں۔"

یعنی جیسے عجیب طریقے سے وہ سلائے گئے تھے اور دنیا کو ان کے حال سے بے خبر رکھا گیا تھا، ویسا ہی عجیب کرشمۂ قدرت ان کا ایک طویل مدت کے بعد جاگنا بھی تھا۔ (۵۲)

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالُوْا رَبُّكُمْ
اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ
اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝
اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا
اِذًا اَبَدًا ۝ وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ
لَا رَيْبَ فِيْهَا ۔ (الكهف ۔ آيات ۱۹ تا ۲۱)

ترجمہ: "ان میں سے ایک نے پوچھا، کہو کتنی دیر اس حال میں رہے؟ دوسروں نے کہا، "شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہوں گے۔" پھر وہ بولے "اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا۔ چلو اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجیں۔ اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہاں سے وہ کچھ کھانے کے لیے لائے۔ اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو ہمارے یہاں ہونے سے خبردار کر بیٹھے۔ اگر کہیں ان لوگوں کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس سنگسار ہی کر ڈالیں گے۔ یا پھر زبردستی ہمیں اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے اور ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے۔ اسی طرح ہم نے اہلِ شہر کو ان کے حال پر مطلع کیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی بے شک آ کر رہے گی۔"

یعنی جب وہ شخص کھانا خریدنے کے لیے شہر گیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ بت پرست روم کو عیسائی ہوئے ایک مدت گزر چکی تھی۔ زبان، تہذیب، تمدن، لباس ہر چیز میں نمایاں فرق آ گیا تھا۔ دو سو برس پہلے کا یہ آدمی اپنی سج دھج، لباس، زبان ہر چیز کے اعتبار سے فوراً ایک تماشا بن گیا۔ اور جب اس نے قیصر ڈیسیس کے وقت کا سکہ کھانا خریدنے کے لیے پیش کیا تو دکاندار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سریانی روایت کی رو سے دکاندار کو اس پر شبہ یہ ہوا کہ شاید یہ کسی پرانے زمانے کا دفینہ نکال کر لایا ہے چنانچہ اس نے آس پاس کے لوگوں

کو اس طرف متوجہ کیا اور آخر کار اس شخص کو حکام کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں جا کر یہ معاملہ کھلا کہ یہ شخص اُن پیروانِ مسیح میں سے ہے جو دو سو برس پہلے اپنا ایمان بچانے کے لیے بھاگ نکلے تھے۔ یہ خبر آناً فاناً شہر کی عیسائی آبادی میں پھیل گئی اور حکام کے ساتھ لوگوں کا ایک ہجوم غار پر پہنچ گیا۔ اب جو اصحابِ کہف خبردار ہوئے کہ دو سو برس بعد سو کر اُٹھے تو وہ اپنے عیسائی بھائیوں کو سلام کر کے لیٹ گئے اور ان کی روح پرواز کر گئی۔ (۵۴)

اِذْ یَتَنَازَعُوْنَ بَیْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَیْهِمْ بُنْیَانًا (الکہف۔ آیت ۲۱)

ترجمہ: "(مگر ذرا خیال کرو کہ جب سوچنے کی اصل بات یہ تھی) اس وقت وہ آپس میں اس بات پر جھگڑ رہے تھے کہ اِن (اصحابِ کہف) کے ساتھ کیا کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا۔ "ان پر ایک دیوار چُن دو۔"

سریانی روایت کے مطابق اس زمانے میں وہاں قیامت اور عالمِ آخرت کے مسئلے پر زور و شور کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اگرچہ رومی سلطنت کے اثر سے عام لوگ مسیحیت قبول کر چکے تھے، جس کے بنیادی عقائد میں آخرت کا عقیدہ بھی شامل تھا، لیکن ابھی تک رومی شرک و بت پرستی اور یونانی فلسفے کے اثرات کافی طاقتور تھے جن کی بدولت بہت سے لوگ آخرت سے انکار، یا کم از کم اس کے ہونے میں شک کرتے تھے۔ پھر اس شک و انکار کو سب سے زیادہ جو چیز تقویت پہنچا رہی تھی وہ یہ تھی کہ افسس میں یہودیوں کی بہت بڑی آبادی تھی اور ان میں سے ایک فرقہ (جسے صدوقی کہا جاتا تھا) آخرت کا کھلم کھلا منکر تھا۔ یہ گروہ کتاب اللہ (یعنی توراۃ) سے آخرت کے انکار پر دلیل لاتا تھا اور مسیحی علماء کے پاس اس کے مقابلے میں مضبوط دلائل موجود نہ تھے۔ متی، مرقس، لوقا تینوں انجیلوں میں صدوقیوں اور مسیح علیہ السلام کے اس مناظرے کا ذکر ہمیں ملتا ہے جو آخرت کے مسئلے پر ہوا تھا، مگر تینوں نے مسیح علیہ السلام کی طرف سے ایسا کمزور جواب نقل کیا ہے جس کی کمزوری کو خود علمائے مسیحیت بھی تسلیم کرتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو متی باب ۲۲۔ آیت ۲۳ - ۳۳ - مرقس باب ۱۲ - آیت ۱۸ - ۲۷ - لوقا باب ۲۰ - آیت ۲۷ - ۴۰)

اسی وجہ سے منکرینِ آخرت کا پلّہ بھاری ہو رہا تھا اور مومنینِ آخرت بھی شک و تذبذب میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے۔ عین اس وقت اصحابِ کہف کے بعث کا یہ واقعہ پیش آیا اور اس نے بعث بعد الموت کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت بہم پہنچا دیا۔ (۵۵)

رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ (الکہف۔ آیت ۲۱)

ترجمہ: "ان کا رب ہی ان کے معاملے کو بہتر جانتا ہے۔"

نحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صالحین نصاریٰ کا قول تھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اصحابِ کہف جس غار میں لیٹے ہوئے ہیں اسی طرح انھیں لیٹا رہنے دو اور غار کے دہانے کو تیغا لگا دو، ان کا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں، کس مرتبے کے ہیں اور کس جزا کے مستحق ہیں۔ (۵۶)

قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا (الکہف-۲۱)

ترجمہ: "مگر جو لوگ ان کے معاملات پر غالب تھے انھوں نے کہا: "ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔"

اس سے مراد رومی سلطنت کے اربابِ اقتدار اور مسیحی کلیسا کے مذہبی پیشوا ہیں جن کے مقابلے میں صالح العقیدہ عیسائیوں کی بات نہ چلتی تھی۔ پانچویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے عام عیسائیوں میں اور خصوصاً رومن کیتھولک کلیسا میں شرک اور اولیاء پرستی اور قبر پرستی کا پورا زور ہو چکا تھا، بزرگوں کے آستانے پوجے جا رہے تھے، اور مسیح، مریم اور حواریوں کے مجسمے گرجوں میں رکھے جا رہے تھے۔ اصحابِ کہف کے بعث سے چند ہی سال پہلے ۴۳۱ء میں پوری عیسائی دنیا کے مذہبی پیشواؤں کی ایک کونسل اسی افسس کے مقام پر منعقد ہو چکی تھی جس میں مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور حضرت مریم کے "مادرِ خدا" ہونے کا عقیدہ چرچ کا سرکاری عقیدہ قرار پایا تھا۔ اس تاریخ کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سچے پیروانِ مسیح کے مقابلے میں اس وقت عیسائی عوام کے رہنما اور سربراہ کار بنے ہوئے تھے اور مذہبی و سیاسی امور کی باگیں جن کے ہاتھوں میں تھیں یہی لوگ دراصل شرک کے علمبردار تھے اور انھوں نے ہی فیصلہ کیا کہ اصحابِ کہف کا مقبرہ بنا کر اس کو عبادت گاہ بنایا جائے۔ (۵۷)

مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت کا بالکل الٹا مفہوم لیا ہے۔ وہ اسے دلیل ٹھہرا کر مقابرِ صلحاء پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن اُن کی گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی ان ظالموں کو بعث بعد الموت اور امکانِ آخرت کا یقین دلانے کے لیے دکھائی گئی تھی اسے انھوں نے ارتکابِ شرک کے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو، کچھ اور ولی پوجا پاٹ کے لیے ہاتھ آ گئے۔ پھر آخر اس آیت سے قبورِ صالحین پر مسجدیں بنانے کے لیے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اس کی نہی میں موجود ہیں:

لعن اللہ تعالیٰ زائرات القبور والمتخذین علیها المساجد والسرج۔ (احمد

ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، اور قبروں پر مسجدیں بنانے اور چراغ روشن کرنے والوں پر۔“

الا وان من کان قبلکم کانوا یتخذون قبور انبیاءہم مساجد فانی انھٰکم عن ذٰلک (مسلم)

ترجمہ: ”خبردار رہو، تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے، میں تمھیں اس حرکت سے منع کرتا ہوں۔“

لعن اللہ تعالیٰ الیھود والنصارٰی اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد (احمد، بخاری، مسلم، نسائی)

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی یہود اور نصاریٰ پر، انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔“

ان اولٰئک اذا کان فیھم الرجل الصالح فمات بنوا علی قبرہ مسجدا وصوروا فیہ تلک الصور اولٰئک شرار الخلق یوم القیامۃ (احمد، بخاری، مسلم، نسائی)

ترجمہ: ”ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ اگر ان میں کوئی مرد صالح ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر مسجدیں بناتے اور اس کی تصویریں تیار کرتے تھے۔ یہ قیامت کے روز بدترین مخلوقات ہوں گے“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تصریحات کی موجودگی میں کون خداترس آدمی یہ جرأت کر سکتا ہے کہ قرآن مجید میں عیسائی پادریوں اور رومی حکمرانوں کے جس گمراہانہ فعل کا حکایۃً ذکر کیا گیا ہے اس کو ٹھیک وہی فعل کرنے کے لیے دلیل و حجت ٹھہرائے؟

اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بھی خالی از فائدہ نہیں کہ ۱۸۳۴ء میں ایوانڈٹی ارنڈیل (ARUNDELL) نے ”ایشیائے کوچک کے اکتشافات“ (DISCOVERIES IN ASIA MINOR) کے نام سے اپنے جو شاہدات شائع کیے تھے ان میں وہ بتاتا ہے کہ قدیم شہر افسس کے کھنڈرات سے متصل ایک پہاڑی پر اس نے حضرت مریم اور ”سات لڑکوں“ (یعنی اصحاب کہف) کے مقبروں کے آثار پائے ہیں۔ (۵۸)

سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَۃٌ رَّابِعُھُمْ کَلْبُھُمْ وَیَقُوْلُوْنَ خَمْسَۃٌ سَادِسُھُمْ کَلْبُھُمْ رَجْمًا

بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ (الکہف - ۲۲)

ترجمہ: "کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کے پونے تین سو سال بعد، نزولِ قرآن کے زمانے میں اس کی تفصیلات کے متعلق مختلف افسانے عیسائیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور عموماً مستند معلومات لوگوں کے پاس موجود نہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ پریس کا زمانہ نہ تھا کہ جن کتابوں میں اس کے متعلق نسبتاً زیادہ صحیح معلومات درج تھیں وہ عام طور پر شائع ہوتیں۔ واقعات زیادہ تر زبانی روایات کے ذریعے سے پھیلتے تھے، اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان کی بہت سی تفصیلات افسانہ بنتی چلی جاتی تھیں۔ تاہم چونکہ تیسرے قول کی تردید اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی ہے اس لیے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ صحیح تعداد سات ہی تھی۔ (۵۹)

قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا (الکہف - آیت ۲۲)

ترجمہ: "کہو، میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔ پس تم سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو، اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو۔"

مطلب یہ ہے کہ اصل چیز ان کی تعداد نہیں ہے بلکہ اصل چیز وہ سبق ہیں جو اس قصے سے ملتے ہیں۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک سچے مومن کو کسی حال میں حق سے موڑنے اور باطل کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہونا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مومن کا اعتماد اسبابِ دنیا پر نہیں بلکہ اللہ پر ہونا چاہیے، اور حق پرستی کے لیے بظاہر ماحول میں کسی سازگاری کے آثار نظر نہ آتے ہوں تب بھی اللہ کے بھروسے پر راہِ حق میں قدم اٹھا دینا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جس "عادتِ جاریہ" کو لوگ "قانونِ فطرت" سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس قانون کے خلاف دنیا میں کچھ نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ درحقیقت اس کا پابند نہیں ہے، وہ جب اور جہاں چاہے اس عادت کو بدل کر جو غیر معمولی کام بھی کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اس کے لیے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے کہ کسی کو دو سو برس تک سُلا کر اس طرح اٹھا بٹھائے جیسے وہ چند گھنٹے سویا ہے، اور اس کی عمر، شکل، صورت،

لباس، تندرستی، غرض کسی چیز پر بھی اس امتدادِ زمانہ کا کچھ اثر نہ ہو۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ نوعِ انسانی کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو یک وقت زندہ کر کے اُٹھا دینا، جس کی خبر انبیاء اور کُتبِ آسمانی نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ جاہل انسان کس طرح ہر زمانے میں اللہ کی نشانیوں کو اپنے لیے سُرمۂ چشمِ بصیرت بنانے کے بجائے الٹا مزید گمراہی کا سامان بناتے رہے ہیں۔ اصحابِ کہف کا جو معجزہ اللہ نے اس لیے دکھایا تھا کہ لوگ اس سے آخرت کا یقین حاصل کریں، ٹھیک اسی نشان کو انھوں نے یہ سمجھا کہ اللہ نے انھیں اپنے کچھ اور ولی پوجنے کے لیے عطا کر دیے —— یہ ہیں وہ سبق جو آدمی کو اس قصے سے لینے چاہئیں اور اس میں توجہ کے قابل یہی امور ہیں۔ ان سے توجہ ہٹا کر اس کھوج میں لگ جانا کہ اصحابِ کہف کتنے تھے اور کتنے نہ تھے، اور ان کے نام کیا کیا تھے، اور اُن کا کُتا کس رنگ کا تھا، یہ ان لوگوں کا کام ہے جو مغز کو چھوڑ کر صرف چھلکوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے اہلِ ایمان کو یہ تعلیم دی کہ اگر دوسرے لوگ اس طرح کی غیر متعلق بحثیں چھیڑیں بھی تو تم اُن سے نہ اُلجھو، نہ ایسے سوالات کی تحقیق میں اپنا وقت ضائع کرو، بلکہ اپنی توجہ صرف کام کی بات پر مرکوز رکھو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی صحیح تعداد بیان نہیں فرمائی تاکہ شوقِ فضول رکھنے والوں کو غذا نہ ملے۔ (٦٠)

ابھی ہجرتِ حبشہ واقع نہ ہوئی تھی۔ اس وقت جو مسلمان ستائے جا رہے تھے ان کو اصحابِ کہف کا قِصہ سنایا گیا تاکہ ان کی ہِمّت بلند رہے اور انھیں معلوم ہو کہ اہلِ ایمان اپنا ایمان بچانے کے لیے اس سے پہلے کیا کچھ کر چکے ہیں۔

اصحابِ کہف کے متعلق بتایا کہ وہ اسی توحید کے قائل تھے جس کی دعوت یہ قرآن پیش کر رہا ہے، اور ان کا حال مکے کے مٹھی بھر مظلوم مسلمانوں کے حال سے اور ان کی قوم کا رویّہ کفارِ قریش کے رویّے سے کچھ مختلف نہ تھا۔ پھر اسی قصے سے اہلِ ایمان کو یہ سبق دیا گیا کہ اگر کفار کا غلبہ بے پناہ ہو اور ایک مومن کو ظالم معاشرے میں سانس لینے تک کی مُہلت نہ دی جا رہی ہو، تب بھی اس کو باطل کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے۔ بلکہ اللہ کے بھروسے پر تن بتقدیر نکل جانا چاہیے۔ اسی سلسلے میں ضمناً کفارِ مکہ کو یہ بھی بتایا کہ اصحابِ کہف کا قِصہ عقیدۂ آخرت کی صحت کا ایک ثبوت ہے۔ جس طرح خدا نے اصحابِ کہف کو ایک مُدّت دراز تک موت کی نیند سلانے کے بعد پھر جِلا اٹھایا اُسی طرح اس کی قدرت سے وہ بُعث بعد الموت بھی کچھ بعید نہیں ہے جسے

ماننے سے تم انکار کر رہے ہو۔ (٦١)

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف-٢٩)

ترجمہ: "صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔"

یہاں پہنچ کر صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ اصحابِ کہف کا قصہ سنانے کے بعد یہ فقرے کس مناسبت سے ارشاد ہوئے ہیں۔ اصحابِ کہف کے جو واقعات اوپر بیان ہوئے ہیں ان میں یہ بتایا گیا تھا کہ توحید پر ایمان لانے کے بعد انھوں نے کس طرح اُٹھ کر دو ٹوک بات کہہ دی کہ "ہمارا رب تو بس وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔" اور پھر کس طرح وہ اپنی گمراہ قوم سے کسی قسم کی مصالحت پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ انھوں نے پورے عزم کے ساتھ کہا کہ "ہم اُس کے سوا کسی دوسرے اِلٰہ کو نہ پکاریں گے، اگر ہم ایسا کریں تو بڑی بے جا بات کریں گے اور کس طرح انھوں نے اپنی قوم اور اس کے معبودوں کو چھوڑ کر بغیر کسی سہارے اور بغیر کسی سر و سامان کے ایک غار میں جا پڑنا قبول کر لیا، مگر یہ گوارا نہ کیا کہ حق سے بال برابر بھی ہٹ کر اپنی قوم سے مصالحت کر لیتے۔ پھر جب وہ بیدار ہوئے تب بھی انھیں فکر ہوئی تو اس بات کی کہ اگر خدا نخواستہ ہماری قوم ہم کو اپنی ملت کی طرف پھیرے جانے میں کامیاب ہو گئی تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے۔ (٦٢)

فصل ۲

یمن پر عیسائیت کا تسلط اور واقعۂ فیل

حبش کی عیسائی سلطنت کا یمن پر حملہ

نجران میں یمن کے یہودی فرمانروا ذونواس نے پیروانِ مسیح علیہ السلام پر جو ظلم کیا تھا اس کا بدلہ لینے کے لیے حبش کی عیسائی سلطنت نے یمن پر حملہ کر کے حمیری حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور ۵۲۵ء میں اس پورے علاقے پر حبشی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ یہ ساری کارروائی دراصل قسطنطنیہ کی رومی سلطنت اور حبش کی حکومت کے باہم تعاون سے ہوئی تھی، کیونکہ حبشیوں کے پاس اس زمانے میں کوئی قابلِ ذکر بحری بیڑا نہ تھا۔ بیڑا رومیوں نے فراہم کیا اور حبش نے اپنی ۷۰ ہزار فوج اسی کے ذریعہ سے یمن کے ساحل پر اتاری۔ آگے کے معاملات سمجھنے کے لیے یہ بات ابتدا ہی میں جان لینی چاہیے کہ یہ سب کچھ مذہبی جذبے سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے پیچھے معاشی و سیاسی اغراض بھی کام کر رہی تھیں، بلکہ غالباً وہی اس کی اصل محرک تھیں اور عیسائی مظلومین کے خون کا انتقام ایک بہانے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ رومی سلطنت جب سے مصر و شام پر قابض ہوئی تھی۔ اسی وقت سے اس کی یہ کوشش تھی کہ مشرقی افریقہ، ہندوستان، انڈونیشیا وغیرہ ممالک اور رومی مقبوضات کے درمیان جس تجارت پر عرب صدیوں سے قابض چلے آ رہے تھے، اسے عربوں کے قبضے سے نکال کر وہ خود اپنے قبضے میں لے لیں تاکہ اس کے منافع پورے کے پورے اسی کو حاصل ہوں۔ اور عرب تاجروں کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے۔ اس مقصد کے لیے ۲۴ء یا ۲۵ء قبل مسیح میں قیصر آگسٹس نے ایک بڑی فوج رومی جنرل ایلیس گالوس (AELIUS GALLUS) کی قیادت میں عرب کے مغربی ساحل پر اتار دی تھی۔ تاکہ وہ اس بحری راستے پر قابض ہو جائے جو جنوبی عرب سے شام کی طرف جاتا تھا لیکن عرب کے شدید جغرافیائی حالات نے اس مہم کو ناکام کر دیا۔ اس کے بعد رومی اپنا جنگی بیڑہ بحر احمر میں لے آئے اور انھوں نے عربوں کی اس تجارت کو ختم کر دیا جو وہ سمندر کے راستے کرتے تھے، اور صرف

برّی راستہ ان کے لیے باقی رہ گیا۔ اسی برّی راستے کو قبضے میں لینے کے لیے انھوں نے حبش کی عیسائی حکومت سے گٹھ جوڑ کیا اور بحری بیڑے سے اُس کی مدد کر کے اُس کو یمن پر قابض کرا دیا۔

اَبرَہَہ یمن کے اقتدار پر کیسے قابض ہوا؟

یمن پر جو حبشی فوج حملہ آور ہوئی تھی، اس کے متعلق عرب مؤرخین کے بیانات مختلف ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ وہ دو امیروں کی قیادت میں تھی، ایک اَریاط اور دوسرا اَبرَہَہ اور محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس فوج کا امیر اریاط تھا، اور اَبرَہَہ اس میں شامل تھا۔ پھر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اَبرَہَہ اور اریاط باہم لڑ پڑے، مقابلے میں اَریاط مارا گیا، اَبرَہَہ ملک پر قابض ہو گیا اور پھر اُس نے شاہِ حبش کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اسی کو یمن پر اپنا نائب مقرر کر دے۔ اس کے برعکس یونانی اور سُریانی مؤرخین کا بیان ہے کہ فتح یمن کے بعد جب حبشیوں نے مزاحمت کرنے والے یمنی سرداروں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دیا تو ان میں سے ایک سردار السُّمَیفَع اَشوَع (جسے یونانی مؤرخین (ESYMPHAEUS) لکھتے ہیں)، نے حبشیوں کی اطاعت قبول کر کے اور جزیہ ادا کرنے کا عہد کر کے شاہِ حبش سے یمن کی گورنری کا پروانہ حاصل کر لیا۔ لیکن حبشی فوج نے اس کے خلاف بغاوت کر دی، اور اَبرَہَہ کو اس کی جگہ گورنر بنا دیا۔ یہ شخص حبش کی بندرگاہ اَدَولیس کے ایک یونانی تاجر کا غلام تھا جو اپنی ہوشیاری سے یمن پر قبضہ کرنے والی حبشی فوج میں بڑا اثر و رسوخ حاصل کر گیا تھا۔ شاہِ حبش نے اس کی سرکوبی کے لیے جو فوجیں بھیجیں وہ یا اس سے مل گئیں یا اس نے ان کو شکست دے دی۔ آخر کار شاہِ حبش کے مرنے کے بعد اس کے جانشین نے اس کو یمن پر اپنا نائب السلطنت تسلیم کر لیا (یونانی مؤرخین اس کا نام اَبرامس (ABRAMES) اور سُریانی مؤرخین ابراہام (ABRAHAM) لکھتے ہیں۔ اَبرَہَہ غالباً اسی کا حبشی تلفُّظ ہے۔ کیونکہ عربی میں تو اس کا تلفّظ ابراہیم ہے

یہ شخص آہستہ آہستہ یمن کا خود مختار بادشاہ بن گیا، مگر برائے نام اس نے شاہِ حبش کی بالادستی تسلیم کر رکھی تھی اور اپنے آپ کو مفوَّض الملک (نائبِ شاہ) لکھتا تھا۔ اُس نے جو اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جب ۵۴۳ء میں وہ سدِّ مآرب کی مرمّت سے فارغ ہوا تو اس نے ایک عظیم الشّان جشن منایا۔ جس میں قیصرِ روم، شاہِ ایران، شاہِ حیرہ اور شاہِ غسّان کے سفرا شریک ہوئے۔ اس کا مفصّل تذکرہ اس کتبے میں درج ہے جو اَبرَہَہ نے سدِّ مآرب پر لگایا تھا۔ یہ کتبہ آج بھی موجود

ہے اور گلیزر (GLASER) نے اس کو نقل کیا ہے۔

بلادِ عرب پر سیاسی، تجارتی اور مذہبی مہم

یمن میں پوری طرح اپنا اقتدار مضبوط کر لینے کے بعد اَبْرَہہ نے اُس مقصد کے لیے کام شروع کر دیا جو اس مہم کی ابتدا سے رومی سلطنت اور اس کے حلیف حبشی عیسائیوں کے پیشِ نظر تھا، یعنی ایک طرف عرب میں عیسائیت پھیلانا اور دوسری طرف اُس تجارت پر قبضہ کرنا جو بلادِ مشرق اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ یہ ضرورت اس بنا پر اور بڑھ گئی تھی کہ ایران کی ساسانی سلطنت کے ساتھ روم کی کشمکشِ اقتدار نے بلادِ مشرق سے رومی تجارت کے دوسرے تمام راستے بند کر دیے تھے۔

اَبْرَہہ نے اس مقصد کے لیے یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا، جس کا ذکر عرب مؤرخین نے اَلْقَلِیس یا اَلْقُلَّیْس کے نام سے کیا ہے (یہ یونانی لفظ EKKLESIA کا معرب ہے اور اُردو کا لفظ کلیسا بھی اسی یونانی لفظ سے ماخوذ ہے) محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس کام کی تکمیل کے بعد اس نے شاہِ حبش کو لکھا کہ میں عربوں کا حج کعبہ سے اس کلیسا کی طرف موڑے بغیر نہ رہوں گا[1]۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس نے یمن میں علی الاعلان اپنے اس ارادے کا اظہار کیا اور اس کی منادی کرا دی۔ اس کی اس حرکت کا مقصد ہمارے نزدیک یہ تھا کہ عربوں کو غصہ دلائے تاکہ وہ کوئی ایسی کارروائی کریں جس سے اس کو مکہ پر حملہ کرنے اور کعبے کو منہدم کر دینے کا بہانہ مل جائے۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ اُس کے اس اعلان پر غضبناک ہو کر ایک عرب نے کسی نہ کسی طرح کلیسا میں گھُس کر رفع حاجت کر ڈالی۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ فعل ایک قریشی نے کیا تھا۔ اور مُقاتِل بن سلیمان کی روایت ہے کہ قریش کے بعض نوجوانوں نے جا کر اس کلیسا میں آگ لگا دی تھی۔ ان میں سے کوئی واقعہ بھی اگر پیش آیا ہو تو کوئی قابلِ تعجب امر نہیں ہے، کیونکہ اَبْرَہہ کا یہ اعلان یقیناً سخت اشتعال انگیز تھا اور قدیم جاہلیت کے دَور میں اس پر کسی عرب یا قریشی کا، یا چند قریشی نوجوانوں کا مشتعل ہو کر کلیسا کو گندا کر دینا یا اس میں آگ لگا دینا کوئی ناقابلِ فہم بات نہیں ہے لیکن

---

[1] یمن پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد عیسائیوں کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ کعبہ کے مقابلے میں ایک دوسرا کعبہ بنائیں اور عرب میں اس کی مرکزیت قائم کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے نجران میں بھی ایک کعبہ بنایا تھا

یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ اَبرَہہ نے خود اپنے کسی آدمی سے خفیہ طور پر ایسی کوئی حرکت کرائی ہو تاکہ اُسے مکہ پر چڑھائی کرنے کا بہانہ مل جائے۔ اور اس طرح وہ قریش کو تباہ اور تمام اہلِ عرب کو مرعوب کر کے اپنے دونوں مقصد حاصل کر لے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، جب اَبرَہہ کے پاس یہ رپورٹ پہنچی کہ کعبے کے معتقدین نے اس کے کلیسا کی یہ توہین کی ہے تو اس نے قسم کھائی کہ میں اس وقت چین نہ لوں گا جب تک کعبے کو ڈھا نہ دوں۔

کعبہ پر اَبرَہہ کی فوج کشی

اس کے بعد ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں ۶۰ ہزار فوج اور ۱۳ ہاتھی (اور بروایت بعض ۹۰ ہاتھی) لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں پہلے یمن کے ایک سردار ذُو نَفر نے عربوں کا ایک لشکر جمع کر کے اس کی مزاحمت کی، مگر وہ شکست کھا کر گرفتار ہو گیا۔ اور اس نے اپنی جان بچانے کے لیے بدرقے کی خدمت انجام دینا قبول کر لیا۔ طائف کے قریب پہنچا تو بنی ثقیف نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی طاقت کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے، اور ان کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ ان کے معبود لات کا مندر بھی تباہ نہ کر دے۔ چنانچہ اُن کا سردار مسعود ایک وفد لے کر اَبرَہہ سے ملا اور اس نے کہا کہ ہمارا بتکدہ وہ معبد نہیں ہے جسے آپ ڈھانے آئے ہیں، وہ تو مکہ میں ہے، اس لیے آپ ہمارے معبد کو چھوڑ دیں۔ ہم مکہ کا راستہ بتانے کے لیے آپ کو بدرقہ فراہم کیے دیتے ہیں۔ اَبرَہہ نے یہ بات قبول کر لی اور بنی ثقیف نے ابو رغال نامی ایک آدمی کو اس کے ساتھ کر دیا۔ جب مکہ تین کوس رہ گیا تو المُغَمّس (یا المُغَمِّس) نامی مقام پر پہنچ کر ابو رغال مر گیا اور عرب مدتوں تک اس کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے۔ بنی ثقیف کو بھی وہ سالہا سال تک طعنے دیتے رہے کہ انھوں نے لات کے مندر کو بچانے کے لیے بیت اللہ پر حملہ کرنے والوں سے تعاون کیا۔

اہلِ مکہ کا جوابی طرزِ عمل

محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ المغمس سے اَبرَہہ نے اپنے مقدمۃ الجیش کو آگے بڑھایا اور وہ اہلِ تہامہ اور قریش کے بہت سے مویشی لوٹ لے گیا جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے بھی دو سو اونٹ تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک ایلچی کو مکہ بھیجا۔ اور اس کے ذریعہ سے اہلِ مکہ کو یہ پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا ہوں بلکہ اس گھر (کعبہ) کو ڈھانے آیا ہوں۔ اگر تم نہ لڑو تو میں تمہاری جان و مال سے کوئی تعرض نہ کروں گا۔ نیز اس نے اپنے ایلچی کو ہدایت کی کہ اہلِ مکہ اگر بات کرنا چاہیں تو ان کے سردار

کو میرے پاس لے آنا۔ مکے کے سب سے بڑے سردار اس وقت عبدالمطلب تھے۔ ایلچی نے ان سے مل کر ابرہہ کا پیغام پہنچایا۔ انھوں نے کہا کہ ہم میں ابرہہ سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے، یہ اللہ کا گھر ہے، وہ چاہے گا تو اپنے گھر کو بچا لے گا۔ ایلچی نے کہا کہ آپ میرے ساتھ ابرہہ کے پاس چلیں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے اور اس کے ساتھ چلے گئے۔ وہ اس قدر وجیہ اور شاندار شخص تھے کہ ان کو دیکھ کر ابرہہ بہت متأثر ہوا اور اپنے تخت سے اُتر کر اُن کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے جو اونٹ پکڑ لیے گئے ہیں وہ مجھے واپس دے دیے جائیں۔ ابرہہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو میں بہت متأثر ہوا تھا، مگر آپ کی اس بات نے آپ کو میری نظر سے گرا دیا کہ آپ اپنے اونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ گھر جو آپ کا اور آپ کے دینِ آبائی کا مرجع ہے، اُس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ انھوں نے کہا میں تو صرف اپنے اونٹوں کا مالک ہوں اور انہی کے بارے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ رہا یہ گھر، تو اس کا مالک ایک رب ہے، وہ اس کی خود حفاظت کرے گا۔ ابرہہ نے جواب دیا وہ اس کو مجھ سے نہ بچا سکے گا۔ عبدالمطلب نے کہا۔ آپ جانیں اور وہ جانے۔ یہ کہہ کر وہ ابرہہ کے پاس سے اُٹھ آئے اور اس نے ان کے اونٹ واپس کر دیے۔

ابن عباسؓ کی روایت اس سے مختلف ہے۔ اس میں اونٹوں کے مطالبے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ عَبد بن حُمید، ابن المنذر، ابن مُردویہ، حاکم، ابو نعیم اور بَیہقی نے ان سے جو روایات نقل کی ہیں ان میں وہ بیان کرتے ہیں کہ جب اَبرہہ الصِّفاح کے مقام پر پہنچا (جو عرفات اور طائف کے پہاڑوں کے درمیان حدودِ حرم کے قریب واقع ہے) تو عبدالمطلب خود اس کے پاس گئے اور اس سے کہا آپ کو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کو اگر کوئی چیز مطلوب تھی تو ہمیں کہلا بھیجتے، ہم خود لے کر آپ کے پاس حاضر ہو جاتے۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے یہ گھر امن کا گھر ہے، میں اس کا امن ختم کرنے آیا ہوں۔ عبدالمطلب نے کہا یہ اللہ کا گھر ہے، آج تک اُس نے کسی کو اس پر مسلط نہیں ہونے دیا ہے۔ اَبرہہ نے جواب دیا ہم اسے مُنہدم کیے بغیر نہ پلٹیں گے۔ عبدالمطلب نے کہا آپ جو کچھ ہم سے چاہیں لے لیں اور واپس چلے جائیں مگر اَبرہہ نے انکار کر دیا اور عبدالمطلب کو پیچھے چھوڑ کر اپنے لشکر آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

دونوں روایتوں کے اس اختلاف کو اگر ہم اپنی جگہ رہنے دیں اور کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیں، تو ان میں سے جو صورت بھی پیش آئی ہو، بہرحال یہ امر بالکل واضح ہے کہ مکّہ اور اس کے آس پاس کے قبائل اتنی بڑی فوج سے لڑ کر کعبے کو بچانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے یہ بالکل قابلِ فہم بات ہے کہ قریش نے اس کی

مزاحمت کی کوئی کوشش نہ کی۔ قریش کے لوگ تو جنگ احزاب کے موقع پر مشرک اور یہودی قبائل کو ساتھ ملا کر زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار کی جمعیت فراہم کر سکے تھے وہ ۶۰ ہزار فوج مقابلہ کیسے کر سکتے تھے،

محمد بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ ابرہہ کی لشکرگاہ سے واپس آکر عبد المطلب نے قریش والوں سے کہا کہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جائیں تاکہ ان کا قتل عام نہ ہو جائے۔ پھر وہ اور قریش کے چند سردار حرم میں داخل ہوئے اور کعبے کے دروازے کا کنڈا پکڑ کر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اس وقت خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بُت موجود تھے۔ مگر یہ لوگ اس نازک گھڑی میں ان سب کو بھول گئے اور انھوں نے صرف اللہ کے آگے دستِ سوال پھیلایا۔ ان کی جو دُعائیں تاریخوں میں منقول ہوئی ہیں ان میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ ابن ہشام نے سیرت میں عبد المطلب کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں:

لاھمّ ان العبد یمنع رحلہ فامنع حلالک
خدایا! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما
لا یغلبنّ صلیبھم ومحالھم غدوًا محالکُ
کل ان کی صلیب اور ان کی تدبیر تیری تدبیر کے مقابلے میں غالب نہ آنے پائے
ان کنت تارکھم وقبلتنا فامر ما بدا لک
اگر تو ان کو اور ہمارے قبلے کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہے تو جو تو چاہے کر

سُہیلی نے روض الاُنُف میں اس سلسلے کا یہ شعر بھی نقل کیا۔

وانصر علی آل الصلیب وعابدیہ الیوم آلک
صلیب کی آل اور اس کے پرستاروں کے مقابلے میں آج اپنی آل کی مدد فرما

ابن جریر نے عبد المطلب کے یہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جو اس موقع پر دعا مانگتے ہوئے انھوں نے پڑھے تھے۔

یارب لا ارجو لھم سواکا یارب فامنع منھم حماکا
اے میرے رب تیرے سوا میں ان کے مقابلے میں کسی سے امید نہیں رکھتا۔ اے میرے رب ان سے اپنے حرم کی حفاظت کر
انّ عدوّ البیت من عاداکا امنعھم ان یخربوا قراکا
اس گھر کا دشمن تیرا دشمن ہے۔ اپنی بستی کو تباہ کرنے سے ان کو روک

حفاظتِ کعبہ کے لیے خدائی انتظامات

یہ دعائیں مانگ کر عبدالمطلب اور ان کے ساتھی پہاڑوں میں چلے گئے۔

اور دوسرے روز ابرہہ مکے میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا، مگر اس کا خاص ہاتھی محمود جو آگے آگے تھا، یکایک بیٹھ گیا۔ اس کو بہت تبر مارے گئے، آنکسوں سے کچوکے دیے گئے، یہاں تک کہ اسے زخمی کر دیا گیا، مگر وہ نہ ہلا۔ اسے جنوب، شمال اور مشرق کی طرف موڑ کر چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ دوڑنے لگتا۔ مگر مکے کی طرف موڑا جاتا تو وہ فوراً بیٹھ جاتا اور کسی طرح آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اتنے میں پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے آئے اور انھوں نے اس لشکر پر ان سنگریزوں کی بارش کر دی۔ جس پر بھی یہ کنکر گرتے اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا۔ محمد بن اسحاق اور عکرمہ کی روایت ہے کہ یہ چیچک کا مرض تھا اور بلادِ عرب میں سب سے پہلے چیچک اسی سال دیکھی گئی۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ جس پر کوئی کنکری گرتی اسے سخت کھجلی لاحق ہو جاتی اور کھجاتے ہی جلد پھٹ جاتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا۔ ابنِ عباسؓ کی دوسری روایت یہ ہے کہ گوشت اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا اور ہڈیاں نکل آتی تھیں۔ خود ابرہہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا اور جہاں سے کوئی ٹکڑا گرتا وہاں سے پیپ اور لہو بہنے لگتا۔ افراتفری میں ان لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ نُفَیل بن حبیب خثعمی کو جسے یہ لوگ بدرقہ بنا کر بلادِ خثعم سے پکڑ لائے تھے، تلاش کر کے انھوں نے کہا کہ واپسی کا راستہ بتائے مگر اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا:

این المفر والالٰه الطّالب   والاشرم المغلوب لیس الغالب

اب بھاگنے کی جگہ کہاں ہے جبکہ خدا تعاقب کر رہا ہے، اور نکٹا (ابرہہ) مغلوب ہے، غالب نہیں ہے۔

اس بھگدڑ میں جگہ جگہ یہ لوگ گر گر کر مرتے رہے۔ عطاء بن یَسار کی روایت ہے کہ سب کے سب اسی وقت ہلاک نہیں ہو گئے، بلکہ کچھ تو وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے بھر گرتے چلے گئے۔ ابرہہ بھی بلادِ خثعم پہنچ کر مرا۔[1]

---

[1] اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو صرف یہی سزا دینے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ تین چار سال کے اندر یمن سے حبشی اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ فیل کے بعد یمن میں ان کی طاقت بالکل ٹوٹ گئی۔ جگہ جگہ یمنی سردار علمِ بغاوت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر ایک یمنی سردار سیف بن ذی یزن نے شاہِ ایران سے فوجی مدد طلب کی اور ایران کی طرف سے ایک ہزار فوج جو چھ جہازوں کے ساتھ آئی تھی، حبشی حکومت کا خاتمہ کر دینے کے لیے کافی ہو گئی۔ یہ ۵۷۵ء کا واقعہ ہے۔

یہ واقعہ مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان وادیٔ مُحَصَّب کے قریب مُحَسِّر کے مقام پر پیش آیا تھا۔ صحیح مسلم اور ابوداؤد کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کا جو قصہ امام جعفر صادق نے اپنے والد ماجد امام محمد باقر سے اور انھوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے اس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مُزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلے تو مُحَسِّر کی وادی میں آپ نے رفتار تیز کردی۔ امام نُووی اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصحاب الفیل کا واقعہ اسی جگہ پیش آیا تھا اسی لیے سنت یہی ہے کہ آدمی یہاں سے جلدی گُزر جائے۔ موطا میں امام مالک روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مُزدلفہ پورے کا پورا ٹھہرنے کا مقام ہے، مگر مُحَسِّر کی وادی میں نہ ٹھہرا جائے۔

اس واقعہ کے متعلق ادباءِ عرب کی شہادتیں

نُفَیل بن حُبَیب کے جو اشعار ابنِ اسحاق نے نقل کیے ہیں ان میں وہ اس واقعہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے:

ردینة لو رأیت ولا تریه
لدی جنب المحصب ما رأینا

اے رُدینہ کاش تو دیکھتی، اور تو نہیں دیکھ سکے گی، جو کچھ ہم نے وادیٔ محصب کے قریب دیکھا۔

حمدت اللّٰه اذ ابصرت طیراً
وخفت حجارة تلقی علینا

میں نے اللہ کا شکر کیا جب میں نے پرندوں کو دیکھا اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں پتھر ہم پر نہ آ پڑیں۔

وکل القوم یسأل عن نفیل
کأن علیّ للحبشان دینا

ان لوگوں میں سے ہر ایک نُفَیل کو ڈھونڈھ رہا تھا، گویا کہ میرے اوپر حبشیوں کا کوئی قرض آتا تھا۔

یہ اتنا بڑا واقعہ تھا جس کی تمام عرب میں شُہرت ہوگئی اور اس پر بہت سے شعراء نے قصائد کہے۔ ان قصائد میں یہ بات بالکل نمایاں ہے کہ سب نے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعجاز قرار دیا اور کہیں اشارۃً وکنایۃً بھی یہ نہیں کہا کہ اس میں ان بتوں کا بھی کوئی دخل تھا۔ جو کعبہ میں پوجے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر عبداللہ ابن الزِّبَعری کہتا ہے:

سِتّون الفاً لم یؤبوا ارضهم
ولم یعش بعد الایاب سقیمها

ساٹھ ہزار تھے جو اپنی سرزمین کی طرف واپس نہ جا سکے، اور نہ واپس ہونے کے بعد ان کا بیمار (ابرہہ) زندہ رہا۔

کانت بها عاد وجرهم قبلهم   والله من فوق العباد یقیمها

یہاں ان سے پہلے عاد اور جرہم تھے۔ اور اللہ بندوں کے اوپر موجود ہے جو اسے قائم رکھے ہوئے ہے

ابو قیس بن اسلت کہتا ہے:

فقوموا فصلوا ربکم وتمسحوا   بارکان هذا البیت بین الاخاشب

اٹھو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور مکہ و منیٰ کی پہاڑیوں کے درمیان بیت اللہ کے کونوں کو مسح کرو۔

فلما اتاکم نصر ذی العرش ردهم   جنود الملیك بین ساف وحاصب

جب عرش والے کی مدد تمہیں پہنچی تو اس بادشاہ کے لشکروں نے ان لوگوں کو اس حال میں پھیر دیا کہ کوئی خاک میں پڑا تھا اور کوئی سنگسار کیا ہوا تھا۔

واقعہ کے متعلق اہم روایات

یہی نہیں بلکہ حضرت امِ ہانیؓ، اور حضرت زُبیر بن عوّامؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قریش نے ۱۰ سال اور بروایتِ بعض سات سال تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ امِ ہانی کی روایت امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں اور طبرانی، حاکم، ابن مردُویہ اور بیہقی نے اپنی کتبِ حدیث میں نقل کی ہے۔ حضرت زبیرؓ کا بیان طبرانی اور ابن مردُویہ اور ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔ اور اس کی تائید مزید حضرت سعید بن المسیب کی اس مرسل روایت سے ہوتی ہے جو خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں درج کی ہے۔

سرورِ عالم کی ولادتِ مبارکہ

جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اہلِ عرب اسے عام الفیل (ہاتھیوں کا سال) کہتے ہیں، اور اسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ ہوئی۔ محدثین اور مؤرخین کا اس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ اصحاب الفیل کا واقعہ محرم میں پیش آیا تھا اور حضورؐ کی ولادت ربیع الاوّل میں ہوئی تھی۔ اکثریت یہ کہتی ہے کہ آپ کی ولادت واقعہ فیل کے پچاس دن بعد ہوئی۔

قرآن میں اس واقعہ کا اجمالی تذکرہ کس لیے؟

جو تاریخی تفصیلات اوپر درج کی گئی ہیں ان کو نگاہ میں رکھ کر سورۂ فیل پر غور کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس سورہ میں اس قدر اختصار کے ساتھ صرف اصحاب الفیل پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا

ذکر کر دینے پر کیوں اکتفا کیا گیا ہے۔ واقعہ کچھ بہت پرانا نہ تھا۔ مکے کا بچہ بچہ اس کو جانتا تھا۔ عرب کے لوگ عام طور پر اس سے واقف تھے۔ تمام اہلِ عرب اس بات کے قائل تھے کہ اَبْرَہَہ کے اس حملے سے کعبہ کی حفاظت کسی دیوی یا دیوتا نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ اللہ ہی سے قریش کے سرداروں نے مدد کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ اور چند سال تک قریش کے لوگ اس واقعہ سے اس قدر متاثر رہے تھے کہ انھوں نے اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی تھی۔ اس لیے سورۂ فیل میں ان تفصیلات کے ذکر کی حاجت نہ تھی، بلکہ صرف اس واقعے کو یاد دلانا کافی تھا، تاکہ قریش کے لوگ خصوصاً، اور اہلِ عرب عموماً اپنے دلوں میں اس بات پر غور کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی دعوت دے رہے ہیں وہ آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمام معبودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جائے، نیز وہ یہ بھی سوچ لیں کہ اگر اس دعوتِ حق کو دبانے کے لیے انھوں نے زور زبردستی سے کام لیا تو جس عذاب نے اصحاب الفیل کا تہس نہس کیا تھا اسی کے غضب میں وہ گرفتار ہوں گے۔ (۶۳)

باب ٦

بائیبل میں نبی آخرالزّماں کی پیشینگوئیاں

فصل ۱

حضرت موسیٰؑ کی زبان سے بشارت

قرآن کا اشارہ

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا
لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ
اَحْمَدُ۔ (الصف ۔ آیت ۶)

ترجمہ: "اور یاد کرو عیسیٰ ابن مریمؑ کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ اے بنی اسرائیل، میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے، اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔"

پہلے فقرے کو بعد والے فقرے کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ میں اللہ کے رسول احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آمد کے متعلق تورات کی دی ہوئی بشارت کی تصدیق کرتا ہوں اور خود بھی ان کے آنے کی بشارت دیتا ہوں۔ اس معنی کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کا اشارہ اُس بشارت کی طرف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے دی تھی۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

> "خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سُننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے مجمع کے دن خداوند اپنے خدا سے حُورِب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور پھر اپنا

کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے تو میں اس کا حساب اُس سے لوں گا۔" (استثناء باب ۱۸۔ آیت ۱۵۔۱۹)

تین اہم توضیحی اشارات

یہ تورات کی صریح پیشینگوئی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر چسپاں نہیں ہو سکتی۔

اس میں حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو اللہ کا یہ ارشاد سنا رہے ہیں کہ میں تیرے لیے تیرے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم کے "بھائیوں" سے مراد خود اسی قوم کا کوئی قبیلہ یا خاندان نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کوئی دوسری ایسی قوم ہی ہو سکتی ہے جس کے ساتھ اس کا قریبی نسلی رشتہ ہو۔ اگر مراد خود بنی اسرائیل میں سے کسی نبی کی آمد ہوتی تو الفاظ یہ ہوتے کہ میں تمہارے لیے خود تم ہی میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ لہٰذا بنی اسرائیل کے بھائیوں سے مراد لامحالہ بنی اسماعیل ہی ہو سکتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کی بنا پر ان کے نسبی رشتہ دار ہیں۔ مزید براں اس پیشینگوئی کا مصداق بنی اسرائیل کا کوئی نبی اس وجہ سے بھی نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں کوئی ایک نبی نہیں، بہت سارے نبی آئے ہیں جن کے ذکر سے بائیبل بھری پڑی ہے

دوسری بات اس بشارت میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جو نبی برپا کیا جائے گا وہ حضرت موسیٰؑ کے مانند ہو گا، اس سے مراد ظاہر ہے کہ شکل صورت یا حالاتِ زندگی میں مشابہ ہونا تو نہیں ہے۔ کیونکہ اس لحاظ سے کوئی فرد بھی کسی دوسرے فرد کے مانند نہیں ہوا کرتا۔ اس سے مراد محض وصفِ نبوت میں مماثلت بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ وصف ان تمام انبیاء میں مشترک ہے جو حضرت موسیٰؑ کے بعد آئے ہیں۔ اس لیے کسی ایک نبی کی یہ خصوصیت نہیں ہو سکتی کہ وہ اس وصف میں اُن کے مانند ہو۔ پس ان دونوں پہلوؤں سے مشابہت کے خارج از بحث ہو جانے کے بعد کوئی اور وجہ مماثلت جس کی بنا پر آنے والے ایک نبی کی تخصیص قابلِ فہم ہو، اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ وہ نبی ایک مستقل شریعت لانے کے اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کے مانند ہو۔ اور یہ خصوصیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ آپ سے پہلے بنی اسرائیل میں جو نبی بھی آئے تھے وہ شریعت موسوی کے پیرو تھے ان میں سے کوئی بھی ایک مستقل شریعت لے کر نہ آیا تھا۔

اس تعبیر کو مزید تقویت پیشین گوئی کے ان الفاظ سے ملتی ہے کہ "یہ تیری (یعنی بنی اسرائیل کی) اس

درخواست کے مطابق ہوگا جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو اپنے خدا کی آواز سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔" اس عبارت میں حورب سے مراد وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسٰیؑ کو پہلی مرتبہ احکام شریعت دیے گئے تھے۔ اور بنی اسرائیل کی جس درخواست کا اس میں ذکر کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ اگر کوئی شریعت ہم کو دی جائے تو ان خوفناک حالات میں نہ دی جائے جو حورب پہاڑ کے دامن میں شریعت دیتے وقت پیدا کیے گئے تھے۔ اس کے جواب میں حضرت موسٰیؑ بنی اسرائیل کو بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری یہ درخواست منظور کر لی ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ میں ان کے لیے ایک ایسا نبی برپا کروں گا جس کے منہ میں میں اپنا کلام ڈالوں گا۔ یعنی آئندہ شریعت دیتے وقت وہ خوفناک حالات پیدا نہیں کیے جائیں گے جو حورب پہاڑ کے دامن میں پیدا کیے گئے تھے۔ بلکہ اب جو نبی اس منصب پر مامور کیا جائے گا اس کے منہ میں بس اللہ کا کلام ڈال دیا جائے گا اور وہ اسے خلقِ خدا کو سنائے گا۔ اس تصریح پر غور کرنے کے بعد کیا اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اس کا مصداق کوئی اور نہیں ہے؟ حضرت موسٰیؑ کے بعد مستقل شریعت صرف آپ ہی کو دی گئی۔ اس کے عطا کرنے کے وقت کوئی ایسا مجمع نہیں ہوا جیسا حورب پہاڑ کے دامن میں بنی اسرائیل کا ہوا تھا اور کسی وقت بھی احکام شریعت دینے کے موقع پر وہ حالات نہیں پیدا کیے گئے جو وہاں پیدا کیے گئے تھے۔

فصل ۲

حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے بشارت

حضرت عیسیٰؑ کے قول کا دوسرا حصہ یہ ہے:

وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗ اَحْمَدُ۔

ترجمہ: ”اور میں بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہوگا۔“

یہ قرآن مجید کی ایک بڑی اہم آیت ہے جس پر مخالفینِ اسلام کی طرف سے بڑی لے دے بھی کی گئی ہے اور بدترین خیانتِ مجرمانہ سے بھی کام لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف صاف نام لے کر آپؐ کی آمد کی بشارت دی تھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔

وہ ”اَحْمَدُ“ ہوگا

۱ - اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی احمد بتایا گیا ہے۔ احمد کے دو معنی ہیں۔ ایک وہ شخص جو اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ دوسرے، وہ شخص جس کی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہو، یا جو بندوں میں سے سب سے زیادہ قابلِ تعریف ہو۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ بھی حضورؐ کا ایک نام تھا۔ مسلم اور ابوداؤد طیالسی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ انا محمد وانا احمد والحاشر...... ”میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں حاشر ہوں ....“ اسی مضمون کی روایات حضرت جُبَیر بن مُطْعِم سے امام مالک، بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی نے نقل کی ہیں۔ حضورؐ کا یہ اسم گرامی صحابہ میں معروف تھا۔ چنانچہ حضرت حسان بن ثابت کا شعر ہے:

صلی الالٰہ ومن یحف بعرشہ
والطیبون علی المبارک احمد

”اللہ نے اور اس کے عرش کے گرد جمگھٹا لگائے ہوئے فرشتوں نے اور سب پاکیزہ ہستیوں نے بابرکت

احمد پر درود بھیجا ہے۔"

تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے کہ حضورؐ کا نام مبارک صرف محمدؐ ہی نہ تھا بلکہ احمدؐ بھی تھا۔ عرب کا پورا لٹریچر اس بات سے خالی ہے کہ حضورؐ سے پہلے کسی کا نام احمد رکھا گیا ہو۔ اور حضورؐ کے بعد احمد اور غلام احمد اتنے لوگوں کے نام رکھے گئے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ زمانۂ نبوّت سے لے کر آج تک تمام اُمّت میں یہ اسمِ گرامی معلوم و معروف رہا ہے۔ اگر حضورؐ کا یہ اسمِ گرامی نہ ہوتا تو اپنے بچوں کے نام غلام احمد رکھنے والوں نے آخر کس احمد کا غلام ان کو قرار دیا تھا؟

"وہ نبی" سے مراد کیا ہے؟

۲۔ انجیل یوحنا اس بات پر گواہ ہے کہ مسیح کی آمد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین شخصیتوں کے منتظر تھے۔ ایک مسیح، دوسرے ایلیاہ (یعنی حضرت الیاسؑ کی آمدِ ثانی) اور تیسرے "وہ نبی"۔ انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

> "اور یوحنا (حضرت یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انھوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ ——— اس نے کہا کہ میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو ......
>
> انھوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے، نہ ایلیاہ نہ وہ نبی تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے؟"
>
> (باب ۱۔ آیات ۱۹۔۲۵)

یہ الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت مسیحؑ اور حضرت الیاسؑ کے علاوہ ایک اور نبی کے بھی منتظر تھے، اور وہ حضرت یحییٰؑ نہ تھے۔ اس نبی کی آمد کا عقیدہ بنی اسرائیل میں اس قدر مشہور و معروف تھا کہ "وہ نبی" کہہ دینا گویا اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بالکل کافی تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ "جس کی خبر تورات میں دی گئی ہے۔" مزید براں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس نبی کی طرف وہ اشارہ کر رہے تھے، اس کا آنا قطعی طور پر ثابت تھا۔ کیونکہ جب حضرت یحییٰؑ سے یہ سوالات کیے گئے تو انھوں نے یہ نہیں کہا کہ کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے، تم کس نبی کے متعلق پوچھ رہے ہو۔

انجیل یوحنا کی پیشینگوئیاں

۳ - اب وہ پیشینگوئیاں دیکھیے جو انجیل یوحنا میں مسلسل باب ۱۴ سے ۱۶ تک منقول ہوئی ہیں:

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے یعنی روحِ حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ نہ اسے دیکھتی ہے نہ جانتی ہے۔ تم اسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے اور تمہارے اندر ہے۔" (۱۴ : ۱۶-۱۷)

"میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں۔ لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔" (۱۴ : ۲۵-۲۶)

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" (۱۴ : ۳۰)

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جسے میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا۔ یعنی سچائی کا روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا۔" (۱۵ : ۲۶)

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔" (۱۶ : ۷)

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے۔ مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا اس لیے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا۔ جو کچھ باپ ہے وہ سب میرا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا ہے اور تمہیں خبریں دے گا۔" (۱۶ : ۱۲-۱۵)

انجیل ترجمہ در ترجمہ کے عمل سے گزری

۴ - ان عبارتوں کے معنی متعین کرنے کے لیے سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ مسیح علیہ السلام اور ان کے ہم عصر اہلِ فلسطین کی عام زبان آرامی زبان کی وہ بولی تھی جسے سُریانی (SYRIAC) کہا جاتا ہے۔ مسیح کی پیدائش سے دو ڈھائی سو برس پہلے ہی سلوقی (SELEUCIDE) اقتدار کے زمانے میں اس علاقے

سے عبرانی رُخصت ہو چکی تھی اور سُریانی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اگرچہ سلوقی اور پھر رومی سلطنتوں کے اثر سے یونانی زبان بھی اس علاقے میں پہنچ گئی تھی، مگر وہ صرف اُس طبقے تک محدود رہی جو سرکاری دربار میں رسائی پاکر، یا رسائی حاصل کرنے کی خاطر، یونانیت زدہ ہو گیا تھا۔ فلسطین کے عام لوگ سُریانی کی ایک خاص بولی (DIALECT) استعمال کرتے تھے جس کے لہجے اور تلفظات اور محاورات دمشق کے عام علاقے میں بولی جانے والی سُریانی سے مختلف تھے۔ اور اس ملک کے عوام یونانی سے اس قدر ناواقف تھے کہ جب ۷۰ء میں یروشلم پر قبضہ کرنے کے بعد رومی جنرل تیتُس (TITUS) نے اہلِ یروشلم کو یونانی میں خطاب کیا تو اس کا ترجمہ سُریانی زبان میں کرنا پڑا۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے شاگردوں سے جو کچھ کہا تھا وہ لامحالہ سُریانی زبان ہی میں ہو گا۔

انجیل کے مُشتبہ نسخے اور ان میں ردّ و بدل

دوسری بات یہ جاننی ضروری ہے کہ بائیبل کی چاروں انجیلیں ان یونانی بولنے والے عیسائیوں کی لکھی ہوئی ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد اس مذہب میں شامل ہوئے تھے۔ ان تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال و اعمال کی تفصیلات سُریانی بولنے والے عیسائیوں کے ذریعہ سے کسی تحریر کی صورت میں نہیں بلکہ زبانی روایات کی شکل میں پہنچی تھیں اور ان سُریانی روایات کو اُنھوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے درج کیا تھا۔ ان میں سے کوئی انجیل بھی ۷۰ء سے پہلے کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ اور انجیل یوحنا تو حضرت عیسیٰؑ کے ایک صدی بعد غالباً ایشیائے کوچک کے شہر افسُس میں لکھی گئی ہے۔ مزید یہ کہ ان انجیلوں کا بھی کوئی اصل نسخہ اس یونانی زبان میں محفوظ نہیں ہے جس میں ابتداءً یہ لکھی گئی تھیں۔ مطبع کی ایجاد سے پہلے کے جتنے یونانی مسودات جگہ جگہ سے تلاش کر کے جمع کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی چوتھی صدی سے پہلے کا نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ تین صدیوں کے دوران میں ان کے اندر کیا کچھ ردّ و بدل ہوتے ہوں گے۔ اس معاملہ کو جو چیز خاص طور پر مشتبہ بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ عیسائی اپنی انجیلوں میں اپنی پسند کے مطابق دانستہ تغیر و تبدّل کرنے کو بالکل جائز سمجھتے رہے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون بائیبل کا مصنف لکھتا ہے:

> "اناجیل میں ایسے نمایاں تغیرات دانستہ کیے گئے ہیں جیسے مثلاً بعض پوری پوری عبارتوں کو کسی دوسرے ماخذ سے لے کر کتاب میں شامل کر دینا .... یہ تغیرات صریحاً کچھ ایسے لوگوں نے بالقصد کیے ہیں جنھیں اصل کتاب کے اندر شامل کرنے کے لیے کہیں سے کوئی مواد مل گیا اور وہ اپنے آپ کو اس کا

مجاز سمجھتے رہے کہ کتاب کو بہتر یا زیادہ مفید بنانے کے لیے اس کے اندر اپنی طرف سے اس مواد کا اضافہ کر دیں...... بہت سے اضافے دوسری صدی ہی میں ہو گئے تھے اور کچھ نہیں معلوم کہ ان کا ماخذ کیا تھا۔"

اس صورتِ حال میں قطعی طور پر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انجیلوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو اقوال ہمیں ملتے ہیں وہ بالکل ٹھیک ٹھیک نقل ہوئے ہیں اور ان میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہوا ہے۔

ایک اور قابلِ توجہ پہلو

تیسری اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد بھی تقریباً تین صدیوں تک فلسطین کے عیسائی باشندوں کی زبان سُریانی رہی اور کہیں نویں صدی عیسوی میں جا کر عربی زبان نے اس کی جگہ لی۔ ان سریانی بولنے والے اہلِ فلسطین کے ذریعہ سے عیسائی روایات کے متعلق جو معلومات ابتدائی تین صدیوں کے مسلمان علماء کو حاصل ہوئیں وہ اُن لوگوں کی معلومات کی بہ نسبت زیادہ معتبر ہونی چاہئیں جنھیں سُریانی سے یونانی اور پھر یونانی سے لاطینی زبانوں میں ترجمہ در ترجمہ ہو کر یہ معلومات پہنچیں۔ کیونکہ مسیحؑ کی زبان سے نکلے ہوئے اصل سُریانی الفاظ ان کے ہاں محفوظ رہنے کے زیادہ امکانات تھے۔

یوحنا کی پیشینگوئیوں کا ماحصل

۵۔ ان ناقابلِ انکار تاریخی حقائق کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ انجیل یوحنا کی مذکورۂ بالا عبارات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بعد ایک آنے والے کی خبر دے رہے ہیں جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ "دُنیا کا سردار" (سرورِ عالم) ہوگا، ابد تک رہے گا۔ "سچائی کی تمام راہیں دکھلائے گا" اور خُود ان کی (یعنی حضرت عیسیٰؑ کی) گواہی دے گا"۔ یوحنا کی ان عبارتوں میں "رُوح القدس" اور "سچائی کی روح" وغیرہ الفاظ شامل کر کے مدّعا کو خبط کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ مگر اس کے باوجود ان سب عبارتوں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس آنے والے کی خبر دی گئی ہے وہ کوئی روح نہیں بلکہ کوئی انسان اور خاص شخص ہے جس کی تعلیم عالمگیر، ہمہ گیر اور قیامت تک باقی رہنے والی ہوگی۔ اس شخصِ خاص کے لیے اُردو ترجمے میں "مددگار" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یوحنا کی اصل انجیل میں یونانی زبان کا جو لفظ استعمال کیا گیا تھا اس کے بارے میں عیسائیوں کو اصرار ہے کہ وہ PARACLETUS تھا۔ مگر اس کے معنی متعین کرنے میں خود عیسائی علماء کو سخت زحمت پیش آئی ہے۔ اصل یونانی زبان میں PARACLETE کے کئی معنی ہیں۔ کسی جگہ کی طرف

بلانا، مدد کے لیے پُکارنا، انذار و تنبیہ، ترغیب، اُکسانا، التجا کرنا، دعا مانگنا۔ پھر یہ لفظ ہیلینی مفہوم میں یہ معنی دیتا ہے: تسلّی دینا، تسکین بخشنا، ہمّت افزائی کرنا۔ بائیبل میں اس لفظ کو جہاں جہاں استعمال کیا گیا ہے ان سب مقامات پر اس کے کوئی معنی بھی ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اور اُرجن (ORIGEN) نے کہیں اس کا ترجمہ CONSOLATOR کیا ہے اور کہیں DEPRECATOR۔ مگر دوسرے مفسّرین نے ان دونوں ترجموں کو رد کر دیا کیونکہ اوّل تو یہ یونانی گرامر کے لحاظ سے صحیح نہیں ہیں، دوسرے تمام عبارتوں میں جہاں یہ لفظ آیا ہے یہ معنی نہیں چلتے۔ بعض اور مترجمین نے اس کا ترجمہ TEACHER کیا ہے، مگر یونانی زبان کے استعمالات سے یہ معنی بھی اخذ نہیں کیے جا سکتے۔ ترتولیان اور آگسٹائن نے لفظ ADVOCATE کو ترجیح دی ہے اور بعض اور لوگوں نے ASSISTANT اور COMFORTER اور CONSOLER وغیرہ الفاظ اختیار کیے ہیں (ملاحظہ ہو سائیکلوپیڈیا آف ببلیکل لٹریچر، لفظ پریکلیٹس)

ایک لفظ کا ہیر پھیر

اب دلچسپ بات یہ ہے کہ یونانی زبان ہی میں ایک دوسرا لفظ PERICLYTOS موجود ہے جس کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا"۔ یہ لفظ بالکل "محمّد" کا ہم معنی ہے۔ تلفّظ میں اس کے اور PARACLETUS کے درمیان بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ کیا بعید ہے کہ جو مسیحی حضرات اپنی مذہبی کتابوں میں اپنی مرضی اور پسند کے مطابق بے تکلّف ردّ و بدل کر لینے کے خوگر رہے ہیں انھوں نے یوحنّا کی نقل کردہ پیشینگوئی کے اس لفظ کو اپنے عقیدہ کے خلاف پڑتا دیکھ کر اس کے اِملا میں یہ ذرا سا تغیّر کر دیا ہو، اس کی پڑتال کرنے کے لیے یوحنّا کی لکھی ہوئی ابتدائی یونانی انجیل بھی کہیں موجود نہیں ہے جس سے یہ تحقیق کیا جا سکے کہ وہاں ان دونوں الفاظ میں سے دراصل کون سا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔

اصل لفظ مُنْحَمَنّا تھا

۶۔ لیکن فیصلہ اس پر بھی موقوف نہیں ہے کہ یوحنّا نے یونانی زبان میں دراصل کون سا لفظ لکھا تھا۔ کیونکہ بہرحال وہ بھی ترجمہ ہی تھا اور حضرت مسیحؑ کی زبان اوپر ہم بیان کر چکے ہیں فلسطین کی سُریانی تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنی بشارت میں جو لفظ استعمال کیا ہوگا وہ لامحالہ کوئی سریانی لفظ ہی ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے وہ اصل لفظ ہمیں ابنِ ہشام کی سیرت میں مل جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی اسی کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ہم معنی یونانی لفظ کیا ہے۔ محمد بن اسحاق کے حوالے سے ابن ہشام نے یُحَنَّس (یوحنّا) کی انجیل کے

باب ۱۵، آیات ۲۳ تا ۲۷، اور باب ۱۶ آیت ۱ کا پورا ترجمہ نقل کیا ہے، اور اس میں یونانی "فارقلیط" کی بجائے سریانی زبان کا لفظ مُنْحَمَنّا استعمال کیا گیا ہے۔ پھر ابنِ اسحاق اور ابن ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ مُنْحَمَنّا کے معنی سریانی زبان میں محمد اور یونانی میں برقلیطس ہیں۔" (ابن ہشام جلد اول، ص ۲۴۸)

اب دیکھیے کہ تاریخی طور پر فلسطین کے عام عیسائی باشندوں کی زبان نویں صدی عیسوی تک سریانی تھی۔ یہ علاقہ ساتویں صدی کے نصف اول سے اسلامی مقبوضات میں شامل تھا۔ ابن اسحاق نے ۷۶۸ء میں اور ابن ہشام نے ۸۲۸ء میں وفات پائی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں کے زمانے میں فلسطینی عیسائی سریانی بولتے تھے۔ اور ان دونوں کے لیے اپنے ملک کی عیسائی رعایا سے ربط پیدا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ نیز اس زمانے میں یونانی بولنے والے عیسائی لاکھوں کی تعداد میں اسلامی مقبوضات میں رہتے تھے۔ اس لیے یہ معلوم کرنا بھی ان کے لیے مشکل نہ تھا کہ سریانی کے کس لفظ کا ہم معنی یونانی زبان کا کون سا لفظ ہے۔ اب اگر ابنِ اسحاق کے نقل کردہ ترجمے میں سریانی لفظ مُنْحَمَنّا استعمال ہوا ہے، اور ابنِ اسحاق یا ابنِ ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ عربی میں اس کا ہم معنی لفظ محمد اور یونانی میں برقلیطس ہے تو اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حضرت عیسیٰؑ نے حضورؐ کا نام مبارک لے کر آپ ہی کے آنے کی بشارت دی تھی اور ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یوحنا کی یونانی انجیل میں دراصل لفظ PERICLYTOS استعمال ہوا تھا جسے عیسائی حضرات نے بعد میں کسی وقت PARACLETUS سے بدل دیا۔

نجاشی کی تصدیق

اس سے بھی قدیم تر تاریخی شہادت حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی یہ روایت ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کو جب نجاشی نے اپنے دربار میں بُلایا، اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سُنیں تو اس نے کہا: مَرْحَبًا بِكُمْ وَبِمَنْ جِئْتُمْ مِنْ عِنْدِهٖ، اَشْهَدُ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّهُ الَّذِيْ نَجِدُ فِي الْاِنْجِيْلِ وَاَنَّهُ الَّذِيْ بَشَّرَ بِهٖ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ (مسند احمد) یعنی "مرحبا تم کو اور اس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، اور وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں اور وہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰؑ ابنِ مریمؑ نے دی تھی۔" یہ قصہ احادیث میں خود حضرت جعفرؓ اور حضرت امّ سلمہؓ سے بھی منقول ہوا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں نجاشی کو یہ معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک نبی کی پیشینگوئی کر گئے ہیں، بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس نبی کی آ

صاف نشاندہی انجیل میں موجود تھی جس کی وجہ سے نجاشی کو یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تامّل نہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ نبی ہیں۔ البتہ اس روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت عیسیٰؑ کی اس بشارت کے متعلق نجاشی کا ذریعۂ معلومات یہی انجیل یوحنا تھی یا کوئی اور ذریعہ بھی اس کو جاننے کا اس وقت موجود تھا۔

سب سے زیادہ قابلِ اعتماد نسخۂ انجیل

۸۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ کی پیشینگوئیوں کو نہیں، خود حضرت عیسیٰؑ کے اپنے صحیح حالات اور آپ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا بھی معتبر ذریعہ وہ چار انجیلیں نہیں ہیں جن کو مسیحی کلیسا نے معتبر و مسلّم اناجیل (CANONICAL GOSPELS) قرار دے رکھا ہے، بلکہ اس کا زیادہ قابلِ اعتماد ذریعہ وہ انجیل برنا باس ہے جسے کلیسا غیر قانونی اور مشکوک الصحت (APOCRYPHAL) کہتا ہے۔ عیسائیوں نے اسے چھپانے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ صدیوں تک یہ دنیا سے ناپید رہی ہے۔ سولھویں صدی میں اس کے اطالوی ترجمے کا صرف ایک نسخہ پوپ سکٹس (SIXTUS) کے کتب خانے میں پایا جاتا تھا اور کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں وہ ایک شخص جان ٹولینڈ کے ہاتھ لگا۔ پھر مختلف ہاتھوں میں گشت کرتا ہوا ۱۷۳۸ء میں ویانا کی امپیریل لائبریری میں پہنچ گیا۔ ۱۹۰۰ء میں اسی نسخے کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ کے کلیرنڈن پریس سے شائع ہوگیا تھا مگر غالباً اس کی اشاعت کے بعد فوراً ہی عیسائی دنیا میں یہ احساس پیدا ہوگیا کہ یہ کتاب تو اس مذہب کی جڑ ہی کاٹے دے رہی ہے جسے حضرت عیسیٰؑ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے مطبوعہ نسخے کسی خاص تدبیر سے غائب کر دیے گئے اور پھر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔ دوسرا ایک نسخہ اسی اطالوی ترجمے سے اسپینی زبان میں منتقل کیا ہوا اٹھارہویں صدی میں پایا جاتا تھا، جس کا ذکر جارج سیل نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مقدمے میں کیا ہے۔ مگر وہ بھی کہیں غائب کر دیا گیا اور آج اس کا بھی کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ مجھے آکسفورڈ سے شائع شدہ انگریزی ترجمے کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں نے اسے لفظ بلفظ پڑھا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جس سے عیسائیوں نے محض تعصب اور ضد کی بنا پر اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے۔

مسیحی لٹریچر میں اس انجیل کا جہاں کہیں ذکر آتا ہے، اسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برنا باس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے، جو صرف اس بنا پر بولا دیا گیا کہ اس میں جگہ جگہ بصراحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشینگوئیاں ملتی ہیں۔

اوّل تو اس انجیل کو پڑھتے ہی سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف کردہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے اگر کسی مسلمان نے لکھی ہوتی تو مسلمانوں میں یہ کثرت سے پھیلی ہوئی ہوتی اور علمائے اسلام کی تصنیفات میں بکثرت اس کا ذکر پایا جاتا۔ مگر یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جارج سیل کے انگریزی مقدمۂ قرآن سے پہلے مسلمانوں کو سرے سے اس کے وجود تک کا علم نہ تھا۔ طبریؔ، یعقوبیؔ، مسعودی، البیرونی، ابن حزم اور دوسرے مصنفین، جو مسلمانوں میں مسیحی لٹریچر پر وسیع اطلاع رکھنے والے تھے، ان میں سے کسی کے ہاں بھی مسیحی مذہب پر بحث کرتے ہوئے انجیل برنا باس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ دنیائے اسلام کے کتب خانوں میں جو کتابیں پائی جاتی تھیں ان کی بہترین فہرستیں ابن ندیم کی الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظّنون ہیں، اور وہ بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے کسی مسلمان عالم نے انجیل برنا باس کا نام تک نہیں لیا ہے۔ تیسری اور سب سے بڑی دلیل اس بات کے جھوٹ ہونے کی یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے بھی ۷۵ سال پہلے پوپ گلاسیئس اوّل (GELASIUS) کے زمانے میں بدعقیدہ اور گمراہ کُن (HERETICAL) کتابوں کی جو فہرست مرتب کی گئی تھی، اور ایک پاپائی فتوے کے ذریعے جن کا پڑھنا ممنوع کر دیا گیا تھا، ان میں انجیل برنا باس (EVANGELIUM BARNBAS) بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت کون سا مسلمان تھا جس نے یہ جعلی انجیل تیار کی تھی۔

فصل ۳

انجیل برنا باس میں حضورؐ کے متعلّق واضح تر پیشگوئیاں

برنا باس مسیحؑ کے اوّلین حواریوں میں سے تھا

بائیبل میں جو چار انجیلیں قانونی اور معتبر قرار دے کر شامل کی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا لکھنے والا بھی حضرت عیسیٰؑ کا صحابی نہ تھا۔ اور ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کہ اس نے آنحضرتؑ کے صحابیوں سے حاصل کردہ معلومات اپنی انجیل میں درج کی ہیں۔ جن ذرائع سے ان لوگوں نے معلومات حاصل کی ہیں ان کا کوئی حوالہ انھوں نے نہیں دیا ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ راوی نے آیا خود وہ واقعات دیکھے اور وہ اقوال سنے ہیں جنھیں وہ بیان کر رہا ہے یا ایک یا چند واسطوں سے یہ باتیں اُسے پہنچی ہیں۔ بخلاف اس کے برنا باس کا مصنّف کہتا ہے کہ میں مسیحؑ کے اوّلین بارہ حواریوں میں سے ایک ہوں، شروع سے آخر تک مسیحؑ کے ساتھ رہا ہوں اور اپنی آنکھوں دیکھے واقعات اور کانوں سُنے اقوال اس کتاب میں درج کر رہا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں وہ کہتا ہے کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت حضرت مسیحؑ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میرے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پھیل گئی ہیں ان کو صاف کرنا اور صحیح حالات دنیا کے سامنے لانا تیری ذمّہ داری ہے۔

برنا باس کی شخصیت

یہ برنا باس کون تھا؟ بائیبل کی کتاب اعمال میں بڑی کثرت سے اس نام کے ایک شخص کا ذکر آتا ہے جو قُبرص کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مسیحیت کی تبلیغ اور پیروانِ مسیحؑ کی مدد و اعانت کے سلسلے میں اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ مگر کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کب دینِ مسیحؑ میں داخل ہوا، اور ابتدائی بارہ حواریوں کی جو فہرست تین انجیلوں میں دی گئی ہے اس میں بھی کہیں اس کا نام درج نہیں ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس انجیل کا مصنف وہی برنا باس ہے یا کوئی اور۔ متی، اور مرقس نے حواریوں (APOSTLES) کی جو فہرست دی ہے، برنا باس کی دی ہوئی فہرست اس سے صرف دو ناموں میں مختلف ہے۔ ایک تُوما،

جس کے بجائے برناباس خود اپنا نام دے رہا ہے، دوسرا شمعون قنانی، جس کی جگہ وہ یہوداہ بن یعقوب کا نام لیتا ہے۔ لوقا کی انجیل میں یہ دوسرا نام بھی موجود ہے۔ اس لیے یہ قیاس کرنا صحیح ہوگا کہ بعد میں کسی وقت صرف برناباس کو حواریوں سے خارج کرنے کے لیئے توما کا نام داخل کیا گیا ہے تاکہ اس کی انجیل سے پیچھا چھڑایا جا سکے، اور اس طرح کے تغیرات اپنی مذہبی کتابوں میں کر لینا ان حضرات کے ہاں کوئی ناجائز کام نہیں رہا ہے۔

اناجیل اربعہ سے بہتر و برتر

اس انجیل کو اگر کوئی شخص تعصب کے بغیر کھلی آنکھوں سے پڑھے اور نئے عہد نامے کی چاروں انجیلوں سے اس کا مقابلہ کرے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ان چاروں سے بدرجہا برتر ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور اس طرح بیان ہوئے ہیں جیسے کوئی شخص فی الواقع وہاں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور ان واقعات میں خود شریک تھا۔ چاروں انجیلوں کی بے ربط داستانوں کے مقابلہ میں یہ تاریخی بیان زیادہ مربوط بھی ہے اور اس سے سلسلۂ واقعات بھی زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات اس میں چاروں انجیلوں کی بہ نسبت زیادہ واضح اور مفصل اور مؤثر طریقے سے بیان ہوئی ہیں۔ توحید کی تعلیم، شرک کی تردید، صفاتِ باری تعالیٰ، عبادات کی روح، اور اخلاقِ فاضلہ کے مضامین اس میں بڑے ہی پُرزور اور مدلل اور مفصل ہیں۔ جن سبق آموز تمثیلات کے پیرایہ میں مسیحؑ نے یہ مضامین بیان کیے ہیں ان کا عُشرِ عَشیر بھی چاروں انجیلوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کس حکیمانہ طریقے سے فرماتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی زبان، طرزِ بیان اور طبیعت و مزاج سے کوئی شخص اگر کچھ بھی آشنا ہو تو وہ اس انجیل کو پڑھ کر یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ یہ کوئی جعلی داستان نہیں ہے۔ جو بعد میں کسی نے گھڑ لی ہو، بلکہ اس میں حضرت مسیحؑ اناجیل اربعہ کی بہ نسبت اپنی اصلی شان میں بہت زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں، اور اس میں ان تضادات کا نام و نشان بھی نہیں ہے جو اناجیل اربعہ میں ان کے مختلف اقوال کے درمیان پایا جاتا ہے۔

یہ انجیل نبوتِ عیسیٰؑ کی صحیح آئینہ دار ہے

اس انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات ٹھیک ٹھیک ایک نبی کی زندگی اور تعلیمات کے مطابق نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ تمام پچھلے انبیاء اور کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ صاف کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے سوا معرفتِ حق کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اور

اور جو انبیاء کو چھوڑتا ہے وہ دراصل خدا کو چھوڑتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کے ٹھیک وہی عقائد پیش کرتے ہیں جن کی تعلیم تمام انبیاء نے دی ہے۔ نماز، روزے اور زکوٰۃ کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کی نمازوں کا جو ذکر بکثرت مقامات پر برناباس نے کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہی فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشا اور تہجد کے اوقات تھے جن میں وہ نماز پڑھتے تھے، اور ہمیشہ نماز سے پہلے وضو فرماتے تھے۔ انبیاء میں سے وہ حضرت داؤد و سلیمانؑ کو نبی قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کو انبیاء کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کو وہ ذبیح قرار دیتے ہیں اور ایک یہودی عالم سے اقرار کراتے ہیں کہ فی الواقع ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہی تھے اور بنی اسرائیل نے زبردستی کھینچ تان کر کے حضرت اسحاقؑ کو ذبیح بنا رکھا ہے۔ آخرت اور قیامت اور جنت و دوزخ کے متعلق ان کی تعلیمات قریب قریب وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔

انجیل برناباس سے عیسائیوں کی مخالفت کی وجہ

۱۰۔ عیسائی جس وجہ سے انجیل برناباس کے مخالف ہیں، وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جگہ جگہ صاف اور واضح بشارتیں ہیں، کیونکہ وہ تو حضورؐ کی پیدائش سے بھی بہت پہلے اس انجیل کو رد کر چکے تھے۔ ان کی ناراضی کی اصل وجہ کو سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تفصیلی بحث درکار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیرو آپ کو صرف نبی مانتے تھے، موسوی شریعت کا اتباع کرتے تھے، عقائد اور احکام اور عبادات کے معاملہ میں اپنے آپ کو دوسرے بنی اسرائیل سے قطعاً الگ نہ سمجھتے تھے، اور یہودیوں سے ان کا اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کو مسیح تسلیم کر کے ان پر ایمان لائے تھے۔ اور وہ ان کو مسیح ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بعد میں جب سینٹ پال اس جماعت میں داخل ہوا تو اُس نے رومیوں، یونانیوں اور دوسرے غیر یہودی اور غیر اسرائیلی لوگوں میں بھی اس دین کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی، اور اس غرض کے لیے ایک نیا دین بنا ڈالا جس کے عقائد اور اصول اور احکام اس دین سے بالکل مختلف تھے جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ اس شخص نے حضرت عیسیٰؑ کی کوئی صحبت نہیں پائی تھی بلکہ اُن کے زمانے میں وہ اُن کا سخت مخالف تھا اور اُن کے بعد بھی کئی سال تک اُن کے پیروؤں کا دشمن بنا رہا۔ پھر جب اس جماعت میں داخل ہو کر اس نے ایک نیا دین بنانا شروع کیا اُس وقت بھی اس نے حضرت عیسیٰؑ کے کسی قول کی سند نہیں پیش کی بلکہ اپنے کشف و الہام کو بنیاد بنایا اور اس نئے دین کی تشکیل میں اُس کے پیش نظر بس یہ مقصد تھا کہ دین ایسا ہو جسے عام غیر یہودی (GENTILE) دنیا قبول کرے۔ اُس نے اعلان کر دیا کہ ایک عیسائی

شریعتِ یہود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس نے کھانے پینے میں حرام و حلال کی ساری قیود ختم کر دیں۔ اس نے ختنہ کے حکم کو بھی منسوخ کر دیا جو غیر یہودی دنیا کو خاص طور پر ناگوار تھا۔ حتیٰ کہ اس نے مسیح کی اُلوہیت اور اُن کے ابنِ خدا ہونے اور صلیب پر جان دے کر اولادِ آدمؑ کے پیدائشی گناہ کا کفارہ بن جانے کا عقیدہ بھی تصنیف کر ڈالا کیونکہ عام مشرکین کے مزاج سے یہ بہت مناسبت رکھتا تھا۔ مسیح کے ابتدائی پیروؤں نے اِن بدعات کی مزاحمت کی، مگر سینٹ پال نے جو دروازہ کھولا تھا، اس سے غیر یہودی عیسائیوں کا ایک ایسا زبردست سیلاب اس مذہب میں داخل ہو گیا جس کے مقابلے میں وہ مُٹھی بھر لوگ کسی طرح نہ ٹھہر سکے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بکثرت لوگ ایسے موجود تھے جو مسیح کی اُلوہیت کے عقیدے سے انکار کرتے تھے۔ مگر چوتھی صدی کے آغاز (۳۲۵ء) میں نیقیہ (NICAEA) کی کونسل نے پولوسی عقائد کو قطعی طور پر مسیحیت کا مسلّم مذہب قرار دے دیا۔ پھر رومی سلطنت خود عیسائی ہو گئی اور قیصر تھیوڈوسیس کے زمانے میں یہی مذہب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ تمام کتابیں جو اس عقیدے کے خلاف ہوں، مردود قرار دے دی جائیں اور صرف وہی کتابیں معتبر ٹھہرائی جائیں جو اس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ۳۶۷ء میں پہلی مرتبہ اتھاناسیوس (ATHANASIUS) کے ایک خط کے ذریعہ معتبر و مسلّم کتابوں کے ایک مجموعہ کا اعلان کیا گیا، پھر اس کی توثیق ۳۸۲ء میں پوپ ڈیمیسیس (DAMASIUS) کے زیرِ صدارت ایک مجلس نے کی، اور پانچویں صدی کے آخر میں پوپ گلاسیس (GELASIUS) نے اس مجموعہ کو مسلّم قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان کتابوں کی ایک فہرست مرتب کر دی جو غیر مسلّم تھیں۔ حالانکہ جن پولوسی عقائد کو بنیاد بنا کر مذہبی کتابوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کا یہ فیصلہ کیا گیا تھا، ان کے متعلق کبھی کوئی عیسائی عالم یہ دعویٰ نہیں کر سکا ہے کہ ان میں سے کسی عقیدے کی تعلیم خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ بلکہ معتبر کتابوں کے مجموعہ میں جو انجیلیں شامل ہیں، خود ان میں بھی حضرت عیسیٰؑ کے اپنے کسی قول سے ان عقائد کا ثبوت نہیں ملتا۔

انجیل برناباس میں غلط عقائد کی تردید

انجیل برناباس اُن غیر مُسلّم کتابوں میں اس لیے شامل کی گئی کہ وہ مسیحیت کے اس سرکاری عقیدے کے بالکل خلاف تھی۔ اس کا مصنف کتاب کے آغاز ہی میں اپنا مقصدِ تصنیف یہ بیان کرتا ہے کہ "اُن لوگوں کے خیالات کی اصلاح کی جائے جو شیطان کے دھوکے میں آ کر یسوع کو ابن اللہ قرار دیتے ہیں، ختنہ کو غیر ضروری ٹھہراتے ہیں اور حرام کھانوں کو حلال کر دیتے ہیں، جن میں سے ایک دھوکہ کھانے والا پولوس بھی ہے۔" وہ بتاتا ہے کہ جب

حضرت عیسیٰ دنیا میں موجود تھے اس زمانے میں ان کے معجزات کو دیکھ کر سب سے پہلے مشرک رومی سپاہیوں نے ان کو خدا اور بعض نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کیا، پھر یہ چھوت بنی اسرائیل کے عوام کو بھی لگ گئی۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ سخت پریشان ہوئے۔ انھوں نے بار بار نہایت شدت کے ساتھ اپنے متعلق اس غلط عقیدے کی تردید کی اور اُن لوگوں پر لعنت بھیجی جو اُن کے متعلق ایسی باتیں کہتے تھے۔ پھر اُنھوں نے اپنے شاگردوں کو پورے یہودیہ میں اس عقیدے کی تردید کے لیے بھیجا اور اُن کی دُعا سے شاگردوں کے ہاتھوں بھی وہی معجزے صادر کرائے گئے جو خود حضرت عیسیٰؑ سے صادر ہوتے تھے، تاکہ لوگ اس غلط خیال سے باز آ جائیں کہ جس شخص سے یہ معجزے صادر ہو رہے ہیں وہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت عیسیٰؑ کی مفصل تقریریں نقل کرتا ہے جن میں انھوں نے بڑی سختی کے ساتھ اِس غلط عقیدے کی تردید کی تھی، اور جگہ جگہ یہ بتاتا ہے کہ آنجناب اس گمراہی کے پھیلنے پر کس قدر پریشان تھے۔ مزید براں وہ اس پولوسی عقیدے کی بھی صاف صاف تردید کرتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے صلیب پر جان دی تھی۔ وہ اپنے چشم دید حالات یہ بیان کرتا ہے کہ جب یہوداہ اسکریوتی یہودیوں کے سردار کاہن سے رشوت لے کر حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کرانے کے لیے سپاہیوں کو لے کر آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار فرشتے آنجناب کو اُٹھا لے گئے، اور یہوداہ اسکریوتی کی شکل اور آواز بالکل وہی کر دی گئی جو حضرت عیسیٰؑ کی تھی۔ صلیب پر وہی چڑھایا گیا تھا نہ کہ حضرت عیسیٰؑ۔ اِس طرح یہ انجیل پولوسی مسیحیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور قرآن کے بیان کی پوری توثیق کرتی ہے۔ حالانکہ نزولِ قرآن سے ۱۱۵ سال پہلے اُس کے اِن بیانات ہی کی بنا پر مسیحی پادری اسے رد کر چکے تھے۔

عیسائیوں کی بدقسمتی

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انجیل برناباس درحقیقت اناجیلِ اربعہ سے زیادہ معتبر انجیل ہے، مسیح علیہ السلام کی تعلیمات اور سیرت اور اقوال کی صحیح ترجمانی کرتی ہے، اور یہ عیسائیوں کی اپنی بدقسمتی ہے کہ اس انجیل کے ذریعہ سے اپنے عقائد کی تصحیح اور حضرت مسیحؑ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا جو موقع ان کو ملا تھا اسے محض ضد کی بنا پر انھوں نے کھو دیا۔ اس کے بعد ہم پورے اطمینان کے ساتھ وہ بشارتیں نقل کر سکتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں برناباس نے حضرت عیسیٰؑ سے روایت کی ہیں۔ ان بشارتوں میں کہیں حضرت عیسیٰؑ حضورؐ کا نام لیتے ہیں، کہیں "رسول اللہ" کہتے ہیں، کہیں آپ کے لیے "مسیح" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، کہیں "قابلِ تعریف" (ADMIRABLE) کہتے ہیں، اور کہیں صاف صاف ایسے فقرے ارشاد فرماتے ہیں جو بالکل لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے ہم معنی ہیں۔ ہمارے لیے ان ساری بشارتوں کو نقل کرنا مشکل ہے کیونکہ وہ اتنی زیادہ ہیں، اور جگہ جگہ مختلف پیرایوں اور سیاق و سباق میں آئی ہیں کہ ان سے ایک اچھا خاصا رسالہ مرتب ہو سکتا ہے۔

انجیل برناباس میں مندرج چند پیشگوئیاں

یہاں ہم محض بطور نمونہ ان میں سے چند کو نقل کرتے ہیں:۔

"تمام انبیاء جن کو خدا نے دنیا میں بھیجا، جن کی تعداد ایک لاکھ ۴۴ ہزار تھی، انھوں نے ابہام کے ساتھ بات کی۔ مگر میرے بعد تمام انبیاء اور مقدس ہستیوں کا نُور آئے گا جو انبیاء کی کہی ہوئی باتوں کے اندھیرے پر روشنی ڈال دے گا کیونکہ وہ خدا کا رسول ہے۔" (باب ۱۷)۔

"فریسیوں اور لاویوں نے کہا اگر تُو نہ مسیح ہے، نہ الیاس، نہ کوئی اور نبی، تو کیوں تُو نئی تعلیم دیتا ہے اور اپنے آپ کو مسیح سے بھی زیادہ بنا کر پیش کرتا ہے؟ یسوع نے جواب دیا جو معجزے خدا میرے ہاتھ سے دکھاتا ہے وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں وہی کچھ کہتا ہوں جو خدا چاہتا ہے، ورنہ درحقیقت میں اپنے آپ کو اُس (مسیح) سے بڑا شمار کیے جانے کے قابل نہیں قرار دیتا جس کا تم ذکر کر رہے ہو۔ میں تو اُس خدا کے رسول کے موزے کے بند یا اس کی جوتی کے تسمے کھولنے کے لائق بھی نہیں ہوں جس کو تم مسیح کہتے ہو، وہ مجھ سے پہلے بنایا گیا تھا اور میرے بعد آئے گا اور صداقت کی باتیں لے کر آئے گا تاکہ اس کے دین کی کوئی انتہا نہ ہو۔" (باب - ۴۴

"بالیقین میں تم سے کہتا ہوں کہ ہر نبی جو آیا ہے وہ صرف ایک قوم کے لیے خدا کی رحمت کا نشان بن کر پیدا ہوا ہے۔ اس وجہ سے اُن انبیاء کی باتیں ان لوگوں کے سوا کہیں اور نہیں پھیلیں جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے۔ مگر خدا کا رسول جب آئے گا، خُدا گویا اس کو اپنے ہاتھ کی مہر دے گا، یہاں تک کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو جو اس کی تعلیم پائیں گی، نجات اور رحمت پہنچا دے گا۔ وہ بے خدا لوگوں پر اقتدار لے کر آئے گا اور بُت پرستی کا ایسا قلع قمع کرے گا کہ شیطان پریشان ہو جائے گا۔" (اس کے آگے شاگردوں کے ساتھ ایک طویل مکالمہ میں حضرت عیسٰیؑ تصریح کرتے ہیں کہ وہ بنی اسماعیل میں سے ہوگا۔ باب - ۴۳)۔

"اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کا رسول وہ رونق ہے جس سے خدا کی پیدا کی ہوئی قریب قریب تمام چیزوں کو خوشی نصیب ہوگی کیونکہ وہ فہم اور نصیحت، حکمت اور طاقت، خشیت اور

محبت، حزم اور ورع کی رُوح سے آراستہ ہے۔ وہ فیاضی اور رحمت، عدل اور تقویٰ، شرافت اور صبر کی رُوح سے مزیّن ہے جو اس نے خدا سے اُن تمام چیزوں کی بہ نسبت تین گنی پائی ہے جنھیں خدا نے اپنی مخلوق میں سے یہ روح بخشی ہے۔ کیسا مبارک وقت ہوگا جب وہ دنیا میں آئے گا۔ یقین جانو، میں نے اس کو دیکھا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے جس طرح ہر نبی نے اس کو دیکھا ہے۔ اس کی رُوح کو دیکھنے ہی سے خدا نے ان کو نبوت دی۔ اور جب میں نے اس کو دیکھا تو میری رُوح سکینت سے بھر گئی یہ کہتے ہوئے کہ اے محمدؐ، خدا تمھارے ساتھ ہو، اور وہ مجھے تمھاری جوتی کے تسمے باندھنے کے قابل بنادے، کیونکہ یہ مرتبہ بھی پالوں تو میں ایک بڑا نبی اور خدا کی ایک مقدّس ہستی ہو جاؤں گا۔" (باب ۴۴)۔

"(میرے جانے سے) تمھارا دل پریشان نہ ہو، نہ تم خوف کرو، کیونکہ میں نے تم کو پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ خدا ہمارا خالق، جس نے تمھیں پیدا کیا ہے، وہی تمھاری حفاظت کرے گا۔ رہا میں تو اس وقت میں دنیا میں اس رسولِ خدا کے لیے راستہ تیار کرنے آیا ہوں جو دنیا کے لیے نجات لے کر آئے گا...... اندریاس نے کہا، اُستاد ہمیں اس کی نشانی بتا دے تاکہ ہم اسے پہچان لیں۔ یسوع نے جواب دیا، وہ تمھارے زمانے میں نہیں آئے گا بلکہ تمھارے کچھ سال بعد آئے گا جبکہ میری انجیل ایسی مسخ ہو چکی ہوگی کہ مشکل سے کوئی ۳۰ آدمی مومن باقی رہ جائیں گے۔ اُس وقت اللہ دنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنے رسول کو بھیجے گا جس کے سر پر سفید بادل کا سایہ ہوگا جس سے وہ خدا کا برگزیدہ جانا جائے گا اور اس کے ذریعہ سے خدا کی معرفت دنیا کو حاصل ہوگی۔ وہ بے خدا لوگوں کے خلاف بڑی طاقت کے ساتھ آئے گا اور زمین پر بُت پرستی کو مٹا دے گا۔ اور مجھے اس کی بڑی خوشی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے ہمارا خدا پہچانا جائے گا اور اس کی تقدیس ہوگی اور میری صداقت دنیا کو معلوم ہوگی اور وہ ان لوگوں سے انتقام لے گا جو مجھے انسان سے بڑھ کر کچھ قرار دیں گے۔ .... وہ ایک ایسی صداقت کے ساتھ آئے گا جو تمام انبیاء کی لائی ہوئی صداقت سے زیادہ واضح ہوگی۔" (باب - ۷۲)۔

"خدا کا عہد یروشلم میں، معبدِ سلیمان کے اندر تعمیر کیا گیا تھا نہ کہیں اور۔ مگر میری بات کا یقین کر کہ ایک وقت آئے گا جب خدا اپنی رحمت ایک اور شہر میں نازل فرمائے گا، پھر ہر جگہ اُس کی صحیح

عبادت ہو سکے گی، اور اللہ اپنی رحمت سے ہر جگہ سچی نماز کو قبول فرمائے گا، ……. میں دراصل اسرائیل کے گھرانے کی طرف نجات کا نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، مگر میرے بعد مسیح آئے گا، خدا کا بھیجا ہوا، تمام دنیا کی طرف، جس کے لیے خدا نے یہ ساری دنیا بنائی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں اللہ کی عبادت ہوگی، اور اس کی رحمت نازل ہوگی" (باب - ۸۲)-

"یسوع نے سردار کاہن سے کہا) زندہ خدا کی قسم جس کے حضور میری جان حاضر ہے، میں وہ مسیح نہیں ہوں جس کی آمد کا تمام دنیا کی قومیں انتظار کر رہی ہیں، جس کا وعدہ خدا نے ہمارے باپ ابراہیمؑ سے یہ کہہ کر کیا تھا کہ "تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی" (پیدائش ۲۲ : ۱۸)- مگر جب خدا مجھے دنیا سے لے جائے گا تو شیطان پھر یہ بغاوت برپا کرے گا کہ ناپرہیزگار لوگ مجھے خدا اور خدا کا بیٹا مانیں۔ اس کی وجہ سے میری باتوں اور میری تعلیمات کو مسخ کر دیا جائے گا یہاں تک کہ بمشکل ۳۰ صاحب ایمان باقی رہ جائیں گے۔ اس وقت خدا دنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنا رسول بھیجے گا جس کے لیے اس نے دنیا کی یہ ساری چیزیں بنائی ہیں، جو قوت کے ساتھ جنوب سے آئے گا اور بتوں کو بت پرستوں کے ساتھ برباد کر دے گا، جو شیطان سے وہ اقتدار چھین لے گا جو اس نے انسانوں پر حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کی رحمت اُن لوگوں کی نجات کے لیے اپنے ساتھ لائے گا جو اس پر ایمان لائیں گے، اور مبارک ہے وہ جو اس کی باتوں کو مانے" (باب ۔ ۹۶)-

"سردار کاہن نے پوچھا کیا خدا کے اس رسول کے بعد دوسرے نبی بھی آئیں گے؟ یسوع نے جواب دیا اس کے بعد خدا کے بھیجے ہوئے سچے نبی نہیں آئیں گے مگر بہت سے جھوٹے نبی آجائیں جن کا مجھے بڑا غم ہے۔ کیونکہ شیطان خدا کے عادلانہ فیصلے کی وجہ سے ان کو اٹھائے گا اور وہ میری انجیل کے پردے میں اپنے آپ کو چھپائیں گے" (باب ۔ ۹۷)-

"سردار کاہن نے پوچھا کہ وہ مسیح کس نام سے پکارا جائے گا اور کیا نشانیاں اس کی آمد کو ظاہر کریں گی؟ یسوع نے جواب دیا اس مسیح کا نام "قابلِ تعریف" ہے، کیونکہ خدا نے جب اس کی روح پیدا کی تھی اُس وقت اس کا یہ نام خود رکھا تھا اور وہاں اسے ایک ملکوتی شان میں رکھا گیا تھا۔ خدا نے کہا، "اے محمدؐ، انتظار کر، کیونکہ تیری ہی خاطر میں جنت، دنیا اور بہت سی مخلوق پیدا کروں گا اور اس کو تجھے تحفہ کے طور پر دوں گا، یہاں تک کہ جو تیری تبریک کرے گا اسے برکت دی جائے گی اور

جو تجھ پر لعنت کرے گا اُس پر لعنت کی جائے گی۔ جب میں تجھے دنیا کی طرف بھیجوں گا تو میں تجھ کو اپنے پیغامبرِ نجات کی حیثیت سے بھیجوں گا۔ تیری بات سچی ہوگی یہاں تک کہ زمین و آسمان ٹل جائیں گے مگر تیرا دین نہیں مٹے گا۔" سو اُس کا مبارک نام محمدؐ ہے۔" (باب - ۹۷)۔

برناباس لکھتا ہے کہ ایک موقع پر شاگردوں کے سامنے حضرت عیسیٰؑ نے بتایا کہ میرے ہی شاگردوں میں سے ایک (جو بعد میں یہوداہ اسکریوتی نکلا) مجھے ۳۰ سکّوں کے عوض دشمنوں کے ہاتھ بیچ دے گا، پھر فرمایا:۔

"اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ جو مجھے بیچے گا وہی میرے نام سے مارا جائے گا، کیونکہ خدا مجھے زمین سے اوپر اٹھا لے گا اور اُس غدار کی صورت ایسی بدل دے گا کہ ہر شخص یہ سمجھے گا کہ وہ میں ہی ہوں۔ تاہم جب وہ ایک بُری موت مرے گا تو ایک مُدّت تک میری ہی تذلیل ہوتی رہے گی۔ مگر جب محمدؐ، خدا کا مقدس رسول آئے گا تو میری وہ بدنامی دُور کر دی جائے گی۔ اور خدا یہ اس لیے کرے گا کہ میں نے اُس مسیح کی صداقت کا اقرار کیا ہے۔ وہ مجھے اس کا یہ انعام دے گا کہ لوگ یہ جان لیں گے کہ میں زندہ ہوں اور اُس ذلت کی موت سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔" (باب - ۱۱۲)۔

"(شاگردوں سے حضرت عیسیٰؑ نے کہا) بے شک میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر موسیٰؑ کی کتاب سے صداقت مسخ نہ کر دی گئی ہوتی تو خدا ہمارے باپ داؤدؑ کو ایک دوسری کتاب نہ دیتا، اور اگر داؤدؑ کی کتاب میں تحریف نہ کی گئی ہوتی تو خدا مجھے انجیل نہ دیتا، کیونکہ خداوند ہمارا خدا بدلنے والا نہیں ہے اور اس نے سب انسانوں کو ایک ہی پیغام دیا ہے۔ لہٰذا جب اللہ کا رسول آئے گا تو وہ اس لیے آئے گا کہ ان ساری چیزوں کو صاف کر دے جن سے بے خدا لوگوں نے میری کتاب کو آلودہ کر دیا ہے۔" (باب ۱۲۴)

تین شبہات اور ان کا جواب

ان صاف اور مفصل پیشینگوئیوں میں صرف تین چیزیں ایسی ہیں جو بادی النظر میں نگاہ کو کھٹکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں، اور انجیل برناباس کی متعدد دوسری عبارتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مسیح ہونے کا انکار کیا ہے۔ دوسری یہ کہ صرف انہی عبارتوں ہی میں نہیں بلکہ اس انجیل کے بہت سے مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل عربی نام "محمدؐ" لکھا گیا ہے، حالانکہ یہ انبیاء کی پیشین گوئیوں کا عام طریقہ نہیں ہے کہ بعد میں آنے والی کسی ہستی کا اصل نام لیا جائے۔ تیسری یہ کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسیح کہا گیا ہے۔

پہلے شبہے کا جواب یہ ہے کہ صرف انجیل برناباس ہی میں نہیں بلکہ لوقا کی انجیل میں بھی یہ ذکر موجود

ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اپنے شاگردوں کو اس بات سے منع کیا تھا کہ وہ آپ کو مسیح کہیں۔ لُوقا کے الفاظ یہ ہیں: "اُس نے اُن سے کہا لیکن تم مجھے کیا کہتے ہو؟ پطرس نے جواب میں کہا خدا کا مسیح۔ اُس نے اُن کو تاکید کر کے حکم دیا کہ یہ کسی سے نہ کہنا۔" (۹ : ۲۰-۲۱) غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل جس مسیح کے منتظر تھے اس کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہ تلوار کے زور سے دشمنانِ حق کو مغلوب کرے گا، اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ مسیح میں نہیں ہوں بلکہ وہ میرے بعد آنے والا ہے۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ برناباس کا جو اطالوی ترجمہ اس وقت دنیا میں موجود ہے اس کے اندر تو حضورؐ کا نام بے شک محمدؐ لکھا ہوا ہے، مگر یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ کتاب کن کن زبانوں سے ترجمہ در ترجمہ ہوتی ہوئی اطالوی زبان میں پہنچی ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل انجیل برناباس سُریانی زبان میں ہوگی، کیونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی زبان تھی۔ اگر وہ اصل کتاب دستیاب ہوتی تو دیکھا جا سکتا تھا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی کیا لکھا گیا تھا۔ اب جو کچھ قیاس کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اصل میں تو حضرت عیسیٰؑ نے لفظ مُنحمنّا استعمال کیا ہوگا، جیسا کہ ہم ابنِ اسحاق کے دیے ہوئے انجیلِ یوحنّا کے حوالہ سے بتا چکے ہیں، پھر مختلف مترجموں نے اپنی اپنی زبانوں میں اس کے ترجمے کر دیے ہوں گے۔ اس کے بعد غالباً کسی مترجم نے یہ دیکھ کر کہ پیشینگوئی میں آنے والے کا جو نام بتایا گیا ہے وہ بالکل لفظ "محمد" کا ہم معنی ہے، آپ کا یہی اسم گرامی لکھ دیا ہوگا۔ اس لیے صرف اس نام کی تصریح یہ شُبہ پیدا کر دینے کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے کہ پوری انجیل برناباس کسی مسلمان نے جعلی تصنیف کر دی ہے۔

تیسرے شُبہ کا جواب یہ ہے کہ لفظ "مسیح" درحقیقت ایک اسرائیلی اصطلاح ہے جسے قرآن مجید میں مخصوص طور پر حضرت عیسیٰؑ کے لیے صرف اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ یہودی ان کے مسیح ہونے کا انکار کرتے تھے، ورنہ یہ نہ قرآن کی اصطلاح ہے نہ قرآن میں کہیں اس کو اسرائیلی اصطلاح کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لفظ مسیح استعمال کیا ہو اور قرآن میں آپ کے لیے یہ لفظ استعمال نہ کیا گیا ہو تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ انجیل برناباس آپ کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرتی ہے جس سے قرآن انکار کرتا ہے۔ دراصل بنی اسرائیل کے ہاں قدیم طریقہ یہ تھا کہ کسی چیز یا کسی شخص کو جب کسی مقدس مقصد کے لیے مختص کیا جاتا تھا تو اس چیز پر یا اس شخص کے سر پر تیل مل کر اسے متبرک (CONSECRATE) کر دیا جاتا تھا۔ عبرانی زبان میں تیل ملنے کے اس فعل کو مسح کہتے تھے اور جس پر ملا جاتا

تھا اسے مسیح کہا جاتا تھا۔ عبادت گاہ کے ظروف اسی طریقہ سے مسح کر کے عبادت کے لیے وقف کیے جاتے تھے۔ کاہنوں کو کہانت (PRIEST HOOD) کے منصب پر مامور کرتے وقت بھی مسح کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اور نبی بھی جب خدا کی طرف سے بادشاہت یا نبوّت کے لیے نامزد کیے جاتے تو انھیں مسح کیا جاتا۔ چنانچہ بائبل کی رُو سے بنی اسرائیل کی تاریخ میں بکثرت مسیح پائے جاتے ہیں۔ حضرت ہارُونؑ کاہن کی حیثیت سے مسیح تھے، حضرت موسیٰؑ کاہن اور نبی کی حیثیت سے، طالوت بادشاہ کی حیثیت سے، حضرت داؤدؑ بادشاہ اور نبی کی حیثیت سے، مَلِک صَدَق بادشاہ اور کاہن کی حیثیت سے، اور حضرت اَلْیَسَعؑ نبی کی حیثیت سے مسیح تھے۔ بعد میں یہ بھی ضروری نہ رہا تھا کہ تیل مَل کر ہی کسی کو مامور کیا جائے، بلکہ محض کسی کا مامور من اللہ ہونا ہی مسیح ہونے کا ہم معنی بن گیا تھا۔ مثال کے طور پر دیکھیے ۱۔ سلاطین، باب ۱۹ میں ذکر آیا ہے کہ خدا نے حضرت الیاسؑ (ایلیاہ) کو حکم دیا کہ حزائیل کو مسح کر کہ آرام (دمشق) کا بادشاہ ہو، اور نِمسی کے بیٹے یاہُو کو مسح کر کہ اسرائیل کا بادشاہ ہو، اور الیشع (اَلْیَسَعؑ) کو مسح کر کہ تیری جگہ نبی ہو۔ ان میں سے کسی کے سر پر بھی تیل نہیں ملا گیا۔ بس خدا کی طرف سے ان کی ماموریت کا فیصلہ سنا دینا گویا انھیں مسیح کر دینا تھا۔ پس اسرائیلی تصوّر کے مطابق لفظ مسیح در حقیقت "مامور من اللہ" کا ہم معنی تھا اور اسی معنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس لفظ کو استعمال کیا تھا۔ (لفظ "مسیح" کے اسرائیلی مفہوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سائیکلوپیڈیا آف ببلیکل لٹریچر، لفظ "مَسِیاہ") (۶۴)

باب ۷

عیسائی خاتمُ النَّبِیّین کے دَور میں

فصل ۱

چند اہم واقعات

"تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے، اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدُنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرورِ نفس نہیں ہے۔"

وَرَقہ بن نَوفَل کی تصدیقِ نبوّت

(غارِ حرا میں فرشتے سے پہلی ملاقات کے بعد جب حضوؐر لرزتے اور کانپتے گھر پہنچے تو پہلے حضرت خُدیجہؓ نے آپ کو تسکین دی) پھر وہ حضوؐر کو ساتھ لے کر وَرَقہ بن نَوفَل کے پاس گئیں جو ان کے چچازاد بھائی تھے، زمانۂ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے، بہت بُوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سے کہا، "بھائی جان! ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سُنیے۔" وَرَقہ نے حضوؐر سے کہا، "بھتیجے تم کو کیا نظر آیا؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا۔ وَرَقہ نے کہا، "یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ نے موسیٰ پر نازل کیا تھا۔ کاش کہ میں آپ کے زمانۂ نبوّت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" وَرَقہ نے کہا، "ہاں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لائے ہیں اور اس سے دُشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پُرزور مدد کروں گا۔" مگر زیادہ مُدّت نہ گزری تھی کہ وَرَقہ کا انتقال ہو گیا۔ .... وَرَقہ بن نَوفَل مکہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے، بچپن سے حضوؐر کی زندگی دیکھتے چلے آ رہے تھے اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپ کے حالات سے

اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے بھی جب یہ واقعہ سُنا تو اسے کوئی وسوسہ نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی آپ اتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپ کا نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابلِ تعجب اَمر نہ تھا۔ (۶۵)

عیسائی سلطنت میں مسلمانوں کی ہجرتِ اُولیٰ

(مکہ میں) حالات جب ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب سنہ ۴۵ عام الفیل (۵ نبوی) میں حضورؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ لو خرجتم الی الارض الحبشة فان بها ملكا لا يظلم عنده احد. وهي ارض صدق حتى يجعل الله لكم فرجا مما انتم فيه۔" اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے۔ جب تک اللہ تمھاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی صورت پیدا کرے، تم لوگ وہاں ٹھہرے رہو۔"

اس ارشاد کی بنا پر پہلے گیارہ مردوں اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی۔ قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا، مگر خوش قسمتی سے شُعَیبَہ کے بندرگاہ پر اُن کو بروقت حبش کے لیے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ رہے۔ پھر چند مہینوں کے اندر مزید لوگوں نے ہجرت کی یہاں تک کہ ۸۳ مرد اور گیارہ عورتیں اور ۷ غیر قریشی مسلمان حبش میں جمع ہو گئے اور مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ۴۰ آدمی رہ گئے۔ (۶۶)

حبشہ کے عیسائی بادشاہ کی حق پسندی

("سیرتِ سرورِ عالم میں" ہجرتِ حبشہ کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے) یہاں صرف یہ بیان کرنا مطلوب ہے کہ مسلمان مہاجرین کے خلاف جب ان کے تعاقب میں آنے والے مشرکینِ مکہ کی سفارت نے اپنا دعویٰ پیش کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور دعوت پر انھوں نے اعتراض اٹھائے تو عیسائی بادشاہ نجاشی نے حضرت جعفرؓ سے حضورؐ پر نازل شدہ کلام کا کوئی حصہ سنانے کی فرمائش کی۔

حضرت جعفرؓ نے جواب میں سورۂ مریم کا وہ ابتدائی حصہ سنایا جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام

لہ حبش کی عیسائی سلطنت کے متعلق آنحضرتؐ نے وسیع الظرفی اور کشادہ دلی سے کلماتِ تحسین کہے ہیں اور وہاں کے حکمران کی انصاف پسندی کو پیشِ نظر رکھ کر مسلمانوں کو حبشہ میں ہجرت کرنے کا مشورہ دیا۔ یہی ایک واقعہ اس بات کو کافی تھا کہ عیسائیوں کے تعلقات مسلمانوں کے ساتھ بہترین صورت میں استوار رہتے۔ مگر افسوس کہ ان لوگوں نے محض تعصبات کی دیواریں کھڑی کر لیں (مرتبین)

سے متعلق ہے۔ نجاشی اس کو سنتا رہا اور روتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہو گئی۔ حضرت جعفرؓ نے تلاوت ختم کی تو اس نے کہا کہ یقیناً یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰؑ لائے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں۔ (۶۷)

مکّہ کی اس سفارت نے حبشہ کے درباری مذہبی پیشواؤں کو رشوتیں دے دلا کر اپنے ساتھ ملا لیا اور اگلے دن دربار میں عمرو بن العاص نے یہ سوال اٹھایا کہ: "ذرا ان لوگوں کو بُلا کر یہ تو پوچھیے کہ عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے"

نجاشی نے پھر مہاجرین کو بلا بھیجا۔ .... اور عمرو بن العاص کا پیش کردہ سوال اُن کے سامنے دُہرایا تو جعفرؓ بن ابی طالب نے اٹھ کر بلا تامل کہا کہ "ھو عبد اللہ و رسولہ و روحہ و کلمۃ اللہ القاھا الی مریم العذراء البتول"

نجاشی نے یہ سن کر ایک تنکا زمین سے اٹھایا اور کہا: "خدا کی قسم جو کچھ تم نے کہا ہے، عیسیٰؑ اُس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے" (۶۸)

حبش کے لیے مسلمانوں کا خاص رویّہ

ابو داؤد اور مسند امام احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ملتا ہے جس میں حبش کے متعلق آپ نے یہ پالیسی متعین فرما دی تھی کہ دعوا الحبشۃ ما ودعوکم دوسری روایت کے الفاظ ہیں اترکوا الحبشۃ ما ترکوکم یعنی "حبش کے لوگ جب تک تمھیں چھوڑے رکھیں تم بھی انھیں چھوڑے رکھو۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے خلفاء راشدین کے دور میں حبش کی طرف کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس ارشاد میں جو مصلحت تھی، ممکن ہے کہ اس میں کسی حد تک اس بات کا لحاظ بھی ہو کہ اہلِ حبش نے مسلمانوں کو اُن کی مصیبت کے وقت جو پناہ دی تھی اس کی رعایت کی جائے اور اپنی طرف سے ان کے خلاف پہل نہ کی جائے تاکہ دنیا کو کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہو سکے کہ مسلمان ایک احسان فراموش جماعت ہیں۔ لیکن اس کی ایک اور وجہ بھی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ حبش کی جغرافی پوزیشن، اور اس کی سابق تاریخ کو دیکھتے ہوئے غالباً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال فرمایا ہو گا کہ اسلام کے جغرافی مرکز، یعنی حجاز کے تحفظ کے لیے حبش سے تعلقات کا درست رہنا ضروری ہے۔ اسی مصلحت سے آپ نے یہ ہدایت فرمائی ہو گی کہ جہاں تک اسلام کی دعوت کا تعلق ہے وہ پُرامن طریقہ سے اس ملک میں پھیلائی جاتی رہے، لیکن جنگ سے حتی الامکان پرہیز کیا جائے۔ (۶۹)

مُقوقِسِ مصر کا رویہ

صلح حُدَیْبیہ سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط اطراف و نواح کے بادشاہوں کو بھیجے تھے ان میں سے ایک اسکندریہ کے رومی بطریق (PATRIARCH) کے نام بھی تھا جسے عرب مُقوقِس کہتے۔ حضرت حاطب بن ابی بَلْتَعہ یہ نامۂ گرامی لے کر جب اس کے پاس پہنچے تو اس نے اسلام تو قبول نہ کیا، مگر اُن کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا اور جواب میں لکھا کہ "مجھے یہ معلوم ہے کہ ایک نبی آنا ابھی باقی ہے، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ وہ شام میں نکلے گا۔ تاہم میں آپ کے ایلچی کے ساتھ احترام سے پیش آیا ہوں اور آپ کی خدمت میں دو لڑکیاں بھیج رہا ہوں جو قبطیوں میں بڑا مرتبہ رکھتی ہیں۔" (ابن سعد) ان لڑکیوں میں سے ایک سیرین تھیں اور دوسری ماریۂ قبطیہؓ (عیسائی حضرت مریم کو ماریہ (MARY) کہتے ہیں۔

مصر سے واپسی پر راستہ میں حضرت حاطب نے دونوں کے سامنے اسلام پیش کیا اور وہ ایمان لے آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے سیرین کو حضرت حسان بن ثابت کی مِلک میں دے دیا اور حضرت ماریہ کو اپنے حرم میں داخل فرمایا۔ ذی الحجہ ۸ھ میں انہی کے بطن سے حضورؐ کے صاحبزادے ابراہیم پیدا ہوئے (الاستیعاب۔ الاصابہ) (۷۰)

قرآن میں رومیوں کی فتح کی بشارت

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۔ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ ٥ (الروم۔ آیت ۳)

ترجمہ :۔ رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں، اور اپنی اس مغلوبیت کے چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے ۸ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قیصرِ روم ماریس (MAURIC) کے خلاف بغاوت ہوئی اور ایک شخص فوکاس (PHOCAS) تختِ سلطنت پر قابض ہو گیا۔ اس شخص نے پہلے تو قیصر کی آنکھوں کے سامنے اس کے پانچ بیٹوں کو قتل کرایا، پھر خود قیصر کو قتل کرا کے باپ بیٹوں کے سر قسطنطنیہ میں برسرِعام لٹکوا دیے، اور اس کے چند روز بعد اس کی بیوی اور تین لڑکیوں کو بھی مروا ڈالا۔ اس واقعہ سے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو روم پر حملہ آور ہونے کے لیے بہترین اخلاقی بہانہ مل گیا۔ قیصر ماریس اس کا محسن تھا۔ اسی کی مدد سے پرویز کو ایران کا تخت نصیب ہوا تھا۔ اُسے وہ اپنا باپ کہتا تھا۔ اس بنا پر

اُس نے اعلان کیا کہ میں غاصب فوکاس سے اُس ظلم کا بدلہ لوں گا جو اس نے میرے مجازی باپ اور اس کی اولاد پر ڈھایا ہے۔ ۶۰۳ء میں اس نے سلطنتِ رُوم کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور چند سال کے اندر وہ فوکاس کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیتا ہوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں ایڈیسا (موجودہ اُورفا) اور دوسری طرف شام میں حَلَب اور اَنطاکیہ تک پہنچ گیا۔ رُوم کے اعیانِ سلطنت یہ دیکھ کر کہ فوکاس ملک کو نہیں بچا سکتا، افریقہ کے گورنر سے مدد کے طالب ہوئے۔ اس نے اپنے بیٹے ہرقل (HERACLIUS) کو ایک طاقتور بیڑے کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس کے پہنچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا، اس کی جگہ ہرقل قیصر بنایا گیا، اور اس نے برسرِ اقتدار آ کر فوکاس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اس نے ماریس کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ۶۱۰ء کا واقعہ ہے، اور یہ وہی سال ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے۔

خسرو پرویز نے جس اخلاقی بہانے کو بنیاد بنا کر جنگ چھیڑی تھی، فوکاس کے عزل اور قتل کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا۔ اگر واقعی اس کی جنگ کا مقصد غاصب فوکاس سے اس کے ظلم کا بدلہ لینا ہوتا تو اس کے مارے جانے پر اسے نئے قیصر سے صلح کر لینی چاہیے تھی۔ مگر اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھی، اور اب اس جنگ کو اس نے مجوسیت اور مسیحیت کی مذہبی جنگ کا رنگ دے دیا۔ عیسائیوں کے جن فرقوں کو رومی سلطنت کے سرکاری کلیسا نے ملحد قرار دے کر سالہا سال سے تختۂ مشقِ ستم بنا رکھا تھا (یعنی نُسطوری اور یعقوبی وغیرہ) ان کی ساری ہمدردیاں بھی مجوسی حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئیں اور یہودیوں نے بھی مجوسیوں کا ساتھ دیا، حتّٰی کہ خسرو پرویز کی فوج میں بھرتی ہونے والے یہودیوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی۔

ہرقل آ کر اس سیلاب کو نہ روک سکا۔ تخت نشین ہوتے ہی پہلی اطلاع جو اسے مشرق سے ملی وہ اَنطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۱۳ء میں دمشق فتح ہوا۔ پھر ۶۱۴ء میں بیتُ المَقدِس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے۔ ان کا سب سے زیادہ مقدّس کلیسا، کنیستہ القیامتہ (HOLY SEPULCHRE) برباد کر دیا گیا۔ اصلی صلیب، جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اسی پر مسیح نے جان دی تھی، مجوسیوں نے چھین کر مدائن پہنچا دی۔ لاٹ پادری زکریاہ کو بھی وہ پکڑ لے گئے اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انھوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کا نشہ جس بُری طرح خسرو پرویز پر چڑھا تھا اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو اس نے بیتُ المَقدِس سے ہرقل کو لکھا تھا۔ اس میں وہ کہتا ہے:

"سب خداؤں سے بڑے خدا، تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام،

تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے۔ کیوں نہ تیرے رب نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا؟"

اس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اُردن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے پورے علاقے پر قابض ہو کر حدودِ مصر تک پہنچ گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مکہ معظمہ میں ایک اور اُس سے بدرجہا زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے والی جنگ برپا تھی۔ یہاں توحید کے علمبردار سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں، اور شرک کے پیرو کار سردارانِ قریش کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ تھے، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ۶۱۵ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر حبش کی عیسائی سلطنت میں (جو روم کی حلیف تھی) پناہ لینی پڑی۔ اس وقت سلطنتِ روم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ مکے کے مشرکین اس پر بغلیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ دیکھو ایران کے آتش پرست فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہم عرب کے بت پرست بھی تمھیں اور تمھارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے۔

ان حالات میں قرآن مجید کی یہ سورۃ نازل ہوئی اور اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ "قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں، مگر اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر ہی وہ غالب آ جائیں گے، اور وہ دن وہ ہو گا جب کہ اللہ کی دی ہوئی فتح سے اہلِ ایمان خوش ہو رہے ہوں گے۔" اس میں ایک کے بجائے دو پیشین گوئیاں تھیں۔ ایک یہ کہ رومیوں کو غلبہ نصیب ہو گا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کو بھی اُسی زمانے میں فتح حاصل ہو گی۔ بظاہر دُور دُور تک کہیں اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں سے کوئی ایک پیشین گوئی بھی چند سال کے اندر پوری ہو جائے گی۔ ایک طرف مٹھی بھر مسلمان تھے جو مکے میں مارے اور کھدیڑے جا رہے تھے اور اس پیشین گوئی کے بعد آٹھ سال تک ان کے لیے غلبہ و فتح کا کوئی امکان کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ دوسری طرف روم کی مغلوبیت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ۶۱۹ء تک پورا مصر ایران کے قبضہ میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابلس کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ ایشیائے کوچک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دباتی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور ۶۱۷ء میں انھوں عین قسطنطنیہ کے سامنے

خلقدون (CHALCEDON موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کرلیا۔ قیصر نے خسرو کے پاس ایلچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ "اب میں قیصر کو اس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک وہ پابزنجیر میرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مصلوب کو چھوڑ کر خداوند آتش کی بندگی نہ اختیار کرے۔" آخر کار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (CARTHAGE موجودہ ٹیونس) منتقل ہو جانے کا ارادہ کرلیا۔ غرض، انگریزی مؤرخ گبن کے بقول قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور تک نہ کر سکتا تھا کہ رومی سلطنت ایران پر غالب آجائے گی بلکہ غلبہ تو درکنار اس وقت تو کسی کو یہ اُمید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جائے گی۔[1]

قرآن کی یہ آیات جب نازل ہوئیں تو کفارِ مکہ نے ان کا خُوب مذاق اُڑایا اور اُبَیّ بن خلف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط بدی کہ اگر تین سال کے اندر رومی غالب آگئے تو دس اونٹ میں دوں گا ورنہ دس اونٹ تم کو دینے ہوں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ قرآن میں فِی بِضْعِ سِنِیْنَ کے الفاظ آئے ہیں، اور عربی زبان میں بِضع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے، اس لیے دس سال کے اندر کی شرط کرو اور اونٹوں کی تعداد بڑھا کر سَو کر دو۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اُبَیّ سے پھر بات کی اور نئے سرے سے یہ شرط طے ہو گئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط ثابت ہو گی وہ سو اونٹ دے گا۔

۶۲۲ء میں ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے، اور اُدھر قیصر ہرقل خاموشی کے ساتھ قسطنطنیہ سے بحرِ اسود کے راستے طرابزون کی طرف روانہ ہوا جہاں اس نے ایران پر پُشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اس جوابی حملے کی تیاری کے لیے قیصر نے کلیسا سے روپیہ مانگا اور مسیحی کلیسا کے اُسقفِ اعظم سرجیس (SERGIUS) نے مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لیے گرجاؤں کے نذرانوں کی جمع شدہ دولت سود پر قرض دی۔ ہرقل نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں آرمینیا سے شروع کیا اور دوسرے

---

[1] (GIBBON, DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE VOL II, 0,768. MODERN LIBRARY NEW YORK.

سال ۶۲۴ء میں اس نے آذربائیجان میں گھس کر زرتشت کے مقام پیدائش ارمیاہ (CLORUMIA) کو تباہ کردیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ خدا کی قدرت کا تماشا دیکھیے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کُن فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں پیش گوئیاں جو سورۂ روم میں کی گئی تھیں، دس سال کی مُدّت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پوری ہوگئیں۔

پھر روم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں۔ نینویٰ کی فیصلہ کُن لڑائی (۶۲۷ء) میں اُنھوں نے سلطنت ایران کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد شاہانِ ایران کی قیام گاہ دستگرد (دَسکرۃ الملک) کو تباہ کر دیا گیا اور آگے بڑھ کر ہرقل کے لشکر عین طیسفون (CTESIPHON) کے سامنے پہنچ گئے جو اُس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا۔ ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کے خلاف گھر میں بغاوت رُونما ہوئی۔ وہ قید کیا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ۱۸ بیٹے قتل کر دیے گئے، اور چند روز بعد وہ خود قید کی سختیوں سے ہلاک ہوگیا۔ یہی سال تھا جس میں صلح حُدَیبیہ واقع ہوئی جسے قرآن "فتح عظیم" کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اور یہی سال تھا جس میں خسرو کے بیٹے قباد ثانی نے تمام رومی مقبوضات سے دست بردار ہو کر اور اصلی صلیب واپس کر کے روم سے صُلح کر لی۔ ۶۲۹ء میں قیصر "مقدس صلیب" کو اس کی جگہ رکھنے کے لیے خود بیتُ المقدِس گیا، اور اسی سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم عُمرۃ القضا ادا کرنے کے لیے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکّۂ معظّمہ میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد کسی کے لیے بھی اس امر میں شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ قرآن کی پیشین گوئی بالکل سچی تھی۔ عرب کے بکثرت مشرکین اس پر ایمان لے آئے۔ اُبَی بن خَلف کے وارثوں کو ہار مان کر شرط کے اونٹ ابوبکر صدیقؓ کے حوالے کرنے پڑے۔ وہ انھیں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ انھیں صدقہ کر دیا جائے۔ کیونکہ شرط اس وقت ہوئی تھی جب شریعت میں جُوئے کی حُرمت کا حکم نہیں آیا تھا، مگر اب حُرمت کا حکم آچکا تھا، اس لیے حربی کافروں سے شرط کا مال تو لے لینے کی اجازت دے دی گئی مگر ہدایت کی گئی کہ اسے خود استعمال کرنے کے بجائے صدقہ کر دیا جائے۔ (۷۱)

ابن عباسؓ اور دوسرے صحابہ و تابعین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ روم و ایران کی اس لڑائی میں مسلمانوں کی ہمدردیاں روم کے ساتھ اور کفّار کی ہمدردیاں ایران کے ساتھ تھیں۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔ ایک یہ کہ ایرانیوں نے اس لڑائی کو مجوسیّت اور مسیحیّت کی لڑائی کا رنگ دے دیا تھا اور وہ ملک گیری

کے مقصد سے تجاوز کر کے اسے مجوسیت پھیلانے کا ذریعہ بنا رہے تھے۔ بیت المُقدس کی فتح کے بعد خسرو پرویز نے جو خط قیصرِ روم کو لکھا تھا اس میں صاف طور پر وہ اپنی فتح کو مجوسیت کے برحق ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے۔ اُصولی اعتبار سے مجوسیوں کا مذہب مشرکینِ مکہ کے مذہب سے ملتا جُلتا تھا، کیونکہ وہ بھی توحید کے منکر تھے، دو خداؤں کو مانتے تھے اور آگ کی پرستش کرتے تھے۔ اس لیے مشرکین کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ ان کے مقابلہ میں مسیحی خواہ کتنے ہی مبتلائے شرک ہو گئے ہوں، مگر وہ خدا کی توحید کو اصل دین مانتے تھے، آخرت کے قائل تھے، اور وحی و رسالت کو سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرتے تھے۔ اس بنا پر ان کا دین اپنی اصل کے اعتبار سے مسلمانوں کے دین سے مشابہت رکھتا تھا، اور اسی لیے مسلمان قدرتی طور پر ان سے ہمدردی رکھتے تھے اور ان پر مشرک قوم کا غلبہ انھیں ناگوار تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایک نبی کی آمد سے پہلے جو لوگ سابق نبی کو مانتے ہوں وہ اصولاً مسلمان ہی کی تعریف میں آتے ہیں اور جب تک بعد کے آنے والے نبی کی دعوت انھیں نہ پہنچے اور وہ اس کا انکار نہ کر دیں، ان کا شمار مسلمانوں ہی میں رہتا ہے۔

اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر صرف پانچ چھ برس ہی گزرے تھے اور حضورؐ کی دعوت ابھی تک باہر نہیں پہنچی تھی۔ اس لیے مسلمان عیسائیوں کا شمار کافروں میں نہیں کرتے تھے۔ البتہ یہودی ان کی نگاہ میں، کافر تھے، کیونکہ وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر چکے تھے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ آغازِ اسلام میں عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی ہی کا برتاؤ ہوا تھا جیسا کہ سورۂ قصص آیات ۵۲ تا ۵۵ اور سورۂ مائدہ آیات ۸۲ تا ۸۵ میں بیان ہوا ہے۔ بلکہ ان میں سے بہت سے لوگ کھلے دِل سے دعوتِ حق کو قبول کر رہے تھے۔ پھر ہجرت حبشہ کے موقع پر جس طرح حبش کے عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں کو پناہ دی اور ان کی واپسی کے لیے کفارِ مکہ کے مطالبے کو ٹھکرا دیا اس کا بھی یہ تقاضا تھا کہ مسلمان مجوسیوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کے خیر خواہ ہوں۔ (۴۲)

وفدِ نجران رسالت مآب کی خدمت میں

۹ھ میں نجران کی عیسائی جمہوریت کا وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ نجران کا علاقہ حجاز اور یمن کے درمیان ہے۔ اس وقت اس علاقے میں ۷۳ بستیاں شامل تھیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ ۲۰ ہزار قابلِ جنگ مرد اس میں سے نکل سکتے تھے۔ آبادی تمام تر عیسائی تھی اور تین سرداروں کے زیرِ حکم تھی۔ ایک عاقب کہلاتا تھا، جس کی حیثیت امیرِ قوم کی تھی۔ دوسرا سید کہلاتا تھا، جو ان کے تمدنی و سیاسی اُمور کی نگرانی کرتا تھا

اور تیسرا اُسقُف (بشپ) تھا جس سے مذہبی پیشوائی متعلق تھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ فتح کیا اور تمام اہلِ عرب کو یقین ہو گیا کہ ملک کا مستقبل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے، تو عرب کے مختلف گوشوں سے آپ کے پاس وفد آنے شروع ہو گئے۔ اسی سلسلے میں نجران کے تینوں سردار بھی، ۲۰ آدمیوں کا ایک وفد لے کر مدینے پہنچے۔ جنگ کے لیے بہر حال وہ تیار نہ تھے۔ اب سوال صرف یہ تھا کہ آیا وہ اسلام قبول کرتے ہیں یا ذمّی بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ خطبہ نازل کیا تاکہ اس کے ذریعے سے وفدِ نجران کو اسلام کی طرف دعوت دی جائے۔ (۴۳)

پہلا امر جو ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ ہے کہ مسیح کی الوہیت کا اعتقاد تمھارے اندر جن وجوہ سے پیدا ہوا ہے، ان میں سے کوئی وجہ بھی ایسے اعتقاد کے لیے صحیح نہیں ہے۔ ایک انسان تھا جس کو اللہ نے اپنی مصلحتوں کے تحت مناسب سمجھا کہ غیر معمولی صورت سے پیدا کرے اور ایسے معجزے عطا کرے جو نبوّت کی صریح علامت ہوں، اور منکرینِ حق کو اسے صلیب پر نہ چڑھانے دے بلکہ اس کو اپنے پاس اُٹھا لے۔ مالک کو اختیار ہے، اپنے جس بندے کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ محض اس غیر معمولی برتاؤ کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ خود مالک تھا، یا مالک کا بیٹا تھا، یا ملکیت میں اس کا شریک تھا۔

دوسری اہم بات جو ان کو سمجھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مسیح جس چیز کی طرف دعوت دینے آئے تھے وہ وہی چیز ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے ہیں۔ دونوں کے مشن میں یک سر مُو فرق نہیں ہے۔

تیسرا بنیادی نکتہ اس تقریر کا یہ ہے کہ مسیح کے بعد ان کے حواریوں کا مذہب بھی یہی اسلام تھا جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ بعد کی عیسائیت نہ اس تعلیم پر قائم رہی جو مسیح علیہ السّلام نے دی تھی اور نہ اس مذہب کی پیرو رہی جس کا اتباع مسیح کے حواری کرتے تھے۔ (۴۴)

مسیحیت کے مختلف عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کتبِ مقدسہ کی ایسی سند نہ پاتے تھے جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ امرِ واقعہ کے عین مطابق ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپ کی تعلیم اور آپ کے کارناموں کو دیکھ

لہ مقاتل بن سلیمان کی روایت میں تصریح ہے کہ وفدِ نجران کی آمد پر وہ آیات نازل ہوئیں جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے بیان میں مشتمل ہیں اور جن کی تعداد ۳۰ یا اس سے کچھ زائد ہے۔ (از مؤلف)

گر اکثر اہلِ وفد اپنے دلوں میں آپ کی نبوت کے قائل بھی ہو گئے تھے۔ یا کم از کم اپنے انکار میں تنزل ہو چکے تھے۔ اس لیے جب ان سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمھیں اپنے عقیدے کی صداقت پر پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلہ میں دعا کرو کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو، تو ان میں سے کوئی اس مقابلہ کے لیے تیار نہ ہوا۔

اس طرح یہ بات تمام عرب کے سامنے کھل گئی کہ نجرانی مسیحیت کے پیشوا اور پادری جن کے تقدس کا سکہ دور دور تک رواں ہے دراصل ایسے عقائد کا اتباع کر رہے ہیں جن کی صداقت پر خود انھیں کامل اعتماد نہیں ہے۔ (۰۵)

حبشہ سے وفد کی آمد

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ (القصص۔ آیت۔ ۵۲)

ترجمہ: ”جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی وہ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں“۔

اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ تمام اہلِ کتاب (یہودی اور عیسائی) اس پر ایمان لاتے ہیں۔ بلکہ یہ اشارہ دراصل اس واقعہ کی طرف ہے جو اس سورہ کے نزول کے زمانہ میں پیش آیا تھا۔

اس واقعہ کو ابنِ ہشام اور بیہقی وغیرہ نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ ہجرتِ حبشہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت کی خبریں حبش کے ملک میں پھیلیں تو وہاں سے ۲۰ کے قریب عیسائیوں کا ایک وفد تحقیقِ حال کے لیے مکہ معظمہ آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجدِ حرام میں ملا۔ قریش کے بہت سے لوگ بھی یہ ماجرا دیکھ کر گرد و پیش کھڑے ہو گئے۔ وفد کے لوگوں نے حضورؐ سے کچھ سوالات کیے، جن کا آپ نے جواب دیا۔ پھر آپؐ نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور قرآن مجید کی آیات ان کے سامنے پڑھیں۔ قرآن سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انھوں نے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کی اور حضورؐ پر ایمان لے آئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو ابوجہل اور اس کے چند ساتھیوں نے ان لوگوں کو راستہ میں جا لیا اور سخت ملامت کی کہ بڑے نامراد ہو تم لوگ، ”تمھارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لیے بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ اور انھیں ٹھیک ٹھیک خبر دو، مگر تم ابھی اس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر اس پر ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ احمق گروہ تو کبھی ہماری نظر سے نہیں گزرا“۔ اس پر انھوں نے جواب دیا کہ ”سلام ہے بھائیو تم کو۔ ہم تمھارے ساتھ جہالت بازی نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔[1] ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔“ (سیرت

---

[1] وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (بقیہ بر صفحہ)

ابن ہشام ج ۲،ص ۳۲ - البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۸۲)۔ (۷۶)

وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ۔ (القصص۔ آیت ۵۳)

ترجمہ:۔ "اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں۔"

یعنی اس سے پہلے بھی ہم انبیاء اور کتبِ آسمانی کے ماننے والے تھے، اس لیے اسلام کے سوا ہمارا کوئی اور دین نہ تھا اور اب جو نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب لے کر آیا ہے اسے بھی ہم نے مان لیا ہے، لہٰذا درحقیقت ہمارے دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے بلکہ جیسے ہم پہلے مسلمان تھے ویسے ہی اب بھی مسلمان ہیں۔ (۷۷)

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (القصص۔ آیت ۵۴)

ترجمہ:۔ "یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ان کا اجر دوبار دیا جائے گا اس ثابت قدمی کے بدلے جو انھوں نے دکھائی۔ وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

یعنی ایک اجر اُس ایمان کا جو وہ پہلے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر رکھتے تھے اور دوسرا اجر اس ایمان کا جو وہ اب نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لائے۔ یہی بات اس حدیث میں بیان کی گئی ہے جو بخاری و مسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثلثة لهم اجران رجل من اهل الكتب أمن بنبيه وأمن بمحمد ...... "تین شخص ہیں جن کو دہرا اجر ملے گا۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو اہل کتاب میں سے تھا اور اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا، پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لایا۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ (القصص۔ آیت ۵۵)

ترجمہ۔ "اور جب انھوں نے بیہودہ بات سُنی تو یہ کہہ کر کنارہ کش ہوگئے کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمھارے اعمال تمھارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔" (مرتبین)

انھیں یہ دوہرا اجر اس بات کا ملے گا کہ وہ قومی و نسلی اور وطنی و گروہی تعصبات سے بچ کر اصل دینِ حق پر ثابت قدم رہے اور نئے نبی کی آمد پر جو سخت امتحان درپیش ہوا اس میں انھوں نے ثابت کر دیا کہ دراصل وہ مسیح پرست نہیں بلکہ خدا پرست تھے، اور شخصیتِ مسیح کے گرویدہ نہیں بلکہ اسلامؑ کے متبع تھے۔ اسی وجہ سے مسیح کے بعد جب دوسرا نبی وہی اسلام لے کر آیا جسے مسیح لائے تھے تو انھوں نے بے تکلف اس کی رہنمائی میں اسلام کا راستہ اختیار کر لیا اور ان لوگوں کا راستہ چھوڑ دیا جو مسیحیت پر جمے رہ گئے۔

وہ بدی کا جواب بدی سے نہیں بلکہ نیکی سے دیتے ہیں۔ جھوٹ کے مقابلے میں جھوٹ نہیں بلکہ صداقت لاتے ہیں۔ ظلم کو ظلم سے نہیں بلکہ انصاف سے دفع کرتے ہیں۔ شرارتوں کا سامنا شرارت سے نہیں بلکہ شرافت سے کرتے ہیں۔ یعنی وہ راہِ حق میں مالی ایثار بھی کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں اشارہ اس طرف بھی ہو کہ وہ لوگ محض حق کی تلاش میں حبش سے سفر کر کے مکے آئے تھے۔ اس محنت اور صرفِ مال سے کوئی مادی منفعت ان کے پیشِ نظر نہ تھی۔ انھوں نے جب سنا کہ مکہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور انھوں نے ضروری سمجھا کہ خود جا کر تحقیق کریں تاکہ اگر واقعی ایک نبی ہی خدا کی طرف سے مبعوث ہوا ہو تو وہ اس پر ایمان لانے اور ہدایت پانے سے محروم نہ رہ جائیں (۷۰)

فصل ۲

مسیحی عقائد اور تصوّرات کی اصلاح کے لیے قرآن کی تلقینات

اُلُوہیت مسیح کی تردید

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا۔ (النسا ۔ ۱۷۲)

ترجمہ:۔ ”مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو، اور نہ مقرب ترین فرشتے اس کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا ہے اور تکبّر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ تعالیٰ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔“

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (المائدہ ۵ ۔ ۱۷)

ترجمہ:۔ ”یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا مسیح ابنِ مریم ہی خدا ہیں۔“

عیسائیوں نے ابتداءً مسیح کی شخصیت کو انسانیت اور اُلُوہیت کا مرکّب قرار دے کر جو غلطی کی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے مسیح کی حقیقت ایک معمّا بن کر رہ گئی جسے اُن کے علماء نے لفاظی اور قیاس آرائی کی مدد سے حل کرنے کی جتنی کوشش کی اتنے ہی زیادہ اُلجھتے چلے گئے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر اس مرکّب شخصیت کے جُزوِ انسانی نے غلبہ کیا اس نے مسیح کے ابن اللہ ہونے اور تین مستقل خداؤں میں سے ایک ہونے پر زور دیا۔ اور جس کے ذہن پر جُزوِ اُلُوہیت کا اثر زیادہ غالب ہوا اس نے مسیح کو اللہ تعالیٰ کا جسمانی ظہور قرار دے کر عین اللہ بنا دیا اور اللہ ہونے کی حیثیت ہی سے مسیح کی عبادت کی۔ ان کے درمیان بیچ کی راہ جنھوں نے نکالنی چاہی انھوں نے سارا زور ایسی لفظی تعبیر میں فراہم کرنے پر صرف کر دیا جن سے مسیح کو انسان بھی کہا جاتا رہے اور اس کے ساتھ خدا بھی سمجھا جا سکے۔ خدا اور مسیح الگ الگ بھی ہوں اور پھر ایک بھی رہیں۔ (۷۹)

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک گروہ نے ان کا انکار کیا تو مخالفت میں اس حد تک پہنچ گیا کہ ان پر ناجائز ولادت کی تہمت لگائی اور ان کو اپنے نزدیک سولی پر چڑھوا کر چھوڑا۔ دوسرے گروہ نے ان کا اقرار کیا تو عقیدت میں بے تحاشا غلو کر کے ان کو خدا کا بیٹا بنا بیٹھا اور پھر ایک انسان کے خدا ہونے کا مسئلہ اس کے لیے ایسی گتھی بنا جسے سلجھاتے سلجھاتے اس میں بے شمار فرقے بن گئے

وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ
بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ
اَنْصَارٍ ۝ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۝ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ مَا الْمَسِيْحُ
ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا
يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ (المائدہ[1]
آیات ۷۲ تا ۷۵)

ترجمہ: "حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل، اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے، حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے ان کو دردناک سزا دی جائے گی۔ پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے؟ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا، اس سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے، اس کی ماں ایک راستباز عورت تھی، اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں، پھر دیکھو یہ کدھر اُلٹے پھرے جاتے ہیں۔"

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ج ۱، النساء، حواشی ۲۱۱ تا ۲۱۶، المائدہ، حواشی ۳۹-۴۰-۱۰۱-۱۳۰)

ان چند لفظوں میں عیسائیوں کے عقیدۂ اُلوہیتِ مسیح کی ایسی صاف تردید کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ صفائی ممکن نہیں ہے۔ مسیح کے بارے میں اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ فی الحقیقت وہ کیا تھا تو ان علامات سے بالکل غیر مشتبہ طور پر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ محض ایک انسان تھا۔ ظاہر ہے کہ جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا، جس کا شجرۂ نسب تک موجود ہے، جو انسانی جسم رکھتا تھا، جو ان تمام حُدود سے محدُود اور ان تمام قیوُد سے مُقیّد اور ان تمام صفات سے مُتّصف تھا جو انسان کے لیے مخصوص ہیں، جو سوتا تھا، گرمی اور سردی محسوس کرتا تھا، حتّٰی کہ جسے شیطان کے ذریعے سے آزمائش میں بھی ڈالا گیا، اس کے متعلق کون معقول انسان یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ وہ خود خدا ہے یا خدائی میں خدا کا شریک و سہیم ہے۔ لیکن یہ انسانی ذہن کی ضلالت پذیری کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ عیسائی خود اپنی مذہبی کتابوں میں مسیح کی زندگی کو صریحاً ایک انسانی زندگی پاتے ہیں اور پھر بھی اُسے خدائی سے مُتّصف قرار دینے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس تاریخی مسیح کے قائل ہی نہیں ہیں جو عالمِ واقعہ میں ظاہر ہوا تھا، بلکہ انھوں نے خود اپنے وہم و گمان سے ایک خیالی مسیح تصنیف کر کے اُسے خدا بنا لیا تھا۔ (۸۱)

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ڟ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ۔ (النساء ۔ ۱۷۱)

ترجمہ:۔ ”اے اہلِ کتاب، اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے (جس نے مریم کے رحم میں بچّہ کی شکل اختیار کی) پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ ”تین“ ہیں۔ باز آجاؤ، یہ تمھارے ہی لیے بہتر ہے۔“

یعنی تین الٰہوں کے عقیدے کو چھوڑ دو خواہ وہ کسی شکل میں تمھارے اندر پایا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی بیک وقت توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ مسیح علیہ السلام کے صریح اقوال جو اناجیل میں ملتے ان کی بنا پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا بس ایک ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا

خدا نہیں ہے۔ ان کے لیے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ توحید اصل دین ہے۔ مگر وہ جو ایک غلط فہمی ابتداء میں ان کو پیش آگئی تھی کہ کلام اللہ نے مسیح کی شکل میں ظہور کیا اور روح اللہ نے اس میں حلول کیا، اس کی وجہ سے اُنھوں نے مسیح اور رُوح القدس کی اُلُوہیت کو بھی خداوندِ عالم کی اُلُوہیت کے ساتھ ماننا خواہ مخواہ لازم کر لیا۔ اس زبردستی کے التزام سے ان کے لیے یہ مسئلہ ناقابلِ حل چیستان بن گیا کہ عقیدۂ توحید کے باوجود عقیدۂ تثلیث کو، اور عقیدۂ تثلیث کے باوجود عقیدۂ توحید کو کس طرح نباہیں۔ تقریباً ۱۸ سو برس سے مسیحی علماء اسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے میں سر کھپا رہے ہیں۔ بیسیوں فرقے اسی کی مختلف تعبیرات پر بنے ہیں۔ اسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے۔ اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہوتے چلے گئے۔ اسی پر ان کے سارے علمِ کلام کا زور صرف ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی، نہ اس کے بھیجے ہوئے مسیح نے، اور نہ اس مشکل کا کوئی حل ممکن ہے کہ خدا تین بھی مانے جائیں اور پھر وحدانیت بھی برقرار رہے۔ اس مشکل کو صرف ان کے غلو نے پیدا کیا ہے اور اس کا بس یہی ایک حل ہے کہ وہ غلو سے باز آجائیں، مسیح اور رُوح القدس کی اُلُوہیت کا تخیل چھوڑ دیں، صرف اللہ کو الٰہِ واحد تسلیم کر لیں، اور مسیح کو صرف اس کا پیغمبر قرار دیں نہ کہ کسی طور پر شریک فی الالوہیت۔ (۸۲)

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۔ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۔ (النساء ۔ ۱۷۱)

ترجمہ:۔ "اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ زمین اور اور آسمانوں کی ساری چیزیں اسی کی مِلک ہیں اور ان کی کفالت و خبرگیری کے لیے بس وہی کافی ہے۔"

یہ عیسائیوں کے ایک بڑے غلو کی تردید ہے۔ بائبل کے عہدِ جدید کی روایات اگر صحیح بھی ہوں تو ان سے (خصوصاً پہلی تین انجیلوں سے) زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے خدا اور بندوں کے تعلق کو باپ اور اولاد کے تعلق سے تشبیہ دی تھی اور "باپ" کا لفظ خدا کے لیے وہ محض مجاز اور استعارہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ تنہا مسیح ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے بنی اسرائیل خدا کے لیے باپ کا لفظ بولتے چلے آرہے تھے اور اس کی بکثرت مثالیں بائبل کے پرانے عہد نامہ میں موجود ہیں۔ مسیح نے یہ لفظ اپنی قوم کے محاورے کے مطابق ہی استعمال کیا تھا اور وہ خدا کو صرف اپنا باپ ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کا باپ کہتے تھے۔ لیکن عیسائیوں نے یہاں پھر غلو سے کام لیا اور مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دیا۔ ان کا عجیب و غریب نظریہ اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ مسیح خدا کا مظہر ہے، اور اس کے کلمے اور اس کی رُوح کا جسدی

ظہور ہے، اس لیے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے، اور خدا نے اپنے اکلوتے کو زمین پر اس لیے بھیجا کہ انسانوں کے گناہ اپنے سر لے کر صلیب پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسان کے گناہ کا کفارہؒ ادا کرے۔ حالانکہ اس کا کوئی ثبوت خود مسیح علیہ السلام کے کسی قول سے وہ نہیں دے سکتے۔ یہ عقیدہ ان کے اپنے تخیلات کا آفریدہ ہے اور اس غا' نتیجہ ہے جس میں وہ اپنے پیغمبر کی عظیم الشان شخصیت سے متاثر ہو کر مبتلا ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارہ کے عقیدے کی تردید نہیں کی ہے، کیونکہ عیسائیوں کے ہاں یہ کوئی مستقل عقیدہ نہیں ہے بلکہ مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا شاخسانہ اور اس سوال کی ایک صوفیانہ و فلسفیانہ توجیہ ہے کہ جب مسیح خدا کا اکلوتا تھا تو وہ صلیب پر چڑھ کر لعنت کی موت کیوں مرا۔ لہٰذا اس عقیدے کی تردید آپ سے آپ ہو جاتی ہے۔ اگر مسیح کے ابن اللہ ہونے کی تردید کر دی جائے اور اس غلط فہمی کو دور کر دیا جائے کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے۔ (۸۳)

زمین و آسمان کی موجودات میں سے کسی کے ساتھ بھی خدا کا تعلق باپ اور بیٹے کا نہیں ہے۔ بلکہ محض مالک اور مملوک کا تعلق ہے۔

خدا اپنی خدائی کا انتظام کرنے کے لیے خود کافی ہے، اس کو کسی سے مدد لینے کی حاجت نہیں کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ (۸۴)

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ۝ وَقَالُوا أَآلِهَتُنَا
خَيْرٌ أَمْ هُوَ ۚ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا
عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ (الزخرف ۔ ۵۷ تا ۵۹)

لہ دینِ عیسوی کی پوری عمارت اس عقیدے پر قائم ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے (یعنی حضرت عیسٰیؑ) کو صلیب پر لعنت کی موت دی جس سے وہ انسان کے گناہ کا کفارہ بن گیا۔ اور انبیاء کی اُمتوں کے درمیان عیسائیوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے صرف عقیدے کو لے کر خدا کی پوری شریعت رد کر دی حتّٰی کہ خنزیر تک کو حلال کر لیا جو تمام انبیاء کی شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ پس جب حضرت عیسٰی علیہ السلام آکر خود اعلان کر دیں گے کہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہ میں نے صلیب پر جان دی، نہ میں کسی کے گناہ کا کفارہ بنا تو عیسائی عقیدے کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ اسی طرح جب وہ بتائیں گے کہ میں نے نہ تو اپنے پیروؤں کے لیے سؤر حلال کیا تھا اور نہ ان کو شریعت کی پابندی سے آزاد ٹھہرایا تھا، تو عیسائیت کی دوسری امتیازی خصوصیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ (از مؤلف)

ترجمہ: "اور جونہی کہ ابن مریم کی مثال دی گئی، تمہاری قوم کے لوگوں نے اس پر غل مچا دیا اور لگے کہنے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟ یہ مثال وہ تمہارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں، در حقیقت یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنایا۔"

قدرت کا نمونہ بنانے سے مراد حضرت عیسیٰ کو بے باپ کے پیدا کرنا، اور پھر ان کو وہ معجزے عطا کرنا ہے جو نہ اُن سے پہلے کسی کو دیے گئے تھے نہ ان کے بعد۔ وہ مٹی کا پرندہ بناتے اور اس میں پھونک مارتے تو وہ جیتا جاگتا پرندہ بن جاتا۔ وہ مادر زاد اندھے کو بینا کر دیتے۔ وہ کوڑھ کے مریض کو تندرست کر دیتے۔ حتیٰ کہ وہ مُردے کو جلا دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ محض اس غیر معمولی پیدائش اور ان عظیم معجزات کی وجہ سے ان کو بندگی سے بالاتر سمجھنا اور خدا کا بیٹا قرار دے کر ان کی عبادت کرنا غلط ہے۔ ان کی حیثیت ایک بندے سے زیادہ کچھ نہ تھی جسے ہم نے اپنے انعامات سے نواز کر اپنی قدرت کا نمونہ بنا دیا تھا[لہ]۔ (۸۵)

سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ فِي
السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ
اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (الزخرف۔ آیات ۸۲ تا ۸۵)

ترجمہ: "پاک ہے آسمانوں اور زمین کا فرمانروا عرش کا مالک، ان ساری باتوں سے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا، اور وہی حکیم و علیم ہے۔ بہت بالا و برتر ہے وہ جس کے قبضے میں زمین اور آسمانوں اور ہر اس چیز کی بادشاہی ہے جو زمین و آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے اور وہی قیامت کی گھڑی کا علم رکھتا ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔"

یعنی آسمان اور زمین کے خدا الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ ساری کائنات کا ایک ہی خدا ہے۔ اسی کی حکمت اس پورے نظامِ کائنات میں کار فرما ہے، اور وہی تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔

[لہ] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول، آل عمران، حواشی ۴۲ تا ۴۴۔ النساء۔ ۱۹۰، المائدہ، حواشی ۴۰۔ ۴۶۔ ۱۲۷۔ جلد سوم، مریم، حواشی ۱۵ تا ۲۲۔ الانبیاء، حواشی ۸۸ تا ۹۰۔ المومنون، حاشیہ ۴۳۔

اس کی ہستی اس سے بدرجہا بلند و برتر ہے کہ کوئی خدائی میں اس کا شریک ہو اور اس عظیم کائنات کی فرمانروائی میں کچھ بھی دخل رکھتا ہو۔ زمین و آسمان میں جو بھی ہے، خواہ وہ انبیاء ہوں یا اولیاء، فرشتے ہوں یا جن یا ارواح، ستارے ہوں یا سیارے، سب اس کے بندے اور غلام اور تابع فرمان ہیں۔ ان کا خدائی صفات سے متصف یا خدائی اختیار کا حامل ہونا قطعی ناممکن ہے۔ ⑧⑥

حضرت عیسیٰؑ کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے تھے

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (المائدہ ۵-۴۶)

ترجمہ: "پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا۔ تورات میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔"

یعنی مسیح علیہ السلام کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہی ایک دین، جو تمام پچھلے انبیاء کا دین تھا، مسیح کا دین بھی وہی تھا اور اسی کی طرف وہ دعوت دیتے تھے۔ تورات کی اصل تعلیمات میں سے جو کچھ ان کے زمانہ میں محفوظ تھا اس کو مسیح خود بھی مانتے تھے اور انجیل بھی اس کی تصدیق کرتی تھی (ملاحظہ ہو متی باب ۵ آیت ۱۷-۱۸) قرآن اس حقیقت کا بار بار اعادہ کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے انبیاء دنیا کے کسی گوشے میں آئے ہیں ان میں سے کوئی بھی پچھلے انبیاء کی تردید کے لیے اور ان کے کام کو مٹا کر اپنا نیا مذہب چلانے کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ ہر نبی اپنے پیشرو انبیاء کی تصدیق کرتا تھا اور اسی کام کو فروغ دینے کے لیے آتا تھا جسے اگلوں نے ایک پاک ورثہ کی حیثیت سے چھوڑا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کوئی کتاب، اپنی ہی پچھلی کتابوں کی تردید کرنے کے لیے کبھی نہیں بھیجی بلکہ اس کی ہر کتاب پہلے آئی ہوئی کتابوں کی مؤید اور مصدق تھی۔ ⑧⑦

حواریانِ عیسیٰؑ مسلم تھے

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ

اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝ (المائدہ۔ آیت ۱۱۱)

ترجمہ:۔ "اور جب میں نے حواریوں کو اشارہ کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تب انھوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔"

یعنی حواریوں کا تجھ پر ایمان لانا بھی ہمارے فضل اور توفیق کا نتیجہ تھا، ورنہ تجھ میں تو اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ اس جھٹلانے والی آبادی میں ایک ہی تصدیق کرنے والا اپنے بل بوتے پر پیدا کر لیتا۔ ضمناً یہاں یہ بھی اشارہ بتا دیا کہ حواریوں کا اصل دین اسلام تھا نہ کہ عیسائیت۔ (۸۸)

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (المائدہ۔ آیت ۱۱۲ تا ۱۱۴)

ترجمہ: "(حواریوں کے سلسلہ میں) یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰؑ ابنِ مریم، کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار سکتا ہے؟ تو عیسیٰؑ نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ انھوں نے کہا ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان سے کھانا کھائیں اور ہمارے دِل مطمئن ہوں اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔ اس پر عیسیٰؑ نے دعا کی۔ خدایا، ہمارے رب، ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر جو ہمارے لیے اور ہمارے اگلے پچھلوں کے لیے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، ہم کو رزق دے اور تو بہترین رازق ہے۔"

چونکہ حواریوں کا ذکر آ گیا تھا اس لیے سلسلہ کلام کو توڑ کر جملہ معترضہ کے طور پر یہاں حواریوں ہی کے متعلق ایک اور واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا جس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ مسیحؑ سے براہِ راست جن شاگردوں نے تعلیم پائی تھی وہ مسیح کو ایک انسان اور محض ایک بندہ سمجھتے تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی اپنے مُرشد کے خدا یا شریکِ خدا یا فرزندِ خدا ہونے کا تصور نہ تھا۔ نیز یہ کہ مسیحؑ نے خود بھی اپنے آپ

کو ان کے سامنے ایک بندۂ بے اختیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جو گفتگو قیامت کے روز ہونے والی ہے، اس کے اندر اس جملۂ معترضہ کا کونسا موقع ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملۂ معترضہ اس گفتگو سے متعلق نہیں ہے جو قیامت کے روز ہوگی بلکہ اس کی اس پیشگی حکایت سے متعلق ہے جو اس دنیا میں کی جا رہی ہے۔ قیامت کی اس ہونے والی گفتگو کا ذکر بیان کیا ہی اس لیے جا رہا ہے کہ موجودہ زندگی میں عیسائیوں کو اس سے سبق ملے اور وہ راہِ راست پر آئیں۔ لہٰذا اس گفتگو کے سلسلہ میں حواریوں کے اس واقعہ کا ذکر بطور ایک جملہ معترضہ کے آنا کسی طرح غیر متعلق نہیں ہے۔ (۸۹)

قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ (المائدہ آیت - ۱۱۵)

ترجمہ: "اللہ نے جواب دیا "میں اس کو تم پر نازل کرنے والا ہوں، مگر اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا اسے میں ایسی سزا دوں گا جو دنیا میں کسی کو نہ دی ہوگی۔"

قرآن اس بات میں خاموش ہے کہ یہ خوان فی الواقع اتارا گیا یا نہیں۔ دوسرے کسی معتبر ذریعے سے بھی اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ یہ نازل ہوا ہو اور ممکن ہے کہ حواریوں نے بعد کی خوفناک دھمکی سن کر اپنی درخواست واپس لے لی ہو۔ (۹۰)

عیسائیوں کا اقامتِ انجیل سے انحراف

وَلْیَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْهِ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدہ - آیت ۴۷)

ترجمہ: "ہمارا حکم تھا کہ اہلِ انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کیے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کافر ہیں، دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں، تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے، وہ دراصل تین بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اوّلاً اس کا یہ فعل حکمِ خداوندی

کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہو سکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا، اس لیے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی و اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر اور ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف از حکمِ خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ البتہ جس طرح انحراف کے درجات و مراتب میں فرق ہے اسی طرح ان تینوں چیزوں کے مراتب میں بھی فرق ہے۔ جو شخص حکمِ الٰہی کے خلاف اس بنا پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو غلط اور اپنے یا کسی دوسرے انسان کے حکم کو صحیح سمجھتا ہے وہ مکمل کافر اور ظالم اور فاسق ہے۔ اور جو اعتقاداً حکمِ الٰہی کو برحق سمجھتا ہے مگر عملاً اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ اگرچہ خارج از ملت تو نہیں ہے مگر اپنے ایمان کو کفر، ظلم اور فسق سے مخلوط کر رہا ہے۔ اسی طرح جس نے تمام معاملات کو حکمِ الٰہی سے انحراف اختیار کر لیا ہے وہ تمام معاملات میں کافر، ظالم اور فاسق ہے۔ اور جو بعض معاملات میں مطیع اور بعض میں منحرف ہے اس کی زندگی میں ایمان و اسلام اور کفر و ظلم و فسق کی آمیزش ٹھیک ٹھیک اسی تناسب کے ساتھ ہے جس تناسب کے ساتھ اس نے اطاعت، اور انحراف کو ملا رکھا ہے۔ بعض اہلِ تفسیر نے ان آیات کو اہلِ کتاب کے ساتھ مخصوص قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر کلامِ الٰہی کے الفاظ میں اس تاویل کے لیے کوئی گنجائش موجود نہیں۔ اس تاویل کا بہترین جواب وہ ہے جو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دیا ہے۔ ان سے کسی نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں ہیں۔ کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ یہودیوں میں سے جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کیا ہو وہی کافر، وہی ظالم اور وہی فاسق ہے۔ اس پر حضرت حذیفہؓ نے فرمایا نعم الاخوۃ لکم بنو اسرائیل ان کانت لھم کل مُرّۃ ولکم کل حلوۃ کلا واللہ لتسلکن طریقھم قدر الشراک۔ کتنے اچھے بھائی ہیں تمہارے لیے یہ بنی اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لیے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمہارے لیے! ہرگز نہیں، خدا کی قسم تم انہی کے طریقہ پر قدم بقدم چلو گے۔ (۹۱)

قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَىْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَ
مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

مِّنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (المائدہ ۵ - آیت ۶۸)

ترجمہ: صاف کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔ ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے۔ مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔"

تورات اور انجیل کو قائم کرنے سے مراد راستبازی کے ساتھ ان کی پیروی کرنا اور انھیں اپنا دستورِ زندگی بنانا ہے۔ اس موقع پر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بائیبل کے مجموعۂ کتبِ مقدسہ میں ایک قسم کی عبارات تو وہ ہیں جو یہودی اور عیسائی مصنّفین نے بطورِ خود لکھی ہیں اور دوسری قسم کی عبارات وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادات یا حضرت موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کے اقوال ہونے کی حیثیت سے منقول ہیں اور جن میں اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ نے ایسا فرمایا یا فلاں نبی نے ایسا کہا۔ ان میں سے پہلی قسم کی عبارات کو الگ کر کے اگر کوئی شخص صرف دوسری قسم کی عبارات کا تتبُّع کرے تو بآسانی یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ اگرچہ مترجموں اور ناسخوں اور شارحوں کی دراندازی سے، اور بعض جگہ زبانی راویوں کی غلطی سے، یہ دوسری قسم کی عبارات بھی پوری طرح محفوظ نہیں رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان میں بعینہٖ اسی خالص توحید کی دعوت دی گئی ہے جس کی طرف قرآن بلا رہا ہے، وہی عقائد پیش کیے گئے ہیں جو قرآن پیش کرتا ہے۔ اور اسی طریقِ زندگی کی طرف رہنمائی کی گئی ہے جس کی ہدایت قرآن دیتا ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی اسی تعلیم پر قائم رہتے جو ان کتابوں میں خدا اور پیغمبروں کی طرف سے منقول ہے تو یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت وہ ایک حق پرست اور راست رو گروہ پائے جاتے اور انھیں قرآن کے اندر وہی روشنی نظر آتی جو پچھلی کتابوں میں پائی جاتی تھی۔ اس صورت میں ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے میں تبدیلِ مذہب کا سرے سے کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اسی راستہ کے تسلسل میں، جس پر وہ پہلے سے چلے آ رہے تھے، آپ کے متبع بن کر آگے چل سکتے تھے۔ (۹۲)

عیسائیت اور یہودیت ذریعہ ہدایت نہیں

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (البقرہ - ۱۳۵)

ترجمہ:- "یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو تو راہِ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ ان سے کہو: نہیں، بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ کا طریقہ۔ اور ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہ تھا۔"

اس جواب کی لطافت سمجھنے کے لیے دو باتیں نگاہ میں رکھیے:-

ایک یہ کہ یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ "یہودیت" اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی۔ اور "عیسائیت" جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے وہ تو حضرت مسیحؑ کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسرِ ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے ہی پر ہے، تو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء اور نیک لوگ، جو ان مذہبوں کی پیدائش سے صدیوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو خود یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں، وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ "یہودیت" اور "عیسائیت" نہ تھی۔ لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار ان مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے، جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں، بلکہ دراصل اس کا مدار اس عالمگیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے، جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ خود یہود و نصاریٰ کی اپنی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کی پرستش، تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے اور ان کا مشن ہی یہ تھا کہ خدائی کی صفات و خصوصیات میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ لہٰذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اس راہِ راست سے منحرف ہو گئی ہیں، جس پر حضرت ابراہیمؑ چلتے تھے، کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہو گئی ہے۔ (۹۳)

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (البقرہ - ۱۴۰)

ترجمہ:- "تمہاری حرکات سے اللہ غافل تو نہیں۔"

یہ خطاب ان کے علماء سے ہے، جو خود بھی اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے کہ یہودیت اور عیسائیت

اپنی موجودہ خصوصیات کے ساتھ بہت بعد میں پیدا ہوئی ہیں، مگر اس کے باوجود وہ حق کو اپنے ہی فرقوں میں محدود سمجھتے تھے اور عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ انبیاء کے مدتوں بعد جو عقیدے، جو طریقے اور جو اجتہادی ضابطے اور قاعدے ان کے فقہاء، صوفیہ اور متکلمین نے وضع کیے، انھیں کی پیروی پر انسان کی فلاح اور نجات کا مدار ہے۔ ان علماء سے جب پوچھا جاتا تھا کہ اگر یہی بات ہے، تو حضرت ابراہیم، اسحاق، یعقوب وغیرہ انبیاء علیہم السلام آخر تمہارے ان فرقوں میں سے کس سے تعلق رکھتے تھے، تو وہ اس کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے، کیونکہ ان کا علم انھیں یہ کہنے کی تو اجازت نہ دیتا تھا کہ ان بزرگوں کا تعلق ہمارے ہی فرقے سے تھا۔ لیکن اگر وہ صاف الفاظ میں یہ مان لیتے کہ انبیاء نہ یہودی تھے، نہ عیسائی تو پھر ان کی حجت ہی ختم ہو جاتی تھی۔ (٩٤)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

(المائدہ۔ آیت ٦٩)

ترجمہ:۔ "(یقین جانو کہ یہاں اجارہ کسی کا بھی نہیں ہے) مسلمان ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا عیسائی، جو بھی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا بے شک اس کے لیے نہ کسی خوف کا مقام ہے نہ رنج کا۔"

یعنی یہ بات سن کر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور حقیقت کو سمجھنے کے بجائے وہ ضد میں آ کر اور زیادہ شدید مخالفت شروع کر دیں گے۔ حالانکہ اللہ کے ہاں اصل چیز ان کی گروہ بندیاں نہیں ہیں بلکہ وہاں جو کچھ اعتبار ہے، وہ ایمان اور عمل صالح کا ہے۔ جو انسان بھی یہ چیز لے کر حاضر ہوگا وہ اپنے رب سے اپنا اجر پائے گا۔ خدا کے ہاں فیصلہ آدمی کی صفات پر ہوگا نہ کہ تمہاری مردم شماری کے رجسٹروں پر۔ (٩٥)

احبار و رہبان کا غلط مقام

وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۚ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۝ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَانَهُ عَمَّا

يُشْرِكُوْنَ ۔ (التوبہ ۔ آیت ۳۱)

ترجمہ :۔ "اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے۔ خدا کی مار ان پر، یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔"

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عَدِی بن حاتم، جو پہلے عیسائی تھے، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے تو انھوں نے منجملہ اور سوالات کے ایک یہ سوال بھی کیا تھا کہ اس آیت میں ہم پر اپنے علماء اور درویشوں کو خدا بنا لینے کا جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کی اصلیت کیا ہے۔ جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو کچھ یہ لوگ حرام قرار دیتے ہیں اسے تم حرام مان لیتے ہو اور جو کچھ یہ حلال قرار دیتے ہیں اسے حلال مان لیتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ یہ تو ضرور ہم کرتے رہے ہیں۔ فرمایا بس یہی ان کو خدا بنا لینا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی سند کے بغیر جو لوگ انسانی زندگی کے لیے جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرتے ہیں وہ دراصل خدائی کے مقام پر بزعم خود متمکن ہوتے ہیں اور جو ان کے اس حق شریعت سازی کو تسلیم کرتے ہیں وہ انھیں خدا بناتے ہیں۔

یہ دونوں الزام، یعنی کسی کو خدا کا بیٹا قرار دینا، اور کسی کو شریعت سازی کا حق دے دینا اس بات کے ثبوت میں پیش کیے گئے ہیں کہ یہ لوگ ایمان باللہ کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ خدا کی ہستی کو چاہے یہ مانتے ہوں مگر ان کا تصورِ خدائی اس قدر غلط ہے کہ اس کی وجہ سے ان کا خدا کو ماننا نہ ماننے کے برابر ہو گیا ہے۔ (۹۶)

کھوکھلی رسمِ اصطباغ

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (البقرۃ ۔ ۳۸)

ترجمہ :۔ "کہو اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو گا۔"

مسیحیت کے ظہور سے پہلے یہودیوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ جو شخص ان کے مذہب میں داخل ہوتا، اسے

غسل دیتے تھے اور اس غسل کے معنی ان کے ہاں یہ تھے کہ گویا اس کے گناہ دھل گئے اور اس نے زندگی کا ایک نیا رنگ اختیار کر لیا۔ یہی چیز بعد میں مسیحیوں نے اختیار کر لی۔ اس کا اصطلاحی نام ان کے ہاں اصطباغ (بپتسمہ) ہے اور یہ اصطباغ نہ صرف ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو ان کے مذہب میں داخل ہوتے ہیں، بلکہ بچوں کو بھی دیا جاتا ہے۔ اسی کے متعلق قرآن کہتا ہے، اس رسمی اصطباغ میں کیا رکھا ہے؟ اللہ کا رنگ اختیار کرو، جو کسی پانی سے نہیں چڑھتا، بلکہ اس کی بندگی کا طریقہ اختیار کرنے سے چڑھتا ہے۔ (۹۷)

باب ۸

عیسائیوں سے متعلق مسلمانوں کے دو اہم مسائل

فصل ۱

اسلام کا ضابطۂ حِلّت و حُرمت اور ذبیحۂ اہلِ کتاب

اہلِ کتاب کے ساتھ مواکلت و مشاربت کا اصول

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ ۪ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ اِذَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَلَا مُتَّخِذِیْۤ اَخْدَانٍ (المائدہ ۵- آیت ۵)

ترجمہ:- "آج تمھارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے۔ اور محفوظ عورتیں بھی تمھارے لیے حلال ہیں خواہ وہ اہلِ ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی، بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے نکاح میں ان کے محافظ بنو، نہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو۔"

اہلِ کتاب کے کھانے میں ان کا ذبیحہ بھی شامل ہے۔ ہمارے لیے ان کا اور ان کے لیے ہمارا کھانا حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان کھانے پینے میں کوئی رکاوٹ اور کوئی چھوت چھات نہیں ہے۔ ہم ان کے ساتھ کھا سکتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ۔ لیکن یہ عام اجازت دینے سے پہلے اس فقرے کا اعادہ فرما دیا گیا ہے۔ "تمھارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں" اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب اگر پاکی و طہارت کے ان قوانین کی پابندی نہ کریں جو شریعت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں، یا اگر ان کے کھانے میں حرام چیزیں شامل ہوں تو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر وہ خدا کا نام لیے بغیر کسی جانور کو ذبح کریں، یا اس پر خدا کے سوا کسی اور کا نام لیں، تو اُسے کھانا ہمارے لیے جائز نہیں۔ اسی طرح اگر اُن کے دسترخوان پر شراب یا سؤر یا کوئی اور حرام چیز ہو تو ہم ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔

اہلِ کتاب کے سوا دوسرے غیر مسلموں کا بھی یہی حکم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ذبیحہ اہلِ کتاب ہی کا جائز ہے جبکہ انھوں نے خدا کا نام اس پر لیا ہو، رہے غیر اہلِ کتاب، تو ان کے ہلاک کیے ہوئے جانور کو ہم نہیں کھا سکتے۔ (۹۸)

وہ اشیاء جن کا کھانا حرام ہے

قرآن مجید میں گوشت کے استعمال پر جو حدود و قیود عاید کی گئی ہیں، اور پھر احادیثِ صحیحہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جو تشریحات فرمائی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

اوّلین قید، جسے قرآن میں چار جگہ صاف صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ مردار، خون، سؤر کا گوشت، اور وہ جانور جسے اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، حرام ہے۔ یہ حکم مکی سورتوں میں سورۂ انعام (آیت ۱۴۵) اور سورہ نحل (آیت ۱۱۵) میں وارد ہوا ہے اور مدنی سورتوں میں سے سورۂ بقرہ (آیت ۱۷۳) اور سورۂ مائدہ (آیت ۳) میں اس کا اعادہ کیا گیا ہے۔

سورۂ مائدہ جو آخری احکامی سورہ ہے، اس پر دو باتوں کا مزید اضافہ کرتی ہے، اوّل یہ کہ صرف وہی مردار حرام نہیں ہے جو طبعی موت مرا ہو، بلکہ وہ جانور بھی حرام ہے جو گلا گھُٹ کر، چوٹ لگ کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ دوم یہ کہ جو جانور مشرکین کی قربان گاہوں پر ذبح کیا جائے وہ بھی حرمت کے حکم میں مَآ اُهِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰهِ بِهٖ کے ساتھ شریک ہے خواہ اس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے یا نہ لیا جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حرام اشیا میں گدھے اور کچلیوں والے درندوں اور پنجوں والے شکاری پرندوں کو بھی شامل فرمایا ہے جیسا کہ بکثرت احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نیل الاوطار، کتاب الاطعمہ والصید والذبائح)

ذبح کے لیے تزکیہ کی شرط

دوسری قید قرآن مجید یہ بیان کرتا ہے کہ صرف وہی جانور حلال ہے جس کا تزکیہ کیا گیا ہو۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے:

> حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃُ .... وَالۡمُنۡخَنِقَۃُ وَالۡمَوۡقُوۡذَۃُ وَالۡمُتَرَدِّیَۃُ
> وَالنَّطِیۡحَۃُ وَمَاۤ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیۡتُمۡ (آیت: ۳)

ترجمہ:- "حرام کیا گیا تم پر مرا ہوا جانور .... اور گلا گھونٹا ہوا اور چوٹ کھایا ہوا اور گرا ہوا اور ٹکر کھایا ہوا اور جس کو درندے نے پھاڑا ہو، بجز اس کے جس کا تم نے تذکیہ کیا ہو۔"

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ جس جانور کی موت تذکیہ سے واقع ہو صرف وہی حرمت کے حکم سے مستثنیٰ ہے، باقی وہ صورتیں جن میں تذکیہ کے بغیر موت واقع ہو جائے، حرمت کا حکم ان سب پر جاری ہوگا۔ تذکیہ کے مفہوم کی کوئی تشریح قرآن میں نہیں کی گئی ہے اور نہ لغت میں اس کی صورت متعین کرنے میں کچھ مدد کرتی ہے۔ اس لیے لامحالہ اس کے معنی متعین کرنے کے لیے ہم کو سنّت کی طرف رجوع کرنا ہوگا، سنّت میں اس کی دو شکلیں بیان کی گئی ہیں۔

ایک شکل یہ ہے کہ جانور ہمارے قابو میں نہیں ہے، مثلاً جنگلی جانور ہے جو بھاگ رہا ہے یا اُڑ رہا ہے یا وہ ہمارے قابو میں تو ہے مگر کسی وجہ سے ہم اس کو باقاعدہ ذبح کرنے کا موقع نہیں پاتے۔ اس صورت میں جانور کا تذکیہ یہ ہے کہ ہم کسی تیز چیز سے اس کے جسم کو اس طرح زخمی کر دیں کہ خون بہ جائے اور جانور کی موت ہمارے پیدا کردہ زخم کی وجہ سے خون بہنے کی بدولت ہو۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس صورت کا حکم ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں امرالدم بم شئت "جس چیز سے چاہو خون بہا دو" (ابوداؤد، نسائی)

دوسری شکل یہ ہے کہ جانور ہمارے قابو میں ہے اور ہم اس کو اپنی مرضی کے مطابق ذبح کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں باقاعدہ تذکیہ کرنا ضروری ہے۔ اور اس کا طریقہ سُنّت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اونٹ اور اس کے مانند جانور کو نحر کیا جائے اور گائے، بکری یا اس کے مانند جانوروں کو ذبح۔ نحر سے مراد یہ ہے کہ جانور کے حلقوم میں نیزے جیسی تیز چیز زور سے چبھوئی جائے تاکہ اس سے خون کا فوارہ چھوٹے اور خون بہہ بہہ کر جانور بالآخر بے دم ہو کر گر جائے۔ اونٹ ذبح کرنے کا یہ طریقہ عرب میں معروف تھا، قرآن میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے (فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ) اور سنّتِ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طریقے سے اونٹ ذبح کیا کرتے تھے۔ رہا ذبح تو اس کے متعلق احادیث میں حسب ذیل احکام وارد ہوئے ہیں:

احادیث میں ذبح کے تفصیلی احکام

عن ابی ھریرۃ قال بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدیل بن ورقاءَ

الخزاعی علی جمل اورق فی محاج منًی الا ان الزکوٰۃ فی الحلق واللبۃ ولا تعجلوا الانفس ان تزھق ۔ (دارقطنی)

ترجمہ :۔ "حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر بُدیل بن وَرقاء خُزاعی کو ایک خاکستری رنگ کے اونٹ پر بھیجا تاکہ منٰی کے پہاڑی راستوں پر یہ اعلان کر دیں کہ ذبح کی جگہ حلق اور لبلبہ کے درمیان ہے[1] اور ذبیحہ کی جان جلدی سے نہ نکال دو۔"

عن ابی عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن الذبیحۃ ان تفرس (طبرانی)

ترجمہ :۔ "ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ ذبح کرتے ہوئے آدمی نخاع تک کاٹ ڈالے۔"

اس مضمون کی روایت امام محمدؒ نے سعید بن المسیب سے بھی مُرسلاً روایت کی ہے جس کے الفاظ ہیں۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھٰی ان تنخع الشاۃ اذا ذبحت[2] ۔ ان احادیث کی بنا پر اور عہد نبوی اور عہد صحابہ کے معمول بہ عمل کی شہادتوں پر حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک ذبح کے لیے حلقوم اور مَری (غذا کی نالی) کو اور مالکیہ کے نزدیک حلقوم اور وَدجین (گردن کی رگوں) کو کاٹنا چاہیے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۔ ج ۱ ۔ ص ۷۲۵ تا ۷۳۰)

اضطراری اور اختیاری ذکات کی یہ تینوں صورتیں جو قرآن کے حکم کی تشریح کرتے ہوئے سنّت میں بتائی گئی ہیں، اس امر میں مشترک ہیں کہ ان میں جانور کی موت یک لخت واقع نہیں ہوتی بلکہ اس کے دماغ اور جسم کا تعلق آخری سانس تک باقی رہتا ہے، تڑپنے اور پھڑپھڑانے سے اس کے ہر حصۂ جسم کا خون کھچ کر باہر آ جاتا ہے اور صرف سیلانِ خُون ہی اس کی موت کا موجب ہوتا ہے۔ اب چونکہ قرآن نے اپنے حکم کی خود کوئی تشریح نہیں کی ہے، اور صاحبِ قرآن سے اس کی یہی تشریح ثابت ہے۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ سے یہی ذکات مراد ہے اور جس جانور کو بہ شرطِ ذکات پوری کیے بغیر ہلاک کیا گیا ہو

---

[1] یعنی گردن کے اوپر سے نہیں کہ پہلے نخاع کٹ جائے بلکہ اندرونی حصہ سے جہاں نرخرہ واقع ہے۔

[2] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا کہ بکری کو ذبح کرتے وقت نخاع تک کاٹ ڈالا جائے۔

وہ حلال نہیں ہے۔

ان صورتوں کے علاوہ قرآن مجید میں تذکیہ کی ایک اور شکل بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی جانور کو سدھائے ہوئے شکاری درندے نے مارا ہو، بشرطیکہ یہ سدھایا ہوا درندہ اپنے مالک کے لیے شکار کو روک رکھے۔ اس صورت میں اگر جانور درندے کے پھاڑنے سے مر بھی جائے تو وہ مذکّٰی شمار ہوگا۔

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ (المائدہ: آیت ۴)

ترجمہ: "اور جن شکاری جانوروں کو تم سدھاتے ہو، جنھیں تم شکار کی تعلیم دیتے ہو جو خدا نے تمھیں سکھائی ہے، وہ جس جانور کو تمھارے لیے روک رکھیں اس کا گوشت کھاؤ۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اس حکم کی یہ تشریح فرماتے ہیں:

فان امسك عليك فادركته حيا فاذبحه وان ادركته قد قُتل ولم يأكل منه فكُلْهُ وان اكل فلا تاكل (بخاری۔ مسلم)

ترجمہ: "اگر وہ جانور کو تیرے لیے روک کر رکھے اور تو اسے زندہ پالے تو ذبح کر۔ اور اگر جانور تجھے اس حالت میں ملے کہ تیرے کتے نے اسے ہلاک کر دیا ہو لیکن اس میں سے کچھ کھایا نہ ہو تو اسے کھالے، لیکن اگر کتے نے کھایا ہو تو پھر اسے نہ کھا۔"

وان اكلَ منه فلا تأكل فانما امسك على نفسه (بخاری۔ مسلم۔ احمد)

ترجمہ: "اگر کتے نے اس میں سے کچھ کھا لیا ہو تو اس جانور کو نہ کھا، کیونکہ اس نے وہ شکار اپنے لیے پکڑا تھا۔"

وما صدت بكلبك غير معلم فادركت ذكاته فكل (بخاری۔ مسلم)

ترجمہ: "اور جو شکار تو نے بے سدھے کتے سے کیا ہو اسے اگر زندہ پا کر تو نے ذبح کر لیا ہو تو اسے کھالے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ سدھائے ہوئے شکاری درندے کا کسی جانور کو مالک کے لیے مارنا قرآن کی رُو سے شرطِ ذکات پوری کر دیتا ہے۔ اس لیے یہ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ کی حرمت سے خارج ہو کر اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ

کے حکم استثناء میں آجاتا ہے لیکن قرآن یہ حکم صرف سدھائے ہوئے شکاری درندے ہی کے لیے بیان کرتا ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم سے اس درندے کو بھی خارج کر دیتے ہیں، جو پالا ہوا ہو مگر شکار کے لیے سدھایا ہوا نہ ہو، لہٰذا اس پر کسی دوسری چیز کو قیاس کر کے اس کے چیرے پھاڑے ہوئے جانور کے جواز کا پہلو نہیں نکالا جا سکتا۔ حدیث کے یہ الفاظ کہ بے سِدھے کُتّے کا مارا ہوا شکار اگر تُو نے زندہ پا کر ذبح کر لیا ہو تو اسے کھالے، اس امر کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں کہ تذکیہ کے سوا جس دوسری صورت سے بھی کوئی جانور مرا ہو وہ مردار کے حکم میں ہے۔

ذبیحہ کی حلّت کے لیے تسمیہ کی شرط

تیسری قید قرآن میں یہ لگائی گئی ہے کہ جانور کو قتل کرنے کے وقت اس پر اللہ کا نام لیا جائے۔ اس حکم کو متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ ایجابی طور پر فرمایا گیا:۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ (الانعام۔ ایت ۱۱۸)

ترجمہ:۔ ”پس کھاؤ اس جانور کا گوشت جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اگر تم اس کی آیات پر ایمان لانے والے ہو۔“

سلبی طریقے سے فرمایا گیا:۔

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ (الانعام۔ ایت ۱۲۱)

ترجمہ:۔ ”اور نہ کھاؤ اس جانور کا گوشت جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اور یقیناً یہ (یعنی اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کرنا یا ایسے جانور کا گوشت کھانا) فسق ہے۔“

سِدھائے ہوئے درندوں کے ذریعہ سے شکار کے معاملے میں بھی ہدایت فرما دی گئی:۔

فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔ (المائدہ۔ ایت ۴)

ترجمہ: ”پس کھاؤ اس جانور کا گوشت جسے وہ تمہارے لیے روک رکھیں اور اس پر اللہ کا نام[1] لو اور اس سے ڈرو وہ جلدی حساب لینے والا ہے۔“

---

[1] کس پر اللہ کا نام لو؟ اس کی تشریح احادیث میں کی گئی ہے جو آگے آتی ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن بہت سے مقامات پر لفظ ذبح استعمال ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی جگہ "جانور پر اللہ کا نام لینے" کے الفاظ بطور اصطلاح استعمال کرتا ہے :۔

لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ۔ (الحج - آیت ۲۸)

ترجمہ :۔ "تاکہ وہ اپنے لیے فائدے دیکھیں اور چند مخصوص دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انھیں بخشے ہیں (یعنی ان کو ذبح کریں)"

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ۔ (الحج - آیت ۳۴)

ترجمہ :۔ "ہر اُمت کے لیے ہم نے ایک قربانی مقرر کی ہے تاکہ وہ اللہ کا نام لیں ان مویشی جانوروں پر جو اس نے ان کو بخشے ہیں (یعنی ان کو ذبح کریں)"

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ (الحج - آیت ۳۶)

ترجمہ :۔ "پس ان اونٹوں پر اللہ کا نام لو کھڑا کر کے (یعنی انھیں نحر کرو)"

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ (الانعام : ۱۱۹)

ترجمہ :۔ "پس کھاؤ اس میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو (یعنی جسے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو)"

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ (الانعام - آیت ۱۲۲)

ترجمہ :۔ "اور نہ کھاؤ اس میں سے جس پر نہیں لیا گیا اللہ کا نام (یعنی جسے اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کیا گیا ہو)"

ذبح کے لیے تسمیہ کی اصطلاح کا یہ مسلسل اور پے در پے استعمال اس امر کی صریح دلیل ہے کہ قرآن کی نگاہ میں ذبیحہ اور تسمیہ ہم معنی ہیں، کسی ذبیحۂ حلال کا تصور تسمیہ کے بغیر نہیں کیا جا سکتا، اور تسمیہ ذبیحۂ حلال کی عین حقیقت میں شامل ہے۔

اب دیکھیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو روایات صحیح اور قوی سندوں کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں، وہ ذبح کے لیے تسمیہ کی شرعی حیثیت کیا ظاہر کرتی ہے۔ حاتم طائی کے صاحبزادے عدی بن حاتم وہ شخص

ہیں جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اکثر شکار کے مسائل پوچھے ہیں ان کو حضورؐ نے جو احکام اس سلسلے میں بتائے وہ یہ ہیں :۔

اذا ارسلت کلبک فاذکر اسم اللہ فان امسک علیک فادرکتہ حیًّا فاذبحہ وان ادرکتہ قد قتل ولم یاکل منہ فکُلْہُ واذا رمیت سہمک فاذکر اسم اللہ (بخاری ومسلم)

ترجمہ :۔ "جب تم شکار پر اپنا کُتا چھوڑنے لگو تو اللہ کا نام لے لو، پھر اگر کُتا اس جانور کو تمھارے لیے روک رکھے اور تم اُسے زندہ پالو تو ذبح کر لیا کرو۔ اور اگر تم اسے اس حال میں پاؤ کہ کُتے نے اسے مار ڈالا ہے مگر اس میں سے کچھ کھایا نہیں ہے تو تم اسے کھا سکتے ہو۔ .... اور شکار پر تیر چھوڑتے وقت بھی اللہ کا نام لے لو۔"

وما صدت بقوسک فذکرت اسم اللہ علیہ فکُلْ وما صدت بکلبک المعلم فذکرت اسم اللہ علیہ فکُلْ۔

ترجمہ :۔ "جس جانور کا شکار تم نے تیر کمان سے کیا ہو اور اس پر اللہ کا نام لے لیا ہو۔ اسے کھالو، اور جس کا شکار تم نے سدھے ہوئے کُتے کے ذریعے سے کیا ہو اور اس پر اللہ کا نام لے لیا ہو اسے بھی کھالو۔"

امرر الدّم بما شئت واذکر اسم اللہ (ابوداؤد۔ نسائی)

ترجمہ :۔ "خون بہادو جس چیز سے چاہو اور اللہ کا نام لے لو۔"

ما علمت من کلب او باز ثم اَرْسَلْتَہٗ وذکرتَ اسم اللہ علیہ فکل مما امسک علیک۔ (ابوداؤد۔ احمد)

ترجمہ :۔ "جو کُتا یا باز تمھارا سدھایا ہوا ہو، پھر تم اسے شکار پر چھوڑو اور چھوڑتے وقت اللہ کا نام لے لو، تو جس جانور کو وہ تمھارے لیے روک رکھے اس کا گوشت تم کھا سکتے ہو۔"

عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اگر میں خدا کا نام لے کر اپنا کُتا چھوڑ دوں، پھر جب شکار کے پاس پہنچوں تو وہاں ایک اور کُتا بھی کھڑا نظر آئے، اور پتہ نہ چل سکے کہ دونوں میں سے کس نے یہ شکار مارا ہے تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے ؟ فرمایا :۔

فلا تاکل فانما سمیت علیٰ کلبک ولم تسم علی غیرہ (بخاری۔ مسلم۔ احمد)

ترجمہ:۔ "اسے نہ کھاؤ، کیونکہ تم نے خدا کا نام اپنے کتے پر لیا تھا اور دوسرے کتے پر تو نہیں لیا تھا۔"

خدا اور رسول کے ان صاف اور قطعی احکام کے بعد اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ کہ شریعت میں ذبیحہ کی حلت کے لیے تسمیہ شرط ہے اور جس جانور کو اللہ کا نام لیے بغیر مارا گیا ہو اس کا کھانا حرام ہے۔ ایسی صریح آیات اور احادیث سے بھی کوئی حکم ثابت نہ ہوتا ہو تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ آخر کسی حکم کے ثبوت کے لیے کس قسم کی نص درکار ہے؟

تسمیہ کے بارے میں فقہاء کے مسالک

مذاہب فقہ میں سے حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ اس پر متفق ہیں کہ جس جانور پر قصداً خدا کا نام لینے سے احتراز کیا گیا ہو اس کا کھانا حرام ہے، البتہ اگر بھولے سے تسمیہ چھوٹ گیا ہو تو مضائقہ نہیں ہے۔ حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، سعید بن المسیبؒ، زہریؒ، عطاءؒ، طاؤسؒ، مجاہدؒ، حسن بصریؒ، ابو مالکؒ، عبدالرحمان بن ابی لیلیٰؒ، جعفر بن محمدؒ، اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمان کا بھی یہی مسلک منقول ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ تسمیہ عمداً چھوٹا ہو یا بھولے سے، دونوں صورتوں میں ذبیحہ حرام ہو جائے گا۔ ابن عمرؓ، نافعؒ، شعبیؒ اور محمد بن سیرینؒ کی یہی رائے ہے اور اسی کو ابو ثور اور داؤد ظاہری نے اختیار کیا ہے۔ ابراہیم نخعیؒ سہواً چھوٹ جانے پر جانور کو مکروہ تحریمی سمجھتے ہیں۔

امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ ذبیحہ کی حلت کے لیے تسمیہ سرے سے شرط ہی نہیں ہے، ذبح کے وقت خدا کا نام لینا ایک مشروع اور مسنون طریقہ تو ضرور ہے، تاہم اگر نہ لیا جائے، خواہ قصداً یا سہواً دونوں صورتوں میں ذبیحہ حلال ہوگا۔ صحابہ میں سے حضرت ابو ہریرہؓ اور مجتہدین میں سے امام اوزاعیؒ کے سوا کسی کا یہ مسلک نہ تھا۔ اگرچہ بعض روایات میں ابن عباسؓ، عطاءؒ بن ابی رباح، امام احمدؒ، امام مالکؒ کی طرف بھی یہ رائے منسوب کی گئی ہے، لیکن ان کا ثابت شدہ مسلک اس کے خلاف ہے۔

شافعیہ کا نقطۂ نظر اور اس کی کمزوری

اس رائے کے حق میں شافعیہ کی پہلی دلیل یہ ہے کہ آیت لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ میں واؤ کو عطف کے معنی میں لینا بلاغت کے خلاف ہے، کیونکہ آیت کا پہلا ٹکڑا جملہ فعلیہ انشائیہ ہے اور دوسرا اسمیہ خبریہ۔ ایسے دو مختلف جملوں کے درمیان عطف درست

نہیں ہو سکتا۔ اس دلیل سے وہ اس واؤ کو حالیہ قرار دے کر معنی یہ کرتے ہیں کہ "نہ کھاؤ اس جانور میں سے جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس حال میں کہ وہ فسق ہو"۔ پھر اس فسق کی تشریح سورۂ انعام کی آیت ۱۴۵ اسے کرتے ہیں جس میں ارشاد ہوا ہے کہ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (یا وہ فسق ہو کہ اللہ کے سوا دوسرے کا نام اس پر لیا گیا ہو)، اس طرح وہ آیت کا مطلب یہ بنا دیتے ہیں کہ صرف غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا گوشت ہی حرام ہے، اللہ کا نام نہ لینے سے کوئی حرمت واقع نہیں ہوتی۔

لیکن یہ ایک بہت ہی کمزور تاویل ہے جس پر متعدد قوی اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

اوّلاً آیت کے متبادر معنی ہرگز وہ نہیں ہیں جو اس تاویل سے بنائے گئے ہیں۔ آیت کو پڑھ کر اس معنی کی طرف ذہن خود بخود منتقل نہیں ہوتا، البتہ اگر آدمی پہلے یہ ارادہ کر لے کہ تسمیہ کے بغیر ذبح کیے ہوئے جانور کو حلال قرار دینا ہے، تب بہ تکلّف اس آیت کے یہ معنی بنا سکتا ہے۔

ثانیاً۔ جملہ فعلیہ انشائیہ پر جملہ اسمیہ خبریہ کا عطف اگر بلاغت کے خلاف ہے تو حالیہ فقرے میں اِنَّ اور لامِ تاکید کا استعمال ہی کونسا بلاغت کے مطابق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو وہی بات کہنی ہوتی جو شوافع کہتے ہیں تو وَهُوَ فِسْقٌ (اس حال میں کہ وہ فسق ہو) فرماتا، نہ کہ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ (اس حال میں کہ یقیناً وہ ضرور فسق ہو)

ثالثاً۔ استدلال کے جوش میں جملہ فعلیہ انشائیہ پر خبریہ کے عطف کو بلاغت کے خلاف کہتے ہوئے ان حضرات کو پوری بات بھی یاد نہ رہی۔ پوری آیت یہ ہے:۔

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ۔ اس آیت میں اگر وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ کے واؤ کو حالیہ مان بھی لیا جائے تو جملہ فعلیہ انشائیہ پر اسمیہ خبریہ کے عطف سے پیچھا نہیں چھوٹتا۔ کیونکہ اس کے بعد کا فقرہ لامحالہ خبریہ ہے جسے کسی طرح بھی حالیہ نہیں بنایا جا سکتا، اور اس کا عطف لا محالہ جملہ انشائیہ پر پڑ رہا ہے۔ پھر قرآن میں اس طرزِ کلام کی یہی ایک مثال نہیں ہے۔ بکثرت مقامات پر اسی طرح فعلیہ انشائیہ پر اسمیہ خبریہ کو معطوف کیا گیا ہے۔ مثلاً فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النور۔ آیت ۴) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ

أَعْجَبَتْكُمْ، وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتّٰى يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ (البقرہ - آیت ۲۲۱)

اب یا تو اپنے بلاغت کے اصولوں پر نظرِ ثانی کر لیجیے، یا پھر کھل کر کہہ دیجیے کہ قرآن کا کلام بلاغت کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ ہر جگہ جہاں قرآن میں جملہ فعلیہ انشائیہ اور اسمیہ خبریہ کے درمیان واؤ ہے وہاں عاطفہ کو حالیہ بنانا ممکن نہیں ہے۔

رابعاً۔ اس تاویل سے اس آیت کے معنی یہ بنتے ہیں کہ ”نہ کھاؤ اس جانور میں سے جس پر نہ لیا گیا ہو اللہ کا نام اس حال میں کہ یقیناً وہ ضرور فسق ہو کہ لیا گیا ہو اس پر غیر اللہ کا نام“۔ سوال یہ ہے کہ اگر اصل مقصود صرف اس جانور کو حرام کرنا تھا جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو تو کیا آیت کا پہلا حصہ بالکل مہمل، فضول اور لایعنی نہیں ہو گیا؟ اس صورت میں یہ کہنے کے تو سرے سے کوئی معنی ہی نہیں رہتے کہ جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس میں سے نہ کھاؤ۔ اس کے بجائے مدعا صرف یہ کہنے سے حاصل ہو جاتا ہے کہ ”نہ کھاؤ اس جانور میں سے جس پر لیا گیا ہو اللہ کے سوا کسی اور کا نام“۔ کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی اس بات کی کوئی معقول توجیہ کر سکتا ہے کہ آخر یہاں لَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ کہنے کی حاجت ہی کیا تھی؟

خامساً۔ اگر واؤ کو حالیہ بھی مان لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ کی تفسیر ایک دور دراز کی آیت کے الفاظ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ سے کریں۔ آخر کیوں نہ ہم اس آیت کے لفظ فسق کو اس معنی میں لیں جو ازروئے لغت اس کے معنی ہیں، یعنی نافرمانی اور خروج از طاعت۔ اس صورت میں آیت کا سیدھا سادھا مفہوم یہ ہوگا کہ نہ کھاؤ اس جانور کا گوشت جس کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس حالت میں جب کہ وہ فسق ہو (یعنی جب کہ جان بوجھ کر اللہ کا نام لینے سے احتراز کیا گیا ہو، اس لیے کہ فسق کا اطلاق حکم کی دانستہ خلاف ورزی پر ہی ہوتا ہے نہ کہ سہواً چھوٹ جانے پر) یہ تاویل شافعیہ کی تاویل کے مقابلے میں زیادہ قابلِ ترجیح ہے، کیونکہ ایک طرف تو یہ ان تمام آیات اور احادیث سے مطابقت رکھتی ہے جو اس مسئلے کے متعلق وارد ہوئی ہیں، اور دوسری طرف یہ تاویل اختیار کرنے سے آیت کا ایک پورا فقرہ (وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) بے معنی ہونے سے بچ جاتا ہے۔

دوسری دلیل حضرات شافعیہ یہ دیتے ہیں کہ ایک گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا کہ کچھ لوگ (جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے) باہر سے ہماری بستی میں گوشت بیچنے آتے ہیں۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ وہ جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیتے ہیں یا نہیں کیا ہم یہ گوشت کھا سکتے ہیں؟ حضورؐ نے اس کے جواب میں فرمایا سَمُّوا عَلَیہِ اَنتُم وَکُلُوا۔” تم خود ہی اس پر اللہ کا نام لے لیا کرو اور کھاؤ“۔ (یہ روایت بخاری، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے) اس سے شافعیہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ تسمیہ واجب نہیں کیونکہ اگر یہ واجب ہوتا تو حضورؐ شک کی حالت میں اس کا گوشت کھانے کی اجازت نہ دیتے۔ حالانکہ دراصل یہ حدیث ان کے مدعا کے خلاف پڑتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تسمیہ کا واجب ہونا عہد نبوی میں مسلمانوں کے اندر ایک معلوم و معروف مسئلہ تھا، اسی وجہ سے تو لوگ اس گوشت کے متعلق پوچھنے آئے تھے جو نئے مسلمان ہونے والے دیہاتی کاٹ کر لاتے تھے۔ ورنہ یہ سوال پیدا ہی کیوں ہوتا اور پوچھنے کا تکلف ہی کیوں کیا جاتا؟ پھر ان کے سوال کا جو جواب حضورؐ نے دیا وہ بھی اس خیال کی توثیق کرنے والا تھا۔ اگر ان لوگوں کا یہ خیال صحیح نہ ہوتا اور گوشت کے حلال یا حرام ہونے میں تسمیہ اور عدمِ تسمیہ کا درحقیقت کوئی اثر نہ ہوتا تو حضورؐ صاف صاف ان سے یہی فرما دیتے کہ ذبیحہ کی حلت کے لیے تسمیہ شرط نہیں ہے، تم لوگ ہر قسم کا گوشت کھا لیا کرو۔ خواہ ذبح کے وقت خدا کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔ لیکن اس کے بجائے حضورؐ نے فرمایا تو یہ کہ تم خود خدا کا نام لے کر کھا لیا کرو۔ اس کا معقول مطلب جو بادنیٰ تامل آدمی کی سمجھ میں آجاتا ہے وہ یہ ہے کہ اول تو مسلمان کے ذبح کیے ہوئے گوشت کے متعلق تمہیں یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ قاعدے کے مطابق ٹھیک ذبح کیا گیا ہوگا اور اطمینان کے ساتھ اسے کھا لینا چاہیے۔ لیکن اگر تمہارے دل میں کوئی شک رہ ہی جاتا ہے تو دفعِ وسواس کے لیے خود بسم اللہ کہہ لیا کرو۔ ظاہر ہے کہ مسلمان کے ذبیحے کے متعلق جو شہروں اور دیہات کی دکانوں پر ملتا ہے، آدمی کہاں تک یہ تحقیق کرتا پھر سکتا ہے، اور شریعت کب اس کو اس تحقیق کا مکلف کرتی ہے کہ اس نے حلال جانور کاٹا ہے یا حرام، تذکیہ کیا ہے یا نہیں۔ اور وہ نیا مسلمان ہے یا پرانا۔ تمام قواعد شرعیہ سے واقف ہے یا نہیں۔ بادی النظر میں آدمی کو مسلمان کی ہر چیز کو صحیح ہی سمجھنا چاہیے الا یہ کہ اس کے غلط ہونے کا کوئی ثبوت سامنے آجائے۔ ثبوت کے بغیر جو شک دل میں پیدا ہوا ہے اسے وجہ اجتناب بنانے کے بجائے اس طرح کے شکوک کو بسم اللہ یا استغفر اللہ کہہ کر رفع کر دینا چاہیے۔ یہ تعلیم

ہے جو اس حدیث سے ملتی ہے۔ تسمیہ کے عدمِ وجوب کی کوئی دلیل اس میں نہیں ہے۔

ایسا ہی کمزور استدلال وہ ایک تابعی بزرگ کی اس مُرسَل روایت سے کرتے ہیں جسے ابوداؤد نے مراسیل میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذبیحۃ المسلم حلال ذکی اسم اللہ او لم یذکر انہ ان ذکر لم یذکر الا اسم اللہ "مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے خواہ اس نے اللہ کا نام لیا ہو یا نہ لیا ہو، وہ نام لے گا بھی تو ظاہر ہے اللہ ہی کا لے گا"۔ یہ حدیث اوّل تو ایک غیر معروف تابعی کی مرسل روایت ہے۔ جس کا یہ وزن کبھی نہیں ہو سکتا کہ متعدد آیات، و مرفوع متصل احادیث سے جس چیز کا وجوب ثابت ہو رہا ہو اسے یہ غیر واجب ثابت کر سکے۔ پھر دیکھنا یہ ہے کہ اگر یہ روایت قطعی صحیح بھی ہو تو کیا واقعی اس سے تسمیہ کا عدمِ وجوب ظاہر ہوتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ جو بات اس سے ظاہر ہوتی ہے وہ تو بس یہ ہے کہ کوئی مسلمان اگر خدا کا نام لیے بغیر جانور ذبح کر بیٹھا ہو تو اسے عمداً ترکِ تسمیہ پر محمول کرنے کے بجائے نسیان پر محمول کیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اگر وہ نام لیتا تو اللہ ہی کا لیتا غیر اللہ کا نہ لیتا، اور اس بنا پر اس کے ذبیحہ کو حلال سمجھ کر کھا لیا جائے۔ اس سے یہ مضمون کہاں نکلتا ہے کہ جو لوگ ذبیحہ پر خدا کا نام لینے کے سرے سے قائل ہی نہ ہوں، اور جن کا نظریہ ہی اس کے خلاف ہو، ان کا ذبیحہ بھی حلال ہے اور سرے سے ذبیحہ پر خدا کا نام لینا ہی ضروری نہیں ہے۔ اس حدیث کے الفاظ کو چاہے کتنا ہی کھینچا اور تانا جائے اس میں اس مفہوم کی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔

یہ ہے کل کائنات ان دلائل کی جو فقہائے شافعیہ تسمیہ کے غیر واجب ہونے پر لاتے ہیں۔ کوئی شخص تقلید کی قسم کھا کر بیٹھ گیا ہو تو ممکن ہے وہ انھیں اٹل دلائل سمجھے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص ان کا تنقیدی جائزہ لے وہ کبھی یہ محسوس کیے بغیر رہ سکتا ہے کہ وجوبِ تسمیہ کے دلائل کے مقابلے میں یہ کس قدر بے وزن دلائل ہیں۔

پس جانوروں کے گوشت کی حلت کے بارے میں جو شرائط قرآن اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہیں وہ یہ ہیں کہ:۔

۱۔ وہ ان اشیاء میں سے نہ ہو جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے فی نفسہٖ حرام قرار دیا ہے۔

۲۔ ان کا تذکیہ کیا گیا ہو، اور

۳۔ اس کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

جس گوشت میں یہ تینوں شرائط پوری نہ ہوتی ہوں وہ طیبات سے خارج اور ان خبائث میں داخل

ہے جن کا استعمال اہلِ ایمان کے لیے جائز نہیں ہے۔

ذبیحۂ اہلِ کتاب کا مسئلہ

اب دیکھنا چاہیے کہ خاص طور پر ذبائح اہلِ کتاب کے بارے میں قرآن و سنّت سے کیا حکم ثابت ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ (المائدہ - آیت ۵)

ترجمہ:۔ "آج تمہارے لیے طیّبات حلال کر دیے گئے اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے ان کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال"۔

اس آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اہلِ کتاب کے دسترخوان پر جو کھانا ہمارے لیے حلال کیا گیا ہے وہ لازماً صرف وہی ہے جو طیّبات میں سے ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا کہ جو چیزیں ہمارے لیے قرآن و احادیثِ صحیحہ کی رُو سے خبائث ہیں، جن کو ہم اپنے گھر میں یا کسی مسلمان کے گھر میں نہ خود کھا سکتے ہیں نہ کسی دوسرے کو کھلا سکتے ہیں، وہی چیزیں جب عیسائی یا یہودی کے دسترخوان پر ہمارے سامنے رکھی جائیں تو وہ ہمارے لیے حلال ہو جائیں۔ اس سیدھی اور صاف تاویل کو چھوڑ کر اگر کوئی شخص دوسری تاویلیں کرنا چاہے تو زیادہ سے زیادہ چار باتیں کہہ سکتا ہے:۔

ایک یہ کہ اس آیت نے ان تمام آیات کو منسوخ کر دیا جو گوشت کی حلّت و حرمت کے متعلق سورۂ نحل، انعام، بقرہ اور خود اس سورۂ مائدہ میں وارد ہوئی ہیں یعنی بالفاظِ دیگر یہ ایک ایسی آیت قرآن میں آ گئی ہے جس نے جھٹکے ہی کو نہیں، مردار، سؤر، خون، نذر لغیر اللہ، سب کو مطلقاً حلال کر دیا۔ مگر اس نسخ کے لیے کوئی دلیل عقلی یا نقلی قیامت تک پیش نہیں کی جا سکتی۔ سب سے زیادہ کھلا ہوا ثبوت اس دعوے کی لغویت کا یہ ہے کہ گوشت کے بارے میں وہ تینوں قیود جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے خود اسی سورۂ مائدہ میں، اسی سلسلہ کلام میں، اس آیت سے بالکل متصل بیان کی گئی ہیں۔ کون صاحبِ عقل کہہ سکتا ہے کہ ایک عبارت کے تین مسلسل و متصل فقروں میں سے آخری فقرہ پہلے دو کا ناسخ ہوا کرتا ہے۔

دوسری تاویل یہ کی جا سکتی ہے کہ اس آیت نے صرف تذکیہ اور تسمیہ کے احکام کو منسوخ کیا ہے سؤر اور مردار اور خون اور وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کی حرمت کا حکم منسوخ نہیں کیا۔ مگر ہمیں نہیں معلوم

کہ ان دونوں قسم کے احکام میں تفریق کے لیے اور ان میں سے ایک کے نسخ اور دوسرے کے بقاء کے لیے بجز ایک خالی خولی ادّعاء کے کوئی دلیل بھی کسی کے پاس ہے۔ اگر دلیل کوئی صاحب رکھتے ہوں تو بسم اللہ وہ اسے پیش فرمائیں۔

تیسری تاویل یہ کی جا سکتی ہے کہ اس آیت نے مسلمانوں کے دسترخوان اور اہلِ کتاب کے دسترخوان میں فرق کر دیا ہے۔ مسلمان کے دسترخوان پر تو کھانے پینے کے معاملے میں وہ تمام قیود باقی رہیں گی جو قرآن میں مختلف مقامات پر بیان کی گئی ہیں، لیکن اہلِ کتاب کے دسترخوان پر وہ سب ختم ہو جائیں گی اور ہمیں آزادی ہو گی کہ جو کچھ بھی وہ ہمارے سامنے لا رکھیں اسے ہم کھا لیں۔ اس تاویل کے حق میں بڑی سے بڑی دلیل جو دی جا سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اہلِ کتاب کیا کچھ کھاتے ہیں، پس جب یہ جانتے ہوئے اس نے ہمیں ان کے ہاں کھانے کی اجازت دی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ بھی وہ کھاتے ہیں وہ سب ہم ان کے ہاں کھا سکتے ہیں۔ خواہ وہ سور ہو یا مردار یا غیر اللہ کے نام کی قربانی یا جھٹکا۔ لیکن استدلال کی جڑ خود وہی آیت کاٹ دیتی ہے جس سے یہ دلیل نکالی گئی ہے۔ اس میں صاف کہا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کے ہاں تم صرف طیبات کھا سکتے ہو، اور طیبات کے لفظ کو مبہم نہیں رہنے دیا گیا ہے بلکہ اس سے پہلے دو مفصل آیتوں میں کھول کر بتایا جا چکا ہے کہ طیبات کیا ہیں۔

چوتھی تاویل یہ ہو سکتی ہے کہ اہلِ کتاب کے ہاں بس سور نہیں کھایا جا سکتا باقی سب کچھ کھایا جا سکتا ہے۔ یا سور، مردار، خون اور مَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ تو ہم نہیں کھا سکتے۔ مگر تذکیہ اور تسمیہ کے بغیر جو گوشت فراہم کیا گیا ہو اسے ہم کھا سکتے ہیں۔ مگر تاویل نمبر ۲ کی طرح یہ بھی محض ایک بے دلیل دعویٰ ہے۔ کوئی معقول یا منقول دلیل اس معاملے میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ کہ قرآن کے احکام میں یہ فرق کس بنا پر کیا گیا ہے، اور اہلِ کتاب کے دسترخوان پر ایک حکم کیوں باقی رہتا ہے اور دوسرے کیوں مرتفع ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ تفریق اور استثناء قرآن سے ماخوذ ہے تو بتایا جائے کہ کس جگہ سے ماخوذ ہے۔ اگر حدیث سے نکالا گیا ہے تو معلوم ہو کہ کس حدیث سے، اور اگر کوئی عقلی دلیل اس کی بنیاد ہے تو وہی سامنے لے آئی جائے۔

ذبیحۂ اہلِ کتاب کے معاملہ میں فقہاء کے مسالک

اس مسئلے میں حنفیہ اور حنابلہ کا مسلک یہ ہے کہ اہلِ کتاب کے دسترخوان پر بھی ہمارے لیے کھانے

پینے کے معاملے میں وہی قیود ہیں جو خود اپنے گھر میں کھانے کے لیے قرآن و سُنّت میں بیان کی گئی ہیں۔ تذکیہ اور تسمیہ کے بغیر ہم کوئی گوشت نہ اپنے ہاں کھا سکتے ہیں نہ یہود و نصاریٰ کے ہاں (الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد اوّل ص ۷۲۶ - ۷۳۰)

شافعیہ کہتے ہیں کہ یہودی اور نصرانی اگر غیر اللہ کے نام پر ذبح کریں تو اس کا کھانا حرام ہے، لیکن اگر وہ اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کریں تو ان کا ذبیحہ ہم کھا سکتے ہیں۔ کیونکہ تسمیہ سرے سے واجب ہی نہیں ہے، نہ مسلم کے لیے نہ کتابی کے لیے (کتاب مذکور ج دوم ص ۲۳) اس مسلک کی کمزوری ہم اوپر واضح کر چکے ہیں اس لیے اس پر بحث کی حاجت نہیں۔

مالکیہ اگرچہ ذبیحہ کی حِلّت کے لیے تسمیہ کو شرط مانتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب کے لیے یہ شرط نہیں ہے، ان کا ذبیحہ خدا کا نام لیے بغیر بھی حلال ہے (کتاب مذکور ج دوم ص ۲۲) اس کے حق میں صرف یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر یہودی عورت کا بھیجا ہوا گوشت کھا لیا تھا اور نہیں پوچھا تھا کہ وہ خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہے یا نہیں۔ لیکن یہ واقعہ تسمیہ کے حکم سے اہلِ کتاب کے استثناء کی دلیل اگر بن سکتا تھا تو صرف اس صورت میں جب کہ یہ بات ثابت ہوتی کہ اس زمانے میں عرب کے یہودی اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کرتے تھے اور پھر بھی حضورؐ نے اس امر سے واقف ہوتے ہوئے ان کا ذبیحہ نوش فرما لیا۔ محض اتنی سی بات کہ آپ نے وہ گوشت تناول فرماتے وقت تسمیہ اور عدمِ تسمیہ کے متعلق کچھ دریافت نہیں فرمایا، وجوبِ تسمیہ کے حکم سے اہلِ کتاب کے مستثنیٰ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ ممکن ہے کہ حضورؐ کو اپنے زمانے کے یہودیوں کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ اللہ کا نام لے کر ہی ذبح کرتے ہیں، اسی لیے آپ نے بلا تامّل ان کا لایا ہوا گوشت کھا لیا ہو۔

ابن عباسؓ کا قول یہ تھا کہ آیت طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ نے آیت لَا تَاْکُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ کو منسوخ کر دیا اور اہلِ کتاب اس حکم سے مستثنیٰ کر دیے گئے (ابوداؤد کتاب الاضاحی) لیکن یہ ابن عباسؓ کی ذاتی تاویل ہے، کوئی حدیث مرفوع نہیں ہے۔ اور ابنِ عباسؓ بھی اس رائے میں منفرد ہیں۔ کوئی دوسرا صحابی اس تاویل و تفسیر میں ان کا ہم خیال نہیں ہے۔ پھر کوئی معقول وجہ بھی انھوں نے اس بات کی بیان نہیں کی ہے کہ اس آیت نے اس آیت کو کیوں منسوخ کر دیا، اور صرف اسی آیت کو منسوخ کر کے کیوں رہ گئی، کھانے پینے کے متعلق باقی سارے قیود کو بھی اس نے کیوں نہ منسوخ

کر ڈالا۔

عطاء اور اوزاعی اور مکحول اور لیث بن سعد کا مسلک یہ تھا کہ اس آیت نے مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کو حلال کر دیا ہے۔ عطاء کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب کے ہاں ہم غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا گوشت کھا سکتے ہیں۔ اوزاعی کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے کان سے بھی سن لو کہ عیسائی نے غیر اللہ کے نام پر کتا چھوڑا ہے تب بھی اس کا مارا ہوا شکار کھا لو۔ مکحول کہتے ہیں کہ اپنے کنیسوں اور اپنی مذہبی تقریبات کے لیے اہلِ کتاب جو قربانیاں کریں ان کے کھانے میں مضائقہ نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۳۹۵) مگر اتنی بڑی بات کی دلیل صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اہلِ کتاب غیر اللہ کے نام کی قربانیاں کرتے ہیں اور پھر بھی اس نے فرما دیا کہ اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو تو یہ بھی معلوم تھا کہ اہلِ کتاب میں سے نصاریٰ سؤر کھاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں پھر کیوں نہ ساتھ ساتھ سؤر اور شراب کی حِلّت کا حکم بھی اسی آیت سے نکال ڈالا جائے۔

ان مختلف مذاہب میں سے صحیح اور قوی مذہب ہمارے نزدیک حنفیہ اور حنابلہ کا ہے۔ باقی مذاہب میں سے کسی مذہب کی پیروی اگر کوئی کرنا چاہے تو اپنی ذمہ داری پر کرے، لیکن جیسا کہ اوپر بحث میں دکھایا جا چکا ہے کہ ان کے وجوہ و دلائل اس قدر کمزور ہیں کہ ان کی بنیاد پر کسی حرام کا حلال اور کسی واجب کا غیر واجب ثابت ہونا بہت مشکل ہے۔ اس لیے میں کسی خدا ترس آدمی کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ وہ ان مذاہب میں سے کسی کا سہارا لے کر یورپ اور امریکہ میں جھٹکے کا گوشت کھانا شروع کر دے۔ آخر میں دو باتوں کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

اول یہ کہ بسا اوقات چھوٹے جانور مثلاً مرغ، کبوتر وغیرہ ذبح کرتے ہوئے یہ صورت پیش آجاتی ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی سے جانور کی گردن کٹ کر سر دھڑ سے فوراً الگ ہو جاتا ہے۔ فقہاء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اس طرح کے ذبیحہ کو کھا لینے میں مضائقہ نہیں۔ اب اس چیز کو بنیاد بنا کر موجودہ زمانے کے بعض علماء نے فتویٰ دے دیا ہے کہ جہاں تمام جانوروں کے لیے ذبح کا طریقہ ہی یہ ہو کہ ایک مشین بیک ضرب سر کاٹ کر پھینک دے وہاں بھی تذکیہ کی شرط پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن فقہاء کے اقوال کو نص بنا کر ان سے ایسے احکام مستنبط کرنا جو بجائے خود منصوص احکام میں ترمیم کر ڈالیں، کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے۔ تذکیہ کے متعلق شریعت کے احکام ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ اور وہ احکام جن نصوص پر مبنی ہیں وہ بھی ہم نے درج

کردیے ہیں۔ اب یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ اگر کچھ فقہاء نے احیاناً بلا ارادہ ان احکام کے خلاف کوئی واقعہ پیش آجانے کی صورت میں لوگوں کو کوئی سہولت دے دی ہے، تو اسے اصل قانون قرار دے لیا جائے اور شریعت کے احکامِ تذکیہ عملاً منسوخ کردیے جائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ فقہاء نے یہ کہا ہے اور بالکل صحیح کہا ہے کہ مسلم اور اہلِ کتاب کے ہر ذبیحہ کے متعلق کھوج لگانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں؟ البتہ اگر ایجاباً یہ معلوم ہو کہ کسی ذبیحہ پر قصداً خدا کا نام نہیں لیا گیا ہے تو اس کے کھانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس بنیاد پر بھی یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ یورپ اور امریکہ میں جو گوشت ملتا ہے اس کے بارے میں کھوج لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ اہل کتاب کا ذبیحہ ہے، اس کو اسی اطمینان کے ساتھ کھاؤ، جس طرح مسلم ممالک میں مسلمان قصائیوں سے گوشت خرید کر کھاتے ہو۔ لیکن یہ بات صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے جب کہ ہمیں اہلِ کتاب کے کسی گروہ یا ان کی آبادی کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ اصولاً و عقیدۃً اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے کے قائل ہیں۔ رہے وہ لوگ جن کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ وہ حرام و حلال کی ان قیود کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔ اور جو اصولاً یہ نہیں مانتے کہ جانور کے حلال اور حرام ہونے میں اللہ یا غیر اللہ کا نام لینے اور نہ لینے کا بھی کوئی دخل ہے، ان کے ذبیحہ پر یہ اطمینان کرنے کی آخر کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے؟ (۹۹)

فصل ۲

نکاحِ کتابیہ

(ایک سوال کا جواب)

ایک دوست کا تقاضا ہے کہ "فرنگیات" کی درآمد کا فتنہ بڑھتا جا رہا ہے، اور اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کی شرعی اجازت ایک بہانہ بن گئی ہے، لہٰذا اس کے متعلق شرعی احکام کی صحیح تشریح ہونی چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ فی الواقع یہ ایک بڑا فتنہ ہے۔ ہندوستان، مصر، شام وغیرہ ممالک میں تو اس کا اثر صرف اسی حد تک رہا ہے کہ میم صاحبات نے اسلامی نظامِ معاشرت میں گھس کر تہذیب اسلامی کی خوب بیخ کنی فرمائی۔ لیکن ٹرکی میں اس کے سیاسی نتائج بھی نہایت خطرناک ثابت ہوئے ہیں۔ یہ ان اہم اسباب میں سے ہے جن کی بدولت ترکوں کی عظیم الشان سلطنت تباہ ہوئی۔ اس بنا پر اگر دردمند مسلمانوں کو اس کے سدِباب کی ضرورت کا احساس ہو تو یہ بالکل جائز ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک مصالح کے کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دے کر کسی شرعی مسئلہ میں ترمیم کرنا درست نہیں۔ قرآن مجید جس نے نازل کیا ہے وہ حکیم مطلق ہے اور اس کی نظر تمام مصالح و ضروریات پر غایت درجہ توازن و تناسب کے ساتھ پڑتی ہے۔ اس کے احکام کو سمجھنے اور حالات پر ان کو ٹھیک ٹھیک منطبق کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حتی الامکان نظر کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے کر تمام چھوٹی اور بڑی مصالح کا جائزہ لیا جائے اور ہر ایک کو رعایت کا وہی درجہ دیا جائے جو خود شارع نے دیا ہے۔

قرآن مجید کی جس آیت میں اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:-

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ
حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ۔ (المائدہ - ٥)

ترجمہ:۔ ”آج تمھارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئیں ہیں اور ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی ہے تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی بھی پاک دامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی جا چکی ہے (تمھارے لیے حلال ہیں) بشرطیکہ تم اُن کو اُن کے مہر ادا کر کے قیدِ نکاح میں لاؤ نہ یہ کہ کھلم کُھلا بدکاری کرنے والے یا چوری چھپے تعلقات رکھنے والے بنو۔“

اختلافاتِ سلف

اس آیت کی تفسیر میں سلف کے درمیان بہت کچھ اختلافات ہوئے ہیں۔ لیکن جمہور علماء نے ہر زمانے میں اس کے حکم کو ظاہر الفاظ اور عموم اطلاق ہی پر باقی رکھا ہے۔ اس لیے کہ کسی حکمِ قرآنی کو ظاہر سے پھیرنے اور عام کو خاص کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے، اور یہاں سرے سے کوئی دلیل ہے ہی نہیں۔ قرآن بھیجنے والے سے بڑھ کر صاحبِ حکمت مقنّن کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ وہ خود اپنے حکم میں کسی استثناء یا تخصّص کی ضرورت سمجھتا تو وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ کے ساتھ کوئی قید ضرور بڑھاتا۔ اس کی شانِ تشریع سے یہ امر بہت بعید ہے کہ وہ قانونی احکام کے بیان میں اتنی چُست زبان بھی استعمال نہ کر سکے جتنی دنیا کے واضعین قانون استعمال کر لیتے ہیں۔ کس طرح ممکن ہے کہ اس کا مقصد تو اہلِ کتاب کے کسی خاص گروہ کو حلال کرتا ہو، اور وہ بیانِ حکم کے لیے الفاظ ایسے منتخب کرے جو تمام اہلِ کتاب کے لیے عام ہوں اور جن میں استثناء اور تخصیص کے لیے قطعاً کوئی اشارہ تک نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام اور تابعین اور ائمۂ سلف نے عموماً اس آیت کو اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کی عام اجازت پر محمول کیا ہے، اور صرف محمول ہی نہیں ہے بلکہ اس کے مطابق عمل بھی کیا ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان بن عفان نے نائلہ بنت فرافصۂ کلبیہ سے نکاح کیا جو نصرانیہ تھی حضرت طلحہ بن عبید اللہ نے ایک شامی یہودیہ سے نکاح کیا۔ حذیفہ بن الیمان اور کعب بن مالک اور مُغیرہ بن شعبہ وغیرہم نے بھی کتابیات سے نکاح کیے یا ان کو نکاح کے پیغام دیے۔

ابن عمرؓ کا مسلک

صحابہؓ میں سے صرف ایک ابن عمر رضی اللہ عنہ ہیں جنھوں نے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح

کو مطلقاً ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مشرک عورتوں کو حرام کیا ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ (یعنی مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں) اور میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑھ کر بھی کوئی شرک ہو سکتا ہے کہ عیسیٰؑ ابن مریم یا کسی بندۂ خدا کو خدا قرار دیا جائے۔ اس بنا پر وہ تمام ان اہلِ کتاب کی عورتوں کو حرام قرار دیتے ہیں جن کے اعتقاد میں کفر و شرک پایا جاتا ہو۔ وَالْمُحْصَنٰتُ کی تفسیر انھوں نے وَالْمُسْلِمَاتُ سے کی ہے۔ یعنی ان کی رائے میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اہلِ کتاب میں سے جو عورتیں مسلمان ہو جائیں ان کے ساتھ بھی نکاح کرنا تمھارے لیے حلال ہے۔

لیکن اس مسئلے میں ابنِ عمرؓ کی رائے درست نہیں جس کے وجوہ مختصراً ہم بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود ہی اہلِ کتاب کے وہ تمام عقائد بیان فرمائے ہیں جو صریح شرک پر مبنی ہیں۔ مثلاً ان کا یہ اعتقاد کہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اور یہ کہ اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ یہی نہیں بلکہ اس نے لفظاً اور کفر کو بھی ان کی طرف منسوب کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس نے کسی جگہ بھی ان کے لیے مشرک کا لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ تمام قرآن میں جہاں کہیں بھی ان کا ذکر آیا ہے، اہلِ کتاب یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ کے ساتھ ہی آیا ہے۔ قرآن کو اوّل سے آخر تک دیکھ جائیے۔ تین گروہ بالکل الگ الگ نظر آئیں گے۔ ایک گروہ مشرکین و کفار، یعنی وہ لوگ جن کے پاس کوئی آسمانی ہدایت محرّف یا غیر محرّف موجود نہیں ہے۔ دوسرے اہلِ کتاب، جو اپنی تمام اعتقادی و عملی گمراہیوں کے باوجود کسی نبی اور کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں، تیسرے مومنین جن سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو ہیں، عام اس سے کہ وہ اسلام ہی میں پیدا ہوئے ہوں۔ یا اہلِ کتاب کے گروہ سے اسلام میں آئے ہوں، یا مشرکین و کفار کے گروہ سے نکل کر مسلمان ہو گئے ہوں۔ قرآن ان تینوں گروہوں کے درمیان واضح امتیاز برتتا ہے اور کہیں ان کو خلط ملط نہیں کرتا کہ مطلقاً اہلِ کتاب بول کر مشرک مراد لے، یا مطلقاً مشرک بول کر اہلِ کتاب مراد لے، یا اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کہہ کر مسلمان مراد لے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ فرما کر نکاح سے منع فرمایا اور دوسری جگہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کہہ کر نکاح کی اجازت دی۔ تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ پہلی آیت میں الْمُشْرِكٰتِ سے بت پرستوں اور دوسری غیر کتابی قوموں کی عورتیں مراد ہیں۔ اور دوسری آیت میں ان غیر مسلم گروہوں کی

عورتیں مراد ہیں جن کے پاس قرآن سے پہلے کتابیں تھیں۔ اگر یہ معنی نہ لیے جائیں تو قرآن کی دو آیتوں میں صریح تعارض لازم آتا ہے جس کو یہ کہہ کر رفع نہیں کیا جا سکتا کہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے مراد وہ عورتیں ہیں جو یہودیت اور نصرانیت چھوڑ کر مسلمان ہو گئی تھیں، یا اُن کتابی فرقوں کی عورتیں ہیں جو شرک و کفر سے پاک تھے، ۳ ہ لیے کہ۔

اوّلاً اللہ تعالیٰ نے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے پہلے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ فرمادیا ہے۔ اور مومنات سے صرف وہی عورتیں مراد نہیں ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئی ہوں بلکہ وہ سب عورتیں بھی مراد ہیں جو اپنے سابق مذہب چھوڑ کر اسلام میں آئی ہوں۔ پس جب مومنات سے نکاح کو عموماً حلال کر دیا تھا اور ان میں وہ عورتیں بھی آپ سے آپ داخل تھیں جو اسلام سے پہلے نصرانی یا یہودی تھیں، تو پھر خاص طور پر وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کے ذکر کی کون سی ضرورت تھی؟ اس طرح تو یہ فقرہ بالکل بے معنی اور عبث ہو جاتا ہے۔

ثانیاً اس آیت سے پہلے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے جن کو کتاب دی گئی ہے۔ کیا وہاں بھی اہلِ کتاب سے مراد وہ مسلمان ہیں جو نصرانیت اور یہودیت چھوڑ کر مسلمان ہوئے ہوں؟ اگر نہیں تو کس بنا پر جائز ہوا کہ ایک ہی آیت کے ایک ٹکڑے میں لفظ اہلِ کتاب کے ایک معنی لیے جائیں اور دوسرے ٹکڑے میں دوسرے معنی؟

ثالثاً نصاریٰ اور یہود کا کونسا فرقہ ایسا ہے جو شرک یا کفر سے پاک ہو؟ خدا کے بارے میں صحیح اعتقاد ان میں باقی ہی کہاں تھا اور کہاں سے آ سکتا تھا؟ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی اصل تعلیمات ہی ان کے ہاں محرّف ہو چکی تھیں۔ پھر صحتِ اعتقاد کا راستہ مل کہاں سکتا تھا۔ ان میں کوئی فرقہ راہِ راست پر ہوتا؟ پس یہ خیال قطعاً صحیح نہیں کہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے یہود و نصاریٰ کا کوئی صحیح العقیدہ گروہ مراد ہے۔ قرآن کی جن آیات سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان میں کچھ صحیح العقیدہ فرقے بھی تھے، ان کا اشارہ دراصل ایسے اہلِ کتاب کی طرف ہے جو نیک دل اور سلیم الفطرت ہونے کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت قبول کر چکے تھے یا عنقریب کرنے والے تھے۔

رابعاً اگر فی الفرض یہود و نصاریٰ کا کوئی خاص گروہ ایسا ہو بھی تو اللہ تعالیٰ نے اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ کے ساتھ کوئی قید ایسی نہیں بڑھائی ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہو کہ یہ حکم

صرف اسی گروہ کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرے اہلِ کتاب اس سے خارج ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم خواہ مخواہ اہلِ کتاب کے اعتقادات کی چھان بین میں لگ جائیں اور اپنے قیاس سے یہ طے کر لیں کہ ان میں سے کس فرقے کی عورتیں حلال ہیں اور کس فرقے کی حرام۔

جن لوگوں نے حضرت ابنِ عمرؓ کے قول کی تائید کی ہے وہ آیت وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ لیکن یہ آیت خاص طور پر ان مردوں اور عورتوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف مسلمان ہو کر ہجرت کر آئے ہوں اور جن کے شوہر یا بیویاں دارالحرب میں بحالتِ کفر رہ گئی ہوں۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ ان کے دارالاسلام میں آتے ہی جاہلیت کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور مہاجر مرد و عورت دونوں نکاح کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہ معنی تو شانِ نزول کے لحاظ سے متحقق ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص نفسِ الفاظ ہی پر حصر کرے تو ہم کہیں گے کہ ایک جگہ لَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ سے ایک عام حکم بیان کیا گیا تھا، پھر دوسری جگہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کہہ کر بتا دیا گیا کہ کفار میں سے ایک خاص جماعت یعنی اہلِ کتاب اس عام ممانعت سے مستثنیٰ ہیں۔ اگر آپ یہ نہیں مانتے کہ پہلے عام کو یہ دوسرا حکم خاص کر رہا ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ متضاد باتیں کرتا ہے، ایک جگہ ایک چیز کی اجازت دیتا ہے اور دوسری جگہ اس کی ممانعت کر دیتا ہے۔ معاذ اللہ۔

ابن عباسؓ کا مسلک

ابن عمرؓ کے بعد دوسرے صحابی جنھوں نے نکاح کتابیات کی اجازت کو محدود کرنے کی کوشش کی ہے ابن عباسؓ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم صرف ذمی عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ نصاریٰ اور یہود میں جو لوگ اسلامی سلطنت کی رعایا ہوں صرف انھیں کی عورتوں سے نکاح کیا جا سکتا ہے، خواہ ان کے اعتقادات میں کیسا ہی فساد ہو۔ رہے اہلِ عرب (یعنی وہ لوگ جو حدودِ دارالاسلام سے باہر رہتے ہوں) تو ان کی عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔ دلیل یہ ہے: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبة - ۴) نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا اور رسول کے دشمن ہوں ان سے محبت رکھنا اہلِ ایمان کا کام نہیں ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ...... يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (المجادلہ - ۳)

دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ازدواجی تعلق کی بنیاد جس چیز پر رکھی ہے وہ مودت اور رحمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (الروم - ۳)

پس جب نکاح کا تعلق محبت و اخلاص کا مقتضی ہے، اور حربی مشرکین و اہلِ کتاب سے محبت رکھنا حرام، اور جنگ کرنا مامور بہ، تو لازم آیا کہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہ ہوگا۔

یہ ہے ابنِ عباسؓ کا استدلال۔ مگر ابنِ عمرؓ کی طرح ان کی اس رائے کو بھی جمہور صحابہ و تابعین و ائمہ مجتہدین نے تسلیم نہیں کیا۔ اگرچہ دارالحرب اور دارالکفر کی رہنے والی کتابی عورت سے نکاح کو بالاتفاق سب مکروہ قرار دیتے ہیں، لیکن اس کی حرمت کا کوئی بھی قائل نہ ہوا۔ کیونکہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کی اجازت حربی اور غیر حربی سب کو شامل ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں رکھی ہے۔ پس جہاں تک قانونی جواز کا تعلق ہے اس کو ٹھیک اسی عموم پر باقی رکھنا چاہیے جو آیت قرآنی میں پایا جاتا ہے۔ رہا قومی مصالح یا شخصی حالات کے لحاظ سے نکاح کا مناسب نہ ہونا اور اس کا لائق پرہیز ہونا تو یہ بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ ہم جائز کو ناجائز نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ حق ہم کو حاصل ہے کہ جو فعل جائز کسی خاص حالت میں یا کسی خاص وجہ سے ہمارے لیے مناسب نہ ہو اس سے ہم پرہیز کریں، کیونکہ جواز کے معنی امر اور لزوم کے نہیں ہیں۔

جمہور کا مسلک اور ان کے اختلافات

ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے کو رد کر دینے کے بعد جو لوگ آیت زیر بحث کے حکم کو عام قرار دیتے ہیں ان کے درمیان تمام تر اختلاف صرف دو لفظوں کی تفسیر میں ہے ایک اَلْمُحْصَنٰتُ ۔ دوسرے اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۔

مُحصنہ کے معنی ایک گروہ کے نزدیک "پاک دامن عورت" کے ہیں۔ اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ محصنہ وہ عورت ہے جو آزاد ہو۔ لونڈی نہ ہو۔ پہلے گروہ کے نزدیک اہلِ کتاب کی صرف ان عورتوں سے نکاح جائز ہے جو عفیفہ ہوں۔ بدکار اور آبرو باختہ اور بے حیا عورتیں اس حکم سے خارج ہیں۔ دوسرے گروہ کی رائے میں کتابیہ لونڈی سے نکاح جائز نہیں خواہ وہ عفیفہ ہی کیوں نہ ہوں، اور آزاد کتابیہ سے جائز ہے خواہ وہ بدکار ہی کیوں نہ ہوں۔

اہلِ کتاب کے متعلق اختلاف اس امر میں ہے کہ کون کون سے گروہ ان میں شامل ہیں۔ امام شافعیؒ

کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب صرف وہ یہودی اور نصرانی ہیں جو بنی اسرائیل سے ہوں۔ رہیں دوسری قومیں جنھوں نے یہودیت و نصرانیت قبول کرلی ہے تو وہ اہلِ کتاب نہیں ہیں۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے، دوسری قومیں ان کی دعوت کی مخاطب ہی نہ تھیں۔ حنفیہ اور جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ ہر وہ قوم جو کسی نبی کو مانتی ہو اور کسی کتاب الٰہی پر ایمان رکھتی ہو، اہلِ کتاب شمار کی جائے گی۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی بھی کوئی قید نہیں۔ اگر کوئی گروہ صحفِ ابراہیمؑ کا ماننے والا یا صرف زبورِ داؤدؑ پر ایمان رکھنے والا ہوتا تو وہ کتابی گروہ ہوتا۔ سلف میں ایک قلیل جماعت اس طرف بھی گئی ہے کہ جن قوموں کے پاس کوئی ایسی کتاب ہے، جس پر آسمانی ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے وہ بھی اہلِ کتاب میں سے ہیں۔ مثلاً مجوسی۔ موجودہ زمانے کے بعض "مجتہدین" نے اسی خیال کو وسعت دے کر یہ اجتہاد فرمایا ہے، کہ ہندو اور جینی اور بودھ مت والے بھی اہلِ کتاب ہیں اور ان کی عورتوں سے بھی نکاح جائز ہے، بہر حال ان کے ہاں بھی کوئی نہ کوئی نبی آیا ہوگا اور کوئی نہ کوئی کتاب ان کو ضرور دی گئی ہوگی۔

صحیح مسلک

ان اختلافات میں جو مسلک سب سے زیادہ صحیح ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب سے مراد صرف یہود و نصاریٰ ہیں عام اس سے کہ وہ اسرائیلی ہوں یا غیر اسرائیلی۔ قرآن مجید میں اہلِ کتاب کا لفظ انہی دونوں گروہوں کے لیے آیا ہے اور ایک جگہ تو تصریح کردی گئی ہے کہ یہی دو گروہ اہلِ کتاب ہیں، وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰي طَاۗىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا (انعام - ۱۵۶) ان دو گروہوں کے علاوہ جن دوسری قوموں کے پاس کتابیں بھیجی گئی تھیں، انھوں نے چونکہ اپنی کتابوں کو بالکل ضائع کر دیا اور ان کے اعتقاد و عمل میں کوئی چیز بھی تعلیماتِ انبیاء پر باقی نہیں رہی، اس لیے ان پر لفظ اہلِ کتاب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں کو اہلِ کتاب قرار نہیں دیا، حالانکہ وہ زردشت کو مانتے ہیں جس پر نبی ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ ہجر کے مجوسیوں سے جب معاملہ پیش آیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ سنوا بھم سنة اھل الکتب۔ "ان کے ساتھ اہلِ کتاب کا سا معاملہ کرو"۔ یہ نہیں فرمایا کہ وہ اہلِ کتاب ہیں۔ پھر جو نامۂ مبارک آپ نے مجوسی ہجر کو لکھا تھا اس میں صراحت کے ساتھ یہ تحریر فرما دیا تھا کہ :-

فان اسلمتم فلکم مالنا وعلیکم ما علینا ومن ابی فعلیه الجزیة غیر

اکل ذبائحھم ولا نکاح نسارھم۔

ترجمہ:۔ "اگر تم اسلام قبول کرو گے تو تمھارے وہی حقوق ہوں گے جو ہمارے ہیں اور تم پر وہی واجبات ہوں گے جو ہم پر ہیں۔ اور جو لوگ تم میں سے انکار کریں گے ان پر جزیہ عائد کر دیا جائے گا۔ مگر نہ ان کا ذبیحہ کھایا جائے گا اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے گا۔"

اس تصریح کے بعد یہ شبہ کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ غیر یہود و نصاریٰ کو بھی اکلِ ذبائح اور نکاحِ مُحصنات کی اغراض کے لیے اہلِ کتاب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

رہی اسرائیلیت کی قید جو امام شافعیؒ نے لگائی ہے تو وہ بھی درست نہیں۔ بلاشُبہ دعوتِ موسوی و عیسوی کے مخاطب صرف بنی اسرائیل تھے۔ مگر جن غیر اسرائیلی قوموں نے نصرانیت کو قبول کیا انھیں بھی تو خدا اور رسول نے اہلِ کتاب ہی میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نامۂ مبارک قیصرِ رُوم کے نام لکھا تھا اس میں یہ آیت نقل فرمائی تھی کہ يَاۤ اَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ۔ دیکھیے یہاں رومیوں کو اے اہلِ کتاب کہہ کر خطاب کیا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ رومی اسرائیلی نہ تھے۔

پھر جن لوگوں نے مُحصنات کا ترجمہ عفیفہ یا حرّہ کیا ہے اور عفّت یا حرّیت کو نکاحِ کتابیہ کے لیے مشروط قرار دیا ہے ان کا مسلک بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ احصان کے مفہوم میں عفت و شرافت دونوں داخل ہیں اور مُحصنہ سے مراد ایسی ہی عورت ہے جو پاک دامن بھی ہو اور شریف و معزز بھی۔ لیکن شارع کا مقصود ان دونوں چیزوں کو نکاح کے لیے شرط قرار دینا ہے بلکہ محض افضلیت اولویت کا اظہار مقصود ہے۔ شارع دراصل یہ بتانا چاہتا ہے کہ تم نکاح کرنے کو تو ہر مومن اور کتابی عورت سے کر سکتے ہو، مگر اولیٰ اور افضل یہ ہے کہ وہ عورت محصنہ، یعنی شریف اور پاک دامن ہو۔ قرآنی احکام میں اس قسم کی قیود بکثرت لگائی گئی ہیں جو ثبوتِ حکم کے لیے شرط کی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ کسی فعلِ جائز کے افضل پہلو یا فعلِ ناجائز کے ارذل پہلو کو ظاہر کرنے سکے لیے بطور ایک قیدِ زائد کے رکھ دی گئی ہے تاکہ اہلِ ایمان افضل کے اختیار اور ارذل سے اجتناب کا اہتمام کریں۔ بعینہٖ یہی مسلک ہے جو اس باب میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اختیار فرمایا ہے۔ حضرت حذیفہ بن الیمان نے ایک یہودیہ سے نکاح کیا۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع پہنچی تو آپ نے لکھا کہ اسے چھوڑ دو۔ انھوں نے دریافت کیا کہ یہ حکم کس بنا پر ہے؟ کیا کتابیہ سے نکاح کرنا حرام ہے؟ آپ نے جواب دیا حرام نہیں ہے بلکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم لوگ اہلِ کتاب کی

آبرو باختہ عورتوں میں نہ پھنس جاؤ۔

پس تمام مسالک میں جو مسلک ہمارے نزدیک اصح ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنے کے شرعی جواز کو عام قرار دیا جائے خواہ وہ حربیہ ہوں یا ذمیہ، عفیفہ ہوں یا نہ ہوں، لونڈیاں ہوں یا آزاد۔

> 'یہاں تک تو مسئلہ کی صرف قانونی حیثیت سے بحث تھی۔ اب ہم اس پہلو سے اس مسئلے پر بحث کرتے ہیں کہ دینی و ملی مصالح کے لحاظ سے صحیح اور مناسب کیا طرزِ عمل ہے اور روحِ دین کے تقاضے کیا ہیں۔

نکاح کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر

شریعتِ اسلامیہ میں نکاح کی حیثیت محض ایک عمرانی معاہدہ (SOCIAL CONTRACT) ہی کی نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ آج کل تعبیر کر رہے ہیں، بلکہ اس میں ایک مذہبی تقدس کی شان بھی ہے۔ یہ تقدس ہندوؤں اور عیسائیوں کے نکاح کی طرح (SACRAMENT) کی حد تک نہیں پہنچتا، مگر عبادت کی حد تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ شارع اس سے نہ صرف تمدنی و عمرانی فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے بلکہ دینی و روحانی فوائد بھی چاہتا ہے۔ اس سے اخلاق کی اصلاح مقصود ہے۔ سوسائٹی کی پاکیزگی مقصود ہے۔ ایک خالص اسلامی نظامِ معاشرت کا بقاء و دوام اور نشو و ارتقاء مقصود ہے۔ دنیا میں خدا کا نام لینے والی اور کلمۃ اللہ کو بلند کرنے والی نسلیں پیدا کرنا مقصود ہیں۔ ان مقاصد میں مددگار ہونے ہی کی وجہ سے نکاح کو عبادت کے قریب جگہ دی گئی ہے۔ بعض فقہائے اسلام نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ بعض حیثیات سے نکاح کو جہاد پر بھی فضیلت ہے۔ کیونکہ نکاح اور جہاد دونوں وجودِ مسلم اور وجودِ اسلام کے اسباب ہیں، مگر جو کچھ افرادِ مسلمین کی مناکحت سے حاصل ہوتا ہے وہ اس سے بدرجہا زیادہ ہے جو جہاد سے حاصل ہوتا ہے۔ جہاد میں تو زیادہ تر امکان اس کا ہے کہ کفار قتل ہوں گے یا ذمی بن کر حالتِ کفر ہی میں رہیں گے۔ بخلاف اس کے اہلِ اسلام کی شادیوں کا خاص نتیجہ یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کی ایک نسل کے اخلاق محفوظ ہوں گے اور دوسری نسل متبعینِ اسلام کی وجود میں آئے گی۔"

اس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ان احادیث پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے متعلق مروی ہیں۔ ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

ایک مرتبہ عکاف بن وداعہ الہلالی سے پوچھا، کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ انھوں نے کہا، نہیں۔ آپ نے پوچھا لونڈی بھی نہیں؟ انھوں نے کہا، نہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا، کیا تم تندرست اور خوشحال ہو؟ انھوں نے عرض کیا، ہاں۔ آپ نے فرمایا۔ تب تو تم شیطان کے بھائیوں میں سے ہو یا عیسائیوں میں سے ہو۔ اگر تم ہماری جماعت میں شامل ہونا چاہتے ہو، تو وہی کرو جو ہم کرتے ہیں اور ہمارے طریقوں میں سے ایک نکاح بھی ہے۔ تم میں بدترین لوگ وہ ہیں جو مجرد رہتے ہیں اور تمہارے مرنے والوں میں بدترین وہ ہیں جو مجرد مرتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ تناکحوا تناسلوا تکثروا فانی مکاثر بکم الامم یوم القیامۃ۔ نکاح کرو، نسلیں بڑھاؤ، اپنی تعداد میں اضافہ کرو، کیونکہ میں قیامت کے روز تمام اُمتوں کے مقابلے میں تمہاری تعداد زیادہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

ایک موقع پر فرمایا:

اربع من اعطیھن فقد اعطی خیر الدنیا والاخرۃ قلباً شاکراً ولساناً ذاکراً وبدناً علی البلاء صابراً وزوجۃ لا تبغیہ حوبا فی نفسھا ومالہٖ

(رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط)

ترجمہ: ”چار چیزیں ہیں کہ جس کو وہ دی گئیں اسے دنیا اور آخرت کی ساری بھلائی دے دی گئی۔ ایک وہ دل کہ خدا جو کچھ دے اس پر وہ شکر ادا کرے۔ دوسرے وہ زبان جو خدا کا ذکر کرنے والی ہو، تیسرے وہ بدن جو مصیبتوں کے مقابلے میں ٹھہرنے کی قوت رکھتا ہو۔ چوتھے وہ بیوی جو شوہر کے مال اور اپنی عصمت میں کسی خیانت کی طرف مائل نہ ہو۔“

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا:

من اراد ان یلقی اللہ طاہراً مطہراً فلیتزوج الحرائر (ابن ماجہ)

ترجمہ: جو کوئی اللہ سے پاک صاف ملنا چاہتا ہو اسے شریف عورتوں سے شادی کرنی چاہیے

ایک دوسری حدیث میں ہے:

لا تزوجوا النساء لحسنھن فعسٰی حسنھن ان یردیھن ولا تزوجوھن لاموالھن فعسٰی اموالھن ان تطغیھن ولکن تزوجوھن علی الدین فلامۃ

خرقاء سوداء ذات دین افضل (ابن ماجة)

ترجمہ:- عورتوں سے ان کے حسن کی خاطر شادیاں نہ کرو۔ ممکن ہے کہ ان کا حسن اُن کو بگاڑ دیوے۔ اور تم ان کے مال و دولت کی خاطر بھی شادیاں نہ کرو، ہو سکتا ہے کہ ان کے اموال انکو سرکش بنا دیں۔ تم کو ان میں جو چیز دیکھنی چاہیے وہ دین ہے۔ ایک کالی کلوٹی کم عقل لونڈی بھی اگر دیندار ہو تو وہ دوسری عورتوں سے افضل ہے۔"

اسی قسم کی بہت سی احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں نکاح کی اہمیت صرف ایک تمدنی ضرورت کو پورا کرنے ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ سب سے بڑا مقصد تحصین نفس، اور طہارتِ اخلاق، اور تہذیب اسلامی کا فروغ، اور خالص مسلمان نسلیں پیدا کرنا ہے۔ اور ان اغراض کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ مسلمان نکاح کریں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے نکاح ایسی عورتوں سے ہوں جو مسلمان ہوں، دین دار ہوں، شریف اور باعصمت ہوں۔ کیونکہ ایک صالح اسلامی سوسائٹی ایسے ہی مردوں اور عورتوں کے ازدواج سے وجود میں آسکتی ہے، اور ایک صالح مسلمان نسل ایسی ہی ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہو سکتی ہے۔

مخلوط شادیوں کی مضرّت

دینی نقطۂ نظر سے ہٹ کر خالص عمرانی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مخلوط شادیوں (MIXED MARRIAGES) سے بڑھ کر کوئی چیز نظامِ معاشرت اور خاندانی زندگی کو فاسد کرنے والی نہیں ہو سکتی۔ دو ایسے میاں بیوی جن کے خیالات میں بُعد المشرقین ہو اور جنھوں نے دو مختلف ماحولوں میں مختلف روایات اور مختلف معاشرتوں کے زیر اثر پرورش پائی ہو، اپنے باہمی اختلاط سے نہ تو خود اپنی زندگی میں سکون و راحت حاصل کر سکتے ہیں، نہ اپنے گھر کو کسی نظامِ معاشرت کا صالح رکن بنا سکتے ہیں اور نہ کوئی ایسی نسل پیدا کر سکتے ہیں جو کسی نظامِ تمدن میں اچھی طرح کھپ سکتی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ان کے درمیان محبت ہو اور آخر تک رہے۔ مگر ان کی محبت اور رفاقت زیادہ سے زیادہ صرف انہی کی ذات کے لیے لطف و لذت کی موجب ہو سکتی ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کا کوئی تمدنی فائدہ نہیں ہے۔ اختلافِ مذہب اور اختلافِ قومیت تو خیر بڑی چیز ہے۔ خاندانی زندگی کی کامیابی اور نظامِ تمدن کی بہتری کے لیے تو ایسی شادیاں بھی مفید نہیں ہوتیں جن کے دونوں فریق ایک ہی سوسائٹی کے دو مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہوں۔ شہری اور دیہاتی تک کا فرق بارہا ناموافقت کا موجب بن جاتا ہے۔ نباہ کے لیے ضروری ہے کہ زوجین

اور ان کے خاندانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ امور میں اتحاد ہو۔ صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ان کا دین ایک ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا طرزِ معاشرت ایک ہو، ان کے خیالات اور اصولِ حیات میں یکسانی ہو۔ ان کے معاشی اور معاشرتی مرتبے میں ہمواری ہو، اور ان کی خاندانی روایات ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوں۔ یہی چیز ہے جس کو اصلاحِ شریعت میں کفاءت کہتے ہیں۔ شارع نے مناکحت میں کفو کو جو اہمیت دی ہے وہ اسی لیے ہے کہ زوجین میں زیادہ سے زیادہ مماثلت ہو، کیونکہ مماثلت صرف زوجین ہی کے لیے مودّت و رحمت کی موجب نہیں ہے بلکہ پوری سوسائٹی کے لیے مفید ہے اور آئندہ نسلوں کی بہتری بھی اسی پر موقوف ہے۔ جن زوجین میں مماثلت نہیں ہوتی ان کی مواصلت محض ایک جسمانی مواصلت ہے جو تمدّن و تہذیب کے لیے نقطۂ نظر سے قطعی بانجھ یا قریب قریب بانجھ ہوتی ہے۔

اختلافِ مذہب کے نقصانات

عدمِ کفاءت کے نقصانات تو صرف اسی قدر ہیں کہ اس سے زوجین میں مودت و رحمت کم نتیجہ خیز اشتراک کمتر ہوتا ہے۔ مگر اختلافِ مذہب و قومیت کے نقصانات اس سے بدرجہا زیادہ ہیں۔ اس میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ایک غیر مسلم ماں کی آغوش میں جو اولاد تربیت پاکر اُٹھے گی وہ دین و اخلاق کے اعتبار سے اسلامی سوسائٹی کے کسی کام کی نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ وہ ایک مسلمان گھر میں غیر اسلامی طریقے رائج کرے گی اور جن جن کے گھروں سے اس کے روابط ہوں گے وہ سب کم و بیش اس عُضوِ فاسد کے شر سے متاثر ہوں گے۔ پھر خود شوہر بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہے گا۔ اگر وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو تو ممکن ہے کہ اپنے دین و ایمان کو بھی ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ لیکن یہ فساد اس حد تک بھی پہنچے تو اس کا کم از کم یہ اثر تو ضرور ہوگا کہ وہ اپنے گھر میں اپنی آنکھوں سے اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب کے بہت سے ارکان کی بربادی ہوتے دیکھے گا۔ اور اس کو گوارا کرے گا۔ سیاسی حیثیت سے بھی اس قسم کی شادیاں خالی از مضرت نہیں۔ سازش اور جاسوسی اور سلطنتِ اسلامی کی بیخ کنی کے لیے مسلمان گھروں کی کافر بہو بہت آسانی کے ساتھ استعمال کی جا سکتی ہے، اور اگر وہ بہت ہوشیار ہو تو اپنے شوہر کو بھی ان اغراض کے لیے آلۂ کار بنا سکتی ہے۔ یہ سب وہ مضرتیں ہیں جو پہلے بھی ظاہر ہو چکی ہیں اور آج ظاہر ہو رہی ہیں۔ ہندوستان میں ہمارے نظامِ معاشرت کو مشرکانہ رسموں اور جاہلانہ عادتوں سے کس نے آلودہ کیا؟ انہی عورتوں نے جو مذہبِ شرک پر قائم رہ کر یا برائے نام مسلمان ہو کر مسلمان خاندانوں میں

داخل ہوئیں۔ مسلمانوں کی نسلوں کو دین و اخلاق کے اعتبار سے کس نے تباہ کیا؟ انہی ماؤں نے جن کے سینوں سے مسلمانوں کے بچے شرک و جاہلیت کا دودھ پی پی کر بڑے ہوئے۔ اسلامی حکومتوں کو کس چیز نے غارت کیا؟ زیادہ تر ان کافر عورتوں کی محبت نے جو مسلمان امراء کے دلوں پر متصرف ہوگئی تھیں۔ آج اسلامی نظامِ معاشرت کی بنیادوں کو کونسی چیز کھوکھلا کر رہی ہے؟ ایک بڑی حد تک ان مغربی عورتوں کی حکومت جو ہماری سوسائٹی کے خوشحال اور با اثر طبقوں پر مسلط ہوگئی ہیں۔

اسلامی قانونِ ازدواج کی شانِ اعتدال

جب حال یہ ہے تو ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ غیر مسلم عورتوں سے نکاح کرنا بالکلیہ ممنوع ہونا چاہیے تھا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ شارع نے اس چیز کو جائز رکھا؟ اس کا صحیح جواب معلوم کرنے کے لیے ہم کو اس مسئلہ کے دوسرے پہلو پر نگاہ ڈالنی چاہیے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں شارع کا کمالِ حکمت اور اس کے طریقِ تشریع کا انتہائی اعتدال و توازن نظر آتا ہے۔

انسان جب کوئی قانون بناتا ہے تو عموماً وہ کسی ایک پہلو کی طرف اس قدر جھک جاتا ہے کہ دوسرے پہلو اس کی رعایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کبھی وہ اجتماعی مصالح پر زیادہ زور دیتا ہے اور شخصی مصالح نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور کبھی شخصی مصالح کی اتنی رعایت کرتا ہے کہ اجتماعی مصالح باطل ہو جاتے ہیں۔ مگر شارعِ اسلام کی حکیمانہ شان ایسی ہے کہ وہ ہر مصلحت پر نظر رکھتا ہے اور ہر ایک کی اتنی ہی رعایت کرتا ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اجتماعی مصالح کا، اور بڑی حد تک شخصی مصالح کا بھی اقتضاء یہ تھا کہ مسلمانوں کی شادیاں مسلمان عورتوں ہی سے ہوں، اور پھر ان میں سے بھی مماثلت اور اتحاد کو ملحوظ رکھا جائے

چنانچہ اس لیے کفاءت ضابطہ مقرر کیا گیا۔

تخیروا لنطفکم وانکحوا الاکفاء روی ذلک من حدیث عائشۃ وانس وعمر من طرق عدیدۃ

ترجمہ:۔ اپنے نطفوں کے لیے اچھی قرارگاہیں تلاش کرو اور اپنے جوڑ کے لوگوں میں شادیاں کرو۔

اور صاف طور پر بتا دیا گیا کہ کفاءت میں سب سے پہلے اور سب سے اہم چیز دین ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَیُطِیْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔

(التوبہ-۹)

ترجمہ:۔ "مومنین اور مومنات ایک دوسرے کے ولی ہیں (اس لیے کہ) وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں، بدی سے منع کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور خدا اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (التحریم۔

ترجمہ:۔ اے اہلِ ایمان اپنے آپ کو اور اپنے اہلِ وعیال کو آگ سے بچاؤ۔

وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِكُم بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ۔ (النساء-۴)

ترجمہ:۔ "اور تم میں سے جو کوئی پاک دامن مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ ان مومن لڑکیوں میں سے اپنے لیے جوڑا منتخب کرے جو تمھاری مملوک ہیں۔ اللہ تمھارے ایمان کو خوب جانتا ہے اور تم سب ایک دوسرے کے ہو۔"

تَزَوَّجُوهُنَّ عَلَى الدِّينِ فلامة خرقاء سوداء ذات دين افضل (الحدیث)

ترجمہ:۔ "تم ان سے دین کی بنا پر شادیاں کرو کیونکہ ایک کالی کلوٹی کم عقل لونڈی بھی اگر دیندار ہو تو وہ دوسری عورتوں سے افضل ہے۔"

دوسری طرف بعض شخصی مصالح اس کی بھی مقتضی تھیں کہ غیر قوموں میں نکاح کرنے کا دروازہ قطعی طور پر بند نہ کر دیا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کسی غیر مسلم عورت کے عشق میں مبتلا ہو جائے اور حصولِ مقصود کا دروازہ بالکل بند پا کر حرام کی طرف جھک پڑے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کسی ایسی جگہ رہتا ہو جہاں مسلم عورت بہم نہ پہنچ سکتی ہو، اور مجرد رہنے کی وجہ سے اس کے اخلاق بگڑنے اور اس کی خانگی زندگی خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ ایسے مخصوص حالات کے لیے کسی حد تک رخصت کا دروازہ کھول دینا ضروری تھا۔ چنانچہ شارع نے یہ دروازہ کھولا۔ مگر اس فتحِ باب میں شخصی مصالح کی رعایت کے ساتھ یہ بات ملحوظ رکھی کہ اجتماعی مصالح کو کم سے کم نقصان پہنچے۔

مسلم اور غیر مسلم کے نکاح کی حرمت

سب سے پہلے تو یہ بات طے کر دی گئی کہ غیر مسلموں کے ساتھ شادی کرنے کی رخصت صرف مردوں

کو دی جا سکتی ہے، عورتوں کے لیے یہ دروازہ قطعاً مسدود ہے۔

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ (الممتحنة۔ ۲)

ترجمہ:۔ "نہ مسلمان عورتیں کافر مردوں کے لیے حلال ہیں اور نہ کافر مرد مسلمان عورتوں کے لیے حلال"

یہ اس لیے کہ عورت کی فطرت ایک انفعالی فطرت ہے۔ اس میں ڈھال لینے سے زیادہ ڈھل جانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ مرد کے اثرات اور اپنے ماحول کے اثرات کو زیادہ شدت کے ساتھ قبول کرتی ہے اور خانگی زندگی میں وہ عموماً شوہر سے مغلوب ہی ہو کر رہتی ہے۔ ایک غیر مسلم مرد سے اس کی شادی ہونے میں کم از کم ۹۰ فی صدی خطرہ اس بات کا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اسلام اور اس کی تہذیب سے کٹ جائے گی۔ اور یہ خطرہ تو سو فی صدی ہے کہ اس کے پیٹ سے جو اولاد پیدا ہو گی وہ ملّتِ کُفر پر رہے گی۔ پس تمام مصالح و حِکَم اس بات کے مقتضی تھے کہ مسلمان عورتوں کے لیے غیر مسلموں کی زوجیت قطعی طور پر حرام کر دی جائے اور رُخصت کا دروازہ اگر کھولا جائے تو وہ صرف مردوں کے لیے ہو۔

مُسلم اور غیر مُسلمہ کے نکاح کے قیود

پھر مردوں کے لیے بھی یہ رخصت عام نہیں ہے۔ غیر مسلموں کو ازدواجی اغراض کے لیے دو طبقوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔

ایک وہ طبقہ جو اسلام اور اس کی تہذیب سے کوسوں دُور ہے جس کے عقائد اور اصولِ حیات اور قوانینِ اخلاق و معاشرت کسی جہت میں بھی مسلمانوں سے نہیں ملتے۔

دوسرا وہ طبقہ جو تمام غیر مسلموں میں اسلام سے اقرب ہے، نبوت اور وحی کو کسی نہ کسی حد تک مانتا ہے، خدا اور یوم آخر کے اعتقاد میں بھی کسی حد تک اسلام کے قریب ہے، اصولِ اخلاق اور قوانینِ معاشرت میں بھی بہت سی ایسی چیزیں ابھی تک اس کے پاس محفوظ ہیں جو منبعِ نبوت سے نکلی ہوئی ہیں۔

ان دونوں طبقوں میں سے پہلے طبقے کے ساتھ شادی بیاہ کرنا مسلمانوں کے لیے قطعی ممنوع کر دیا گیا۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ
اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ
وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ

وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهٖ ۔ (البقرہ - ۲۷)

ترجمہ :۔ " اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں ۔ ایک مومن لونڈی ایک مشرکہ سے بہتر ہے خواہ وہ تم کو کتنی ہی پسند ہو ۔ اور اپنی عورتوں کی شادیاں بھی مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں ۔ ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے خواہ وہ تمھیں کتنا ہی پسند ہو ۔ وہ آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور خدا اپنے اذن سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے ۔"

نکاحِ کتابیہ کی اجازت

رہا دوسرا طبقہ تو اس کی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دے دی گئی ، مگر اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ یہ کام خطرے سے خالی نہیں ہے ، تاہم یہ رخصت صرف اس لیے عطا کی گئی ہے کہ تم حرامکاری میں مبتلا نہ ہو ۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (المائدہ - آیت - ۵)

ترجمہ :۔ " اور حلال کی گئی ہیں تمھارے لیے ان لوگوں کی عورتیں بھی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے ، بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے انھیں قیدِ نکاح میں لاؤ ، علانیہ یا چوری چھپے زناکاری نہ کرو (اور یاد رکھو کہ) جو شخص اپنے ایمان سے پھرا اس کا سب کیا کرایا غارت ہو جائے گا ۔ اور آخرت میں وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا "

آخری فقرہ قابلِ غور ہے ۔ اس میں صاف طور پر متنبہ کر دیا گیا ہے کہ غیر مسلم عورت سے شادی کرنے میں ایمان کا خطرہ ہے ۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ اگر ایسے خطرناک کام کی اجازت دی گئی ہے تو وہ غیر معمولی حالات و ضروریات ہی کے لیے ہے ۔

نکاحِ کتابیہ کی کراہیت

جو لوگ شریعتِ اسلام کی روح سے اچھی طرح واقف تھے ۔ انھوں نے اسی بنا پر اس اجازت کو ہمیشہ رخصت ہی کے قبیل سے سمجھا اور اس کو پسند نہ کیا کہ مسلمانوں میں کتابیات سے شادی کرنے کا عام رواج

ہو۔ شریعت کے سب سے بڑے رازدان اپنے عہد میں حضرت عمرؓ تھے۔ انھوں نے حضرت حذیفہؓ کو جو کچھ لکھا تھا وہ شریعت کے مقصد پر خوب روشنی ڈالتا ہے۔ زمانہ اسلام کے غلبے کا تھا۔ مسلمان علاقۂ شام میں فاتح اور حکمران کی حیثیت سے تھے۔ معاملہ ایک ایسے جلیل القدر مسلمان کا تھا۔ جس نے براہِ راست شمعِ نبوّت سے نورِ ایمان کا اکتساب کیا تھا۔ اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب میں اس سے بڑھ کر اور کون پختہ ہو سکتا تھا۔ مگر باوجود اس کے حضرت عمرؓ نے حضرت حذیفہؓ کو ایک کتابیہ کے ساتھ ازدواجی تعلق رکھنے سے منع کیا۔ پھر یہ نہیں فرمایا کہ کتابیہ سے شادی کرنا حرام ہے بلکہ یہ فرمایا کہ اس سے مسلمان گھروں میں اہلِ کتاب کی بداخلاق عورتوں کے گھس آنے کا اندیشہ ہے، لہٰذا اس اجازت سے فائدہ نہ اٹھانا ہی بہتر ہے۔

غور کیجیے کہ جب غلبے کی حالت میں نکاح کتابیہ کے متعلق اسلام کا یہ طرزِ عمل ہے تو ایسی حالت میں کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے جب کہ ایک مسلمان کفار سے مغلوب اور مرعوب ہوں اور ان کی سوسائٹی میں گھرا ہوا ہو۔ اس وقت تو نکاحِ کتابیہ کی کراہت اور زیادہ بڑھ جانی چاہیے، کیونکہ دارالکفر میں اس کی مضرتیں کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ائمۂ اسلام نے عموماً نکاحِ کتابیہ کو مکروہ اور خصوصاً دارالکفر میں نہایت مکروہ قرار دیا ہے۔ شمس الائمہ سرخسی اپنی کتاب المبسوط میں لکھتے ہیں:۔

> يجوز للمسلم ان يتزوج كتابية في دار الحرب ولكنه يكره لانه اذا تزوجها ثم ربما يختار المقام فيهم .... اذا ولدت تخلق الولد باخلاق الكفار وفيه بعض الفتنة فيكره لهذا .... وسئل علي رضي الله عنه عن مناكحة اهل الحرب من اهل الكتب فكره ذلك (ج ۵ - ص ۵۰)

ترجمہ:۔ مسلمان کے لیے دارالحرب میں کتابیہ سے شادی کرنا جائز تو ہے مگر مکروہ ہے کیونکہ اگر وہ وہاں شادی کرے گا تو ممکن ہے کہ کفار ہی کے ملک میں رہ پڑے .... اور جب کتابیہ کے پیٹ سے اولاد پیدا ہو تو وہ کفار کے اخلاق پر اٹھے۔ اس میں اور بھی فتنے ہیں۔ اس لیے یہ مکروہ ہے ...... حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حربی عورتوں کے ساتھ نکاح کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اس کو مکروہ فرمایا۔

امام ابنِ جریر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

”ذمیہ اور حربیہ دونوں سے نکاح جائز ہے بشرطیکہ نکاح کرنے والا ایسی جگہ نہ ہو جہاں اس کی اولاد

کے کفر پر مجبور ہونے کا خوف ہو۔" (جزو سادس۔ ص ۶۱)

ہدایہ میں ہے کہ:

ویجوز تزویج الکتابیات والاولیٰ ان لا یفعل ولا یاکل ذبیحتهم الا للضرورة وتکرہ الکتابیة الحربیة اجماعاً لافتتاح باب الفتنة من امکان التعلق المستدعی للمقام معها فی دار الحرب وتعریض الولد علی التخلق باخلاق اهل الکفر۔ (کتاب النکاح)

ترجمہ:۔ "کتابیات سے نکاح کرنا جائز تو ہے مگر بہتر یہی ہے کہ نہ کیا جائے اور نہ ان کا ذبیحہ کھایا جائے، الّا یہ کہ کوئی ضرورت آ پڑے۔ اور حربی کتابیہ سے نکاح کرنا تو بالاجماع مکروہ ہے۔ کیونکہ اس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے۔ مثلاً یہ کہ عورت سے ایسا گہرا تعلق ہو جائے کہ مسلمان شوہر اسی کے ساتھ کافروں کے ملک میں رہ پڑے اور یہ کہ اس کی اولاد اہلِ کفر کے اخلاق سے متخلق ہو کر اٹھے۔"

اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کتابیہ کو حرام اور باطل ٹھہرانا تو درست نہیں ہے، البتہ قانونِ اسلامی کی روح اور ائمۂ اسلام کے اجماع سے اس کا مکروہ ہونا اور خصوصاً دار الکفر میں، اور غلبۂ کفار کی حالت میں نہایت درجہ مکروہ و مبغوض ہونا ثابت ہے۔ اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کے فعل سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ صرف نکاحِ کتابیہ ہی کے معاملے میں نہیں بلکہ شریعت کی تمام رُخصتوں کے معاملے میں، جن سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا اندیشہ پایا جاتا ہو، مسلمانوں کے اولی الامر کو امتناعی احکام جاری کرنے کا حق ہے، اور اس قسم کے امتناعی احکام جائز کو ناجائز اور حلال کو حرام کیے بغیر نافذ کیے جا سکتے ہیں۔ مگر ایسے احکام جاری کرنے والوں میں اتنا تفقُّہ ہونا چاہیے کہ وہ قانونِ شریعت کی شانِ اعتدال کو ضائع نہ کریں۔ (۱۰۰)

نکاحِ کتابیہ میں ضروری احتیاط

اہلِ کتاب کی جن عورتوں سے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دی گئی ہے ان کے بارے میں قرآن مجید دو شرطیں لگاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ مُحصنات (پاک دامن) ہوں، دوسرے یہ کہ ان سے نکاح کر کے ایک مسلمان خود اپنے ایمان کو خطرے میں نہ ڈال بیٹھے (ملاحظہ ہو سورہ مائدہ آیت ۵) ان شرائط کی رو سے فاسق و فاجر کتابیات کے ساتھ شادی جائز نہیں ہے۔ اور یہ دیکھنا ایک مسلمان کا فرض ہے کہ جس عورت سے وہ شادی کر رہا ہے وہ اس کے گھر میں، اس کے خاندان میں، اور اس کے بچوں میں ایسے افعال رائج کرنے کی موجب نہ بنے

جو اسلام میں حرام ہیں۔ بلاشبہ وہ اسے مذہب ترک کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس کو چرچ جانے سے نہیں روک سکتا۔ مگر اسے شادی سے پہلے ہی یہ شرط کر لینی چاہیے کہ وہ اس کی زوجیّت میں آنے کے بعد شراب، سؤر کے گوشت اور دوسری حرام چیزوں سے اجتناب کرے گی۔ ایسی شرط پہلے ہی طے کر لینے کا اسے حق بھی ہے اور ایسا کرنا اس کا فرض بھی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین کے معاملہ میں سخت تساہل کرنے والا آدمی ہے۔ اس کے بعد اگر اس کی اپنی اولاد ان حرام افعال میں مبتلا ہو (اور ظاہر ہے کہ اولاد کا ماں سے متاثر نہ ہونا متوقع نہیں ہو سکتا) تو اس کی ذمہ داری میں وہ بھی شریک ہو گا۔ (۱۰۱)

باب ۹

متفرّقات

فصل ۱

ضمیمہ (۱)

ایک مسیحی بزرگ کے چند اعتراضات

امید واثق ہے کہ ایک محقق اور طالب حقیقت کے ذیل کے استفسارات پر ترجمان القرآن کے توسط سے روشنی ڈالتے ہوئے نہ صرف مستفسر کو ہی بلکہ تمام ناظرین کو تشکر و امتنان کا موقع دیں گے۔

۱۔ قرآن نے مسیح کی نسبت چار وعدے ذکر کیے ہیں۔ چوتھا وعدہ ہے: وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ (آل عمران - ۲) مسیح کے متبعین اور مسیح کے کافروں کے وجود کا قیام قیامت تک پایا جانا اس بات کو مستلزم ہے کہ مسیح کے متبعین مسیح کے اتباع پر قائم رہیں۔ اور اتباع کے لیے مسیح کی ہدایت اور تعلیم کا قائم اور محفوظ رہنا اور پھر قیامت تک محفوظ رہنا ضروری ہے، جس سے لازم آتا ہے کہ مسیح ہی قیامت تک اپنی تعلیم اور ہدایت دائمی کی رُو سے دائمی ہادی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو درمیان میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے وجود کو گھیڑنے کے کیا معنی؟ دوسرے اسلام کا تخالف پہلی صورت مسلمہ کے منافی معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ اہل اسلام کے نزدیک اگر مسیح آسمان پر زندہ ہیں اور وہی آنے والے ہیں، پیغمبر اسلام کے ظہور سے پہلے بھی وہی اور بعد میں بھی وہی، تو اس صورت میں درمیان میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے ظہور کا کیا مطلب؟ جبکہ غلبۂ متبعین مسیح کا وعدہ استمرار بلافصل کے معنوں میں قیامت تک کے لیے پیش کیا جا چکا ہے۔

۳۔ آیت إِن كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكَ، لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ (یونس - ۱۰) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب خود پیغمبر اسلام بھی قرآن کی وحی کے متعلق شک میں پڑ جاتے تھے تو اس صورت میں شک کو نکالنے کے لیے آپ کو حکم ہوا کہ اہل کتاب سے آپ اپنے شک کو نکلوا لیجیے، جس سے واضح ہے کہ یہ قرآن پیغمبر اسلام کو بھی شک میں ڈالنے والی چیز ہے۔ اور اہل کتاب کی کتاب اور تعلیم ایسی چیز ہے کہ قرآن کے متعلق شک رکھنے والے کو بھی وہی دور کرتی ہے، تو اس

صورت میں بھی اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے ظہور سے اور مسیحؑ کے بعد آنے سے کیا فائدہ ہوا؟ اور قرآن کریم کی نسبت تو یہ ہے، مگر تورات کی نسبت لکھا ہے۔ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (آلِ عمران۔۱۰) جس سے ظاہر ہے کہ توراۃ قابلِ استشہاد ہے اور وہ اس صورت میں کہ محفوظ ہو اور محرف مبدل نہ ہو۔ اور یہ صورت بھی پہلی صورت پیش کردہ کی مؤید ثابت ہوتی ہے۔

امید ہے آپ ان ہر سہ سوالات پر جن کا مآل معنی واحد ہے، ایمانداری کے ساتھ خوب روشنی ڈالیں گے۔ ورنہ آپ کی خاموشی یا غلط اور ناقابلِ تسلی جواب سے کئی مسلمان کہلانے والے معزز اور اہلِ علم عیسائی ہونے والے ہیں۔ اور سات اشخاص تو عیسائی ہو چکے ہیں۔ شاید آپ ابھی تک بے خبر ہی ہوں۔ حیدر آباد میں اندر ہی اندر آپ کو معلوم ہے کیا ہو رہا ہے؟ اور قدرت شاہ خان مبشرؔ مسیحی کے ٹریکٹ "خط بنام مسلمانانِ حیدر آباد" نے کیا کچھ تہلکہ مچا دیا ہے کہ کئی خاندانوں کے خاندان عیسائی ہونے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔"

آپ کا مخلص ایک محقق

کاتبِ خط کوئی مسیحی پادری معلوم ہوتے ہیں جنھوں نے مسلمان بن کر سوال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر وہ ایک سچے عیسائی کی طرح سامنے آ کر اعتراضات کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا اور اس صورت میں بھی ان کے اعتراض کا جواب اسی محبت سے دیا جاتا جس کے ساتھ ایک بھٹکے ہوئے مسلمان کو دیا جا سکتا ہے۔ خیر طریقِ اعتراض کے انتخاب میں وہ آزاد ہیں۔ ہمارا کام بہرحال ان کے اعتراض کو رفع کرنا اور انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

۱۔ سب سے پہلے آپ کو اس بڑی اور بنیادی غلطی پر متنبہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو نہ صرف آپ نے کی ہے بلکہ مسیحی معترضین بالعموم اس میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ وہ غلطی یہ ہے کہ آپ لوگ جب اسلام اور پیغمبرِ اسلام کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے آپ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک نئے مذہب کا نام ہے جس کا آغاز ساتویں صدی عیسوی میں ہوا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بانی تھے۔ اسی وجہ سے آپ کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اگر تورات و انجیل برحق تھیں اور موسیٰؑ و مسیحؑ برحق تھے تو ان کے بعد "اسلام" کیوں آیا اور "پیغمبرِ اسلام" کے ظہور کی کیا ضرورت لاحق ہوئی۔ لیکن قاعدے کی بات ہے کہ اگر آپ کسی پر گرفت کرنا چاہتے ہوں تو اسے اس دعوے پر پکڑیے جو اس نے خود کیا ہو نہ کہ اس الزام پر جو آپ زبردستی اس کے سر منڈھ دیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کب کہا تھا کہ میں ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈال رہا ہوں۔ اور میرے اس نو ایجاد مذہب کا نام

اسلام ہے؛ وہ تو اس بات کے سرے سے مدّعی ہی نہیں ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ میں اسی مذہب کو لے کر آیا ہوں جسے مجھ سے پہلے عیسیٰؑ اور موسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور نوحؑ لے کر آئے تھے اور اس مذہب کا نام ہمیشہ سے اسلام (خدا کی فرمانبرداری) ہی تھا نہ کہ یہودیت اور عیسویت۔ پھر وہ ان گزشتہ پیغمبروں کے بعد اپنے آنے کی وجہ جو بیان کرتے ہیں اس میں بھی کہیں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ موسیٰ اور مسیح علیہم السلام کی تعلیمات دنیا سے بالکل مٹ گئی تھیں، یا بالکل مسخ ہو گئی تھیں اس لیے بھیجا گیا ہوں، بلکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اوّل تو توریت اور انجیل میں تحریف ہو گئی ہیں۔ دوسرے اس تحریف کے باوجود جو خدائی تعلیمات ان دونوں میں صاف صاف پائی جاتی ہیں ان سے ہٹ کر پیروانِ موسیٰؑ نے ایک نیا نظام "یہودیت" کے نام سے اور پیروانِ عیسیٰؑ نے ایک دوسرا نظام "مسیحیت" کے نام سے بنا لیا ہے اور ان دونوں مذہبوں میں بہت سی ایسی باتیں بنائے دین بنا لی گئی ہیں جو اس اسلام کے خلاف ہیں جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ لے کر آئے تھے، اس لیے ضرورت پیش آئی کہ پھر اسلام کی اصل تعلیم کو اس کی خالص صورت میں، آمیزشوں سے چھانٹ کر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اور اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے میں بھیجا گیا ہوں۔ یہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل دعویٰ۔

اب اگر آپ گرفت کرنا چاہتے ہیں تو اس دعویٰ پر کیجیے۔ یہ آخر بحث و تحقیق کا کون سا طریقہ ہے کہ ایک شخص کی طرف آپ بطورِ خود ایک دعویٰ منسوب کرتے ہیں —— جس سے وہ بشدّت انکاری ہے —— اور پھر اس کے دعوے پر نہیں بلکہ اپنے منسوب کیے ہوئے دعوے پر اعتراضات شروع کر دیے ہیں۔

اس غلطی کا ارتکاب آج سے نہیں، ایک مدّت سے مسیحی علماء کر رہے ہیں۔ اور یہی غلطی ہے جس پر ان کے اکثر و بیشتر اعتراضات کی بنا قائم ہے۔ اگر آپ واقعی ایک محقّق ہیں تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ پہلے آپ ٹھنڈے دل سے اس امر کی تحقیق فرمائیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل دعویٰ وہ ہے جو میں بیان کر رہا ہوں یا وہ جو آپ ان کی طرف منسوب کر رہے ہیں؟ پھر اگر ثابت ہو کہ ان کا واقعی دعویٰ وہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے تو یہ دیکھیں کہ آیا وہ صحیح ہے یا نہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مذہب "اسلام" (خدا کی فرمانبرداری) تھا؟ کیا وہ ازلی و ابدی حقیقتیں جن کو ماننے اور جن کے مطابق اخلاق و اعمال کو ڈھالنے پر انسان کی نجات کا انحصار رہا ہے ہمیشہ سے وہی نہیں رہی ہیں جن کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی ہے؟ کیا خدا کے ہاں انسان کی نجات کا مدار ابراہیمؑ اور اسحاقؑ کے زمانے میں کچھ اور اصولوں پر اور بعد کے زمانے میں ان سے مختلف اصولوں پر ہو سکتا ہے؟ اگر آپ مانتے ہیں کہ یہ اصول ازلی و ابدی

ہیں تو نوایجاد مذہب یہودیت اور مسیحیت قرار پاتے ہیں یا اسلام؟ یہودیت اور مسیحیت میں تو آپ متعدد ایسی چیزیں پائیں گے جن کو اصولوں (یعنی مدارِ نجات) کا مرتبہ دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ ایک خاص نسل یا ایک خاص زمانے تک محدود ہیں۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں آپ قطعاً کوئی ایسی چیز نہیں پا سکتے جو نوعِ انسانی کی نجات کے عالمگیر ہی وابدی اصولوں سے زائد یا ان سے مختلف ہو۔ اس نقطۂ نظر سے آپ دیکھیں گے تو سوال کی نوعیت ہی بدل جائے گی۔ پھر تو سوال یہ نہ ہوگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیچ میں کہاں سے آگئے۔ بلکہ یہ ہوگا کہ آدمؑ و نوحؑ اور ابراہیمؑ و اسحٰقؑ کے وقتوں سے جو اصل دین (اسلام) چلا آرہا تھا اس کے سلسلہ میں یہ یہودیت اور مسیحیت کہاں سے آداخل ہوئیں؟

۲۔ آپ نے پہلے اعتراض میں جو آیت نقل کی ہے اس میں مسیح کا انکار کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں اور مسیح کا اتباع کرنے والوں میں نصاریٰ اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ اور اگر اتّباع سے مراد اتباعِ کامل یعنی ٹھیک ٹھیک قدم بقدم چلنا مراد لیا جائے تب تو نصاریٰ اس کے مصداق نہیں رہتے، بلکہ صرف مسلمان ہی اس کے مصداق قرار پاتے ہیں۔ اس لیے کہ نصاریٰ نے سیّدنا عیسٰی علیہ السلام کی تعلیم کے اصل الاصول کو چھوڑ دیا اور یہودیوں کے بالمقابل ایک دوسرے طور پر ان کے ساتھ کفر کیا۔ بخلاف اس کے مسلمان اسی تعلیم پر قائم رہے جو حضرت عیسٰیؑ نے اور ان سے پہلے تمام انبیاء علیہم السلام نے دی تھی۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی رسول آئے ہیں خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے میں آئے ہوں، ان سب کی ایک ہی تعلیم تھی، اور وہ یہ تھی کہ خدائے واحد کی بندگی کرو۔ ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ مجھ کو خدا مان لو۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ
كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (آلِ عمران - آیت ۸)

ترجمہ: "کسی بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوّت عطا کرے، اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم خُدا پرست بن جاؤ۔"

اس مقدس گروہ کے ایک فرد حضرت عیسٰیؑ بھی تھے اور انھوں نے بھی کبھی عبدیّت کے مقام سے بال برابر تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ (النساء ، ۲۳)

ترجمہ: "مسیح نے کبھی اس کو عار نہ سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو"

پس نصاریٰ کا عقیدہ تثلیث اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اُلوہیت کی نسبت کرنا اور ان کو خدا کا بیٹا کہنا دراصل حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے، اور جو لوگ ایسا عقیدہ رکھتے ہیں وہ آپ کے ساتھ ویسا ہی کفر کرتے ہیں جیسا کہ یہودی کرتے ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ …… لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۔ (المائدہ - ۱۰)

ترجمہ: "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم اللہ ہے، درآنحالیکہ خود مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمھارا پروردگار ہے …… یقیناً کفر کیا انھوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے"

اس لحاظ سے اِتَّبَعُوْكَ کے اصلی مصداق مسلمان اور وہ عیسائی ہیں جو مسیح کو خدا کا بیٹا نہیں بلکہ اس کا رسول مانتے ہیں، ان کی طرف کسی درجہ میں الوہیت کو منسوب نہیں کرتے، اور اس عقیدۂ صالحہ کے قائل ہیں، اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ[1] (النسا: ۲۳) اور اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ[2] (النسا - ۲۳) البتہ اگر اتباع سے مراد اتباعِ کامل نہ لیا جائے تو اس اعتبار سے مسلمانوں کی طرح عیسائی بھی متبعین مسیح میں داخل ہو جاتے ہیں، اور اللہ کا یہ وعدہ دونوں سے متعلق ہو جاتا ہے کہ ان کو یہودیوں پر غلبہ عطا فرمائے جنھوں نے مسیح کا قطعی اور کلی انکار کیا۔

۲۔ مسیح کی، اور صرف انہی کی نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی ہدایت اور تعلیم اپنی اصل کے لحاظ سے قائم و محفوظ ہے، اور قیامت تک رہے گی جیسا کہ ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس تعلیم و ہدایت کو مٹانے نہیں آئے تھے بلکہ اس کو ثابت اور مستحکم کرنے اور ان آمیزشوں سے پاک کرنے

---

[1] مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کا رسول ہے اور وہ کلمہ ہے جو اللہ نے مریم پر اتارا اور اللہ کی طرف سے ایک روح ہے۔

[2] اللہ تو اکیلا ہی اِلٰہ ہے۔ وہ پاک ہے اس سے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔

گئے تھے جو انسانی خواہشات اور بشری وساوس کی بدولت اس میں گھل مل گئی تھیں۔ نصاریٰ سے ان کی جنگ اس بات پر نہ تھی کہ وہ مسیح اور ان کی تعلیم و ہدایت کو کیوں مانتے ہیں، بلکہ اس بات پر تھی کہ وہ اس کو کیوں نہیں مانتے۔ انھوں نے بار بار اپنے خدا کی طرف سے فرمایا کہ یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ[1] (النساء-۲۳) اور یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ[2] (المائدہ-۱۰) اور وَلَوْ اَنَّھُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ مِّنْ رَّبِّھِمْ لَاَکَلُوْا مِنْ فَوْقِھِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِھِمْ[3] (المائدہ-۷) اور وَلْیَحْکُمْ اَھْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فِیْهِ[4] (المائدہ-۷) مگر جب دیکھا کہ مسیح کے متبعین سرے سے انجیل ہی کھو بیٹھے ہیں اور انجیل کے نام سے مسیح کی چند سوانح عمریاں لیے پھرتے ہیں جن میں مسیح کی تعلیم و ہدایت کا ایک بہت ہی خفیف حصہ اور وہ بھی آمیزشوں سے آلودہ پایا جاتا ہے تو انھوں نے نصاریٰ کے سامنے قرآن پیش کیا، اور کہا کہ جو کچھ تم نے کھو دیا تھا، وہ پہلے سے بھی زیادہ مکمل صورت میں پھر تمھارے پاس آگیا ہے۔ یہ وہی تعلیم ہے جو مسیح نے دی اور ان سے پہلے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور نوحؑ دے چکے ہیں۔ تم نے اور تم سے پہلے کی اُمتوں نے اس ہدایت کو بار بار گم کیا، مگر اب یہ ہدایت تم کو ایسی مستحکم صورت میں دی جاتی ہے کہ قیامت تک اس کو کوئی گم نہ کر سکے گا۔ پس درحقیقت متی اور مرقس اور لوقا اور یوحنا کی کتابوں میں نہیں بلکہ قرآن میں مسیحؑ کی اصلی تعلیم قائم اور محفوظ ہے اور وہی انشاء اللہ قیامت تک محفوظ رہے گی۔

۴۔ آپ کا یہ قول بھی محلِ نظر ہے کہ آیت زیرِ بحث سے لازم آتا ہے کہ مسیحؑ ہی قیامت تک اپنی تعلیم اور ہدایت دائمی کی رُو سے دائمی ہادی ہے۔” یہ مفہوم آپ کے تخیّل کا پیدا کردہ ہے۔ آیت کے الفاظ اس

---

[1] اے اہلِ کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو (یعنی حد سے نہ بڑھو)

[2] اے اہلِ کتاب تم کسی طرح حق پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل اور ان کتابوں کو قائم نہ رکھو جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کی گئی ہیں۔

[3] اور اگر وہ توراۃ اور انجیل اور ان کتابوں کو جو ان کے رب کی طرف سے ان کی طرف نازل کی گئی تھیں قائم رکھتے تو اوپر سے اور نیچے سے (ہر طرف سے) ان کو رزق ملتا۔

[4] اہلِ انجیل کو ان احکام کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے جو اللہ نے انجیل میں نازل کیے تھے۔

پر دلالت نہیں کرتے۔ وہاں تو صرف اس قدر کہا گیا ہے کہ جو تیرا انکار کرتے ہیں، ان پر ہم تیرا اتباع کرنے والوں کو قیامت تک غالب رکھیں گے۔ ان الفاظ سے یہ معنی کیونکر نکالے جا سکتے ہیں کہ اب تو ہی دائمی ہادی ہے اور تیرے بعد یہی ہدایت پیش کرنے کے لیے کوئی اور نبی نہ بھیجا جائے گا۔ افسوس کہ آیاتِ کتاب میں لفظی و معنوی تحریفات کرنے کی پرانی عادت ہمارے مسیحی بھائیوں میں سے ابھی تک نہیں گئی۔

۵۔ مسیح کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا مطلب آپ ہم سے پوچھنے کی بجائے خود مسیح علیہ السلام سے پوچھیے۔ جن کا یہ ارشاد تمام تحریفات کے باوجود کتاب یوحنا میں اب تک موجود ہے۔

> "لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار (تسلی دہندہ، یا وکیل یا شفیع) تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا" (یوحنا۔ ۱۶: ۷۔ ۸)

اور یہ کہ:

> "لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کی روح جو باپ کی طرف سے نکلتی ہے، تو وہ میری گواہی دے گا" (یوحنا ۱۵: ۲۶)

اور یہ کہ:

> "لیکن مددگار یعنی سچائی کی روح جسے باپ میرے نام سے بھیجے وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا۔ اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا" (یوحنا ۱۴: ۲۶)

اور یہ کہ:

> "اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں" (یوحنا ۱۴: ۳۰)

اور یہ کہ:

> "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا" (۱۶: ۱۲۔ ۱۳)

مسیح کے ان ارشادات سے آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا مطلب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ "غلبۂ

متبعین مسیح کا وعدہ، جو آپ کے نزدیک "استمرار بلا فصل" کے معنوں میں قیامت تک کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ کے ظہور سے ٹوٹتا نہیں، اور زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آپؐ نے آکر مسیح کی گواہی دی (اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ اور وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ) اور اس بہتانِ عظیم پر یہودیوں کو توبیخ کی جو وہ مسیح اور اس کی ماں پر رکھتے تھے (وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا) اور وہ سب باتیں مسیحیوں کو یاد دلائیں جو مسیح نے ان سے کہی تھیں (وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ)..... مسیح اسی لیے گئے تھے کہ اس دوسرے آنے والے کے لیے جگہ خالی کر دیں جو ان کے بعد آ کر اس کام کو پورا کرنے والا تھا جسے وہ نامکمل چھوڑ گئے تھے۔

۶۔ آیت اِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ .... الخ میں اگرچہ خطاب بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف معلوم ہوتا ہے، مگر دراصل ہر وہ شخص اس کا مخاطب ہے جو قرآن پڑھے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے ناظر یا سامع اگر تجھے قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہے تو جن لوگوں کے پاس قرآن سے پہلے آئی ہوئی کتابیں موجود ہیں ان سے دریافت کر لے، ان کی گواہی سے تجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کتاب خدا ہی کی طرف سے ہے۔ یہ اشارہ ان پیشگوئیوں کی طرف ہے جو انبیائے سابقین کی کتابوں میں نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق موجود ہیں۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ
لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ (البقرہ - ۱۷)

ترجمہ:۔ "جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ خود اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے سچی بات کو چھپاتا ہے۔"

وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (انعام، ۱۴)

ترجمہ:۔ "اور جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن درحقیقت تیرے پروردگار کی طرف سے اُترا ہوا ہے۔"

قرآن نے اپنی صداقت پر منجملہ بہت سی شہادتوں کے ایک شہادت انبیائے سابقین کی کتابوں سے بھی پیش کی ہے اور اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ بالخصوص ان لوگوں کو مطمئن کرنا مقصود ہے جو انبیائے سابقین کی کتابوں کو تو مانتے ہیں مگر قرآن کی صداقت میں شک کرتے ہیں۔ اس لیے کہ کتبِ سابقہ کی گواہی انھیں کے لیے

معتبر ہو سکتی ہے۔ اس طلبِ شہادت میں کوئی بات ایسی نہیں۔ جس سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہو کہ قرآن شک میں ڈالنے والی چیز ہے۔ بات کو اس کے صاف اور واضح مفہوم سے پھیر کر پیچیدہ مطلب نکالنے کی کوشش کرنا کسی طالبِ حق کا کام نہیں۔ ان طریقوں کو ایسے لوگوں کے لیے چھوڑ دیجیے جو نزاع و جدال کی الجھنوں میں اپنا وقت ضائع کرنا چاہتے ہوں۔

قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ سے پہلے ایک اور فقرہ تھا جس کو آپ نے دانستہ یا نادانستہ چھوڑ دیا۔ پوری آیت یہ ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (اٰلِ عمران ۔ اٰیت ۹۳)

ترجمہ: ”تمام کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے بجز ان کے جنھیں اسرائیل نے تورات کے نزول سے پہلے اپنے لیے حرام کر لیا تھا۔ اے محمد کہو کہ تورات لے آؤ اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔“

اس آیت میں یہود کو یہ الزام دیا گیا ہے کہ تم تورات کے احکام کو چھپاتے ہو۔ اور یہ الزام ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر دیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ میں ہے:

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (سورۃ المائدہ ۔ اٰیت ۴۳)

ترجمہ: ”وہ تجھ کو اپنے معاملہ میں کیسے حکم بنائیں جب کہ خود ان کے پاس تورات موجود ہے۔ جس میں اللہ کا حکم ہے اور پھر وہ اس سے رُوگردانی کرتے ہیں وہ دراصل تورات پر ایمان نہیں رکھتے۔“

قرآن میں یہودیوں کے دو جرم بتائے گئے ہیں۔ ایک جرم یہ کہ وہ کتاب میں تحریف کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ تحریفات کے باوجود جو کچھ کتاب میں سچی خدائی تعلیم باقی ہے اس کو بھی اپنی خواہشاتِ نفس کے اتباع میں چھپاتے اور اس کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ یہاں اگر تورات سے استشہاد ہے تو وہ یہودیوں کے جرم پر ہے۔ اس سے آپ کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ (۱۰۲)

فصل ۲

ضمیمہ (۲)

پوپ پال ششم کا پیغامِ امن اور اس کا جواب

دسمبر ۱۹۶۷ء میں رومن کیتھولک چرچ کے پوپ کا ایک پیغام جو تمام دنیا کی دینی جماعتوں کے سربراہوں کے نام جاری کیا گیا تھا، مولانا محترم کو بھی وصول ہوا تھا۔ اس کا مولانا محترم نے جو جواب دیا تھا وہ ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اسے بشکریہ ترجمان القرآن اس مجموعے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

ڈیر پوپ پال ششم[1]

چند روز پہلے مجھے ڈاکٹر آر۔ اے بٹلر، ڈائرکٹر لوئیلا ہال، لاہور کے توسط سے آپ کا وہ نہایت قابلِ قدر پیغام پہنچا جس میں آپ نے نئے سال کا آغاز "ایک یومِ امن" کی تقریب سے کرنے کی اپیل کیتھولک چرچ کے معتقدین کے علاوہ تمام دنیا کے بڑے بڑے ادیان کے پیرؤوں اور تمام نیک خواہشات رکھنے والے لوگوں سے کی تھی۔ اس پیغام کے متعلق میں اپنے خیالات آپ تک جلدی پہنچانا چاہتا تھا، مگر رمضان اور عید الفطر کی مصروفیات اس میں مانع رہیں۔ اب پہلی فرصت میں میں آپ کو خطاب کر رہا ہوں۔

میں آپ کو اس بات پر مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے ایک ایسے مقصد کی طرف دنیا کے انسانوں کو دعوت دی ہے جو سب کا مشترک مقصد ہے اور ساتھ ساتھ ان اہم اسباب کی نشاندہی بھی کی۔ جو اس مقصد کے حصول میں سنگِ راہ ہوں۔ فی الحقیقت امن ان اولین بنیادی ضروریات میں سے ہے جس پر نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا

---

[1] خط انگریزی میں تھا اور ان الفاظ سے مکتوب الیہ کو خطاب کیا گیا تھا۔

انحصار ہے۔ مگر اس کی خواہش اور اس کی ضرورت کا احساس رکھنے کے باوجود جن وجوہ سے انسان ہمیشہ اس سے محروم ہوتا رہا ہے اور آج بھی محروم ہے وہ وہی وجوہ ہیں جن میں سے اکثر کی طرف آپ نے صحیح طور پر دنیا کے لوگوں کی توجہ دلائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک عملاً ان کو رفع کرنے کے لیے کچھ نہ کیا جائے گا محض پاکیزہ خواہشات اور تمناؤں کے اظہار سے کوئی امن دنیا کو میسّر نہ آسکے گا۔ اس بنا پر میرے نزدیک یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک شخص، قوم، مجموعۂ اقوام اور پیروانِ مذہب کا گروہ پورے خلوص اور دیانت کے ساتھ خود اپنا محاسبہ کر کے دیکھے کہ اس کی اپنی کوتاہیاں کیا ہیں، جو اس کے ابنائے نوع کو، اور بالآخر خود اس کو امن سے محروم کرنے کی موجب ہوتی ہیں اور جہاں تک بھی اس کے امکان میں ہو اس کو رفع کرنے کی کوشش کرے۔ اسی طرح ہم میں سے ہر ایک پوری صاف گوئی کے ساتھ اصلاح کی نیت سے، نہ کہ تلخی پیدا کرنے اور بڑھانے کے لیے دوسرے گروہوں کے نیک نیت لوگوں تک یہ بات پہنچانی چاہیے کہ ان کے طرزِ عمل میں کیا چیزیں ایسی ہیں جو اس کے گروہ کے لیے موجب اذیت ہوتی ہیں تاکہ وہ انھیں رفع کرنے کی کوشش کر سکیں۔

ٹھیک اسی غرض کے لیے میں آپ کو چند ایسے امور کی طرف توجہ دلا رہا ہوں۔ جو مسلمانوں کے لیے اپنے مسیحی بھائیوں سے وجہ شکایت ہیں تاکہ کیتھولک چرچ کے پیشوائے اعظم ہونے کی حیثیت سے جو غیر معمولی اثر و رسوخ آپ کو مسیحی دنیا میں حاصل ہے، اس سے کام لے کر آپ اُن کی اصلاح کے لیے سعی فرمائیں۔ اور میں اس بات کا خیر مقدم کروں گا کہ ہمارے مسیحی بھائیوں کے لیے ہمارے طرزِ عمل میں اگر کوئی معقول وجہ شکایت ہو تو وہ ہمیں بتائی جائے۔ ہم انشاء اللہ ان کو رفع کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ دنیا میں امن اور صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے میں ہم سب اسی طرح مددگار بن سکتے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کریں۔ دوسروں سے فیاضانہ سلوک کرنے کی فراخ حوصلگی اگر ہم میں موجود نہ بھی ہو تو کم از کم اتنا تو ہو کہ دوسروں کی حق تلفی کرنے یا ان کو اذیت دینے سے تو ہم باز رہیں۔

مسیحی بھائیوں کے طرزِ عمل میں جو امور کسی ایک ملک یا قوم کے لیے نہیں، پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے وجہ شکایت ہیں۔ انھیں میں کسی لاگ لپیٹ کے بغیر مختصراً آپ سے بیان کیے دیتا ہوں۔

۱۔ ایک مُدّتِ دراز سے مسیحی اہلِ علم اپنی تحریروں اور تقریروں میں سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن اور اسلام پر جو حملے کر رہے ہیں اور آج بھی جن کا سلسلہ جاری ہے، وہ مسلمانوں کے لیے انتہائی موجبِ اذیت ہیں۔ میں "حملے" کا لفظ قصداً استعمال کر رہا ہوں، تاکہ آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہماری شکایت معقول علمی تنقید کے خلاف ہے۔

علمی تنقید اگر دلیل کے ساتھ اور تہذیب و شائستگی کے حدود میں ہو تو خواہ وہ کیسے ہی سخت اعتراضات پر مشتمل ہو، ہم اس کو برا نہیں مانتے بلکہ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور دلیل کا جواب دلیل سے دینے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن ہمیں بجا طور پر شکایت ان حملوں کے خلاف ہے جو جھوٹے اور رکیک الزامات کی صورت میں اور نہایت دل آزار زبان میں کیے جاتے رہے اور اب تک کیے جا رہے ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کا انتہائی ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور ان کے متعلق کوئی خلافِ ادب بات زبان سے نکالنا ہمارے عقیدے میں کفر ہے۔ آپ کوئی مثال ایسی نہیں پا سکتے کہ کسی مسلمان نے کبھی سیدنا مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ کی شان میں کوئی بے ادبی کی ہو۔ اگرچہ ہم حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے قائل نہیں ہیں، مگر ان کی نبوت پر ہمارا ویسا ہی ایمان ہے جیسا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ہے، اور کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُن پر اور دوسرے انبیاء پر بھی ایمان نہ لائے۔ اسی طرح ہم صرف قرآن ہی کو نہیں بلکہ تورات اور انجیل کو بھی خدا کی کتابیں تسلیم کرتے ہیں اور کوئی مسلمان ان مقدس کتابوں کی توہین کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ ہماری طرف سے اگر کبھی کوئی بحث ہوئی ہے تو اس حیثیت سے ہوئی ہے کہ بائیبل جس شکل میں اب پائی جاتی ہے یہ کہاں تک مستند ہے؛ اور یہ بحث خود مسیحی علماء بھی کرتے رہے ہیں۔ کسی مسلمان نے کبھی اس کا انکار نہیں کیا کہ حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور بائیبل کے دوسرے انبیاء پر اللہ کا کلام نازل ہوا تھا، اور مسلمان چاہے یہ بات نہ مانتے ہوں کہ اس وقت پائی جانے والی پوری بائیبل اللہ کا کلام ہے، مگر یہ ضرور مانتے ہیں کہ اس میں اللہ کا کلام موجود ہے۔ لہٰذا ہمارے مسیحی بھائیوں کو ہم سے یہ شکایت کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا ہے کہ ہم ان کے انبیاء کی، یا ان کی کتب مقدسہ کی توہین کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے ہمیں آئے دن ان سے یہ رنج پہنچتا رہتا ہے، اور صدیوں سے اس دل آزاری کا سلسلہ چل رہا ہے۔ کہ ان کے مصنفین اور مقررین ہمارے نبی اور ہماری کتاب مقدس اور ہمارے دین پر سخت حملے کرتے ہیں۔ دنیا کی اسلامی اور مسیحی برادریوں کے درمیان تعلقات کی خرابی کا یہ ایک اہم سبب ہے، اس سے شدید باہمی منافرت پیدا ہوتی ہے، اور مزید براں اس ناروا پروپیگنڈے کا لازماً یہ نتیجہ بھی ہوتا ہے کہ مسیحی عوام کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و تحقیر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ آپ دنیا کے امن کی بہت بڑی خدمت انجام دیں گے اگر مسیحیت کے پیروؤں کو اس طرزِ عمل میں کم از کم اتنی اصلاح کر لینے کی نصیحت کریں کہ یہ دل آزاری اور نفرت انگیزی کی حد تک نہ پہنچے۔

۲۔ مسیحی مشن اور مشنری ایک مدتِ دراز سے مسلم ممالک میں مسیحیت پھیلانے کے لیے جو جو طریقے استعمال

کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں، وہ بھی دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک بڑی وجہ شکایت ہیں۔ دوسرے ملکوں اور آبادیوں میں ان کا جو طرزِ عمل بھی ہو، اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ مگر مسلمان ملکوں اور آبادیوں میں ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ انھوں نے محض "تبلیغ" پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اس سے تجاوز کر کے دوسرے متعدد ایسے طریقے اختیار کیے ہیں جو تبلیغ کے بجائے سیاسی دباؤ، معاشی طمع و تحریص، اور اخلاقی و اعتقادی تخریب کی تعریف میں آتے ہیں۔ جنھیں مشکل ہی سے کوئی معقول آدمی اشاعتِ مذہب کے جائز ذرائع تسلیم کر سکتا ہے۔ افریقہ کے ایک بڑے حصے میں انھوں نے استعماری طاقتوں کی مدد سے مسلمانوں کو تعلیم سے محروم کیا، اور درسگاہوں کے دروازے ہر اس شخص پر بند کر دیے جو مسیحیت قبول نہ کرے۔ یا کم از کم اپنا اسلامی نام ترک کر کے مسیحی نام نہ اختیار کرے۔ اس طریقے سے جو با اثر مسیحی اقلیت پیدا کی گئی، آزادی کا دور آنے کے بعد آج وہ بہت سی افریقی ریاستوں پر سیاسی، فوجی اور معاشی حیثیت سے غالب ہے جن کی بیشتر آبادی مسلمان ہے۔ یہ ایک صریح ناانصافی تھی جو مسلم اکثریت رکھنے والے افریقی ملکوں کے ساتھ کی گئی۔ سوڈان میں برطانوی استعمار کی مدد سے مشنریوں نے جنوبی حصے کو اپنے لیے "محفوظ علاقہ" بنوا لیا جس میں تعلیم اور تبلیغ کا حق صرف مسیحی مشنریوں کے لیے مختص کر دیا گیا اور مسلمانوں کے لیے تبلیغ تو درکنار، دوسری اغراض تک کے لیے وہاں جانے پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کو کسی دلیل سے بھی اشاعتِ مذہب کا جائز و معقول طریقہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ خود ہمارے ملک میں ہسپتالوں اور درس گاہوں کا معروف طریقِ کار یہ ہے کہ وہ مسلمان مریضوں اور طلبہ سے بے تحاشا فیسیں وصول کرتے ہیں، اور جو غریب آدمی عیسائیت قبول کرے اسے علاج اور تعلیم کی سہولتیں مفت یا برائے نام خرچ پر بہم پہنچاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تبلیغ نہیں بلکہ ضمیر و ایمان کی خرید و فروخت ہے۔ علاوہ بریں ان کی درسگاہیں ہمارے ہاں ایک ایسی نسل تیار کر رہی ہیں جو نہ مسیحیت اختیار کرتی ہے، نہ مسلمان رہتی ہے بلکہ اپنے اخلاق و تہذیب، زبان اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے ایک اجنبی عنصر بن کر رہ جاتی ہے اور مذہبی حیثیت سے اس کے اندر مسیحیت یا اسلام کے بجائے الحاد و بے دینی کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیا کوئی معقول آدمی یہ مان سکتا ہے کہ یہ مذہب کی خدمت ہے جو مسیحی مشن انجام دے رہے ہیں۔ یہی وجوہ ہیں جن کی بنا پر مسلمان ملکوں میں عموماً ان مشنوں کو مذہبی تبلیغ کے بجائے اسلام اور مسلم معاشرے کے خلاف ایک سازش سمجھا جاتا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس کے نتائج پر غور فرمائیں اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مشنری اداروں کے طرزِ تبلیغ میں اصلاح

کی کوشش کریں۔

۳۔ مسیحی دنیا کے متعلق مسلمانوں کا عام احساس یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک شدید جذبۂ عناد رکھتی ہے اور آئے دن ہمیں ایسے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ جو اس احساس کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس کا تازہ ترین تجربہ وہ ہے جو ابھی حال میں عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر ہوا۔ اس لڑائی میں اسرائیل کی فتح پر یورپ اور امریکہ کے بیشتر ملکوں میں جس طرح خوشیاں منائی گئیں انھوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کے دل میں زخم ڈال دیے ہیں۔ آپ شاید ہی کوئی مسلمان ایسا پائیں گے جس نے عربوں کی شکست اور اسرائیل کی فتح پر مسیحی دنیا کے اس علی الاعلان اظہارِ مسرت و شادمانی اور اسرائیل کی کھلی کھلی حمایت کو دیکھ کر یہ محسوس نہ کیا ہو کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مسیحیوں کے گہرے جذبۂ عناد کا مظاہرہ تھا۔ فلسطین میں اسرائیل کی ریاست جس طرح بنی ہے، بلکہ بنائی گئی ہے، اس کی تاریخ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دو ہزار برس سے فلسطین عرب آبادی کا وطن تھا۔ موجودہ صدی کے آغاز میں وہاں یہودی ۸ فی صد سے زیادہ نہ تھے۔ اس حالت میں برطانوی حکومت نے اس کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا فیصلہ کیا اور مجلسِ اقوام نے نہ صرف اس فیصلے کی توثیق کی بلکہ برطانوی حکومت کو فلسطین کا مینڈیٹ دیتے ہوئے یہ ہدایت کی کہ وہ یہودی ایجنسی کو باقاعدہ شریک حکومت بنا کر اس تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اس کے بعد دنیا بھر کے یہودیوں کو لا لا کر ہر ممکن تدبیر سے فلسطین میں بسانے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ ۳۰ سال کے اندر ان کی آبادی ۳۳ فی صد تک پہنچ گئی۔ یہ ایک صریح ظلم تھا جس کے ذریعے سے ایک قوم کے وطن میں زبردستی ایک دوسری اجنبی قوم کا وطن بنایا گیا۔ پھر ایک دوسرا اس سے بھی ظالمانہ قدم اٹھایا گیا اور امریکہ نے کھلے بندوں دباؤ ڈال کر اقوامِ متحدہ سے یہ فیصلہ کرایا کہ یہودیوں کے اس مصنوعی قومی وطن کو یہودی ریاست میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس فیصلے کی رُو سے ۳۲ فی صدی یہودی آبادی کو فلسطین کا ۵۵ فی صدی اور عربوں کی ۶۸ فی صدی آبادی کو ۴۵ فی صدی رقبہ الاٹ کیا گیا تھا لیکن یہودیوں نے لڑ کر طاقت کے بل پر اس ملک کا ۷۷ فی صدی رقبہ حاصل کر لیا۔ اور مار دھاڑ اور قتل و غارت کے ذریعہ سے لاکھوں عربوں کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ یہ ہے اسرائیل کی اصل حقیقت۔ کیا دنیا کا کوئی انصاف پسند اور ایمان دار آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک جائز ریاست ہے جو فطری اور منصفانہ طریق سے بنی ہے؟ اس کا تو عین وجود ہی ایک بدترین جارحیت ہے اور اس پر مزید ظلم یہ ہے کہ یہودی صرف ان حدود کے اندر محدود رہنے پر بھی راضی نہیں ہیں جو انھوں نے فلسطین میں زبردستی حاصل کی ہیں، بلکہ وہ سالہا سال سے علانیہ کہہ رہے ہیں کہ نیل سے فرات تک کا پورا علاقہ ان کا قومی وطن ہے۔ اس

کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ یہ قوم ہر وقت یہ جارحانہ ارادہ رکھتی ہے کہ اس پورے علاقے پر جبراً قبضہ کرے اور اس کے اصل باشندوں کو زبردستی نکال کر دنیا بھر میں پھیلے ہوئے یہودیوں کو وہاں لا کر بسائے۔ اسی جارحانہ سکیم کا ایک جز گزشتہ ماہ جون کا وہ اچانک حملہ تھا جس کے ذریعے سے اسرائیل نے ۲۶ ہزار مربع میل علاقے پر قبضہ کیا۔ اس پورے ظلم کی ذمہ دار مسیحی دنیا ہے۔ اس نے ایک قوم کے وطن میں ایک دوسری قوم کا وطن زبردستی بنوایا۔ اس نے اس مصنوعی قومی وطن کو ایک ریاست میں تبدیل کرایا۔ اس نے اس جارح ریاست کو روپے اور ہتھیاروں سے مدد دے کر اتنا طاقت ور بنایا کہ وہ زبردستی اپنے توسیعی منصوبوں کو عمل میں لا سکے اور اب اس ریاست کی تازہ فتوحات پر یہی مسیحی دنیا جشنِ شادمانی منا رہی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد نہ صرف عربوں میں بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں مسیحیوں کی انصاف پسندی، ان کی خیر اندیشی اور مذہبی عناد و تعصب سے ان کی بریّت پر کوئی اعتماد باقی رہ گیا ہے؟ اور کیا آپ کا خیال ہے کہ دنیا میں امن قائم کرنے کے یہی طریقے ہیں؟ یہ دراصل ہمارا نہیں بلکہ آپ کا کام ہے کہ مسیحی بھائیوں کو اس روش پر شرم دلائیں اور ان کی رُوح کو اس گندگی سے پاک کرنے کی کوشش کریں۔

۴۔ اس سلسلے میں ایک زیادتی ایسی بھی ہے جو خود آپ کی طرف سے ہو رہی ہے، اگرچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ ہے اور آپ کو غالباً یہ احساس نہیں ہے کہ درحقیقت وہ ایک زیادتی ہے۔ میرا اشارہ آپ کی اس تجویز کی طرف ہے کہ قدیم بیتُ المُقدّس کو بین الاقوامی کنٹرول میں دے دیا جائے۔ آپ یہ تجویز شاید اس خیال سے پیش کر رہے ہیں کہ اس طرح یہ مقدس شہر لڑائی جھگڑے سے محفوظ رہے گا لیکن درحقیقت اس کا نتیجہ ایک اور ظلم کی شکل میں رُونما ہوگا۔ ظاہر ہے کہ بین الاقوامی کنٹرول اسی بین الاقوامی ادارے کے ہاتھ میں ہوگا، جس نے اسرائیل کی یہ مصنوعی ریاست بنائی ہے اور جو آج تک اسرائیل کی کسی جارحیت کو نہ روک سکا ہے نہ اس کے ہو جانے کے بعد اس کا تدارک کر سکا ہے۔ اس ادارے کے کنٹرول میں جب یہ شہر آ جائے گا تو وہ یہودیوں کے لیے بیت المُقدّس میں آباد ہونے کے دروازے اسی طرح چوپٹ کھول دے گا جس طرح مجلسِ اقوام کے انتداب کے تحت برطانوی حکومت نے یہودی مہاجرین کے لیے فلسطین کے دروازے کھولے تھے، اور پھر یہودیوں کو بیت المقدس کی زمینیں اور عمارتیں خریدنے کی وہی سب سہولتیں بھی فراہم کر دی جائیں گی جو برطانوی انتداب اس سے پہلے فلسطین میں ان کو فراہم کر چکا ہے۔ اس طرح تھوڑی ہی مدت کے اندر یہ شہر عملاً یہودی شہر بن جائے گا۔ اور وہ یہودی اس پر

قابض ہوں جن کے دلوں میں نہ مسیحی مقدسات کا کوئی احترام ہے نہ اسلامی مقدسات کا۔

میں آپ کے پیغام کے جواب میں اس طویل مراسلے اور اس صاف گوئی پر معذرت خواہ ہوں۔ مگر میں آپ کو یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا تھا کہ قیامِ امن کی اصل رکاوٹیں کیا ہیں۔ جنھیں دور کرنے کے لیے عملاً کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ میں پھر اس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ اگر اسلامی دنیا کی طرف سے کوئی ایسی بات ہو جسے امنِ عالم کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جائے تو وہ مجھے بتائی جائے۔ مجھ کو جو تھوڑا بہت اثر دنیائے اسلام میں حاصل ہے اسے میں خود بھی اس رکاوٹ کے دور کرنے میں استعمال کروں گا اور دوسرے زعمائے اسلام کو بھی اس کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ (۱۰۳)

فصل ۲

ضمیمہ (۳)

پاکستان میں مسیحیت کی ترقی کے اصل وجوہ[1]

جن فتنوں کے پھیلنے کا انحصار نشر و تبلیغ پر ہو۔ ان کا مقابلہ تو بے شک نشر و تبلیغ سے کیا جا سکتا ہے اور اس کام میں دانستہ کوتاہی میں نے کبھی نہیں کی ہے لیکن جن فتنوں کو پھیلانے میں اختیارات کی طاقت کارفرما ہو ان کے علاج کی کوئی صورت اس طاقت کی اصلاح یا تبدیلی کے سوا نہیں ہے۔ ان کو محض نشر و تبلیغ سے نہیں روکا جا سکتا۔

جو لوگ اس ملک میں عیسائیت قبول کر رہے ہیں یا پہلے جنھوں نے قبول کی ہے، ان میں سے بہت ہی کم ایسے ہوں گے جنھوں نے دلیل کی بنا پر یہ مان لیا ہو کہ خدا تین ہیں، یا حضرت عیسٰیؑ خدا کے بیٹے تھے۔ یا ایک شخص کا سولی پر چڑھ جانا دوسروں کے گناہوں کا کفارہ ہو سکتا ہے۔ اس کے عقائد کو صحیح مان کر، اور اسلام کے معقول عقائد کو غلط سمجھ کر مسلمانوں سے عیسائی بن جانے والے آخر کتنے ہو سکتے ہیں۔ دراصل جو چیز لوگوں کو عیسائیت کی آغوش میں کھینچے لیے جا رہی ہے وہ مسیحی مشنریوں کی تبلیغ نہیں بلکہ مشن ہسپتالوں اور سکولوں کی کارگزاری ہے جسے فروغ دینے میں ہماری اپنی حکومت کی بالواسطہ اور بلاواسطہ امداد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس پر مزید وہ غیر معمولی اثر و رسوخ جو عیسائی پادریوں کو ہمارے حکام عالی مقام کی بارگاہوں میں حاصل ہے۔ یہ عیسائیت کے پھیلنے میں مددگار ہو رہا ہے۔ ان اسباب کی جب تک روک تھام نہ ہو، میری، آپ کی یا تمام علماء کی مجموعی تبلیغ سے بھی کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

عیسائی ہسپتالوں میں ہر شخص جا کر خود دیکھ سکتا ہے کہ وہ نہ بے غرض خدمتِ خلق کے ادارے ہیں اور نہ علاج کے تجارتی ادارے بلکہ ان میں کھلم کھلا ایمان خریدنے کا کاروبار ہو رہا ہے۔ ان اداروں میں مسلمانوں سے علاج کی خوب فیسیں لی جاتی ہیں اور عیسائیوں کا مفت علاج ہوتا ہے اور اس کے

---

[1] ایک خط کے جواب میں مؤلف نے مکتوب الیہ کو جواب دیا تھا۔

ساتھ دینِ مسیحی کی تبلیغ بھی مریضوں پر کی جاتی ہے۔ اس حالت میں ایک غریب آدمی کے لیے جو اپنا یا اپنے کسی عزیز کا علاج کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، اس امر کی بہت بڑی تحریص موجود ہے کہ اپنا دین تبدیل کر کے علاج کی سہولتیں حاصل کر لے۔

مسیحی مدرسوں اور کالجوں میں بھی یہی صورت ہے کہ ان میں مسلمانوں سے خوب فیسیں لی جاتی ہیں اور عیسائیوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے، بلکہ ان کے لیے بیرونی ممالک میں بھی تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں فراہم کر دی جاتی ہیں۔ یہاں پھر غریبوں کے لیے یہ تحریص موجود ہے کہ جو تعلیم وہ اپنے بچوں کو خود نہیں دلا سکتے، اس کا انتظام محض مذہب تبدیل کرنے سے ہو سکتا ہے اور دنیوی ترقی کے دروازے ان کے لیے کھل سکتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کے ادارے ہمارے ملک میں ایک طرف تو بیرونی روپے سے چل رہے ہیں اور دوسری طرف ہماری اپنی حکومت ہر طرح ان کی امداد کر رہی ہے۔ ان کو گرانٹ دی جاتی ہے۔ ان کو زمینیں دی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ وہ رعایتیں کی جاتی ہیں جو خود مسلمانوں کے مذہبی اداروں کے ساتھ کبھی نہیں کی گئیں اور ان کے معاملے میں اس سوال سے بالکل آنکھیں بند کر لی گئی ہیں کہ باہر سے آنے والا یہ روپیہ جو ان اداروں پر خرچ ہو رہا ہے، اور غیر ممالک کے مشنری ہمارے شہروں اور دیہات میں پھیل کر اس روپے سے جو کام لے رہے ہیں، اس کے پیچھے خالص دینی تبلیغ کے علاوہ اور کیا اغراض کارفرما ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمارے اپنے ہی حکمران مذہبی اداروں کے تمام معقول حدود سے تجاوز کر کے اس بات پر نہ صرف راضی ہیں بلکہ اس میں خود مددگار بن رہے ہیں کہ دوسرے لوگ روپے کے زور سے مسلمانوں کے ایمان خرید لیں۔

مسیحی پادریوں کے اثر و رسوخ کا یہ حال ہے کہ آج ہمارے دیہاتی علاقوں میں غیر مسیحی عوام کو ظالموں کے ظلم سے بچانے کے لیے کوئی تحفظ حاصل نہیں۔ لیکن ہر جگہ مسیحی برادری کا پشت پناہ ایک پادری موجود ہے جو تھانے سے لے کر سیکرٹری ایٹ تک ہر درجے اور مرتبے کے حکام سے مسیحیوں کو نہ صرف انصاف دلاتا ہے بلکہ ان کے لیے بے جا رعایتیں تک حاصل کر لیتا ہے۔ مسلمانوں کے کسی عالم کو ان حاکموں کی بارگاہوں میں وہ رسائی حاصل نہیں ہے جو عیسائی پادریوں کو حاصل ہے۔ مسلمان علماء ان تمام حکام کی نگاہوں میں ویسے ہی ذلیل و خوار ہیں جیسے انگریز حاکموں کی نگاہ میں کبھی تھے۔ مگر مسیحی پادری ان کا بھی اُسی طرح "فادر" ہے جس طرح انگریز حاکموں کا تھا۔ یہ ایک اور سبب ہے جس کی بنا پر دیہات کے بے سہارا لوگ اپنے آپ کو پولیس اور زمینداروں اور بااثر غنڈوں کے ظلم سے بچانے کے لیے مسیحیت میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور

ہو رہے ہیں۔

یہ تو غریبوں میں مسیحیت کے پھیلنے کے اسباب ہیں۔ رہے کھاتے پیتے طبقے، تو ہماری حکومت ہی کی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ خوشحال لوگ اپنی اولاد کو اُردو زبان اور اپنی قومی تہذیب اور اپنے دین کی تعلیم و تربیت دینا لا حاصل سمجھتے ہیں اور ان کو ایسی تعلیم و تربیت دلوانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے وہ زبان اور اطوار و عادات کے اعتبار سے پورے انگریز یا امریکی بن جائیں۔ اس غرض کے لیے وہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو مسیحی اداروں میں بھیجتے ہیں جہاں کا پورا ماحول ان کو اسلام اور اسلامی تہذیب سے بیگانہ اور اسلامی تعلیمات سے محض ناواقف ہی نہیں بلکہ منحرف اور باغی بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد اگر یہ نوجوان عیسائی نہ بھی بنیں تو بہر حال مسلمان تو نہیں رہتے، بلکہ مسلمانوں کی بہ نسبت عیسائیوں سے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ تعلیم سے فارغ ہو کر ہمارے بڑے بڑے افسر بنتے ہیں اور اونچے عہدے انھیں کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ ان سے کوئی یہ اُمید کر سکتا ہے کہ ان کی ہمدردیاں مسیحیت کے مقابلے میں کبھی اسلام کے ساتھ ہو سکیں گی اور مسیحیت کے فروغ کو روکنے کا کوئی جذبہ ان میں پیدا ہو سکے گا۔

ان حالات میں محض مسیحی عقائد کی تردید میں مضامین لکھنے یا گاؤں گاؤں تبلیغ کے لیے دورے کرنے سے مسیحیت کے اس سیلاب کو کہاں تک روکا جا سکتا ہے۔ (۱۰۴)

ضمیمہ اوّل

عبارات مؤلّف کے حوالہ جات

(۱) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حاشیہ ۳۲
(۲) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حاشیہ ۳۴
(۳) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حاشیہ ۳۵
(۴) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حاشیہ ۳۶
(۵) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حاشیہ ۴۴
(۶) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۴
(۷) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۵
(۸) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۶
(۹) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۷
(۱۰) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۸
(۱۱و) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۸
(۱۱ب) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۹ الف
(۱۲) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ المومنون حاشیہ ۴۴
(۱۳) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۲۰
(۱۴) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۲۰ الف
(۱۵) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۶
(۱۶) رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۱۹۳-۱۹۴

(۱۷) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۲۲
(۱۸) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ انبیاء حاشیہ ۸۹
(۱۹) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۴۰
(۲۰) تفہیم القرآن ج ۱ سورہ النساء حاشیہ ۲۱۲-۲۱۳
(۲۱) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ المومنون حاشیہ ۴۳
(۲۲) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ الزخرف حاشیہ ۵۷
(۲۳) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۲۲
(۲۴) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حاشیہ ۴۰
(۲۵) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حاشیہ ۴۸
(۲۶) مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۲۴۲ تا ۲۴۳
(۲۷) الجہاد فی الاسلام
(۲۸) الجہاد فی الاسلام
(۲۹) الجہاد فی الاسلام
(۳۰) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۳۶
(۳۱) تفہیم القرآن ج ۵ سورۂ الصف حاشیہ ۸
(۳۲) الجہاد فی الاسلام
(۳۳) رسائل و مسائل حصہ اوّل ص ۳۶۲-۳۶۳

(۳۴) رسائل و مسائل حصہ اوّل ص ۳۶۱

(۳۵) تفہیم القرآن ج ۵ سورۂ التغابن حاشیہ ۵

(۳۶) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۱۰۱

(۳۷) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۱۳۰

(۳۸) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حاشیہ ۲

(۳۹) الجہاد فی الاسلام

(۴۰) رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۳۴

(۴۱) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ النساء حاشیہ ۲۰۵

(۴۲) رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۳۵-۳۶

(۴۳) تفہیم القرآن ج ۵ سورۂ الحدید حاشیہ ۵۴

(۴۴) تفہیم القرآن ج ۶ سورۂ بروج حاشیہ ۴

(۴۵) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حواشی ۶-۷

(۴۶) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حاشیہ ۹

(۴۷) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف کا ضمیمہ ص ۹۶، ۷۷

(۴۸) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حاشیہ ۱۰

(۴۹) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حاشیہ ۱۱

(۵۰) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حاشیہ ۱۲

(۵۱) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حاشیہ ۱۴

(۵۲) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حاشیہ ۱۵

(۵۳) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حاشیہ ۱۶

(۵۴) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حاشیہ ۱۷

(۵۵) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حاشیہ ۱۸

(۵۶) تفہیم القرآن ج ۳ سورہ کہف حاشیہ ۱۹

(۵۷) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حاشیہ ۲۰

(۵۸) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حاشیہ ۲۱

(۵۹) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حاشیہ ۲۲

(۶۰) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ کہف حاشیہ ۲۳

(۶۱) تفہیم القرآن ج ۳ دیباچہ الکہف ص ۶-۷

(۶۲) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ الکہف حاشیہ ۳۱

(۶۳) تفہیم القرآن ج ۶ دیباچہ سورۂ فیل

(۶۴) تفہیم القرآن ج ۵ سورۂ الصف حاشیہ ۸

(۶۵) تفہیم القرآن ج ۶ دیباچہ سورۂ العلق

(۶۶) تفہیم القرآن ج ۳ دیباچہ سورۂ مریم

(۶۷) تفہیم القرآن ج ۳ دیباچہ سورۂ مریم

(۶۸) تفہیم القرآن ج ۳ دیباچہ سورۂ مریم

(۶۹) رسائل و مسائل ج ۱ ص ۲۵۹

(۷۰) تفہیم القرآن ج ۶ سورۂ تحریم حاشیہ ۲

(۷۱) تفہیم القرآن ج ۳ دیباچہ سورۂ روم ص ۴۲۷ تا ۴۲۸

(۷۲) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ روم حاشیہ ۱

(۷۳) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حاشیہ ۲۹

(۷۴) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آل عمران حاشیہ ۵۴

(۷۵) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آل عمران حاشیہ ۵۵

(۷۶) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ القصص حاشیہ ۷۲

(۷۷) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ القصص حاشیہ ۷۳

(۷۸) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ القصص حواشی ۷۴ تا ۷۷

(۷۹) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۳۹

(۸۰) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ الزخرف حاشیہ ۵۸
(۸۱) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۱۰۰
(۸۲) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ نساء حاشیہ ۲۱۵
(۸۳) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ نساء حاشیہ ۲۱۶
(۸۴) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ نساء حاشیہ ۲۱۷
(۸۵) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ الزخرف حاشیہ ۵۳
(۸۶) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ الزخرف حواشی ۶۵-۶۶
(۸۷) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۷۶
(۸۸) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۱۲۷
(۸۹) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۱۲۸
(۹۰) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۱۲۹
(۹۱) تفہیم القرآن ج ۱ سورہ المائدہ حاشیہ ۷۷
(۹۲) تفہیم القرآن ج ۱ سورہ المائدہ حاشیہ ۹۷
(۹۳) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۱۳۵
(۹۴) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۱۴۱
(۹۵) تفہیم القرآن ج
(۹۶) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ التوبہ حاشیہ ۳۱
(۹۷) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۱۳۷
(۹۸) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۲۱
(۹۹) تفہیمات حصہ سوم ص ۲۲۶ تا ۲۴۷
(۱۰۰) تفہیمات حصہ دوم ص ۳۱۴ تا ۳۳۶
(۱۰۱) رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۳۲۳-۳۲۴
(۱۰۲) تفہیمات حصہ اوّل ص ۱۶۷ تا ۱۷۶
(۱۰۳) مکاتیب از سید ابوالاعلیٰ مودودی
ص ۲۱۵ تا ۲۲۴
(۱۰۴) رسائل و مسائل حصہ چہارم ص ۱۰۲ تا ۱۰۶

ضمیمہ دوم

عباراتِ مؤلف کے حوالہ جات

(۱) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ بقرہ حاشیہ ۱۲۳
(۲) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ بقرہ حاشیہ ۱۲۳
(۳) تفہیم القرآن ج ۲ دیباچہ سورۂ یوسف ص ۳۸۱
(۴) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ بقرہ حاشیہ ۵۶
(۵) تفہیم القرآن ج ۵ سورۂ الحشر حاشیہ ۴
(۶) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۴۲
(۷) تفہیم القرآن ج ۵ سورۂ الجمعہ حاشیہ ۱۰
(۸) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ یوسف (دیباچہ)
(۹) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ یوسف حاشیہ ۶۸
(۱۰) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ یوسف حاشیہ ۶۹
(۱۱) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ القصص حواشی ۳ تا ۵
(۱۲) تفہیم القرآن ج
(۱۳) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ یونس حواشی ۷۸-۷۹
(۱۴) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ القصص حاشیہ ۴۶
(۱۵) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ القصص حاشیہ ۵۰
(۱۶) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ القصص حاشیہ ۵۲
(۱۷) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ القصص حاشیہ ۵۲
(ذیلی حاشیہ)

(۱۸) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ القصص حاشیہ ۵۲
(۱۹) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ الاعراف حاشیہ ۹۳
(۲۰) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ المومنون حاشیہ ۴۱
(۲۱) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ الشعراء حاشیہ ۱۸
(۲۲) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ الشعراء حاشیہ ۴۲
(۲۳) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ الشعراء حاشیہ ۵۳
(۲۴) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ الشعراء حواشی ۴۲-۴۳
(۲۵) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ طٰہٰ حواشی ۵۲-۵۴
(۲۶) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ الشعراء حاشیہ ۴۵
(۲۷) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ الاعراف حاشیہ ۹۸
(۲۸) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۶۷
(۲۹) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ الاعراف حاشیہ ۹۹
(۳۰) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ الاعراف حاشیہ ۱۰۱
(۳۱) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ الاعراف حاشیہ ۱۰۷
(۳۲) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حواشی ۶۷-۶۸
(۳۳) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ طٰہٰ حاشیہ ۶۲
(۳۴) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ طٰہٰ حاشیہ ۶۷

(۲۵) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ طٰہٰ حاشیہ ۶۸
(۲۶) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ طٰہٰ حاشیہ ۷۳
(۲۷) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ طٰہٰ حاشیہ ۷۴
(۲۸) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ الاعراف حاشیہ ۱۰۹
(۲۹) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۷۰
(۳۰) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ الاعراف حاشیہ ۱۱۸
(۳۱) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ الاعراف حاشیہ ۱۱۹
(۳۲) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۷۳
(۳۳) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ طٰہٰ حاشیہ ۵۹
(۳۴) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۷۱
(۳۵) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۷۷
(۳۶) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۷۴
(۳۷) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۷۵
(۳۸) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۸۴
(۳۹) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۸۵
(۵۰) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۴۶
(۵۱) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ ابراہیم حاشیہ ۱۲
(۵۲) الجہاد فی الاسلام ص ۳۵۸ تا ۳۶۳
(۵۳) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ الاعراف حاشیہ ۱۲۸
(۵۴) رسائل و مسائل حصہ ۳ - ص ۱۷۹ تا ۱۹۱
(۵۵) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ بنی اسرائیل حاشیہ ۶
(۵۶) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ توبہ حاشیہ ۳۳
(۵۷) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۱۱۰
(۵۸) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۱۶۰
(۵۹) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۸۷
(۶۰) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۹۰
(۶۱) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ نساء حواشی ۷۲-۷۳
(۶۲) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آل عمران حاشیہ ۶۶
(۶۳) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آل عمران حاشیہ ۲
(۶۴) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۶۳
(۶۵) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۸۰
(۶۶) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۹۸
(۶۷) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ الکہف حاشیہ ۱۸
(۶۸) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۹۱
و سورۂ آل عمران حاشیہ ۶۵
(۶۹) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آل عمران حاشیہ ۲۳
(۷۰) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۸۹
(۷۱) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آل عمران حاشیہ ۶۴
(۷۲) تفہیم القرآن ج ۱ سورہ المائدہ حاشیہ ۱۰۳
(۷۳) تفہیم القرآن ج ۱ سورہ الاعراف حواشی ۱۲۲ تا ۱۲۵
(۷۴) تفہیم القرآن ج ۱ سورہ البقرہ حواشی ۷۸-۷۹
(۷۵) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ نساء حاشیہ ۱۹۱
(۷۶) الجہاد فی الاسلام طبع سوم ص ۳۲۸ تا ۳۳۰
(۷۷) الجہاد فی الاسلام ص ۳۲۹ تا ۳۳۰
(۷۸) الجہاد فی الاسلام طبع سوم ص ۳۳۰ تا ۳۳۷
(۷۹) تفہیم القرآن ج ۱ سورہ البقرہ حاشیہ ۲۶۸

(۸۰) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۲۶۹
(۸۱) تفہیم القرآن ج ۱ سورہ البقرہ حاشیہ ۲۷۰
(۸۲) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۲۷۱
(۸۳) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۷۳
(۸۴ا) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ بنی اسرائیل حاشیہ ۸
(۸۴ب) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ الصافات حاشیہ ۷۳
(۰۵) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ الصافات حاشیہ ۷۲
(۸۶) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ الصافات حاشیہ ۷۰
(۸۷) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ الصافات حاشیہ ۷۱
(۸۸) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ الانبیاء حاشیہ ۷۲
(۸۹) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ النمل حاشیہ ۲۰
(۹۰) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ النمل حاشیہ ۲۰
(۹۱) تفہیم القرآن ج ۳ سورہ الانبیاء حاشیہ ۷۴
(۹۲) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ الانبیاء حاشیہ ۷۴
(۹۳) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ النمل حاشیہ ۵۵
(۹۴) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ النمل حاشیہ ۵۶
(۹۵) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۱۰۴
(۹۶) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۱۰۵
(۹۷) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۱۰۵
(۹۸) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حواشی ۱۰۵-۱۰۶
(۹۹) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۱۰۴
(ذیلی حاشیہ)
(۱۰۰) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ التوبہ حاشیہ ۲۹

(۱۰۱) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ بنی اسرائیل حاشیہ ۸
(۱۰۲) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ بنی اسرائیل حاشیہ ۹
(۱۰۳) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۳
(۱۰۴) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۵
(۱۰۵) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۶
(۱۰۶) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۷
(۱۰۷) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۸
(۱۰۸) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۱۹
(۱۹ الف
(۱۰۹) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۲۰
(۱۱۰) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ مریم حاشیہ ۲۰ الف
(۱۱۱) تفہیم القرآن ج ۳ سورہ مریم حاشیہ ۲۱
(۱۱۲) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ الزخرف حاشیہ ۵۳
(۱۱۳) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آل عمران حاشیہ ۴۸
(۱۱۴) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آل عمران حاشیہ ۴۶
(۱۱۵) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آل عمران حاشیہ ۴۸
(۱۱۶) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ النور حاشیہ ۲
(۱۱۷) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آل عمران حاشیہ ۵۲
(۱۱۸) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۷۹
(۱۱۹) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ النساء حاشیہ ۱۹۳
(۱۲۰) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ الزخرف حاشیہ ۵۸
(۱۲۱) تفہیم القرآن ج ۴ ص ۱۶۵
(۱۲۲) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ بنی اسرائیل حاشیہ ۹

(۱۲۳) تفہیم القرآن ج ۲ سورہ الاعراف حاشیہ ۱۰۸

(۱۲۴) تفہیمات حصہ دوم ص ۴۰ تا ۵۱

(۱۲۵) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ الاعراف حاشیہ ۲۲

(۱۲۶) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ الصافات حاشیہ ۶۷

(۱۲۷) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ یوسف حاشیہ ۱۴

(۱۲۸) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ یوسف حاشیہ ۶۲

(۱۲۹) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ یوسف حاشیہ ۷

(۱۳۰) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ یوسف حاشیہ ۸

(۱۳۱) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ یوسف حاشیہ ۱۲

(۱۳۲) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ یوسف حاشیہ ۴۲

(۱۳۳) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ القصص حاشیہ ۲۲

(۱۳۴) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ القصص حاشیہ ۳۸

(۱۳۵) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ القصص حاشیہ ۳۱

(۱۳۶) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ الزخرف حواشی ۴۲-۴۳

(۱۳۷) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ طٰہٰ حاشیہ ۶۷

(۱۳۸) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ طٰہٰ حاشیہ ۶۹

(۱۳۹) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ طٰہٰ حاشیہ ۷۲

(۱۴۰) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ طٰہٰ حاشیہ ۶۳

(۱۴۱) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ ص حاشیہ ۲۸

(۱۴۲) تفہیمات حصہ دوم ص ۴۷ تا ۵۱

(۱۴۳) تفہیم القرآن ج ۳ سورہ النحل حاشیہ ۵۶

(۱۴۴) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ سبا حاشیہ ۲۰

(۱۴۵) تفہیم القرآن ج ۴ سورۂ ص حاشیہ ۲۶

(۱۴۶) تفہیم القرآن ج ۳ سورۂ الانبیاء حاشیہ ۷۹

(۱۴۷) تفہیم القرآن ج ۵ دیباچہ سورۂ حشر ص ۳۰۰ تا ۳۰۴

(۱۴۸) تفہیم القرآن ج ۱ شانِ نزول سورۂ بقرہ ص ۴۶-۴۷

(۱۴۹) تفہیم القرآن ج ۲ سورۂ التوبہ حاشیہ ۲۶

(۱۵۰) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۹۵

(۱۵۱) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ نساء حواشی ۷۹-۸۰

(۱۵۲) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ نساء حواشی ۸۱ تا ۸۳

(۱۵۳) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۷۱

(۱۵۴) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۸۸

(۱۵۵) تفہیم القرآن ج ۱ شانِ نزول سورۂ آلِ عمران
ص ۲۲۹-۲۳۰

(۱۵۶) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۸۶

(۱۵۷) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۵۷

(۱۵۸) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۵۸

(۱۵۹) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۱۰۸

(۱۶۰) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ النساء حواشی ۴۷-۵۰

(۱۶۱) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حاشیہ ۶۱

(۱۶۲) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حاشیہ ۹۲

(۱۶۳) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حاشیہ ۱۰۹

(۱۶۴) تفہیم القرآن ج ۱ سورہ المائدہ حواشی
۶۹-۷۰-۷۱

(۱۶۵) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ النساء حاشیہ ۹۴

(۱۶۶) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ النساء حاشیہ ۹۴
(ذیلی حاشیہ)

(۱۶۷) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آل عمران حاشیہ ۹۷
(۱۶۸) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ الانعام حاشیہ ۵۹
(۱۶۹) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حواشی ۷۶-۷۷
(۱۷۰) تفہیم القرآن ج ۳ تاریخی پس منظر سورۂ نور
ص ۳۰۸ تا ۳۰۹

(۱۷۱) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آلِ عمران حاشیہ ۱۲۸
(۱۷۲) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ المائدہ حاشیہ ۹۲
(۱۷۳) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ البقرہ حواشی ۱۰۰-۱۰۱
(۱۷۴) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ النساء حاشیہ ۱۸۱
(۱۷۵) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ آل عمران حاشیہ ۱۲۹
(۱۷۶) تفہیم القرآن ج ۵ دیباچہ سورۂ الحشر
ص ۳۷۴ تا ۳۷۸

(۱۷۷) الجہاد فی الاسلام
طبع سوم ص ۲۶۶ تا ۲۶۸

(۱۷۸) الجہاد فی الاسلام ص ۲۶۸
(۱۷۹) الجہاد فی الاسلام ص ۲۶۸-۲۶۹
(۱۸۰) تفہیم القرآن ج ۵ دیباچہ سورۂ الحشر
ص ۳۷۸-۳۷۹

(۱۸۱) الجہاد فی الاسلام طبع سوم ص ۲۵۸ تا ۲۶۲
(۱۸۲) تفہیم القرآن ج ۴ دیباچہ سورہ احزاب
ص ۵۴، ۵۸ تا ۶۲

(۱۸۳) تفہیم القرآن ج ۴ ص ۶۲-۶۳
(۱۸۴) الجہاد فی الاسلام طبع سوم ص ۲۶۲ تا ۲۶۶
(۱۸۵) تفہیم القرآن ج ۵ دیباچہ سورۂ جمعہ
(۱۸۶) الجہاد فی الاسلام طبع سوم ص ۲۶۹ تا ۲۷۳
(۱۸۷) پمفلٹ سانحہ مسجد اقصیٰ ص ۳ تا ۳۰
(۱۸۸) تفہیم القرآن ج سورۂ حٰم السجدہ حاشیہ ۷۰
(۱۸۹) تفہیم القرآن ج ۱ سورۂ النساء حاشیہ ۱۹۹

اسلام

جس سے مجھے عشق ہے

اڈیار

روزنامہ "نیروٹم" مدراس کے مدیر اور AIADMK کے مجلس عاملہ کے رکن کے اسلام کے سلسلے میں بے لاگ تاثرات

● کیا حضرت مسیحؑ خدا کے بیٹے ہیں؟ ● زندہ زبان میں زندہ مصحف ● اسلام انّا دورائی کی نظر میں ● کیا اسلام تلوار سے پھیلا ہے؟ ● کیا مسلمانوں نے مندروں کو ڈھایا ہے؟

ان تمام سوالوں کے جوابات اس کتاب میں ملاحظہ کریں

قیمت /-۳ روپے

مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۶

بیرون ٹائٹل طباعت نیو کریسنٹ پرنٹرز